خصوصی شمارہ

۷۲

خالد طور

کا مکمل ناول

بالوں کا گچھا

ترتیب

اجمل کمال

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 72
اپریل 2012

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 800روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 80امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)
بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی
اکاؤنٹ: City Press Bookshop
اکاؤنٹ نمبر: 0100513669

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35650623 35213916
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

نئی کتابیں

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

Rs.200

لغاتِ روزمرہ (تیسرا ایڈیشن)

اردو زبان میں غیر معیاری استعمالات کی
فہرست و تنقید کچھ مزید لسانی نکات کے ساتھ

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.400

بوفِ کور

(ناول)

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.200

شہنشاہ

(ناول)

ریشارد کاپوشنسکی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.200

روشن دان

(خاکے)

جاوید صدیقی

Rs.200

اردو کا ابتدائی زمانہ

(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

گمشدہ چیزوں کے درمیان

عالمی ادب سے انتخاب

(منتخب ترجمے)

محمد سلیم الرحمٰن

Rs.250

زٹل نامہ

(کلیات)

جعفر زٹلی

مرتب: رشید حسن خاں

Rs.300

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 71 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابرئیل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 800 روپے
بیرون ملک: 80 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

خالد طور

بالوں کا گچھا

(ناول)

خالد طور 1943 میں مشرقی پنجاب کے قصبے فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن شمالی پنجاب کے ضلع اٹک کے گاؤں کھوڑ میں اور لڑکپن چکوال ضلع جہلم کے مقام بلکسر میں گزرا۔ یہ وہ مقامات ہیں جن کے تفصیلی مرقعے ان کی کہانیوں اور ناولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے ساہیوال اور لاہور میں تعلیم حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے صحافت میں ایم اے کیا۔ پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز میں خالد طور نے پاکستان ٹیلی وژن میں حالات حاضرہ کے رپورٹر کے طور پر اور روزنامہ نوائے وقت میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ 1979 میں وہ ریڈیو پاکستان سے پروڈیوسر کے طور پر وابستہ ہوئے اور پروگرام مینجر کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا جس سے ان کا شغف اب بھی جاری ہے۔ ان کی پہلی طویل کہانی ''سائیں موسم'' تھی جو 1966 میں فنون، لاہور، میں شائع ہوئی۔ پہلا ناول کانی نکاح 1991 میں پہلی بار انھوں نے خود شائع کیا۔ بعد میں یہ ناول آج کے شمارہ 63 میں دوبارہ شائع کیا گیا۔ اس کے بعد سے خالد طور کی طویل اور مختصر کہانیاں آج میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ بالوں کا گچھا ان کا وہ ناول ہے جسے انھوں نے برسوں پہلے لکھنا شروع کیا لیکن پھر بددل ہو کر ادھورا چھوڑ دیا۔ اس ناول کو انھوں نے اسی سال مکمل کیا ہے۔

بالوں کا گچھا

انتساب

رامِن فراز خالد کے نام

1

بڑے بھائی کو ضلع سرگودھا کے ایک قصبے جھاوریاں میں ٹرانسفر ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے، ان کا خط ہمیں ملا جس میں انھوں نے گرمیوں کی چھٹیاں جھاوریاں میں گزارنے کی دعوت دی تھی۔ میرا اور بہنوں کا انبساط قابلِ دید تھا۔ ہماری حالت ان بچوں جیسی تھی جو پکنک پر جانے والے ہوں۔

''کھوڑ دیکھ دیکھ کر تو میں تنگ آ چکی ہوں،'' مجھ سے بڑی بہن عصمت (عصمت النسا) نے کہا۔ ''وہی تیل کے کنویں، پہاڑ، خشک پہاڑیاں — پتھریلی — بے جان —''

''اور وہی وت ودھاوے!''[1] بہن زیبا (زیب النسا) نے کہا اور ہم نے ہنسنا شروع کر دیا۔ امی کھوڑ کے علاقے کے رہنے والوں کو ''وَت وَدھاوے'' کہا کرتی تھیں۔ کیوں کہتی تھیں، نہ کبھی ہم نے پوچھا نہ امی نے کبھی بتایا۔ ہم بے چینی سے چھٹیوں کی راہ دیکھنے لگے۔ میں اور عصمت تو بہت بے چین تھے۔ ہمیں بچپن ہی سے نئی نئی جگہوں پر جانے اور ایڈونچر کا شوق تھا۔ والد صاحب کھوڑ سے تبدیل ہو کر بلکسر آ گئے تھے۔ بلکسر میں خوبصورت بنگلہ تو تھا لیکن سکول نہیں تھے۔ ہم ان دنوں چکوال کی ایک نواحی بستی کوٹ طرّے باز خان میں کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ کوٹ طرے باز خان کو کچھ لوگ کوٹ سرفراز خان بھی کہتے تھے۔ طرے باز خان چکوال کے نامی گرامی وکیل تھے۔ ہمیشہ شلوار کرتا پہنتے تھے، سر پر کلاہ والی پگڑی باندھتے تھے؛ کچہری میں بھی شلوار کرتے پر ہی کالا کوٹ پہن لیا کرتے تھے۔ سرفراز خان جاگیردار تھے، ہمیشہ پتلون شرٹ اور ٹائی میں ملبوس رہتے تھے، کبھی کبھی سر پر سولر ہیٹ بھی پہنا کرتے تھے۔ سردیوں میں طرے باز خان شیروانی اور سرفراز خان تھری پیس سوٹ پہنتے تھے۔ سرفراز خان چکوال کے لوگوں کو شاید اجنبی محسوس ہوتے تھے، اس لیے مضافاتی بستی کو کوٹ طرے باز خان ہی کہا جاتا تھا۔ یہ مضافاتی بستی ایک ٹیلے پر تھی۔ سرفراز خان کی سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی

1۔ دھنی کی زبان میں وَت کا مطلب ''اَور'' ہے، ودھاوے کا مطلب بڑھائے۔ وت ودھاوے کا مطلب ''اور بڑھائے'' ہے۔

حویلی چوکور تھی اور بلندی پر تھی؛ طرے باز خان کی حویلی چھوٹی تھی اور قدرے نشیب میں، ہمارے کرائے کے گھر سے چند قدم ہی دور تھی۔ اسی بستی میں لڑکیوں کے لیے ہائی سکول موجود تھا جو ہمارے کرائے کے گھر سے سوگز سے بھی کم فاصلے پر قدرے اونچائی پر تھا۔ سکول کے سامنے اینٹوں کی بنی ہوئی سڑک ڈھلوان سی بناتی ہوئی، ہمارے گھر کے سامنے سے موڑ کاٹتی ہوئی چکوال شہر کی سمت چلی جاتی تھی، جہاں سے چکوال شہر کی لڑکیاں ٹولیاں سی بنا کر گزرا کرتی تھیں۔

بہن عصمت اور باجی زیبا دوپہر کو کھانا کھانے گھر آجایا کرتی تھیں، آدھی چھٹی ختم ہونے پر پھر سکول چلی جایا کرتی تھیں۔ میرا اسکول دور تھا۔ امی اور بڑی آپا ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ آپا کی گرہستی اجڑ چکی تھی۔ صدمے نے ان کی ذہنی حالت تباہ کر دی تھی۔ والد صاحب کی طرح بڑی بڑی آنکھوں والی آپا اپنے وجود میں سمٹ چکی تھیں، بہت کم بولتی تھیں۔ گرمی کی چھٹیاں ہوئیں تو آپا غیر متوقع طور پر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

''میں نہیں جاؤں گی تمھارے ساتھ،'' انھوں نے آہستہ سے کہا۔ ''کوئی مجھے مجبور نہ کرے۔''

ہم سب جانتے تھے کہ آپا جب کوئی فیصلہ کر لیتی ہیں تو اسے بدلنا ان کے اپنے اختیار میں بھی نہیں رہتا۔

اگلے روز ہم بلکسر پہنچ گئے۔ بہن عصمت، باجی زیبا اور میں نے جھاوریاں جانے کے لیے اپنے اپنے بیگ تیار کرنا شروع کر دیے۔ بھائی نے خط میں سب ہدایات تحریر کر دی تھیں۔

ہمیں سرگودھا جانے والی بس پر بیٹھ کر ایک چھوٹے سے شہر شاہ پور اترنا تھا جہاں بھائی تانگہ لیے موجود ہوں گے۔ قصبہ جھاوریاں، شاہ پور سے بارہ میل دور تھا۔ وہاں صرف تانگے ہی جاتے تھے۔ قصبے میں انسانوں اور حیوانوں کے لیے ہسپتال موجود تھے۔ بھائی ضلع اٹک کے کسی قصبے دومیل سے ٹرانسفر ہو کر جھاوریاں کے وٹرنری ہسپتال میں آئے تھے۔

چکوال سے سرگودھا جانے والی بس صبح سات بجے بلکسر کے لاری اڈے پر پہنچتی تھی۔ والد صاحب ہمیں تقریباً پونے سات بجے کمپنی کی چھوٹی سی ویگن پر لاری اڈے لے آئے۔ سات بجے بس آئی۔ مسافر بہت ہی کم تھے۔ ہمیں اگلی نشستیں مل گئیں۔ والد صاحب ہمیں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ ان دنوں بسوں ہی میں کنڈکٹر ٹکٹ دیا کرتے تھے۔

''کہاں جانا ہے؟'' کنڈکٹر نے مقامی زبان کے بجاے اردو میں پوچھا۔

''شاہ پور۔'' میں نے جیب سے ٹکٹوں کے لیے پیسے نکالے۔ ''تین ٹکٹ۔''

بس چلی۔ سفر میں ہمیشہ بہت دلچسپیاں ہوا کرتی ہیں۔ خصوصاً مجھے شمالی پنجاب کے اس اجاڑ علاقے میں سفر کرنا بہت اچھا لگتا تھا جہاں کوسوں تک آبادی کے آثار نظر نہیں آیا کرتے... افق تک پھیلا ہوا بیابان، جنڈ اور کریر کے چھوٹے چھوٹے درخت، پھلاہیاں، جھاڑیاں اور ان پر پھیلی ہوئی ایک ایسی کیفیت جس میں وسعت بھی ہوتی ہے، تنہائی بھی — ایسی تنہائی جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان کرتے ہوے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شاید اسی کو ہُو کا عالم کہا جاتا ہوگا، لیکن ہر بار میری کیفیت ہُو کے عالم سے بھی جدا ہو جایا کرتی تھی۔

دھرابی کا قصبہ گزرا۔ بس کی سب کھڑکیاں کھلی تھیں۔ صبح کی ہوا میں خنکی تھی جو چہرے پر جھونکوں کے ٹکرانے پر خوشگوار تاثر پیدا کر رہی تھی۔ کئی ڈھوکیں گزریں۔ ایک برساتی نالے سے گزر کر بس تلہ گنگ پہنچ گئی۔ کچھ سواریاں اتریں، کچھ مسافر بس میں داخل ہوے۔ ایک مسافر نے بس میں سوار ہوتے ہوے نعرہ سا لگایا۔

''میں جابے ویساں!'' (میں جابہ جاؤں گا)۔

سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بہت اونچی آواز میں بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس نے جابہ جانا ہے۔ جابہ شاید راستے میں آنے والے کسی گاؤں کا نام ہوگا۔ چند سواریوں نے اسے پاس بٹھا کر یقین دلایا کہ وہ جابہ جانے والی بس ہی میں بیٹھا ہے۔ بس چلی۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا کہ جھاوریاں کا قصبہ کیسا ہوگا؟

تلہ گنگ سے بس کو سرگودھا کی سمت مڑنا تھا۔ سڑک تین اطراف میں جاتی ہے: سیدھی میانوالی کی سمت، شمال میں ڈھلیاں، پنڈی گھیب اور راولپنڈی جانے کے لیے، اور جنوب میں سرگودھا جانے کے لیے۔ بس جنوب کی سمت مڑی اور تلہ گنگ سے نکلنے پر ایک بار پھر اجاڑ بیابان نظر آیا۔ یہاں بھی جنڈ اور کریر کے خودرَو چھوٹے چھوٹے درخت افق تک پھیلے ہوے نظر آئے۔ جنگلی بیروں کی جھاڑیوں کے درمیان کہیں کہیں کھیت بھی نظر آتے تھے جن میں اگلی فصل کے لیے لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ کچھ کھیتوں میں سہاگہ پھرا ہوا نظر آیا۔

''ان فصلوں کا دارومدار بارش پر ہے،'' میں نے سوچا، ''تمام بارانی علاقوں کی طرح یہاں بھی کسان ہل چلا کر افق کی سمت دیکھنا شروع کر دیتے ہوں گے۔ جب افق پر انھیں سرمئی بادلوں کی زلفیں ہوا میں اڑتی بوندوں سے بھیگی بھیگی نظر آتی ہوں گی، وہ کھیتوں میں بیج ڈالنے کی تیاری شروع کر دیتے ہوں گے۔''

میں یہ بھی جانتا تھا کہ مون سون سے پہلے، مقامی پیروں کے کارندے ملنگ کسانوں کو ترغیب دینے لگتے ہیں کہ وہ پیروں کو بارش کے لیے دعائیں مانگنے کے لیے کہیں اور نذرانہ دیں۔ قدیم زمانے کے مکار ساحروں کی طرح ہر سال مقامی پیر بارش کے لیے دعا کا معاوضہ نذرانوں کی صورت وصول کرتے ہوئے کسانوں سے اچھی خاصی رقم بٹور لیتے ہیں — سادہ لوح کسان مون سون کی بارشوں کو پیروں کی دعاؤں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

سورج کے بلند ہونے پر جہاں ہوا میں گرمی کا احساس بڑھ رہا تھا، اجاڑ بیابان میں کرنوں کی چمک اس تپش کا احساس دلانے لگی تھی جو دوپہر آنے پر ہر شے کو جھلسا دیا کرتی ہے — سارا راستہ اجاڑ تھا۔ پھر ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے — یہ چینجی (Cheenji) کا گاؤں تھا۔ چینجی کون تھی یا کون تھا؟ کوئی نہیں جانتا۔ بہت ہی چھوٹا گاؤں تھا۔ گاؤں کے قریب سڑک پر چند دیہاتی نظر آئے۔ انھوں نے بڑے بڑے سفید پٹکے باندھے ہوئے تھے۔ نہ کسی سواری نے اترنا تھا نہ ہی دیہاتیوں میں سے کسی نے بس کو رکنے کا اشارہ کیا۔ بس، اپنی مخصوص رفتار میں، گاؤں کے قریب سے گزر گئی۔ گاؤں کے آگے جھاڑ جھنکاڑ کم ہو گیا۔ سڑک کی دونوں جانب کھیت نظر آئے — دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت۔ ان کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر جھاڑیاں باڑ بناتی نظر آئیں۔ آڑی ترچھی جھاڑیاں اور زرد پوہلی کے پودے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ کھیتوں کے آس پاس کسانوں کی بہت سی ڈھوکیں ہوں گی لیکن شام سے پہلے ان کا محل وقوع جاننا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ شام کو ان کے تنوروں سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیریں ہی بتایا کرتی ہیں کہ وہ کہاں واقع ہیں۔

ان کھیتوں کے کنارے کہیں بلند تھے تو کہیں نشیبی رخ اختیار کر رہے تھے۔ شمالی پنجاب میں زمین کہیں بھی ہموار نہیں ہے۔ کھیتوں کے کناروں پر اُگے ہوئے درخت دور تک جاتے ہوئے افق میں گم سے ہو جاتے ہیں — شاید یہ حرکت کا نظر سے کوئی خاص تعلق ہے کہ دور کے درخت پیچھے کی

سمت جانے کے بجائے آگے کی سمت نیم دائرہ سا بناتے ہوے چلتے محسوس ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ نیم دائرہ بنا کر سڑک کے آگے آ جائیں گے۔

پھر کھچیاں (Khichyan) کا گاؤں آیا۔ یہ بھی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں بھی نہ کوئی مسافر اترا نہ چڑھا، بس گاؤں کو پیچھے چھوڑ گئی — پھر وہی اجاڑ بیابان نظر آنے لگے۔ مسافر اب بس کی کھڑکیاں بند کر رہے تھے کیونکہ ہوا میں تپش بڑھ گئی تھی۔ جون کی تپتی چاشت جھلستی دوپہر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سڑک کے کناروں پر ببولوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ سے دکھائی دے رہے تھے۔ ان ببولوں کے نیچے، پٹکے سروں پر باندھے کچھ دیہاتی بیٹھے نظر آئے، وہ اونگھتے محسوس ہو رہے تھے۔ بس میں بھی کئی مسافر اونگھ رہے تھے، کچھ آنکھیں بند کیے سو رہے تھے یا غنودگی کے عالم میں تھے۔

''میں جابے ونجنا ایں!'' (میں نے جابہ جانا ہے۔) بلند آواز پر سب مسافر چونکے۔ بہن عصمت نے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہی مسافر بس میں کھڑا شور مچا رہا تھا۔ کنڈکٹر نے اسے تسلی دی، بٹھایا اور کہا کہ جابہ آنے پر وہ اسے اتار دے گا۔ دس پندرہ منٹوں کے بعد جابہ کا قصبہ نظر آنے لگا اور وہ دیہاتی پھر سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس بار کنڈکٹر نے اسے کھڑا ہی رہنے دیا۔ بس جابہ پہنچ گئی۔ مٹی اور بھوسے سے لپی ہوئی گھروں کی دیواریں، لکڑی کے کچھ کھلے کچھ بند دروازے . . . جابہ گاؤں قدرے بڑا تھا۔ سڑک اس گاؤں کے بیچ میں سے گزرتی ہے۔ جہاں بس رکی وہاں چھوٹا سا ہوٹل بھی نظر آیا جس میں دو چار دیہاتی بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ سامنے دو چار بڑے بڑے دیگچے رکھے ہوٹل کا مالک بار بار ڈھکن اٹھا کر دیگچوں کے اندر دیکھ رہا تھا۔ شور مچانے والا مسافر جابہ میں یوں بس سے اترا جیسے کسی قید خانے کی بس سے اتر رہا ہو۔ ایک مسافر بیوی بچوں کے ساتھ سوار ہوا اور بس جابہ سے بھی نکلی۔

دور کٹھہ کالرہ کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ چوٹیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ بھائی نے خط میں لکھا تھا کہ کٹھہ کالرہ کے پہاڑوں میں ڈھلوان بہت خطرناک ہے —ایک دم نیچے گرتی ہوئی۔ جیسے جیسے پہاڑ نمایاں ہوے، میرا تجسس بڑھ گیا۔ بس پہاڑ کے قدموں میں پہنچی تو بھائی کی بات پر یقین ہو گیا— ڈھلوان بہت ہی خطرناک محسوس ہوئی۔ نیچے جاتی ہوئی سڑک اندھی ڈھلوان پر ہر دو تین سو گز کی دوری پر ایک دم سے مڑ جاتی ہے جیسے یوٹرن لے رہی ہو۔

''نہ جانے سرگودھا سے آنے والے بھاری ٹرک،''میں نے سوچا،''اس چڑھائی پر کیسے چڑھتے ہوں گے؟''

ایک موڑ سے کچھ نیچے، شدید گرمی میں جھلسی ہوئی چٹانوں کے درمیان، بکریاں اور دنبے نظر آئے جو ڈھلوان پر اُگی خشک گھاس پر منہ مار رہے تھے۔ ایک بکرے نے ایک ببول کے چھوٹے سے درخت کے تنے پر اگلے پیر ٹکائے ہوئے تھے۔ سیاہ رنگ کا یہ بکرا بلندی سے ریچھ کی طرح نظر آ رہا تھا— سینگ نہ ہوتے تو واقعی اس پر ریچھ ہی کا دھوکا ہوتا۔ کچھ دور، ایک ببول کے نیچے، ایک چرواہا، بڑا سا پٹکا باندھے، تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بچپن ہی سے تیز جھلساتی ہوئی دھوپ نے اس کے بدن پر، اس کی جلد پر، جیسے تانبے کی چمکیلی چادر چڑھا رکھی تھی جس سے اس کی تمام حس ختم سی محسوس ہو رہی تھی —وہ لُو جو کسی شہری نوجوان کو دس پندرہ منٹوں ہی میں سن سٹروک سے بے جان کر سکتی ہے، شمالی پنجاب کے چرواہوں کے لیے معمولی گرم ہوا رہتی ہے۔

دس بارہ موڑ کاٹنے کے بعد بس پہاڑ کے پاؤں میں قدرے ہموار سڑک پر آ گئی، پھر ایک موڑ کاٹ کر سیدھی ڈھلوان پر اتری۔ یوں محسوس ہوا جیسے بس آسمان سے زمین پر اتری ہو —سارا ماحول یکسر بدل گیا۔ تمام مناظر نئے نئے سے لگے۔ سڑک کے کنارے شیشم کے لمبے لمبے گھنے درخت نظر آئے جن کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں۔ جھاڑ جھنکاڑ کہیں بھی نہ تھا۔ سڑک پر چھاؤں زیادہ اور دھوپ کم تھی۔ ہوا میں تپش کا احساس کم ہو گیا۔ اس کے باوجود کہ بس بلندی سے نشیبی میدانوں میں آئی تھی، ہوا میں خنکی کا احساس موجود تھا۔ درختوں کے درمیان سے نظر آنے والے کھیتوں میں ہریالی تھی۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیوں کو خریف کی فصلوں نے تقریباً چھپا رکھا تھا۔ سڑک بھی اجاڑ نہیں تھی۔ بیل گاڑیاں اور تانگے نظر آنے لگے تھے۔ ضلع سرگودھا مکمل طور پر شمالی پنجاب میں شامل نہیں ہے لیکن یہاں کی زبان اور لہجے پر شمالی پنجاب کا اثر موجود ہے جو بس میں بیٹھے مسافروں کی باتوں میں مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کٹھہ کالرہ کے پہاڑ اس سلسلے ہائے کوہ میں شامل ہیں جنھیں سالٹ رینج کہا جاتا ہے۔ مقامی لوگ اس سلسلے کو کالا چِٹا پہاڑی سلسلہ کہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں سون سکیسر کے پہاڑ بھی موجود ہیں۔

بس شاہ پور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پتا ہی نہ چلا کہ دوپہر کب سہ پہر میں بدل گئی تھی۔ کہیں

کہیں سڑک پر درختوں کا سلسلہ کم ہونے لگتا تھا؛ خصوصاً جب بس دریائے جہلم کے پل کے پاس پہنچی تو درخت بہت کم رہ گئے۔ بھائی نے خط میں بتایا تھا کہ شاہ پور سے پہلے دریائے جہلم کا پل آئے گا۔ دریا آگے جا کر دریائے چناب سے مل جاتا ہے۔ پل سے پہلے شدید گرمی نے مناظر کو دھندلائی ہوئی تپش میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ دھند موسم سرما جیسی نہ تھی، یوں لگتا تھا جیسے تمازت پھیلاتی ہوئی چمکتی کرنیں آپس میں الجھ گئی ہیں۔ بس پل پر سے گزری۔ دریا میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ پل کے آگے کا علاقہ اور بھی سرسبز نظر آیا۔ ہوا میں موجود تپش کے احساس میں خریف کی فصلوں سے اٹھتی ہوئی مہک بھی رچی ہوئی تھی۔

2

بس شاہ پور پہنچی۔ اڈے پر بھائی موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک لمبے قد کے، گورے چٹے، دبلے پتلے، چست پاجامے اور ململ کے انگرکھے میں ملبوس، ادھیڑ عمر کے شخص بھی موجود تھے۔ لمبی آنکھیں، لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اوپر کی سمت اٹھی ہوئی پیشانی، چہرہ قدرے لمبوترا اور رخساروں پر ابھری ہوئی ہڈیاں۔ ان کے چہرے پر شگفتگی تھی۔

''یہ لباس مقامی لوگوں کا تو ہو نہیں سکتا،'' میں نے انھیں دیکھتے ہی سوچا۔ کنڈکٹر نے ہمارا سامان، جو تین بیگز پر مشتمل تھا، اتارا۔ ایک تانگے والے نے بیگ لے کر تانگے میں رکھ دیے۔ بھائی نے ہم سے ملنے کے بعد اپنے ساتھی کی سمت اشارہ کیا جو مسکرا رہے تھے۔

''یہ میر صاحب ہیں،'' بھائی نے کہا، ''جھاوریاں میں میرے بہترین دوست۔ میرے ساتھ چلے آئے آپ کو لینے۔'' میر صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا، بہنوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ہم تانگے میں بیٹھے ہی تھے کہ میر صاحب نے تانگے والے کی سمت دیکھا... پھر بھائی کی طرف دیکھا۔

''بھیا... بچے اتنی گرمی میں آئے ہیں،'' میر صاحب نے کہا، ''انھیں پیاس تو لگی ہوگی۔''

''ہاں،'' بھائی نے کہا ''لیکن یہاں...''

اس سے پہلے کہ بھائی کچھ کہتے، میر صاحب نے تانگے والے کی سمت دیکھا۔

''کیوں بھیا،'' انھوں نے کہا، ''یہاں کوئی ہوٹل ہے؟''

''جی،'' تانگے والے نے کہا، ''ہوٹل تو ہے لیکن اس وقت تو کھانا نہیں ملے گا۔''

''کھانا نہیں چاہیے ہمیں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''کہیں دودھ سوڈا[2] مل جائے گا؟''

''کیوں نہیں جی،'' تانگے والے نے کہا۔ ''وہ سامنے ہی تو ہے پان سگریٹوں کی دکان، وہاں مل جائے گا۔'' اس نے تانگہ موڑا۔ پان سگریٹ کی دکان کے سامنے پہنچ گیا۔

''لے آؤ بھیا،'' میر صاحب نے کہا۔ ''ٹھنڈی ہونی چاہییں۔''

''جھاوریاں میں تو۔ ۔ ۔ '' بھائی نے کہا، ''برف بھی نہیں ملے گی۔ میں تو ان کو بتا چکا ہوں کہ جھاوریاں میں بجلی بھی نہیں ہے۔ گرمیاں گزارنا ایڈونچر ہوگا۔''

''بھیا، ہم تو دیہاتی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں،'' میر صاحب نے کہا۔

تانگے والا سرخ و سفید، گلابی بوتلیں لے آیا۔ بوتلیں ٹھنڈی تھیں۔ پیاس بھی تھی۔ دودھ سوڈا اچھا لگا۔

''سفر کیسا رہا؟'' میر صاحب نے میری طرف دیکھا۔ وہ اور بھائی تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں اور بہنیں پیچھے تھے۔

''ٹھیک ہی گزرا،'' میں نے کہا، اور میر صاحب مسکرائے۔

''اتنی شدید گرمی میں خوشگوار تو ہرگز نہ رہا ہوگا،'' انھوں نے کہا۔ پھر انھوں نے باجی زیبا اور بہن عصمت سے کچھ سوال پوچھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ بہنیں میٹرک کر رہی ہیں تو بہت خوش ہوئے۔

''ہماری دو بیٹیاں ہیں،'' انھوں نے کہا۔ ''گاؤں کے ماحول میں بہت تنہا تنہا سی رہتی ہیں۔ آپ سے مل کر بہت اچھا محسوس کریں گی۔''

2۔ ان دنوں دیہاتوں میں دودھ سوڈے کو بہترین مشروب سمجھا جاتا تھا۔ چکوال کے چھپڑ بازار میں تو سب کے سامنے دودھ سوڈے کی بوتلیں بھری جایا کرتی تھیں جنھیں بازار سے گزرتا ہوا ہر شخص دیکھ سکتا تھا۔ ایک لکڑی کے سانچے میں شیشے کی ایسی بوتلیں دودھ اور خوشبوؤں سے بھر کر رکھ دی جاتی تھیں جن کی گردنیں اندر کی سمت بڑھی ہوتی تھیں اور اوپر ہونٹ نچا ہوتا تھا۔ سانچے میں بوتلیں رکھ کر کس دی جاتی تھیں۔ ان کے منھ ایسے سوراخوں سے جڑے ہوتے تھے جو گیس کے سلنڈر سے پیوست ہوتے تھے۔ سانچے کو زور سے گھمایا جاتا تھا اور کچھ دیر بعد کچے کھٹاک سے بوتلوں کے دہانوں میں پھنس جاتے تھے۔ انھیں کھولنے کے لیے بھی لکڑی کا چوکور ٹکڑا استعمال کیا جاتا تھا جو اندر سے ابھرا ہوتا تھا۔

تانگے کا سفر خوشگوار تھا۔ شاہ پور سے جھاوریاں جانے والی سڑک کے دونوں کناروں پر اونچے اور گھنے شیشم کے درخت تھے جن کی شاخوں اور پتوں سے چھن چھن کر ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں بہت دلکش نظر آ رہی تھیں اور سامنے سے آنے والی ہوا، جو پشت پر میرے بالوں کو بار بار اُڑا رہی تھی، خنک اور خوشگوار تھی۔ خنکی کے اس احساس میں مہک بھی تھی — خریف کے بلند ہوتے ہوئے پودوں، ہلکے اور گہرے سبز رنگ والے پودوں کی مہک۔

تانگے کی رفتار ایک سی تھی۔ بھائی اور میر صاحب کبھی کبھی باتیں کرنا شروع کر دیتے تھے ورنہ گھوڑے کے سموں کی آواز ہی، ایک تسلسل کے ساتھ، تال سی بلند کر رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ درختوں پر پرندوں کے شور کا احساس ہوا۔ ہر شام کی طرح، بسیرا کرنے سے پہلے، پرندے شور مچا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد چڑیوں کی تھی۔ کہیں کہیں درختوں کی اونچی شاخوں پر کوّے بھی شور مچا رہے تھے۔ وہ کبھی اڑتے تھے، پھر بیٹھ جاتے تھے، ان کے بیٹھنے سے شاخیں جھولنے لگتی تھیں، پھر اڑتے تھے اور شاخوں میں جُھلاہٹ سی چھوڑ جاتے تھے۔

ایک قصبہ گزرا۔

''یہ چاچڑاں ہے،'' بھائی نے کہا۔ ''یہاں کا جاگیردار رانا افضل میرا اچھا دوست بن گیا ہے۔''

''وٹرنری ڈاکٹر سے دوستی تو جاگیرداروں کی ضرورت بھی ہے،'' میر صاحب نے کہا، اور بھائی نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔

''نہیں،'' انھوں نے کہا، ''ایسی بات بھی نہیں ہے۔ رانا افضل اچھا آدمی ہے۔''

چھوٹی سی کولتار کی سڑک کے دونوں کناروں پر کبھی کبھی چرواہے اور چرواہیاں بھی نظر آتی تھیں۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہنکاتی، اپنے اپنے گھروں کی سمت تیز تیز قدموں سے یوں چلی جا رہی تھیں جیسے شام ہونے کا احساس ان کی نگاہوں میں بھی گہرا ہو رہا ہو۔ جھاوریاں کی طرف سے آنے والا ایک تانگہ بھی گزرا، بیل گاڑی بھی گزری اور کوٹ احمد خان کا قصبہ آ گیا۔ شام کے سایوں میں سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا بورڈ نظر آیا جس پر کالے رنگ سے قصبے کا نام لکھا ہوا تھا۔ شام گہری ہو رہی تھی۔

''بس ایک گاؤں اور — '' بھائی نے کہا۔'' کوٹ بھائی خان، اور پھر ہم جھاوریاں پہنچ جائیں گے۔''

درختوں پر اب پرندوں کی آوازیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ چند کلومیٹر کے بعد کوٹ بھائی خان کا قصبہ آ گیا اور پھر نیم تاریکی میں ہم جھاوریاں پہنچ گئے۔

تانگہ بائیں جانب مڑا۔ جہاں سے گھوڑے نے بائیں جانب مڑنا شروع کیا وہاں سے ایک سڑک دائیں جانب بھی جاتی نظر آئی۔ اسی سڑک کے کنارے ایک ہوٹل میں لالٹینوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے باہر بچھی چارپائیوں پر چند دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک بوسیدہ سی بس بھی کھڑی تھی۔

''یہ لاری اڈہ ہے،'' بھائی نے کہا۔'' صبح یہاں سے ایک بس کالرہ اسٹیٹ جاتی ہے۔ کالرہ اسٹیٹ خضر حیات ٹوانہ کی جاگیر ہے۔ وہاں سے سرگودھا کے لیے بسیں چلتی ہیں۔''

تانگہ بائیں ہاتھ مڑ کر تیس چالیس گز ہی دور گیا ہوگا کہ سڑک کی ایک جانب کھلے احاطے والی عمارت نظر آئی۔ اس ایک منزلہ عمارت کے سامنے تنور بھی نظر آیا جس پر سرکنڈوں کا چھپر تھا۔

''یہ میرا ہسپتال ہے،'' بھائی نے کہا، اور خود ہی ہنس پڑے۔ میر صاحب نے بھی قہقہہ لگایا۔ ''یہاں میں جانوروں کا علاج کرتا ہوں۔''

دوسری جانب تنور پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے اردگرد چند لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ عورت نے اپنا سر دوپٹے سے باندھ رکھا تھا۔ یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا ہی تھا کہ دیہات میں لوگ رات کا کھانا کھا کر بہت جلد سو جاتے ہیں۔ شام سے کچھ پہلے تنوروں میں لکڑیاں پھینک دی جاتی ہیں اور اندھیرا ہونے سے پہلے تنور بند ہو جاتے ہیں۔ تنور سے دو تین سو گز دور، ایک میدان نما کھلے احاطے کے سامنے، دائیں جانب ایک چوڑی گلی میں تانگہ مڑا اور دائیں سمت دروازے کے سامنے رک گیا۔ چوڑی گلی کے سامنے کھیت نظر آئے۔

دروازہ بھابھی نے کھولا۔ انھیں شاید ہمارا انتظار بہت بے چین کیے ہوئے تھا۔ دروازے کے پاس ہی ایک تیس بتیس برس کی عورت بھی کھڑی تھی جو تیزی سے صحن میں موجود ایک مرد کی طرف مڑی۔'' ڈورا (بہرا) ہو گیا ہے تو گداؤ؟'' وہ چیخی۔'' نہ تانگہ رکنے کی آواز سنی ہے نہ دروازہ کھٹکھٹانے کی . . . دھیان کدھر ہے تیرا؟''

گداؤ نام کا مرد چونک کر دروازے کی سمت دوڑا اور ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہی تانگے کی سمت گیا جہاں کوچوان سامان اتار رہا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کے چہرے کے خدوخال واضح نہ تھے۔ گھر میں دروازے کے سامنے لمبا چوڑا صحن تھا۔ بیرونی دروازے کے قریب ہی دائیں جانب برآمدہ تھا۔ برآمدے میں دو لالٹینوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک میرا دھیان صحن کی سمت گیا۔ ایک کتا غرّا رہا تھا۔ پھر اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ دروازے کے سامنے بھائی اور میر صاحب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ پھر میر صاحب چلے گئے۔

''چپ کر ٹائیگر!'' عورت نے پھر چیخ کر کہا، ''کوئی غیر نہیں گھسا گھر میں۔''

عورت کے پہلو میں ایک بچہ بھی تھا — چار پانچ برس کا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا منڈا ہوا سر چمک رہا تھا۔ جیسے ہی وہ صحن میں بھونکتے ہوئے کتے کو دیکھنے کے لیے مڑا، میری نگاہیں اس کے سر پر ٹھہر سی گئیں۔

اس کے سر پر پیچھے کی سمت دائیں جانب بالشت بھر بالوں کا گچھا لٹکا ہوا تھا۔

بھابھی نے بچے کی سمت اشارہ کیا۔ ''رقیہ کا بیٹا ہے بُوبا۔''

کھانا تیار تھا۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ گداؤ (گدا حسین) ایک شور مچانے والا گیس لیمپ لے آیا جس کی تیز روشنی میں برآمدے کے ساتھ ساتھ، اندر کی جانب دو کمروں میں کھلنے والے دروازے نظر آئے۔ صحن بھی نمایاں ہوگیا۔ ہم برآمدے میں بیٹھے تھے۔ برآمدے میں اوپر کی جانب تین چقیں گول کی ہوئی نظر آئیں۔

''ہسپتال سے اٹھالائے ہو؟'' بھائی نے گداؤ کے ہاتھ میں گیس لیمپ دیکھ کر کہا۔

''پھر کیا ہوا صاب!'' گداؤ نے کہا۔ آواز نہ موٹی تھی نہ پتلی۔ ''ہسپتال میں اس وقت کون سا جانور آئے گا۔ لالٹین ہے بخشو کے پاس۔''

برآمدے میں گرمی تھی۔ میرا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا لیکن نئی جگہ، نیا ماحول، نئے لوگوں کے سامنے پیدا ہونے والی کیفیت ہر احساس پر بھاری تھی۔

''بستر لگا دیے ہیں؟'' بھائی نے سوالیہ لہجے میں گداؤ سے کہا، پھر ہماری طرف دیکھا۔ ''یہاں ہم چھت پر سوتے ہیں۔''

''لگا دیے ہیں صاب جی،'' گداؤ نے کہا۔

''تم بھی کھانا کھالو،'' بھائی نے کہا،'' اور پھر گھر پہنچو، دیر ہوگئی ہے۔''

''اچھا صاب جی،'' گداؤ نے جواب دیا اور برآمدے میں، بیرونی دروازے کی دوسری جانب، باورچی خانے کی طرف بڑھا جہاں رقیہ بیٹھی بُوبے (محبوب) کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ گداؤ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ہمارے سامنے میز پر کھانا موجود تھا۔ سب سے نمایاں چنگیر[3] تھی جس میں سرخ اور پیلا رنگ نمایاں تھا اور دسترخوان میں تنور کی روٹیاں پڑی تھیں۔

''چھت پر رات کے وقت ٹھنڈی ہوا چلتی ہے،'' بھابھی نے میری پیشانی پر پسینے کے قطرے دیکھتے ہوئے کہا،'' آرام سے نیند آ جاتی ہے۔''

برآمدے میں وقت کا احساس نہ رہا، نہ ہی گرمی کا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ گداؤ کھانا کھا کر چلا گیا۔ رقیہ برتن سمیٹ رہی تھی۔

''یہاں زندگی تھوڑی مشکل ہے،'' بھائی نے کہا،'' وہ آسائشیں جن کے آپ لوگ عادی ہو، یہاں نہیں ہیں۔''

''چکوال میں بھی . . . '' عصمت نے کہا،'' زیادہ آسائشیں نہیں ہیں۔ بجلی ہے لیکن پانی ماشکی ہی بھرتا ہے۔ وہاں بھی کوئی فلش سسٹم نہیں ہے۔''

''یہی میں بتانے والا تھا،'' بھائی نے کہا۔'' یہاں پانی کے لیے صحن میں ہینڈ پمپ ہے۔'' ان کا ہاتھ صحن کی طرف اٹھا ہوا تھا۔'' گداؤ پانی کی کمی نہیں ہونے دیتا۔ غسل خانے میں بڑا جستی حمام ہے جس میں ٹونٹی لگی ہوئی ہے۔ لیٹرین میں پانی کا بیرل موجود ہے۔ یہاں تو خود ہی پانی کو بہانا پڑتا ہے جو باہر کھیت کے کنارے گہری نالی میں چلا جاتا ہے۔ کھوڑ اور بلکسر میں کمپنی کے بنگلوں کے مقابلے میں یہ سب کچھ تم لوگوں کو سو برس پیچھے کی زندگی محسوس ہوگی۔''

بھابھی نے ہماری طرف دیکھا۔

''شروع شروع میں تو پریشانی ہوتی ہے،'' انھوں نے کہا،'' پانچ چھ مہینوں میں مجھے تو عادت سی ہوگئی ہے۔'' بھابھی پوٹھوہار کی رہنے والی ہیں۔ وہ وسطی پنجاب کی پنجابی بولیں یا اردو، ان کا لہجہ

3۔ چنگیر: دوب سے بنی ہوئی روٹیاں رکھنے والی بڑی تھالی۔

پوٹھوہاری ہی رہتا ہے۔ بھابھی کے بڑے بھائی چکوال کے ریلوے سٹیشن پر سٹیشن ماسٹر تھے۔ ایک بار ٹرین سے اترتے ہوئے امی نے بھابھی کو دیکھ لیا۔ اتنی پسند آئیں کہ فوراً ہی بھائی سے بیاہنے کا فیصلہ کرلیا۔ بھابھی صرف پرائمری تک تعلیم یافتہ تھیں۔ والد صاحب نے مزاحمت کی لیکن جب امی نے بھائی کو بھابھی کی تصویر دکھائی، وہ انکار نہ کر سکے۔

میں ہاتھ دھونے صحن میں نکلا تو بندھا ہوا کتا زور سے بھونکا۔ بھائی میرے پیچھے تھے۔

''ٹائیگر!'' انھوں نے زور سے کہا اور کتا خاموش ہوگیا۔ وہ آگے بڑھے۔ میں نے بھی صحن کے کچے فرش پر پاؤں رکھا۔ ٹائیگر پھر غرّایا۔ بھائی کتے کے پاس گئے تو اس نے دم ہلانی شروع کر دی۔

''یہ کیا نام ہے؟'' میں نے سوچا۔''ٹائیگر... کیا ٹائیگر بھی بھونکا کرتے ہیں؟''

میں بھائی کے پہلو میں تھا۔ ٹائیگر نے دھیمی دھیمی روشنی میں مجھے دیکھا۔ دُم ہلنی بند ہوگئی۔ اس نے آہستہ سے ''بھاؤں'' کی آواز نکالی، پھر بھائی کی طرف دیکھا، دم پھر ہلنی شروع ہوگئی۔ بھائی نے مڑ کر صحن میں آتی ہوئی بھابھی اور بہنوں کی طرف دیکھا۔ ٹائیگر پھر بھونکا۔ پھر اس نے زنجیر سے بندھے بندھے ایک چکر لگایا۔

''سِٹ ڈاؤن!'' بھائی نے کہا اور ٹائیگر بیٹھ گیا۔ بھابھی کے ہاتھ میں تیز روشنی والی ٹارچ تھی۔ صحن روشن ہوگیا۔ ٹائیگر کا بدن اب صاف نظر آ رہا تھا۔ بہت خوبصورت جرمن شیفرڈ تھا۔ اوپر سے سیاہی مائل بھورا، پیٹ کے نیچے مکمل بھورا، ٹانگیں ہلکی بھوری تھیں، کان سیدھے کھڑے تھے، آنکھیں خوبصورت تھیں اور دونوں آنکھوں کے اوپر دو گہرے سیاہ رنگ کے دھبے تھے۔ دم کسی لومڑ کی طرح گھنے بالوں کی، گچھے دار تھی۔ دم میں بھی سیاہی مائل بھورا رنگ نظر آ رہا تھا۔

صحن خاصا بڑا تھا۔ صحن میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

''یہاں رقیہ اور بوبا سوتے ہیں،'' بھابھی نے کہا۔ میں نے بچے کی سمت دیکھا، وہ ماں کا بازو دونوں ہاتھوں سے تھامے اس کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں گنجے سر پر بالوں کا گچھا لہرا رہا تھا۔

جہاں ٹائیگر بندھا ہوا تھا، اس کے قریب ہینڈ پمپ نظر آیا۔ ٹائیگر کے اوپر ایک گھاس پھوس کا

چھپر بنا ہوا تھا۔ دو پہر کے وقت وہ اس چھپر کی چھاؤں میں گرمی سے محفوظ رہتا ہوگا۔ ہینڈ پمپ کے نیچے بالٹی موجود تھی۔ میں نے ہاتھ دھوئے۔ بھابھی کے ساتھ بہنیں صحن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ صحن کے سامنے والی دیوار کے آگے کھیت تھے جنھیں میں تانگے سے اترتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اسی دیوار میں دائیں ہاتھ غسل خانہ اور غسل خانے کے آگے لیٹرین تھی۔

''صحن میں بھی زیادہ گرمی نہیں ہوتی،'' بھابھی نے کہا۔

''ہو بھی تو کیا ہے بی بی جی،'' رقیہ بولی،'' رہنا تو یہیں ہے۔''

ہینڈ پمپ سے برآمدے کی سمت، چند قدم دور، چھت کی سمت جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ سرخ اینٹوں کی ان سیڑھیوں پر چڑھ کر سب سے پہلے میں چھت پر گیا۔ چھت پر پانچ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چارپائیوں پر بچھی سفید چادریں نیم تاریکی میں بھی نظر آرہی تھیں۔ چھت کے چاروں جانب دو دو فٹ اونچی منڈیر بنی ہوئی تھی۔ مشرق کی جانب سڑک، سڑک کے آگے میدان نما احاطہ اور اس سے آگے قصبہ تھا۔ مغرب کی سمت کھیت اندھیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ مشرق کی جانب احاطے سے پہلے کچی سڑک شمالاً جنوباً جاتی تھی۔ بیرونی دروازے کے سامنے چوڑی گلی تھی جہاں آکر تانگہ رکا تھا — کم از کم پچاس فٹ چوڑی، جس کے آگے پھر مکان بنے ہوئے تھے۔ جنوب میں گھر کے ساتھ چار دیواری والا ایک کھلا خالی پلاٹ تھا جس کا گیٹ سڑک کی سمت کم روشنی میں سیاہ دہانہ سا نظر آرہا تھا۔ خالی پلاٹ سے آگے جنوبی سمت پھر مکان بنے ہوئے تھے۔

بھائی نے بتایا تھا کہ وہ جس کرائے کے گھر میں رہ رہے ہیں، محکمۂ حیوانیات نے کسی مقامی شخص سے تین برسوں کے لیے لیا ہوا ہے۔ ہر سال کرائے میں چند روپوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بھائی کے ساتھ بھابھی اور بہنیں بھی چھت پر آگئیں۔ بھائی نے یہ بھی بتایا کہ اس سے پہلے وہ جتنے قصبوں میں رہے ہیں، وہاں ہسپتالوں کے احاطوں ہی میں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر کے لیے گھر بنے ہوئے تھے۔ وہ مکان بھی بہتر حالت میں تھے۔ جھاوریاں میں یہ سہولت بھی میسر نہیں ہے۔

''یہاں مچھر بہت ہیں،'' بھائی نے بیرونی دیوار کے آگے کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،'' لیکن تمھیں مچھر دانیوں کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔'' بھائی کی یہ بات عجیب سی لگی۔ ''صبح تمھیں ...'' بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا،'' چھت کی منڈیر کے پاس اور صحن میں رقیہ اور بچے کی

چار پائی کے گرد سفید پاؤڈر نظر آئے گا۔'' انھوں نے کسی کیمیکل کا نام لیا جو میں بھول چکا ہوں۔'' گداوَ باقاعدگی سے بکھیر دیتا ہے۔ پاؤڈر کا اثر کم از کم تین راتوں تک رہتا ہے۔''

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ چھت پر کسی کیمیکل کی ہلکی ہلکی بو پھیلی ہوئی ہے۔ ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکے شمالاً جنوباً چل رہے تھے اور ان میں خنکی بھی تھی۔

''ادھر شمال میں۔۔۔'' بھائی نے کہا،'' سالٹ رینج میں کٹھہ کالرہ کے پہاڑ ہیں۔'' ان کا ہاتھ شمال کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ وہ منڈیر کے قریب ایک چار پائی پر بیٹھ گئے۔'' نیچے دریائے جہلم بہتا ہے۔ دریا سے جھاوریاں تک گھنا جنگل ہے جسے مقامی لوگ میگھا پتن کا جنگل کہتے ہیں۔ دریائے جہلم کے اس سمت والے کنارے کا نام میگھا پتن ہے۔''

مجھے حیرت ہوئی۔ ضلع سرگودھا میں دریا کے کنارے کا نام میگھا پتن؟ پتن تو خیر پنجابی زبان میں دریا کے کنارے ہی کو کہا جاتا ہے، لیکن میگھا — یہ تو بنگالی لفظ ہے۔

''ممکن ہے۔۔۔'' میں نے سوچا'' پراچین سنسکرت میں میگھا کا لفظ اس علاقے میں بولی جانے والی زبان میں شامل ہو اور آج بھی اپنی اصلی صورت میں موجود ہے۔ شمالی پنجاب کی بولیوں میں سنسکرت کے بہت الفاظ موجود ہیں۔ شمالی پنجابی میں گھٹنے کے اوپر رانوں کو جانگھیں کہا جاتا ہے، کہیں کہیں جنگھاں بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خالصتاً سنسکرت کا لفظ ہے۔''

بھابھی بھائی کی چار پائی کے ساتھ بچھی چار پائی پر لیٹ گئیں، ان کے ساتھ والی چار پائی باجی زیبا کو ملی، باجی کے ساتھ والی چار پائی پر عصمت اور سیڑھیوں کے پاس منڈیر کے قریب چار پائی میرے لیے تھی۔ تھکن کا احساس لیٹنے پر کچھ زیادہ ہی ہوا۔

''پہاڑوں سے آنے والی ہوا شام ہی سے ٹھنڈی ہونا شروع ہو جاتی ہے،'' بھائی نے کہا، ''بس یہاں۔۔۔'' وہ چار پائی پر لیٹ گئے۔'' دن کے وقت آپ کو تکلیف ہوگی۔''

''تکلیف کیسی بھائی جان؟'' بہن عصمت نے کہا،'' مجھے تو یہ جگہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔''

''انسان کو ہر حال میں صابر و شاکر رہنا چاہیے،'' بہن زیبا نے کوئی قرآنی آیت پڑھی۔ سب خاموش ہو گئے۔

ہمارا گھر تضادات کا مجموعہ تھا۔ والد صاحب، جنھوں نے زندگی کا طویل حصہ مشرقِ وسطیٰ

میں گزارا تھا اور ان آئل کمپنیوں میں ملازمت کی تھی جو امریکی اور برطانوی تھیں، پھر ان کے دوستوں میں جرمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، فطری طور پر بہت آزاد خیال تھے۔ برصغیر کے سیاسی نظریات میں وہ انڈین نیشنل کانگریس سے متاثر تھے اور زندگی بھر کانگریسی ہی رہے۔ والدہ صاحبہ نے بھی زندگی کا بیشتر حصہ مشرقِ وسطیٰ میں گزارا تھا۔ روانی سے عربی بولتی تھیں۔ ان کی قریبی سہیلیوں میں مشرقِ وسطیٰ کے شیوخ کی بیویاں تھیں جن پر، بقول والد صاحب، آزاد خیال دنیا کا ہر دروازہ اور روزن بند تھا۔ والد صاحب نے یہ بھی بتایا تھا، اور امی نے تصدیق بھی کی تھی، کہ شیوخ کی بیویوں کی تعداد خاصی ہوتی تھی۔ ہر بیوی شام کے وقت بن سنور کر بیٹھ جایا کرتی تھی لیکن تین تین مہینے گزر جاتے تھے، شیخ کی آمد نہیں ہوا کرتی تھی۔۔۔ منطقی سی بات ہے کہ وہ عورتیں گھٹن کا شکار ہو جاتی تھیں اور پھر پوری شدت سے مذہب میں پناہ تلاش کرتی تھیں۔ والدہ صاحبہ نے ان کے ساتھ طویل عرصہ گزارا تھا۔ ان پر بھی مذہبی رجحانات شدت سے وارد ہوے، اور وہ اس قدر مذہبی ہو چکی تھیں کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ دینی شعائر کے تحت گزرتا تھا۔ والد صاحب سیکولر ذہن رکھتے تھے، انھوں نے کبھی والدہ صاحبہ پر کوئی پابندی نہ لگائی تھی۔ بڑے بھائی آزاد خیالی میں والد صاحب سے بھی کچھ آگے تھے۔ بڑی آپا گرہستی اجڑ جانے کے بعد صوفی ازم کی سمت چلی گئیں۔ سارا سارا دن اکیلی بیٹھی سوچتی رہتی تھیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھ رہی تھی، تو ہم کا شکار ہوتی جا رہی تھیں۔ منجھلے بھائی نہ آزاد خیال تھے نہ مذہبی، ان کی زندگی متوازن تھی۔ بہن زیبا، والدہ صاحبہ ہی کی طرح، شدید قسم کے مذہبی رجحانات رکھتی تھیں۔ انھوں نے پانچویں جماعت ہی میں برقع اوڑھنا شروع کر دیا جو بڑے بھائی اور بہن عصمت نے بڑی تگ و دو سے اتروایا۔ باجی زیبا نے برقع تو اتار دیا لیکن سر پر اس انداز سے دوپٹہ لیا کرتی تھیں جیسے اسکارف باندھا ہوا ہو۔ وہ بات بات پر مذہبی حوالے دیا کرتی تھیں اور ہر معاملے میں قرآنی آیات سنایا کرتی تھیں۔ بہن عصمت آزاد خیال تھیں۔ دونوں بہنوں میں بہت پیار بھی تھا اور ہر دوسرے تیسرے دن ان میں لڑائی بھی ہوا کرتی تھی۔ لڑائی کا باعث باجی زیبا کا مذہبی رجحان اور عصمت کی آزاد خیالی تھی۔ پہلے ان میں کسی بات پر بحث ہوتی تھی جو بڑھتے بڑھتے اچھے خاصے جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ لڑائی کے بعد وہ دو تین روز ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتی تھیں، پھر خود ہی ان میں صلح ہو جاتی تھی۔ گھر میں

عجیب سا ماحول بنا رہتا تھا۔ باجی زیبا پانچوں وقت کی نمازی تھیں، وہ رات کو اٹھ کر امی کے ساتھ تہجد بھی ادا کرتی تھیں۔ بہن عصمت نے شاید ہی کبھی نماز ادا کی ہو گی۔ وہ میری طرح موسیقی کی شیدائی تھیں۔ میں ان سب کرداروں سے چھوٹا تھا اور ان کے درمیان بہت تنہا رہتا تھا۔ اکثر مجھے یوں محسوس ہوا کرتا تھا کہ موسیقی میں دلچسپی لینے کے باوجود، بہن عصمت بھی مجھ سے بہت الگ تھیں۔ تنہائی کا احساس، جو بچپن ہی سے میرے ساتھ تھا، لڑکپن میں بہت گہرا ہو چکا تھا۔ میں کسی مذہبی رویے اور کسی دوسرے نظریے سے متاثر نہ تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے فطرت خود میرے کردار کی تشکیل میں مصروف ہے۔ مجھے فطرت کی ایک جمالیاتی کشش اپنی جانب کھینچ رہی تھی، جسے میں حسنِ فطرت کے ہر مظہر میں محسوس کرتا تھا۔ وہ جمالیاتی قوت لاشکل تھی لیکن پھر بھی میں اسے ہر سمت دیکھا کرتا تھا، حسنِ فطرت کے ہر مظہر میں مجھے وہ مسکراتی محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد بھائی نے خاموشی کو توڑا۔

''یہاں کے لوگ سادہ لوح ہیں،'' انھوں نے کہا، ''بہت بھلے مانس ہیں لیکن اگر کسی سے دشمنی ہو جائے تو بہت خطرناک بھی ہیں۔''

''یہ جو میر صاحب...'' عصمت نے پوچھا، ''جو آپ کے ساتھ ہمیں لینے آئے تھے، یہ تو شاید انڈیا سے آئے لگتے ہیں۔''

''ہاں،'' بھائی نے کہا، ''وہ یوپی کے رہنے والے ہیں۔ یوپی یا بہار کے کسی میڈیکل کالج میں فورتھ ایئر کے طالب علم تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ ایم بی بی ایس کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر سرحد کی اس سمت آ گئے۔ اب یہاں جھاوریاں میں ایک ڈسپنسری چلا رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے میں یہاں بور نہیں ہوتا ورنہ یہاں بیزار ہونے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔''

3

''اٹھو!'' بھابھی کی آواز پر میں جاگا۔ ''دھوپ آ جائے گی۔''

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں کسی کمرے میں نہیں، چھت پر ہوں۔ نیند ہی کی کیفیت میں سیڑھیوں سے اترتے ہوئے مجھے ٹائیگر کے بھونکنے کی آواز آئی۔

''ادھر آئیں صاب!'' صحن میں ہینڈ پمپ کے پاس گداؤ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ گہرے سانولے رنگ کا، بیضوی چہرے پر سیدھی اٹھی ہوئی ناک والا، گول گول آنکھوں والا۔ اس کا ماتھا چوڑا تھا اور اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کے بال تھے۔ بالوں کو دیکھتے ہی مجھے چکوال کے بس اڈے کے قریب حجام کی دکان یاد آئی جس میں ایک کیلنڈر نما بڑے چارٹ پر مختلف قسم کی حجامتوں والے نوجوانوں کی تصاویر تھیں — بوائے کٹ، سولجر کٹ، ہیرو کٹ وغیرہ۔ گداؤ کے تیل چپڑے بال ہیرو کٹ کی تصویر جیسے تھے۔ چالیس برس کے لگ بھگ عمر والے گداؤ کی زبان اور لہجہ مقامی تھا۔

''یہاں انتظام ہے۔'' گداؤ نے غسل خانے اور لیٹرین کی سمت اشارہ کیا۔ ''باہر کھیتوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔'' پھر اس نے ہینڈ پمپ کے پانی سے بھری بالٹی کی سمت دیکھا۔ ''منہ ہاتھ دھولیں۔ نہانا ہے تو غسل خانے میں حمام بھرا ہوا ہے۔''

کچھ دیر بعد جب میں برآمدے کی سمت جا رہا تھا، مجھے دیسی گھی کے پراٹھوں کی خوشبو محسوس ہوئی۔ سیڑھیوں کے نیچے برآمدے ہی میں باورچی خانے میں رقیہ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس کے گھٹنے سے لگ کر بوبا بھی بیٹھا ہوا تھا جس کی پشت میری جانب تھی۔ میری نظریں ایک بار پھر اس کے سر پر موجود بالوں کے گچھے پر رک گئیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کھوڑ گاؤں میں، ہلکسر میں، چکوال میں، کئی بچوں کے سروں پر بالوں کے گچھے دیکھے تھے۔ میرے ذہن میں تجسس موجود تھا کہ سارے سر کو منڈوا کر ایک جگہ بالوں کو بڑھانے اور گچھا بنانے کے اس عمل کے پیچھے کون سا راز پنہاں ہے؟ اتنی بات تو میں سمجھ ہی سکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی وہم سے ہے — وہ وہم کیا ہے؟ ان پسماندہ علاقوں میں رہنے والے ہزاروں لاکھوں انسان توہمات کا شکار ہیں۔ بالوں کی یہ لٹ کس وہم سے وابستہ ہے، کس ضعیف الاعتقادی سے پیوستہ ہے — مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ رقیہ ایک بڑی سی ٹرے لے کر اٹھی۔ وہ اگرچہ تیس برس کی تھی لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی جوانی نے ادھیڑ پنے کی دہلیز پر پاؤں رکھ دیا ہے۔ گوری، گول چہرے، لمبی لمبی آنکھوں، مناسب ناک، تنگ دہانے اور لمبے بالوں والی رقیہ کا چہرہ مجھے جانا پہچانا سا لگا۔ اس لیے کہ شمالی پنجاب میں اس قسم کے چہرے اکثر نظر آتے ہیں۔ دبلی پتلی، لمبے قد والی رقیہ نے کُرتا اور لاچا[4] پہن رکھا تھا، خالصتاً دیہاتی عورت لگتی تھی۔ بوبا بھی

4۔ لاچا: ایک قسم کی دھوتی جو عورتیں باندھتی ہیں۔

اٹھا۔ خاصا پیارا سا بچہ تھا، سفید رنگ، ماں ہی کی طرح گول چہرہ، لمبی آنکھیں، چھوٹی سی مناسب ناک، تنگ دہانہ — وہ مسکرار ہاتھا۔ یہ مسکراہٹ اس کی معصوم آنکھوں میں بھی تھی۔ اندر دائیں جانب والے بڑے سے کمرے میں سب ناشتے کی میز پر موجود تھے، میں ہی سب سے آخر میں بیدار ہوا تھا۔

''یہاں سب معمولات بدلنا ہوں گے،'' بھائی نے کہا۔ ''سورج نکلنے سے پہلے اٹھنا، نہانا دھونا، ناشتہ کرنا — کچھ دیر بعد شدید گرمی کا احساس ہوگا جو دوپہر تک جھلسانے کا احساس دلائے گی — گاؤں میں بجلی بھی نہیں ہے۔''

میں نے کمرے کی چھت کی سمت دیکھا۔ لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر نظر آرہے تھے۔

''ساری دوپہر آپ لوگوں کو کمروں ہی میں گزارنا ہوگی،'' بھائی نے کہا، ''پسینہ سکھانے کے لیے ہاتھ سے پنکھا جھلانا پڑتا ہے۔ آپ لوگوں کو پہلے دس پندرہ دن مشکل محسوس ہوں گے، پھر عادت ہوجائے گی۔''

عصمت نے باہر صحن کی طرف دیکھا۔

''یہ تو محکمے والوں کی زیادتی ہے،'' اس نے کہا۔ '' کچھ تو سہولتیں ہونا چاہیے تھیں۔ اسی لیے ڈاکٹر دیہاتی علاقوں میں سروس نہیں کرتے، شہروں ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔''

''یہ گھر تو غنیمت ہے،'' بھائی نے کہا۔ ''اگر کسی کچے مکان میں جگہ ملتی تو — جہاں نہ ہینڈ پمپ ہوتا نہ غسل خانہ نہ لیٹرین، صبح صبح آپ کو کھیتوں میں جانا پڑتا۔''

بھابھی ہنسنے لگیں۔ بہن زیبا کچھ کہتے کہتے رک گئیں — مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آیت سنانے لگی تھیں۔

4

میرا ارادہ جھاوریاں کا سارا قصبہ دیکھنے کا تھا۔ میں آس پاس کے کھیتوں کا، نہر کا بھی جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ سن کر بھائی چونکے۔

''یہ چھوٹا سا گاؤں ہے،'' انھوں نے کہا۔ '' گاؤں کے باہر تمھیں کتوں سے بھی ہوشیار رہنا

ہوگا۔ ویسے تو وہ اس وقت سو رہے ہوں گے لیکن اگر کسی ایک نے بھی تمھارا اجنبی چہرہ دیکھ لیا تو بھونک بھونک کر سارے گاؤں کے کتے بلا لے گا۔''

''مجھے کھوڑ گاؤں کے دوستوں نے بچپن ہی میں کتوں سے بچنے کے طریقے بتائے ہوئے ہیں،'' میں نے کہا، ''نمٹ لوں گا۔''

بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ سی آئی۔ بھابھی نے مجھے چائے کی پیالی دی۔

''پھر بھی احتیاط ہی کرنا،'' بھابھی نے کہا۔

ناشتے کے بعد میں نے اٹھتے ہوئے، باقی بچے ہوئے پراٹھوں میں سے آدھا پراٹھا توڑا۔

''کیا کھاتے ہوئے جاؤ گے؟'' عصمت نے کہا، ''یا کتوں کو رشوت دو گے؟''

''ابھی تو ٹائیگر سے دوستی کرنا چاہتا ہوں،'' میں نے کہا اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ برآمدے سے صحن میں جاتے ہوئے میری نظر پھر بوبے کے بالوں کے گچھے پر ٹھہر گئی جو ناشتہ کرتے ہوئے بچے کے سر پر دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ صحن میں مجھے دیکھ کر ٹائیگر پھر غرّایا۔ میں سیدھا اسی کی سمت گیا۔ پراٹھے کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر میں نے ٹائیگر کی سمت پھینکا جسے اس نے ہوا ہی میں دبوچ لیا۔ پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا ٹکڑا دبوچتے ہوئے ٹائیگر کی دم ذرا سی ہلی، کان اکڑے اور آنکھوں میں خوشی کی چمک سی آئی۔

''چارچشما ہے صاب!'' گداؤ کی آواز آئی جو صحن میں بچھی چارپائی کے قریب اینٹ پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ میری نگاہیں ٹائیگر کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ گول دھبوں پر گئیں۔

''بہت نایاب نسل ہے چھوٹے صاب جی،'' گداؤ نے کہا۔ ''شاہ پور کی طرف ہے نا گاؤں چاچڑاں، وہاں کے زمیندار رانا افضل کے پاس اس نسل کا جوڑا ہے۔ یہ ابھی دو مہینے کا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ رانا کو اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ انھی دنوں بڑے صاب ہسپتال میں آئے تھے۔ رانا اسے ہسپتال میں چھوڑ گیا تھا۔ بڑے صاب جی نے امید چھوڑی نہ ہمت ہاری۔ علاج کیا اور بچا لیا — میں گیا تھا چاچڑاں . . . '' گداؤ نے پراٹھے کا نوالہ توڑا۔ ''رانا کے لیے صاب جی کا سندیسہ لے کر، کہ دو چار دنوں کے بعد وہ اپنا کتا لے جائے لیکن نہ رانا آیا نہ کوئی اس کا ملازم۔ ہم نے رکھ لیا ہے۔ ابھی تو آٹھ مہینے کا ہے، بڑی شے نکلے گا . . . مشکل وقت آیا تو مرتا مر جائے گا، بھاگے گا نہیں۔'' گداؤ نے

نوالہ منہ میں ڈال کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

''ایسے تو بُل ٹیریر ہوتے ہیں،'' میں نے کہا۔ ''یہ تو جرمن شیفرڈ ہے۔ یہ تو کتوں میں سب سے ذہین نسل ہے۔''

''نہ صاب جی!'' گداؤ نے کہا۔ ''یہ بہت سخت جان بھی ہوتا ہے۔ بُولی (بل ٹیریر) تو اس کے آگے دم دبا کر میاؤں میاؤں کرنے لگتا ہے — یہ چار چشما ہے چار چشما — جنگل کا بھیڑیا!''

مجھے کتوں سے متعلق زیادہ معلومات نہیں تھیں، نہ ہی مجھے ٹائیگر کی دلیری سے کوئی دلچسپی تھی، مجھے تو اس کی خوبصورتی نے متاثر کیا تھا۔ سیاہی مائل بھورا رنگ جو کہیں کہیں سنہری سا نظر آتا تھا، گچھے دار دم، خوبصورت آنکھیں — ٹائیگر جیسا خوبصورت جانور میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

میں بیرونی دروازے سے باہر نکلا۔ چوڑی گلی روشن تھی۔ دائیں جانب سرسبز کھیت تھے جو دور تک نظر آئے اور ان کے آگے شیشم کے لمبے اور گھنے درختوں کی لکیر نما قطار نظر آئی۔ بائیں ہاتھ میدان نما احاطہ تھا جس سے پہلے کچی سڑک تھی۔ شمال میں مکانات تھے۔ پہلے مکان کے سامنے دو دکانیں تھیں۔ پہلی دکان میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص کیروسین (مٹی کے تیل) کے کاٹے ہوئے ڈبے میں لکڑیاں جلا کر، اس انوکھے چولھے پر دیگچی چڑھائے، چائے بنا رہا تھا۔ گاؤں میں یقیناً کیروسین دستیاب نہیں تھا، ورنہ رقیہ لکڑیوں پر کھانا نہ پکاتی۔ ادھیڑ عمر والے کو ڈبہ کہیں سے مل گیا ہوگا۔ دکان کسی کاریگر کی لگتی تھی۔ سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے نہائی، دھونکنی، انگیٹھی اور ہتھوڑا نظر آیا۔ یقیناً لوہار کی دکان تھی۔ اگلی دکان کے باہر دیوار میں پیوست بڑے بڑے کیلوں پر سائیکل کے پرانے ٹائر نظر آئے۔ کسی سائیکل ٹھیک کرنے والے کی دکان ہوگی۔ میں کچی سڑک پر دکانوں کے سامنے سے گزرا۔ میرا رخ شمال کی جانب تھا۔ کچی سڑک سے گلیاں دائیں جانب کھیتوں کی سمت نکل رہی تھیں۔ بائیں جانب مکانات تھے — بھوسے اور گارے کی لپی ہوئی دیواروں والے کچے مکانات۔ سڑک تھوڑا سا خم کھا کر گاؤں سے نکلی۔ سامنے ایک تانگے والا کھڑا تھا۔ تانگے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا — ہوٹل کیا، ایک سٹال سا بنا ہوا تھا جس پر ایک موٹا دکاندار کھڑا چائے بنا رہا تھا۔ بڑی سی کیتلی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ سامنے دو چارپائیوں کے درمیان لمبی سی میز تھی اور چارپائیوں پر تین دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے۔ تانگے کی پچھلی نشست پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بائیں ہاتھ مڑ گیا۔

پورے گاؤں کا چکر لگایا، چاشت سے کچھ پہلے پھر اسی احاطہ نما میدان کے سامنے پہنچ گیا جہاں چوڑی گلی میں ہمارے گھر کا بیرونی دروازہ کھلتا تھا۔ ہسپتال کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے سڑک کی دوسری جانب تنور کی سمت دیکھا۔ ادھیڑ عمر کی ماسی [5] روٹیاں لگا رہی تھی۔ دو عورتیں اور لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میدان کے سامنے میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر میں نے احاطہ پار کیا۔ میدان کی شمالی جانب ایک سرخ اینٹوں کی سولنگ والی گلی جاتی نظر آئی۔ جہاں سے گلی شروع ہوتی تھی وہاں ایک اور چھوٹا سا احاطہ تھا جس کے باہر ایک مٹیالے زنگ آلود بورڈ پر ''ڈسٹرکٹ بورڈ پرائمری سکول جھاوریاں'' تحریر تھا۔

مجھے کھوڑ کا پرائمری سکول یاد آیا۔

احاطے کی شمالی جانب سے شروع ہونے والی گلی دراصل قصبے کا بازار تھی — مرکزی بازار۔ میں بازار میں داخل ہوا۔ شروع میں سبزی فروشوں کی دکانیں نظر آئیں، پھر پرچون والوں کی۔ گلی کی دونوں جانب عمارتیں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ طرزِ تعمیر ہندوانہ تھی۔ میں ایسی عمارتیں چکوال میں بھی دیکھ چکا تھا۔ یقیناً یہ سب گھر ہندوؤں اور سکھوں کے ہوں گے جو تقسیم ہند کے وقت یا تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے یا مارے گئے ہوں گے۔ ان ہی دو دو تین تین منزلہ عمارتوں میں گلی کی جانب دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ پرچون والوں سے آگے قصاب تھے۔ قصابوں کی دکانوں سے گوشت کی بو آئی جو ہمیشہ مجھے ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ دکانوں پر لٹکے ہوئے گوشت پر مکھیاں بیٹھی دیکھ کر مجھے ابکائی سی آئی اور میں تیزی سے ان کے سامنے سے گزر گیا۔ قصابوں کے آگے کپڑے والوں کی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں سے آگے ایک بند دکان پر ڈسپنسری کا بورڈ لگا تھا۔ یقیناً میر صاحب کی تھی۔ اتوار کی وجہ سے بند تھی۔ ڈسپنسری سے آگے جوتوں کی دکان تھی۔ جوتوں کی دکان کے آگے بیلوں سے چلنے والی آٹا پیسنے کی چکی نظر آئی، اس چکی کو خراس کہا جاتا ہے۔ چکی کے آگے کولھو تھا جس میں ایک بیل مسلسل گھومتا نظر آیا۔ تیلی کی اس دکان کے آگے ایک بہت ہی چھوٹی، تھڑا نما دکان میں موچی بیٹھا تھا۔ گلی میں دائیں جانب دکانیں بہت کم تھیں۔ دو چار گلیاں نکلتی نظر آئیں جو رہائشی محلّوں کی سمت جا رہی تھیں۔ جھاوریاں کے اس وسطی حصے میں مکان پکے تھے، دو منزلہ، تین منزلہ — پہچان مشکل نہ تھی، یہ سب ہندوؤں اور سکھوں کے مکانات محسوس ہو رہے تھے۔ اب یقیناً ان پر

5۔ ماسی: گاؤں میں تنور پر روٹیاں لگانے والی کو سب گاؤں ماسی ہی کہتا ہے۔

مقامی لوگوں کا قبضہ تھا۔ بازار کی گلی جہاں شمالی سمت میں گاؤں سے نکلتی تھی وہاں ایک روئی دھنکنے والے دُھنیے کی دکان تھی اور اس سے آگے لکڑیوں کا ٹال تھا۔ ٹال سے آگے پھر وہی جگہ تھی جہاں سے میں صبح بھی گزرا تھا اور جہاں تانگہ کھڑا تھا۔ وسطی پکے گھروں کے علاوہ جھاوریاں کا ہر علاقہ کچے گھروں پر مشتمل تھا۔ گارے اور بھوسے سے لپی دیواریں، کچی گلیاں، جن میں دونوں جانب پانی کے نکاس کی گندی نالیاں نظر آئیں جن میں لڑھکتی ہوئی گندگی آہستہ آہستہ بہتی جارہی تھی۔ یہ گندگی جنوب سے شمال کی طرف بہہ رہی تھی، اس سے احساس ہورہا تھا کہ جنوب کی سمت جھاوریاں کا قصبہ قدرے اونچائی پر ہے۔ نالیوں کے کنارے سیاہ تھے اور تعفن کا احساس بھی نمایاں تھا۔ شمال مشرق تھا یا جنوب مغرب، مشرق تھا کہ مغرب، شمال مغرب تھا یا جنوب مشرق — جھاوریاں کے ہر حصے میں مکانات کچے تھے۔ گلیوں میں ننگے پاؤں بچے اور بچیاں کھیلتی اور دوڑتی نظر آئیں۔ مجھے گلیوں سے گزرتے ہوئے دیکھ کر دیہاتیوں نے بار بار غور سے دیکھا، خصوصاً عورتوں نے۔ ایک عورت نے مجھے دیکھ کر دوسری عورت کی سمت دیکھا، سر کو اوپر کی سمت دھیما سا جھٹکا دیا، جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ لڑکا کون ہے؟ پھر انھوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں، مجھے غور سے دیکھا، ان کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ میں ان کے قریب سے گزرا۔۔۔ جانتا تھا کہ دو چار دنوں میں سارے گاؤں کو پتا چل جائے گا کہ یہ اجنبی لڑکا وٹرنری ڈاکٹر کا بھائی ہے۔

میں واپس مڑا۔ گرمی کا احساس بڑھ چکا تھا، پیشانی سے پسینے کے قطرے، آنکھوں پر لڑھک رہے تھے، بار بار ہاتھ پیشانی کی سمت جارہا تھا۔ جاتے ہوئے بھی اور آتے ہوئے بھی بازار میں دکانداروں نے میری سمت توجہ تو دی تھی لیکن کسی نے یہ نہ پوچھا کہ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ بھائی کے گھر پہنچا تو صحن میں ٹھک ٹھک کی آوازیں آرہی تھیں۔ گداؤ صحن کی دیوار کے پاس، جہاں دھوپ بھی تھی چھاؤں بھی، لکڑیاں چیر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کلھاڑی ایک طرف رکھ دی۔ میرے قریب آیا۔ برآمدے کی چقیں گرادی گئی تھیں۔ میں ایک سٹول کھینچ کر برآمدے کے سامنے صحن کے اس حصے میں بیٹھ گیا جہاں دھوپ نہیں تھی۔ گداؤ میرے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ میرے یہ بتانے پر کہ میں گاؤں کا چکر لگا کر آیا ہوں، گداؤ نے مجھ سے جھاوریاں کا تفصیلی تعارف کرایا۔

''یہ جو میدان ہے نا صاب جی،'' گداؤ نے کہا،'' جہاں پرائمری سکول ہے، یہ کسی کی بھی

ملکیت نہیں ہے۔ اس سے آگے جو بازار ہے، وہاں دونوں جانب عمارتیں ہندوؤں اور سکھوں کی تھیں۔ بائیں جانب جو گلی مڑتی ہے وہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ وہاں بھی سب گھر پکے ہیں — تاجر لوگوں کے — ادھر ادھر کے دیہات سے اناج اکٹھا کر کے سرگودھا جا کر بیچنے والے تاجروں کے . . . ''

'' آڑھتی ہوے نا؟ '' میں نے کہا۔

'' ہاں ہاں وہی، '' گداؤ نے کہا، '' آڑھت کرنے والوں کے — وہ آج بھی یہی کام کرتے ہیں۔ ایک دو کپڑے کے تاجر بھی ہیں۔ دائیں طرف سب گھر ہندوؤں اور سکھوں کے تھے لیکن ان پر یہاں کے لوگوں نے پٹواریوں کو رشوت دے کر قبضہ کر لیا۔ صرف ایک گھر ہی بچا تھا، وہ ڈاکٹر جی (میر صاحب) کو الاٹ ہو گیا۔ باقی سب گھر پٹواریوں نے کاغذات کے ہیر پھیر سے رشوت لے کر مقامی لوگوں کے نام کرا دیے تھے۔ جھاوریاں کے اس طرف . . . '' گداؤ نے شمالی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا، '' ہمارا محلہ ہے، ہم صدیوں سے وہیں رہ رہے ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا صاب — ہم میراثی لوگ ہیں۔ ''

'' اس میں چھپانے والی کیا بات ہے گداؤ، '' میں نے کہا، '' گانے بجانے والے تو آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ ''

میرے اس جملے پر گداؤ کی آنکھیں چمکیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

'' گانا بجانا ہمارا پیشہ ہے صاب جی، '' اس نے کہا، '' لیکن میں تھیٹر کا ایکٹر بھی تھا — اب تو اداکاری چھوڑ دی ہے، ہسپتال کی نوکری کر لی ہے — پر جوانی میں میں خوشاب کے ایک تھیٹر میں ملازم تھا۔ ''

'' اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم سچے آرٹسٹ ہو، '' میں نے کہا۔ '' اپنے تھیٹر سے متعلق کچھ بتاؤ۔ ''

گداؤ کے چہرے پر سوچ کا تاثر ابھرا۔

'' بڑی لمبی کہانی ہے صاب جی، '' اس نے کہا، '' پھر کبھی سناؤں گا ویلا (فارغ) ہو کے . . . ابھی تو . . . ہاں . . . کیا بتا رہا تھا میں؟ ہاں . . . ادھر، '' گداؤ کا ہاتھ مشرق کی سمت اٹھا ہوا تھا۔ '' ادھر سب کسانوں کے گھر ہیں۔ بہت غریب کسان ہیں۔ کسی کے پاس ایک بیگھہ زمین ہے کسی کے پاس آدھا — وہاں سب زمینیں ہندوؤں اور سکھوں کی تھیں۔ کسان بڑے خوش تھے کہ ملک آزاد ہو گیا تو وہ زمینیں انھیں مل جائیں گی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں صاب . . . '' گداؤ نے صحن میں اس سمت دیکھا جہاں

دھوپ، آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی، برآمدے کے پاس سیڑھیوں کی سمت جارہی تھی۔ ''یہاں ہندوؤں اور سکھوں کی جتنی زمینیں تھیں، سب پر یہاں کے بڑے زمینداروں نے قبضہ کرلیا۔ سب ان کی جاگیریں بن گئیں۔ سرگودھے سے زمینوں کی جانچ کرنے والے آئے تھے لیکن گرداوروں[6] اور پٹواریوں نے زمینداروں سے رشوت لے کر نہ جانے کیا چکر چلایا کہ زمینوں کا ریکارڈ ہی غائب ہو گیا۔ جو لوگ جانچ کرنے آئے تھے، وہ اپنی مٹھیاں گرم کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ غریب کسان منھ دیکھتے رہ گئے، زمینیں جاگیرداروں کو مل گئیں — غریب کسان غریب ہی رہے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی چھوٹی چھوٹی زمینیں بھی زمینداروں کو دے دیں اور ان کے مزارعے بن گئے۔ وہ سارے اب اُدھر . . . ''اس نے مشرق کی طرف ہاتھ اٹھایا'' کچے مکانوں میں رہتے ہیں۔ آپ اُدھر سے ہوکر آئے ہیں۔ آپ نے وہاں مسجد کے اردگرد کچے مکان دیکھے ہوں گے، وہ سب کسانوں کے ہیں . . . مزارعوں کے۔ شاہ پور جانے والی سڑک سے ادھر . . . ''گداؤ نے اب جنوب مشرق کی سمت اشارہ کیا۔'' پیشہ ور لوگ رہتے ہیں، موچی، نائی، تیلی، ترکھان، پینجے وغیرہ، اور اُدھر . . . ''گداؤ کی انگلی جنوب کی سمت اٹھی۔'' ادھر فوجیوں کا محلہ ہے۔ سب مرد فوج میں ہیں، یہ ہے نا بہن رقیہ . . . ''گداؤ نے باورچی خانے کی طرف دیکھا۔'' ماسی جیراں تندور والی کی چھوٹی بہن . . . اس کے سارے رشتے دار فوجیوں کے محلے میں رہتے ہیں۔ اسی طرف فوجیوں کے محلے کے ساتھ لاری اڈہ ہے، وہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ اڈے سے شاہ پور کے لیے تانگے چلتے ہیں، ایک بس سرگودھے بھی جاتی ہے سویرے سویرے . . . جھاوریاں سے پانچ کلومیٹر دور کالرہ اسٹیٹ ہے۔ خضر حیات ٹوانے کا نام تو سنا ہوگا آپ نے۔''

''ہاں،'' میں نے کہا'' وہ یونینسٹ پارٹی کا لیڈر . . . پنجاب کا وزیر اعلیٰ بھی رہا تھا۔''

''وہی صاب جی''، گداؤ نے کہا۔ کالرہ اسٹیٹ اسی کی ہے۔ ٹوانہ خاندان یہاں کا سب سے بڑا جاگیرداروں کا خاندان ہے۔ ان کی جاگیریں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر یہاں میکن خاندان ہے۔ کوٹ بھائی خان اور کوٹ احمد خان ان ہی کی جاگیریں ہیں۔ پھر شاہ پور کی سمت رانوں کی جاگیریں ہیں۔ چاچڑاں کا رانا افضل بڑا زمیندار ہے۔ یہ جو ہمارے گھر کے آگے کچی سڑک ہے،

6۔ گرداور: پٹواریوں کا انچارج، دورہ کرنے والا، زمینوں کی جانچ پڑتال کرنے والا۔

ہے (دائیں ہاتھ) جائیں تو آگے پھر تانگوں کا اڈہ ہے۔''

''میں وہ دیکھ چکا ہوں،''میں نے کہا،''وہاں سے تانگے میگھا پتن جاتے ہیں۔''

گداؤ نے بیرونی دیوار کی طرف دیکھا جس کے آگے کھیت ہیں۔''یہ جو کھیت ہیں، ملیاروں (سبزی فروشوں) کے ہیں لیکن وہ اناج بھی اُگاتے ہیں، کپاس بھی بیچتے ہیں۔ درمیان میں کھو (رہٹ) بھی ہے جس کے آس پاس سبزیاں اُگاتے ہیں... ابھی آپ گاؤں سے باہر نہیں گئے ... اور اپنی سبزیاں بازار میں بیچتے ہیں، وہاں سبزی بیچنے والوں کو دے آتے ہیں۔ لاری اڈے پر آس پاس کی ڈھوکوں سے ملیارنیں بھی سبزی لا کر بیچتی ہیں۔ میں تو ان ہی سے خریدتا ہوں — تازی تازی...''

گداؤ مسلسل بولے جا رہا تھا۔''میں جی، ہسپتال کا ملازم ہوں لیکن جو ڈاکٹر بھی آتا ہے اس کے گھر کا کام بھی کرتا ہوں۔''گداؤ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی۔''پہلے جو ڈاکٹر یہاں آتے رہے ہیں، ان کی بیگمیں بڑی خسیس تھیں، پر بی بی جی...''گداؤ نے بھابھی کی تعریف کی،''بی بی جی بہت اچھی ہیں۔ مجھے گھر کے کام کرنے کی الگ سے تنخواہ دیتی ہیں۔ کھانا تو میں دونوں وقت یہاں پر ہی کھاتا ہوں۔ صبح جلدی آ جاؤں تو بہن رقیہ ناشتہ بھی دے دیتی ہے... بڑے مزے سے زندگی گزر رہی ہے۔''

''تم مجھے گاؤں کے متعلق بتا رہے تھے،''میں نے کہا۔

''ہاں...''گداؤ چونکا۔''اُدھر...''اس نے بیرونی دیوار کی طرف اشارہ کیا،''ادھر کھیت ہیں جو نہر کی طرف جاتے ہیں۔ نہر دریائے جہلم سے نکلنے والی ایک بڑی نہر سے نکلتی ہے۔''

''وہ جو شیشم کے لمبے لمبے گھنے درختوں کی قطار...''میں نے کہنا شروع کیا تو گداؤ نے میری بات کاٹ دی۔

''ہاں جی... وہی... وہ ٹاہلیاں نہر کے کناروں پر اُگی ہوئی ہیں۔ بڑی ٹھنڈی جگہ ہے، لیکن صاب جی، وہ کھیتوں سے آگے کھو سے بھی آگے... اُدھر آپ نہ ہی جائیں تو بہتر ہے۔''

''کیوں، اُدھر کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''وہاں مندر والی حویلی کے کھنڈر ہیں،''گداؤ نے کہا۔''اچھی جگہ نہیں ہے، خطرناک ہے۔

بہت کم لوگ جاتے ہیں اُدھر... کوئی جاتا ہی نہیں... ایک ہندو سیٹھ کی حویلی تھی جس نے اس کے ساتھ مندر بھی بنوایا تھا۔ اُدھر آپ نہ ہی جائیں تو اچھا ہے۔''

اس سے پہلے کہ گداؤ مجھے مزید معلومات فراہم کرتا، چق اٹھی، رقیہ باہر آئی۔''ہیر رانجھے کا قصہ ہی سناتا رہے گا کہ لکڑیاں بھی چیرے گا؟'' رقیہ نے اپنے سے کم از کم دس سال بڑے گداؤ کی سمت غصے سے دیکھا۔

''او بھاگوانے...'' گداؤ نے رقیہ کی طرف دیکھا۔''ہر وقت اپنی ناک پر پیلا ڈیموں (زرد تتیا) نہ بٹھائے رکھا کر، چیر دی ہیں لکڑیاں... ہیر رانجھے کا تو میں قصہ بھی بھول چکا ہوں بہن میریے۔'' گداؤ کی آواز دھیمی سی ہوگئی۔اٹھا اور صحن سے چیری ہوئی لکڑیاں اٹھا کر برآمدے میں باورچی خانے کے سامنے رکھتے ہوئے صحن میں آیا اور پھر باہر چلا گیا۔اس کے چہرے پر اداسی سی تھی۔اندر کمرے سے بھابھی اور بہنوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

5

بھائی نے وقت گزارنے کا ایک دلچسپ طریقہ یہ بنا رکھا تھا کہ وہ ہر شام ہسپتال کے صحن میں کرسیوں پر بیٹھ کر شام کی چائے پیا کرتے تھے جو ہسپتال کا سائیس بخشو (محمد بخش) بنایا کرتا تھا۔ان کے ساتھ شام گزارنے والوں میں میر صاحب اور گداؤ ہوا کرتے تھے۔یہ معمول اتوار کے روز بھی جاری رہتا تھا۔

شام ہوئی تو میں بھی بھائی کے ساتھ ہسپتال پہنچا۔ہسپتال کے صحن کی بیرونی دیوار نہیں تھی۔سامنے تنور تھا۔سڑک کی جانب ہسپتال کے تین کمرے تھے جن کے دروازے اندر صحن میں کھلتے تھے۔پہلا کمرہ بھائی کا آفس تھا، دوسرا جانوروں کی دوائیوں اور آلاتِ جراحی والی ڈسپنسری تھی جس میں ہسپتال کے کمپاؤنڈر کی کرسی بھی موجود تھی۔ بھائی نے بتایا کہ کمپاؤنڈر بوڑھا ہے، ریٹائرمنٹ ہونے والی ہے۔بہت سنجیدہ سا ہے، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔تیسرا کمرہ بہت بڑا ہال نما تھا۔ یہ دراصل اصطبل تھا جس میں نسل کشی کے لیے تھارو بریڈ [7] گھوڑا موجود تھا۔اس اصطبل نما کمرے کی

7_Thoroughbred: اصیل، خالص نسل کا گھوڑا جس میں نسلی خوبیاں ہوں، بڑی جسامت کا گھوڑا۔

اندرونی دیواروں پر کھونٹی نما بڑی بڑی کیلوں پر ایک سپاٹ (زین) لٹکی ہوئی تھی۔ اسی طرح کی دو چار کیلوں پر گھوڑے کا ساز و سامان لٹکا ہوا تھا۔ جہاں گھوڑا بندھا ہوا تھا وہاں کھرلی (چرنی) میں کالے چنے اور گھوڑے کے لیے سبز چارے کے پتے بکھرے ہوے تھے۔ کمروں کے سامنے کھلے صحن کی مغربی سمت، قدرے کونے میں کچا کوٹھڑی نما کمرہ بنا ہوا تھا۔ یہ کمرہ سائیس بخشو کا تھا۔ صحن کے سامنے ایک چھپر تھا، خاصا چوڑا، اس میں دو بیل، ایک گائے، دو گدھے اور ایک نیالے رنگ والا موٹا، چوڑے جبڑے والا بل ڈاگ موجود تھا۔ یہ بھائی کے مریض تھے اور چھپر ان کا وارڈ تھا۔ بخشو کی کوٹھڑی کے پاس اینٹوں کا بنا ہوا چولھا، لکڑیاں، برتن اور پانی کا بڑا سا گھڑا بھی نظر آیا۔ بخشو شاہ پور کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گداوہی کی عمر کا بخشو چھوٹے قد کا تھا، گٹھیلا، گول چہرے اور موٹی ناک والا، اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی تھیں، رنگ کالا تھا۔ ایک تو سیاہ فام تھا، اوپر سے اصطبل میں کام کرنے سے اس کے کالے رنگ پر مٹی سی جمی رہتی تھی۔ چھپر کے سامنے جنوبی سمت میں ایک سیاہ شیشم کا پیڑ تھا۔ زیادہ اونچا تو نہ تھا، لیکن بہت گھنا تھا۔ شیشم کے اس درخت کا سایہ جنوبی دیوار پر بھی پھیلا رہتا تھا۔ دیوار کے اُس پار انسانوں کے لیے ہسپتال تھا اور اس کے آگے کھیت تھے۔ ہسپتال میں شیشم کے درخت کے نیچے ایک کنکریٹ کی بنچ تھی جو زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ سڑک کی جانب منظر صاف تھا۔ بیس فٹ چوڑی پکی سڑک کے دوسری جانب تنور تھا۔ تنور پر ادھیڑ عمر کی ماسی، دوپٹے سے سر باندھے، روٹیاں لگا رہی تھی۔ آس پاس چند لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بڑی عمر کی عورتیں نہیں تھیں۔ تنور کے اوپر بھی بخشو کی کوٹھڑی کی مانند گھاس پھوس کا چھپر بنا ہوا تھا۔ چھپر کے کناروں پر گھاس کے لمبے لمبے تنکے، آپس میں پیوست تنکے، نیچے لٹکے ہوے تھے اور تنور سے مسلسل اٹھنے والے دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے۔

بخشو نے تین کرسیاں اور ایک موڑھا ایک چھوٹی سی لکڑی کی مضبوط میز کے گرد رکھ دیا۔ میں اور بھائی ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ میر صاحب آ گئے۔ انھوں نے کھلے پانچوں والا سفید پاجامہ اور ململ کا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ گاؤں کے ماحول میں خاصے اجنبی سے لگ رہے تھے لیکن صرف مجھے — گاؤں کے لوگوں کے لیے تو وہ کسی صورت میں اجنبی نہ ہوں گے۔ 1947 سے اس گاؤں میں رہ رہے تھے۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں تپش تو تھی لیکن دوپہر جیسی نہیں تھی

تاہم بدن پر پسینے کا احساس نمایاں تھا۔ بخشو، چائے بنانے کے لیے اپنی کوٹھڑی کے پاس چولھے کے سامنے بیٹھا، لکڑیوں پر پھونکیں مار رہا تھا۔ چھپر میں موجود مریض جانوروں میں سے ایک بیل بیٹھ گیا۔ دوسرے بیل اور گدھے کھڑے رہے۔ نہ جانے انھیں کیا بیماری تھی۔ بُل ڈاگ اپنے چوڑے جبڑے سے زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ میں جس کرسی پر بیٹھا، وہاں سے تنور صاف نظر آ رہا تھا۔ تنور اتنا قریب تھا کہ وہاں کی آوازیں بھی ہسپتال کے صحن تک پہنچ رہی تھیں۔

''کیسا لگا ہمارا گاؤں؟'' میر صاحب نے کرسی پر پہلو بدلا۔

''شمالی پنجاب کے دوسرے دیہات جیسا ہی ہے،'' میں نے جواب دیا، ''اگرچہ سرگودھا کا ضلع مکمل طور پر شمالی پنجاب میں نہیں ہے۔''

''آپ کس کلاس میں پڑھتے ہیں؟'' میر صاحب نے پوچھا۔

''نویں میں،'' میں نے جواب دیا۔

''یہ نائنتھ کلاس میں پہنچ چکا ہے،'' بھائی نے کہا، ''اس کے انگلش کے ٹینسز چھٹی جماعت والے ہیں۔ بہت ہی کمزور ہے انگلش میں۔''

''لو بھیا،'' میر صاحب نے فوراً کہا، ''ہم کس مرض کی دوا ہیں؟ تین مہینوں میں طاق نہ کر دیں تو کہیے گا۔'' میر صاحب نے میری سمت دیکھا۔ ''بازار میں ہے ہماری ڈسپنسری۔ کل دو بجے کے بعد آ جایئے گا، ہم دنوں میں آپ کو ٹینسز سکھا دیں گے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میر صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ گداؤ آ گیا۔

''چھوٹے صاب نے تو آج ہی سارا جھاوریاں دیکھ لیا ہے،'' گداؤ نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اس کی فطرت میں چین نام کی کوئی کیفیت نہیں ہے،'' بھائی نے کہا، ''آوارہ گرد تو یہ بچپن ہی سے ہے۔''

''آوارگی اچھی چیز ہے،'' میر صاحب نے کہا۔ ''میڈیکل کالج میں داخل ہونے سے پہلے ہم بھی آوارہ گرد تھے۔'' وہ مسکرائے۔ ''لکھنؤ کی سڑکوں پر گنگناتے پھرتے تھے۔''

''آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے؟'' میں نے فوراً سوال کیا۔

''یہ تو پکا میراثی ہے!'' بھائی نے میری طرف اشارہ کیا اور گداؤ نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں صاحبزادے،'' میر صاحب نے گہرا سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ ''وہ نوجوانی تھی۔ میڈیکل کالج میں اکثر موسیقی کی محفلیں سجا کرتی تھیں — سنہا پریوار، مشرا پریوار اور تیواری پریوار کے لڑکے لڑکیوں میں سخت مقابلہ ہوتا تھا۔ کلاسیکل، نیم کلاسیکل، ٹھمریاں، دادرے، غزلیں، بھجن اور فلمی گیت . . . کیا یاد کرا دیا آپ نے! وہ ہماری زندگی کا رنگین دور تھا۔'' میر صاحب کے چہرے پر اداسی نمودار ہوئی۔

''کیا آپ بھی گایا کرتے تھے؟'' میں نے پوچھا اور میر صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی۔

''برخوردار، ہم نے کیا گانا تھا!'' میر صاحب نے کہا، ''ہم وہاں بھی دیہی علاقے کے رہنے والے تھے، ہمیں تو بس لوک گیت ہی یاد تھے۔''

''کیا آپ کو کسی لوک گیت کے بول اور دھن یاد ہے؟'' میں مسلسل سوال کیے جا رہا تھا۔

''ہاں،'' میر صاحب نے کہا، ''ہمارا ایک پسندیدہ لوک گیت تھا جو ہم اکثر گایا کرتے تھے۔''

''اگر آپ اجازت دیں،'' میں نے کہا، ''تو میں سننے کی فرمائش کروں۔''

بھائی نے مسکراتے ہوئے میز پر کہنیاں رکھیں۔

''یہ آپ کو بھی میراثی بنا کر چھوڑے گا،'' انھوں نے کہا اور ایک بار پھر گداؤ کا قہقہہ بلند ہوا۔ تنور پر ایک دو لڑکیوں نے سر گھما کر ہماری طرف دیکھا۔ میر صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ کبھی کبھی ان کے ہونٹ اس طرح ہلنے لگتے تھے جیسے دل ہی دل میں لوک گیت کی دھن یاد کر رہے ہوں۔

''اب تو آواز بھی ہمارا ساتھ نہیں دیتی،'' میر صاحب نے کہا، ''لیکن آپ نے فرمائش کی ہے تو ہم ٹال بھی نہیں سکتے۔'' میر صاحب کے ہونٹوں پر جنبش کچھ دیر نمایاں رہی۔ پھر انھوں نے کھانستے ہوئے گلا صاف کیا۔

''جُھلنی میں رنگ سانچا، ہمار پیا . . .''

میر صاحب نے خوبصورت لوک دھن میں گیت کا مکھڑا اٹھایا، دہرایا اور گداؤ نے فوراً ہاتھوں سے تال دینا شروع کر دی۔ گداؤ کی اس حرکت پر بھائی اور میر صاحب، دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔

''او طبلچی!'' بخشو چائے کی ٹرے اٹھائے قریب پہنچ چکا تھا۔ ''یہ ہسپتال ہے۔'' اس نے گداؤ کی طرف چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھا۔ ''تیرا تھیٹر نہیں ہے — شانی بائی کا کوٹھا نہیں ہے۔''

''بک بک نہ کر!'' گداؤ نے کہا۔

''کیا کہا؟'' میر صاحب چونکے، ''شانی بائی — بھیا، یہ کون ہیں؟''

''تھی ڈاکٹر صاحب،'' گداؤ نے کہا، ''شاہانہ . . . سرگودھے کی رہنے والی تھی۔ میرے ساتھ تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ ملک میں تقسیم کا رَولا مچ گیا تھا تو بمبئی چلی گئی تھی۔''

''تو کیا سمجھتا ہے؟'' بخشو نے میز پر پیالیاں رکھتے ہوئے کہا، ''مجھے کچھ پتا نہیں؟''

''بکواس کرتا ہے صاب،'' گداؤ نے غصے سے کہا، ''میں نے تو صرف اسے اتنا ہی کہا تھا کہ بمبئی نہ جا، وہاں خورشید اور گیتا بالی کے آگے تجھے کون پوچھے گا، پر وہ نہ مانی، چلی گئی۔''

''یہ بھی بتادے،'' کالے بخشو کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ''بتادے کہ تو نے تھیٹر کیوں چھوڑ دیا تھا؟''

''حرامی!'' گداؤ نے دایاں ہاتھ تیزی سے نیچے کیا جیسے جوتا اتارنے لگا ہو۔ بخشو ہنستے ہوئے اپنی کوٹھری کی طرف دوڑا۔ بھائی اور میر صاحب بھی ہنس رہے تھے۔ گداؤ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چپل پھر نیچے پھینکی۔ ''کوئی بات نہیں تھی صاب۔'' بھائی کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے وہ بھی کوئی شریر سا سوال کرنے والے ہیں۔

''اب دیکھیں نا صاب جی،'' گداؤ نے کہا، ''وہ ہے نا شاہ زمان، لالہ سدھیر، اِدھر تھیٹر ہی کا اداکار تھا۔ لاہور گیا اور ہیرو بن گیا۔''

''تم کیوں نہیں گئے؟'' بھائی نے پوچھا۔

''لاہور کیا . . . '' گداؤ نے کہا، ''میں تو بمبئی چلا جاتا، پر حالات ہی ایسے تھے، نہ جا سکا۔ چلا جاتا تو پران اور جیون کی ٹکر کا ولن ہوتا!''

میر صاحب اور بھائی نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ ماحول خاصا خوشگوار ہو گیا۔ ہم چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ تنور کی سمت سے دو لڑکیاں ہمارے قریب آئیں۔ ایک لڑکی کے چہرے پر میری نگاہیں ٹھہر سی گئیں۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔

لمبا قد، دبلی پتلی، خوبصورت گلابی چہرہ، آنکھیں لمبی، گھنی پلکیں، ستواں ناک، پتلے ہونٹ، ابرو، جیسے کسی طائرِ ابر نے پر کھولے ہوں... کنجِ دہن عندلیب کی منقار جیسا، چہرہ نہ لمبا نہ چوڑا، بہت ہی خوبصورت رخساروں اور ٹھوڑی والی، اس کی خوبصورت پیشانی پر دائیں جانب، بالوں سے نکلتی ہوئی زلفیں خم کھا کر رخساروں پر بکھر رہی تھیں۔ اس نے گاؤں کی لڑکیوں کی طرح چھینٹ کا کرتا اور کالا لاچا باندھ رکھا تھا۔ آنکھیں اس قدر خوبصورت تھیں کہ ایک پل ہی میں میرے حواس جیسے اونگھ کر بیدار ہوئے۔ میں حیرت زدہ تھا۔ اس قسم کا چہرہ اور روپ شمالی پنجاب میں کہیں نظر نہیں آتا، نہ ہی ان علاقوں میں یہ حسن نظر آتا ہے۔ یہ لڑکی کون ہے؟ سوال میرے ذہن میں نمودار ہو چکا تھا... دوسری لڑکی سانولی تھی، درمیانہ قد، نہ موٹی نہ پتلی، بیضوی چہرے والی، تیز تیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ خاصی خوبصورت تھی لیکن پہلی لڑکی کے ساتھ کھڑی، معمولی شکل وصورت والی ہی لگتی تھی۔

''ہوڈاکٹر صاب،'' سانولی لڑکی نے بلند آواز میں کہا، ''سنا ہے تیرا بال بچہ آیا ہے، کتنی روٹیاں لگانی ہیں؟''

''تمیز سے بولا کر نوراں!'' گداؤ نے اسے ڈانٹا۔ ''بڑوں سے بات کرنی نہیں آتی تجھے — بدتمیز! تو ہی اسے سمجھا گلنازی۔''

خوبصورت چہرے والی لڑکی مسکرائی۔ مسکراہٹ پورے چہرے پر پھیل کر اس کی آنکھوں میں سمٹ گئی۔ اس کے نام پر بھی میں چونکا۔ گلناز... یہ نام تو ان علاقوں میں نہیں رکھا جاتا۔ یہ نام تو پٹھانیوں کا بھی نہیں ہے۔ پٹھانیاں گلنار نام تو رکھتی ہیں، گلناز نہیں — یہ لڑکی کہاں کی ہے؟''

''یہ کیا سمجھائے گی!'' بخشو نے خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا۔ ''گنے جتنی لمبی ہو گئی ہے پر دماغ اب بھی بچوں جیسا ہے۔'' بخشو کے اس جملے پر گلنازی کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ مٹ سی گئی اور اس کے چہرے پر چھوٹی بچی جیسی معصومیت سی ابھر آئی۔

''دس بارہ تو لگانی ہوں گی!'' سانولی نوراں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''پندرہ،'' گداؤ نے کہا۔ ''جاتے ہوئے لے جاؤں گا۔''

میں بے اختیار گلنازی کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھ پر محویت سی طاری ہو چکی تھی۔ اپنی طرف مجھے مسلسل دیکھتے ہوئے دیکھ کر گلنازی نے نگاہیں جھکا لیں اور دائیں پاؤں میں پہنی ہوئی سلیپر نما گرگابی

کومٹی میں دائیں بائیں ہلانے لگی۔ پھر اس نے نوراں کے ساتھ تنور کی طرف مڑتے ہوئے مجھے دیکھا — مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پلکوں میں تھرتھراہٹ سی ہے۔ دونوں تنور کی سمت جاتے ہوئے سڑک پار کر گئیں۔ سڑک کے پار جا کر گلنازی نے سر موڑ کر پھر مجھے دیکھا اور تنور پر دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے بال بہت ہی لمبے تھے، چوٹی کمر سے نیچے لٹک کر تنور کی گارے سے لپی جگہ پر پڑی تھی۔ میں مسلسل اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''ماسی جیراں کی بیٹی ہے،'' گداؤ کی آواز پر میں چونک اٹھا اور گھبرا سا گیا۔ بھائی اور میر صاحب کیا سوچ رہے ہوں گے کہ میں آتے ہی لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گیا ہوں . . . میں نے فوراً تنور سے نظریں ہٹا کر گداؤ کی سمت دیکھنا شروع کر دیا۔

''وہ ہے نارقیہ،'' گداؤ نے کہا،''بوبے کی ماں . . . ماسی (خالہ) ہے گلنازی کی۔''

میرے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھر رہا تھا، ایک خیال بار بار گردش کر رہا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے، یہ گلنازی، جس کا نام اس علاقے کا نہیں ہے، یہ کہاں کی رہنے والی ہے؟ یہ رقیہ کی بھانجی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے خدوخال تو شمالی پنجاب اور اس علاقے کے نہیں ہیں، نہ ہی یہ پٹھانی لگتی ہے۔ خیال سوالیہ نشان بن کر میرے ذہن میں ٹھہر سا گیا۔

میری نظریں پھر تنور کی سمت گئیں۔

گلنازی مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

6

اگلی صبح میں ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ برآمدے میں بوبے کی چھوٹی سی آواز میں خوشی کا تاثر ابھرا۔''ماں . . . ماں . . . ناجی . . .''

صحن میں ماسی جیراں اور گلنازی کھڑی تھیں۔ رقیہ انھیں اندر کمرے میں لے آئی۔ بھائی اٹھ کر ہسپتال چلے گئے۔ رقیہ نے باجی زیبا اور عصمت سے ماسی جیراں اور گلنازی کا تعارف کرایا۔ گلنازی نے ایک دو بار میری طرف دیکھا۔ وہ کل شام کی طرح بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ پھر بہن عصمت گلنازی سے باتیں کرنے لگیں۔ میں چونکا، گلنازی کی آواز بھی بے حد خوبصورت

تھی، اسی کی مانند — بو با گلنازی کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ گلنازی بھی ماسی جیراں (نذیر بیگم) کی طرح کمرے میں موجود چار پائیوں پر بیٹھ جاتی، بوبے نے گلنازی کا بازو کھینچا۔

''ناجی... ''اس نے گلنازی کو کھینچا۔

''گلنازی،'' رقیہ نے کہا،''بوبے کو باہر لے جا، پھر منہ بھی دھلوا دینا۔''

میرے دل میں تجسّس تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ گلنازی کیا واقعی اس علاقے کی رہنے والی ہے؟ اس بات پر مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ گلنازی نے بوبے کو باہر لے جاتے ہوئے اپنی خوبصورت آنکھوں کے کونے سے، کیا لفظ استعمال کروں، کنکھیوں سے بھی زیادہ خوبصورت انداز سے میری طرف دیکھا۔ اس کے باہر جاتے ہی میں نے اپنے تجسّس کو زبان دے دی۔

''ماسی،'' میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا،'' یہ گلنازی... کیا یہ تیری بیٹی ہے؟''

ماسی جیراں کی آنکھیں ایک دم پھٹ سے کھلیں، لمحے بھر ہی اس کے چہرے پر پریشانی سی ابھری۔

''ہاں،'' ماسی نے کہا،'' میری بیٹی ہے... پر تو نے کیوں پوچھا ہے؟''

''ماسی... ''میں نے جرأت سے کام لے کر پوچھا،'' کیا واقعی تیری بیٹی ہے؟''

بھابھی اور بہنیں بھی میرے اس سوال پر حیران سی تھیں۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے؟'' عصمت نے کہا،'' یہ کیا پوچھ رہے ہو؟''

''وہ... ''میں نے کہا،'' میرا سارا بچپن انھی علاقوں میں گزرا ہے، اٹک، جہلم، میانوالی، سرگودھا، چکوال — انھی علاقوں میں بڑا بھی ہوا ہوں۔ میں نے ان علاقوں میں اس شکل کی لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔'' میری آواز مدھم ہو کر سرگوشی کے قریب پہنچ گئی۔'' اس قسم کی لڑکی، اس علاقے میں... یقین نہیں آرہا ہے۔''

ماسی جیراں کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ پھر جیسے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پورے کمرے میں خاموشی پھیل کر ٹھہر سی گئی۔ ماسی مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی، پھر اس نے صحن کی سمت دیکھا۔

''گلنازی میری سگی بھانجی نہیں ہے،'' رقیہ نے کہا اور ماسی جیراں کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا، جھٹکے سے اس کا سر رقیہ کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں غصہ نمایاں تھا۔

''بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کر رقیہ۔۔۔'' ماسی نے دبی دبی آواز میں غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''بے وقوف تو تُو ہمیشہ سے ہے ہی۔۔۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ کوئی بات کرنے کی نہیں بھی ہوتی۔''

''میں۔۔۔ آپا۔۔۔ میں۔۔۔'' رقیہ بوکھلا سی گئی۔

''کون ہے گلنازی؟'' عصمت نے صحن کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور خاموشی چھا گئی۔ ماسی کچھ دیر صحن کی سمت دیکھتی رہی، پھر اس نے عصمت کی طرف دیکھا۔

''میری بیٹی ہے،'' ماسی جیراں نے کہا۔ ''یہ رقیہ۔۔۔ یہ تو پاگل ہے بی بی جی۔'' ماسی جیراں نے بھابھی کی طرف دیکھا۔ ''نہ سوچتی ہے نہ سمجھتی ہے، جو منھ میں بات آتی ہے، اسے روک نہیں سکتی۔''

بھابھی نے ماسی کی سمت غور سے دیکھا۔

''ہمیں پوچھنے کا کوئی حق نہیں،'' بھابھی نے کہا، ''لیکن ابھی جو رقیہ نے۔۔۔''

برآمدے کی چق اٹھی اور گلنازی بوبے کا ہاتھ پکڑے کمرے میں داخل ہوئی۔ بھابھی کا جملہ ادھورا ہی رہا۔ ماسی پریشان سی تھی۔ گلنازی نے پھر میری طرف دیکھا۔

''گلنازی،'' ماسی جیراں نے کہا۔

''جی ماں جی؟'' گلنازی کی آواز بہت ہی خوبصورت تھی۔

''تو یوں کر،'' ماسی جیراں نے کہا، ''آج شاید مَن چھٹی[8] والے اونٹ آئیں گے۔ تو گھر چلی جا، آئیں تو تندور کے پاس دو اونٹ اتروالینا، بکسے سے بارہ آنے نکال کر اونٹ والے کو دے دینا۔ جا میری اچھی دِھی (بیٹی)، آ کر چلے گئے تو ٹال سے لکڑیاں لینی پڑیں گی۔''

''پر ماں،'' گلنازی نے کہا، ''وہ تو دوپہر کے بعد آتے ہیں۔''

''گرمی بہت ہوگئی ہے گلنازی،'' ماسی جیراں نے کہا، ''اونٹوں والے صبح صبح ہی چل پڑے ہوں گے۔۔۔ جا میری اچھی دِھی۔۔۔ اور میں آٹا بھگو آئی ہوں، اسے بھی دیکھ لینا۔''

8۔ مَن چھٹی: دریا کے کنارے پر اُگنے والی ایک جھاڑی جس کی ٹہنیاں چھڑیوں جیسی پتلی ہوتی ہیں، سوکھ جانے پر جلدی آگ پکڑ لیتی ہیں۔ ان کے کوئلے بھی زیادہ دیر تک دہکتے رہتے ہیں۔ عموماً تنوروں میں جلائی جاتی ہیں۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گلنازی نہیں جانا چاہتی... لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے ماسی کی طرف دیکھا۔

''اچھا ماں،'' گلنازی نے کہا۔ ''جلدی آ جانا۔''

گلنازی نے جاتے ہوئے پھر مجھے گوشۂ چشم سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں چمک سی تھی۔

برآمدے کی چق اٹھی، گری اور پھر بیرونی دروازہ کھل کر بند ہوگیا۔ ماسی نے گہری سانس لی۔

''تجھے کبھی عقل نہیں آئے گی رقیہ!'' ماسی نے کہا، ''تو اچھی طرح جانتی ہے کہ میں نے یہ بات گلنازی سے بھی آج تک چھپائی ہوئی ہے، اگر بیبیوں نے یہ بات گلنازی کے سامنے پوچھ لی ہوتی... اور تو...'' ماسی جیراں نے میری طرف دیکھا، ''ہے تو لڑکا سا، پر تیرا دماغ...'' ماسی نے بھابھی کی طرف دیکھا۔ ''دیور ہے آپ کا بی بی جی؟''

''ہاں،'' بھابھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تیری عقل تیرے ٹخنوں میں ہے رقیہ!'' ماسی جیراں مسلسل رقیہ پر برس رہی تھی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ گلنازی کو یہ بات زندگی بھر پتا چلے۔''

''اگر نہیں بتانا چاہتی ہو ماسی،'' میں نے کہا، ''نہ بتاؤ۔ مجھے تو بس جو محسوس ہوا کہہ دیا، مجھے معاف کر دو۔''

''اب کس بات کی معافی!'' ماسی جیراں نے ایسے لہجے میں کہا جس میں نہ غصہ تھا نہ سکون، وہ بے چین سی تھی۔ ''بات کھل ہی گئی ہے... میں نہیں چاہتی کہ گلنازی کو کبھی بھی پتا چلے کہ میں اس کی سگی ماں نہیں ہوں... اس بات سے میں بہت ڈرتی ہوں بی بی جی... پر یہ رقیہ... بے وقوف... زبان پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ کسی دن گلنازی کو اس کی وجہ سے پتا چل جائے گا۔''

''نہیں... آپا... میں نے تو...'' رقیہ کا لہجہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

''چپ!'' ماسی جیراں نے اسے ڈانٹا۔ ''اب کیا ہے؟''

''تو ہماری طرف سے بے فکر رہ ماسی،'' بھابھی نے کہا۔ ''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔''

''میں بھی وعدہ کرتی ہوں،'' عصمت نے کہا، ''کسی سے کبھی یہ بات نہیں کہوں گی۔''

''میں قرآن کی قسم کھا کر کہتی ہوں،'' باجی زیبا نے کہا،'' میں کسی سے یہ بات نہیں کروں گی۔''

''میں نے کسی کو کیا بتانا ہے،'' میں نے کہا۔''غلطی ہوگئی... ایک سوال ذہن میں تھا، پوچھ لیا۔''

ماسی جیراں کچھ دیر برآمدے کی چھتوں کو دیکھتی رہی، پھر اس نے بھابھی کو دیکھا۔
''میرے رشتے داروں کو اس بات کا پتا ہے، لیکن سب نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے کہ وہ یہ بات گلنازی کو کبھی نہیں بتائیں گے۔ گلنازی کی ہم عمر لڑکیاں اور لڑکے، سب یہی سمجھتے ہیں کہ گلنازی میری سگی بیٹی ہے۔'' ماسی پھر خاموش ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سوچ رہی ہے کہ گلنازی سے متعلق سچ ہمیں بتائے کہ نہ بتائے۔''اب آپ کو ساری بات بتانی ہی پڑے گی،'' ماسی نے کہا،'' ورنہ آپ سوچیں گی کہ پتا نہیں میں گلنازی کو کہاں سے اٹھا لائی ہوں... کہیں سے اٹھا کر نہیں لائی ہوں... ہوا یوں تھا کہ جب میری شادی چاچے کے بیٹے نذر حسین سے ہوئی تھی تو وہ سرگودھا میں ایک ٹرک پر کلینڈری (کلینزی) کرتے تھے۔ وہ سرگودھا سے ٹرک پر کبھی پشاور، کبھی لاہور، کبھی میانوالی، کبھی راولپنڈی جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جہلم، سیالکوٹ اور جموں بھی جایا کرتے تھے۔'' ماسی رکی، کچھ سوچنے لگی جیسے یادوں کو ذہن میں اکٹھا کر رہی ہو۔''ایک بار جموں میں ان کی ملاقات ایک سکھ فوجی سے ہوئی۔ رنبیر سنگھ نام تھا اس کا... ٹرک نے جموں سے پھلوں کے کریٹ لے کر لاہور جانا تھا... رنبیر سنگھ کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کی فوج میں تھا۔ چھٹیوں پر اپنے گھر لدھیانے جا رہا تھا۔ نذر حسین نے ٹرک ڈرائیور سے کہہ کر رنبیر سنگھ کو ٹرک پر بٹھا لیا۔ لاہور پہنچتے پہنچتے دونوں میں دوستی ہو گئی۔ ایک دوسرے کے گھروں کے پتے بھی لے لیے۔ رنبیر سنگھ نے نذر حسین کو بتایا کہ وہ مہاراجہ کی چھ کشمیر انفنٹری میں لانس نائیک ہے، لیکن جموں میں ایک کرنل... کیا نام تھا... گھن... ہاں گھنسارا سنگھ کی کوٹھی میں کام کرتا ہے۔ پھر رنبیر سنگھ نے نذر حسین سے کہا کہ اگر تو فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے تو میں تیری مدد کر سکتا ہوں۔ فوج میں بھرتی ہو جا... مہاراجہ کی فوج تو انگریزوں کی فوج سے بھی بہتر ہے۔ بھرتی مشکل ضرور ہے، کیونکہ کسی غیر کشمیری کو مہاراجہ کی فوج میں بھرتی نہیں ملتی، لیکن میں یہ کام کرا سکتا ہوں۔ کرنل گھنسارا سنگھ کی بیوی بہت ہی اچھی عورت ہے... سفارش میں کرا دوں

گا... تجھے کشمیر کا ہی بتادوں گا۔ بنا کرنل صاحب لیں گے ... بس تو فیصلہ کر ... فوج میں بھرتی ہو جا ... اچھا رہے گا ... ورنہ زندگی بھر سڑکیں ہی گاہتا[9] رہے گا۔ تو فیصلہ کر، بھرتی کرانا میرا کام۔ کرنل صاحب کی بات تو مہاراجہ بھی نہیں ٹال سکتا۔''

یوں لگتا تھا ماسی جیراں اپنی یادوں میں محو ہو چکی ہے۔

''وہ سن چالی (چالیس) تھا بی بی جی۔ ان ہی دنوں یہ خبریں آ رہی تھیں کہ مسلمان اور ہندو الگ الگ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو یہاں جھاوریاں میں یقین ہی نہیں آتا تھا۔ یہاں بہت ہندو اور سکھ رہتے تھے۔ کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا، سب بھائی بھائی بن کر رہتے تھے۔ ہم سب بہت سکھی رہ رہے تھے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ملک دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ نذر حسین نے رنبیر سنگھ کی بات پر بہت سوچا، مجھ سے مشورہ کیا اور رنبیر سنگھ کو چٹھی لکھ دی کہ وہ بھرتی ہونا چاہتے ہیں۔ ایک مہینے بعد جواب آیا کہ بھرتی کی بات پکی ہو گئی ہے۔ مہاراجہ کی فوج ہندوستانی فوج سے اچھی ہے، کیونکہ نفری کم ہے، بہت جلد ترقی مل جائے گی۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ تو اپنی تیاری کر لے، میں جلد ہی تجھے دوسری چٹھی بھیجوں گا۔ پندرہ دنوں بعد پھر چٹھی ملی جس کے اوپر 'مبارک ہو' لکھا ہوا تھا۔ نذر حسین جموں چلے گئے۔ دو تین ہفتے بعد آئے تو سپاہی کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ چھ کشمیر انفنٹری میں بھرتی ہو گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ جموں چلی گئی۔ میں نے جموں میں دو سال گزارے۔ نذر حسین سپاہی سے لانس نائیک، پھر نائیک ہو گئے۔ رنبیر سنگھ نے ٹھیک کہا تھا، بہت جلد ترقی ملی۔ بھرا (بھائی) رنبیر سنگھ بھی حوالدار ہو چکا تھا۔ سن ترتالی (تینتالیس) میں ہم سری نگر چلے گئے۔ وہاں ہمارے پڑوس میں ایک حوالدار تھے — دلبر چوہان۔ راجوڑی کے رہنے والے تھے۔ ان کی شادی کشمیر کے پہاڑی علاقے باغ کے قریب کسی گاؤں کی شمشادہ بانو سے ہوئی۔''

''شمشاد بیگم یا شمشاد بانو ہوگا اس کا نام،'' باجی زیبا نے کہا، ''یہ شمشادہ کیا ہے؟'' باجی زیبا ہنسیں۔ بھابھی اور عصمت بھی ہنسنے لگیں، خود ماسی جیراں بھی ہنسی۔

''یہی نام تھا بی بی جی،'' ماسی نے کہا، ''شمشاد تو مردوں کا بھی نام ہوتا ہے۔ میری پڑوسن کا

9۔ گاہنا: پنجابی زبان میں کھیت میں سہاگہ پھیرنے کو کہا جاتا ہے، لیکن جب یہ لفظ محاورے میں استعمال ہوتا ہے، یعنی سڑکیں گاہنا، تو اس کا مفہوم بے سود محنت کرنا بن جاتا ہے کیونکہ سڑکوں پر اناج نہیں اگتا۔

نام شمشادہ بانو ہی تھا۔ بہت خوبصورت تھی بی بی جی... یہ جو میری گلنازی ہے... میں بتارہی تھی کہ وہ میری بہت اچھی سہیلی بن گئی تھی۔ شمشادہ پہاڑی زبان بولتی تھی۔ شمشادہ کا نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن، اکلوتی تھی۔ ماں مرچکی تھی، باپ باغ کے قریب ہی کہیں رہتا تھا۔ دلبر چوہان کا بھی یہی حال تھا، ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ رشتے دار راجوڑی ہی میں تھے۔ نہ ان میں سے کوئی سری نگر آتا تھا نہ حوالدار دلبر چوہان راجوڑی جاتا تھا۔ اس کے ماں باپ بھی فوت ہو چکے تھے۔ عجیب اتفاق تھا ان میاں بیوی کی زندگیوں میں... دونوں اکیلے... اُسی سال شمشادہ کے باپ کی بھی خبر آ گئی۔ شمشادہ بہت روئی۔ ماں بننے والی تھی، میں نے ہی اسے سنبھالا۔ فروری کا مہینہ تھا، بہت سردی تھی جب گلنازی پیدا ہوئی تھی۔ نام شمشادہ بانو ہی نے رکھا تھا — گل ناز۔ اسی سال نذر حسین کو بھی حوالداری مل گئی... نومبر کے مہینے میں...'' ماسی جیراں کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ واقعات کی کڑیاں ملانے میں اسے دقت محسوس ہورہی تھی۔ پھر وہ مسکرائی۔ ''بی بی جی، یہ جو گلنازی ہے نا، ہو بہو ماں کی تصویر ہے۔ شمشادہ بانو بالکل اسی طرح کی تھی — وہی منہ متھا (خدوخال)، وہی قد، ویسے ہی لمبے بال — گلنازی کی تو آواز بھی ماں جیسی ہے۔ شمشادہ پہاڑی زبان بولتی تھی اور میں بھی اس کے ساتھ رہ رہ کر پہاڑی زبان بولنا سیکھ گئی تھی۔ حوالداری ملنے کے بعد نذر حسین اور بھرا دلبر چوہان اکثر سری نگر سے باہر اسکیمنگ [10] پر رہتے تھے۔ مہینے میں دو چار بار ہی سری نگر آتے تھے۔ گلنازی سری نگر ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ ان دنوں بس میں ہی تھی شمشادہ اور گلنازی کی دیکھ بھال کے لیے۔ شمشادہ تھی تو پہاڑن، پر دل کی بہت کمزور تھی۔ سن چھیالی (چھیالیس) میں... سردیوں کا موسم تھا۔ گلنازی تین برس کی تھی جب انگریزوں کی فوج سے ایک کپتان... یا پتا نہیں لفٹین (لیفٹیننٹ) سری نگر آیا اور چھ کشمیر انفنٹری کے جوانوں کو ٹریننگ کے لیے درّہ برزل لے گیا۔ اس نے جن کو کشمیر انفنٹری سے چنا تھا، ان میں حوالدار دلبر چوہان اور حوالدار جی (نذر حسین) بھی تھے۔ درہ برزل کے بارے میں سنا تھا کہ برف سے ڈھکا رہتا ہے اور وہاں رہنا بہت ہی مشکل ہے۔ شمشادہ بہت ہی فکر مند رہنے لگی۔ ہر وقت خیریت کی دعائیں مانگتی رہتی تھی... کہتی تھی کہ اس دنیا میں دلبر کے علاوہ اس کا کوئی نہیں ہے... یہ ایک بچی اور وہ، بس یہی میری دنیا ہے۔ شمشادہ یہ کہہ کر رونے لگتی تھی۔ میں تسلیاں دیتی تھی... اسے

10۔ اسکیمنگ (Scheming): فوجی مشقوں کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

کہتی تھی کہ دیکھ، میں نے بھی تو حوصلہ قائم رکھا ہوا ہے۔تو کیوں گھبراتی ہے؟تو جواب میں گلنازی کو سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیتی تھی۔کہتی تھی، دلبر کے علاوہ میرا کوئی نہیں... کہاں جاؤں گی؟میں اسے سنبھالتی رہی، لیکن وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ تین مہینوں کی ٹریننگ کے بعد حوالدار جی اور بھرا (بھائی) دلبر چوہان آ گئے... بی بی جی، میں نے ایسا کرشمہ کبھی نہیں دیکھا، پندرہ دنوں ہی میں شمشادہ پھر سے وہی شمشادہ بن گئی جو دلبر کے جانے سے پہلے تھی۔ بہت گوڑا (گہرا) پیار تھا دونوں میں... لیکن مجھے اور گلنازی کی ماں کو اس انگریز لفٹین پر بہت غصہ تھا۔ جب حوالدار جی اور بھرا دلبر واپس آئے تو ان کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ بڑی سخت ٹریننگ کرائی تھی انگریز نے۔ دو مہینوں میں جب دونوں کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو پھر کسی برفانی علاقے میں ٹریننگ کے آرڈر آ گئے۔حوالدار جی اور بھرا دلبر چوہان کو بھی جانا تھا۔ اسی رات شمشادہ کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ ناک سے خون نکلنے لگا۔ بے ہوشی کی حالت میں ہم اسے ہسپتال لے کر گئے۔گلنازی کو میں نے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ڈاکٹر نے کہا کہ اگر بہتر گھنٹے نکال گئی تو شمشادہ بچ جائے گی۔بہتر گھنٹے کیا بی بی جی،'' ماسی جیراں نے بھابھی کی طرف دیکھا،'' چار گھنٹے بھی نہ نکال سکی... جو رب کو منظور... ننھی سی جان گلنازی کو چھوڑ کر چلی گئی۔ میری سہیلی ہی نہ تھی، بہن بن چکی تھی۔ میں گلنازی کو گود میں لے کر بہت روئی تھی۔حوالدار دلبر چوہان نے شمشادہ کو دفنانے کے بعد گلنازی کو میرے حوالے کیا اور نذر حسین کے ساتھ پھر ٹریننگ پر چلا گیا۔میری اپنی تو کوئی اولاد تھی نہیں، گلنازی ہی میری تنہائی کا سہارا بن گئی۔ اسی لیے کہتی ہوں... میری بیٹی ہے۔'' ماسی جیراں نے میری طرف دیکھا۔'' کہیں سے اٹھا کے نہیں لائی ہوں... مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' باجی زیبا نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

''ہونا کیا تھا بی جی!'' ماسی جیراں نے کہا۔'' دو مہینے کی ٹریننگ کے بعد حوالدار جی اور بھائی دلبر سری نگر آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پچور کھنڈ کے درّے میں تھے۔ وہاں بھی سارا سال برف پڑی رہتی ہے۔ان ہی دنوں بھرا رنبیر سنگھ جموں سے سری نگر آ گیا۔حوالدار رنبیر سنگھ کچھ پریشان تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ بھرا رنبیر سنگھ نے بتایا کہ افواہیں غلط نہیں ہیں، ملک تقسیم ہو رہا ہے۔حوالدار جی اور میں بہت پریشان تھے۔دلبر چوہان کو کوئی پریشانی نہیں تھی، اس نے تو سری نگر ہی رہنا تھا۔وہ دوسری

شادی کرنے کا بھی سوچ رہا تھا تا کہ گلنازی کو ماں مل جائے... پر رب کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پریشان تو ہم تھے بی بی جی کہ ملک تقسیم ہو گیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ اگلے روز بھرا رنبیر سنگھ ہمارے گھر آیا تو اس نے بتایا کہ انگریز لاٹ (لارڈ) صاحب نے کشمیر مہاراجہ ہی کو دینے کا فیصلہ کیا ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں، چھ کشمیر انفنٹری رہے گی۔ ہاں سرگودھے واپس آنا ذرا مشکل ہو جائے گا۔ پھر اگلے روز جب ہمارے گھر میں دلبر چوہان بھی بیٹھا تھا، رنبیر سنگھ آیا۔ اس نے کہا، یار و فکر نہ کرو، میرا بھائی پہلگام میں ہے، میں ابھی سے اسے کہہ دوں گا کہ ہمارے لیے ایک ایک کنال زمین خرید لے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مزے سے زندگی گزرے گی۔'' ماسی پھر خاموش سی ہو گئی۔ ''بات تو اچھی تھی بھرا رنبیر سنگھ کی،'' ماسی نے پھر کہنا شروع کیا... ''پر میں بہت اداس ہو گئی تھی، بہن بھائیوں اور رشتے داروں سے زندگی بھر کے لیے دور ہو جانا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔''

ماسی نے رقیہ کی سمت دیکھا، کچھ دیر سوچتی رہی۔

''پھر سن سنتالی (سینتالیس) کی جولائی کا وہ منحوس دن بھی آیا جب حوالدار جی اور بھرا دلبر چوہان کو برفانی علاقے میں کسی دراس نامی چھاؤنی میں بھیج دیا گیا۔ دراس میں چھ کشمیر انفنٹری کا ہتھیاروں کا ڈپو تھا۔ اس کی حفاظت بہت ضروری تھی، کیونکہ یہ خبریں بھی سری نگر پہنچ رہی تھیں کہ چھ کشمیر انفنٹری کے کچھ افسر اور جوان باغی ہو گئے ہیں۔ اگست میں ملک تقسیم ہو گیا... وہ بہت ہی مشکل دن تھے۔ میں سری نگر میں بہت اکیلی تھی۔ رات کو گلنازی میرے سینے سے لپٹ کر سو جاتی تھی تو میرے آنسو بہنے لگتے تھے۔ میں ان لوگوں کو بددعائیں دیتی رہتی تھی جنھوں نے انگریزوں سے آزادی کے نام پر ملک ہی توڑ دیا تھا۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر... نہ حوالدار جی کا پتا تھا نہ بھرا دلبر چوہان کی کوئی خبر تھی۔ میری ہمت بھی شمشادہ کی طرح ٹوٹنے لگی تھی جب بھرا رنبیر سنگھ نے ایک دن آ کے دونوں کی خیریت کی خبر سنائی۔ پھر امید بندھ گئی۔ عجیب دن تھے، ہر روز کوئی نئی بات سننے میں آتی تھی۔ کبھی آس بندھ جاتی تھی، کبھی مایوسی گھیر لیتی تھی۔ پھر ایک دن یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ سری نگر پر حملہ ہونے والا ہے۔ میں بہت گھبرا گئی۔ رہی سہی کسر بھرا رنبیر سنگھ نے یہ کہہ کر نکال دی کہ خبر سچ ہے... بہت سے پٹھانوں کے قبیلے سری نگر پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ ان قبائلیوں نے اکتوبر کی بیس تاریخ کو مظفر آباد کے قریب بھٹ راسی کے جنگل میں جمع ہو کر بڑا لشکر تیار کر لیا ہے اور وہ سری نگر پر

حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بہت خطرناک ہیں، کیونکہ ان کا مقصد لوٹ مار ہے۔ وہ سری نگر کو لوٹنا چاہتے ہیں، یہاں کی جوان لڑکیوں اور بچیوں کو اغوا کرنا چاہتے ہیں . . . رنبیر سنگھ نے گلنازی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''پر تو فکر نہ کر بہن میرے، جب تک تیرا یہ سکھ بھائی زندہ ہے، کوئی تیری طرف دیکھ نہ سکے گا۔ اگر قبائلی بارہ مولا کے قریب پہنچ گئے تو میں تجھے اور گلناز کو لے کر سری نگر سے نکل جاؤں گا۔ بہن کہا ہے تجھے۔ گلناز میری بھانجی ہے . . . واہگورو کی سوں (قسم)، تمھیں بچانے کے لیے کٹ مروں گا۔ پہلگام تک تمھیں اور گلناز کو لے جانا میرا ذمہ . . . میرے جیتے جی تمھیں کوئی ہاتھ نہ لگا سکے گا . . . یہ میرا وعدہ ہے!

''بی بی جی، اس رات میں سو نہ سکی۔ پہلی بار مجھے بہت اکیلی ہونے کا احساس ہوا۔ رات بھر گلنازی کو چھاتی سے لگائے میں روتی رہی تھی۔ نہ حوالدار جی کی کوئی خبر تھی نہ بھرا دلبر چوہان کی . . . اوپر سے قبائلیوں کے حملے کا خوف . . . تین دن، تین راتیں، ایسا مشکل وقت پھر نہیں دیکھا۔ چوتھے دن بھرا رنبیر سنگھ بہت خوش خوش آیا، اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبہ کھول کر گلنازی کو مٹھائی دی۔

''کمال ہوگیا بہن میرے (میری بہن)، بھائی رنبیر سنگھ نے خوشی سے کہا، واہگورو کی کرپا ہوگئی . . . مہر ہوگئی . . . وہ مہاراجہ ہری سنگھ، وہ تو گدڑ (گیدڑ) نکلا . . . دس بارہ ٹرکوں میں سامان لاد کر مہاراجہ، رانی اور محل کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر، اپنے اے ڈی سی کی نگرانی میں جموں بھاگ گیا ہے۔ ہوائی اڈے پر انڈین آرمی کے دستے اتر رہے ہیں۔ ان کے پاس توپیں بھی ہیں، بکتر بند گاڑیاں بھی ہیں . . . بھاری نفری آ رہی ہے . . . قبائلیوں کی ماں کی سری . . . وہ تو یہ خبر سن کر ہی بھاگ رہے ہیں کہ انڈین آرمی سری نگر پہنچ گئی ہے۔ اور بہن منہ میٹھا کر، راجہ مہاراجہ سب ختم، اب یہ انڈیا ہے۔ سری نگر پر اب کسی مہاراجہ کی حکومت نہیں ہے۔ اب ہم چھ کشمیر انفنٹری والے انڈین آرمی کا حصہ ہیں۔ حوالدار نذر حسین، حوالدار دلبر چوہان، میں، ہم سب اب انڈین آرمی کے حوالدار ہیں۔ اب تو سب فکر چھوڑ دے۔ دراس کا اسلحہ ڈپو اب انڈین آرمی کا ڈپو ہے۔ ادھر دیکھنے والے کی ایسی تیسی . . .

''پھر ارنبیر سنگھ خوش خوش چلا گیا،لیکن مجھے ایک نئی فکر دے گیا۔ میں اور گلناز ی قبائلیوں سے تو محفوظ ہوگئی تھیں،لیکن میں یہ سوچ سوچ کے سوکھ رہی تھی کہ اب ہمیشہ کے لیے سرگودھے میں اپنے بہن بھائیوں اور رشتے داروں کو چھوڑنا ہوگا۔ اگلے روز پھر رنبیر آیا تو میں نے اسے اپنے اندیشے سے آگاہ کیا۔ وہ بہت ہی خوش تھا، راشن لے کر آیا تھا۔

''او بہن میریے، یہ بھی کوئی مسئلہ ہے! حوالدار نذر حسین اور تیرے پاس انڈین پاسپورٹ ہوگا... تین مہینے سرگودھے جاکر مل آیا کرنا بہن بھائیوں اور رشتے داروں سے... میں تو اپنے بھائی کو پہلگام خط لکھ رہا ہوں کہ ہم تینوں یاروں کے لیے زمینیں دیکھنا شروع کردے۔ وہاں ریٹائرمنٹ کے بعد ہم بہت اچھی زندگی گزاریں گے۔

''پھر ارنبیر چلا گیا۔ اسی مہینے کے آخری دنوں میں وہ آیا تو اس کا چہرہ دیکھ کر میں گھبرا گئی۔

''گھبرا مت بہن میریے، رنبیر نے کہا،خبر اچھی نہیں ہے،لیکن ایسی بھی نہیں کہ پریشانی ہو۔

''کیا ہوا ہے؟ میں نے پوچھا۔

''جیسے ہی مہاراجہ بھاگا ہے اور انڈین آرمی نے سری نگر کا کنٹرول سنبھالا ہے، کشمیر کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، چھ کشمیر انفنٹری کے کچھ افسروں نے انڈین آرمی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے،لیکن انھوں نے بڑی چالاکی سے یہ بات انفنٹری کے سپاہیوں سے چھپالی ہے کہ مہاراجہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ وہ مہاراجہ کے خلاف بغاوت کررہے ہیں، سپاہیوں کو ساتھ ملا لیا ہے۔ سپاہی پہلے ہی سے مہاراجہ سے نفرت کرتے ہیں — مسلمان سپاہی — جن کا تعلق گلگت اور بلتستان سے ہے۔ بغاوت ہو چکی ہے اور انھوں نے بریگیڈیئر جی کو گلگت میں گرفتار کرلیا ہے۔ پتا نہیں کہ وہ زندہ ہیں یا مار دیے گئے ہیں — میرے تو وہ اپنے ہیں... برسوں رہا ہوں ان کے ساتھ... بہت چنتا ہو رہی ہے مجھے... گلگت کی طرف کی تمام وادیوں میں بغاوت ہوگئی ہے۔ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ بغاوت مہاراجہ کے خلاف ہے۔

''میں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ دراس پر حملے کا خطرہ تو نہیں ہے؟ اس پر رنبیر نے کہا،خطرہ تو ہے،بہن میریے،لیکن اب دراس کی حفاظت کرنا انڈین آرمی کی ڈیوٹی ہے۔ تو فکر نہ کر۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ باغی افسر سپاہیوں اور سول آبادی کو دھوکا دے رہے ہیں کہ بغاوت مہاراجہ کے

خلاف ہے۔ [11] ایک انگریز افسر بھی اس سازش میں ان کا ساتھ دے رہا ہے — میجر براؤن ہے اس کا نام — وہ گلگت اسکاؤٹس کا کمانڈر ہے۔

''بی بی جی، مجھے سارے نام تو یاد نہیں رہے لیکن اتنا یاد رہے کہ وہ کسی کیپٹن حسن خان اور صوبیدار میجر بابر خان کا نام لے رہا تھا۔ اس نے پھر کہا، سازش پہلے ہی سے تیار تھی۔ انگریزوں نے پہلی اگست ہی کو مہاراجہ سے کہہ دیا تھا کہ اب اس کا راج ختم ہے۔ وہ فیصلہ کرے کہ انڈیا کا ساتھ دے گا یا نہیں۔ چودہ اگست کو ریاستی فوج کے سربراہ میجر جنرل اسکاٹ نے خود گلگت جا کر وہاں افسروں کو بتادیا تھا کہ اب چونکہ مہاراجہ ختم ہوگیا ہے، شمالی علاقوں کا سارا کنٹرول اب انڈین آرمی ہی کے پاس ہوگا۔ لیکن یہ بات چھ کشمیر انفنٹری کے افسروں نے جوانوں اور سول لوگوں سے چھپالی اور یہی شور مچایا کہ بغاوت مہاراجہ کے خلاف ہے۔۔۔ تو فکر نہ کر، دراس برفانی علاقہ ہے۔ وہاں سردیوں کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ ریچھ بھی جان بچانے کے لیے غاروں میں چھپ جاتے ہیں۔ میرے یاروں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کم از کم اس موسم میں تو ہرگز نہیں۔ دراس میں بہت مضبوط مورچے ہیں، لکڑیوں اور کوئلوں کا ذخیرہ ہے۔ کم از کم چھ مہینوں کا راشن پانی بھی موجود ہے۔۔۔ اگر دراس پر حملہ ہوا تو اگلے سال اپریل تک ہی ہو سکے گا اور اس وقت تک انڈین آرمی دراس کا کنٹرول سنبھال لے گی۔۔۔ اب تو ہم ہی انڈین آرمی ہیں۔

11۔ ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں جب میں گلگت میں قیام پذیر تھا، وہاں چھ کشمیر انفنٹری کے ایک افسر سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ عوام کو دھوکا دیا گیا تھا۔ نام نہ بتانے کی شرط پر انھوں نے مجھے یہ بات بتائی کہ 1947 میں شمالی علاقوں کے عوام کی اکثریت کشمیر کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ ان کے دلوں میں مہاراجہ کے لیے نفرت تھی۔ اسی بات کا فائدہ اٹھا کر انفنٹری کے باغیوں نے عوام میں یہی پروپیگنڈا کیا کہ بغاوت مہاراجہ کے خلاف ہے۔ اگر اس وقت عوام تک سچائی پہنچ جاتی کہ مہاراجہ ختم ہو چکا ہے اور کشمیر اب ہندوستان کا حصہ ہے، تو نہ سپاہی بغاوت میں حصہ لیتے نہ عوام، کیونکہ سب کشمیر ہی میں رہنا چاہتے تھے۔ اس سازش میں میجر براؤن بھی شامل تھا۔ میں نے مزاحمت کی تھی اور کہا تھا کہ میجر جنرل اسکاٹ کا پیغام گھر گھر پہنچا دو کہ مہاراجہ ختم ہو چکا ہے، لیکن میری اور میرے ساتھیوں کی آوازیں طوفان میں پھڑ پھڑاتی چڑیوں جیسی تھیں۔ اگر اس وقت سچائی سپاہیوں اور عوام تک پہنچ جاتی تو مسئلہ کشمیر کبھی پیدا ہی نہ ہوتا، کیونکہ جو علاقے اب آزاد کشمیر کہلاتے ہیں ان میں بھی یہی چال چلی گئی تھی کہ بغاوت مہاراجہ کے خلاف ہے۔

''بھرا رنبیر سنگھ کی باتوں میں حوصلہ تھا لیکن نہ جانے کیوں میں ڈری ڈری سی تھی۔ بھرا رنبیر سنگھ نے گلنازی کو گود میں لے کر پیار کیا، میری طرف دیکھا۔

''دیکھ بہن میریے، چار مہینے ہی تو ہیں۔تو بڑی حوصلے والی ہے۔ یہ چار مہینے کسی طرح گزر جائیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اپریل میں میرے یار واپس سری نگر آ جائیں گے۔

''میری پوری زندگی میں اس سے زیادہ بھاری اور سیاہ دن نہیں آئے۔ خوف، امید، پریشانی حوصلہ... چھوٹی سی گلنازی، جسے دیکھ دیکھ کر میرا دل ڈوب جاتا تھا۔ سری نگر شہر میں ہر روز افواہیں پھیل جاتی تھیں۔ یہ افواہ دل کو دہلا دینے والی تھی کہ سری نگر پر بڑا حملہ ہونے والا ہے، لیکن بھرا رنبیر سنگھ ہر چوتھے پانچویں دن آکر تسلی دے جاتا تھا کہ سب افواہیں دشمن کے ایجنٹ اڑا رہے ہیں، سری نگر بالکل محفوظ ہے۔ ایک دن اس نے آکر بتایا کہ دراس بالکل محفوظ ہے۔ اس خبر سے بہت حوصلہ ہوا۔ خدا اسے اور اس کی اولاد کو ہمیشہ خوش رکھے۔ بی بی جی، بھرا رنبیر سنگھ بہت ہی اچھا انسان تھا۔ وہ مجھے خود ہی راشن پہنچا دیتا تھا جو میرے اور گلنازی کے لیے بہت ہوتا تھا۔ ایک گوالا صبح صبح دودھ بھی دے جاتا تھا۔ رنبیر سنگھ حوالدار صاحب کی تنخواہ بھی مجھے لا دیتا تھا، کاغذ پر میرا انگوٹھا لگوا کے لے جاتا تھا۔ ہر طرح کا خیال رکھتا تھا۔ اس زمین پر خدا نے کئی نیک روحیں بھیجی ہوئی ہیں بی بی جی... میں اس کی کون تھی؟ اس کے احسان تو میری سانسوں کے ساتھ رہیں گے۔ دسمبر گزرا، جنوری فروری گزری، مارچ کا مہینہ بھی گزر گیا۔ وہ شاید اپریل کا آخری ہفتہ تھا جب ایک صبح نکلنے والا سورج میرے لیے کالا ہو گیا۔ تقریباً گیارہ بجے بھرا رنبیر آیا۔ اس نے بتایا کہ دراس پر حملہ ہو گیا ہے۔

''گلگت اور چترال کے باغیوں نے اسکردو پر قبضہ کر لیا ہے، رنبیر سنگھ نے مشکل سے یہ بات مجھے بتائی، اور انھی باغیوں نے چھ کشمیر انفنٹری کے باغیوں میجر احسان علی اور کیپٹن بابر، اسکاؤٹوں شاہ خان اور شیر علی کے ساتھ مل کر، دو چار سو باغیوں کے ساتھ دراس پر حملہ کر دیا ہے۔ انڈین آرمی کے دستے سری نگر سے دراس روانہ ہو چکے ہیں۔ باغیوں نے دیوسائی کو پار کر کے اچانک ہی حملہ کر دیا ہے۔ وہاں موجود فوجی خطرے میں ہیں۔

''میرا تو دل اچھل کر گلے میں آ گیا تھا بی بی جی۔ مایوسی اتنی تھی کہ میں کمزور سی ہو کر بستر پر گر پڑی تھی۔ بار بار خوف طاری ہو جاتا تھا۔ وہ منحوس شام تو مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گی۔ بھرا رنبیر سنگھ

آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں، چہرہ غمزدہ تھا۔ مجھے اور گلنازی کو دیکھ کر وہ سسکیاں لینے لگا۔

''میں سب سمجھ گئی تھی بی بی جی۔۔۔ بس اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔۔۔ پھر بھائی رنبیر سنگھ نے بتایا کہ دراس پر باغوں نے شدید حملہ کیا، وہ اسلحہ چھین لینا چاہتے تھے۔ وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ہمارے فوجی بے جگری سے لڑے لیکن باغیوں کے مقابلے میں تعداد بہت کم تھی۔۔۔ اس لڑائی میں حوالدار جی اور بھرا دلبر چوہان دونوں شہید ہو گئے ہیں۔''

ماسی جیراں کے چہرے پر غم کا وہی تاثر نمایاں ہو گیا جو برسوں پہلے یہ خبر سن کر اس پر طاری ہوا ہوگا۔ وہ خاموش سی ہو گئی۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیوار کی سمت دیکھنے لگی۔ پھر اس نے بھابھی کی طرف دیکھا۔ ''بہت مشکل وقت ہوتا ہے بی بی جی، بڑے بڑوں کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں اکیلی، چار سال کی بچی گلنازی۔۔۔ نہ والی نہ وارث، ہر طرف اندھیرا تھا۔ میں حوالدار جی کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکی۔ نہ جانے دونوں کو کہاں برفوں میں دفن کر دیا گیا ہوگا۔ میں اس دن کو یاد کر کے روتی تھی جب حوالدار جی نے ٹرک پر کلینڈری چھوڑ کر سپاہی کی وردی پہنی تھی۔'' ماسی جیراں کی آواز بھرا گئی۔

''اکیلی جان، چھوٹی سی گلنازی۔۔۔ ہر طرف اندھیرا۔۔۔ بس دو ہی راستے تھے، ایک تو بھرا رنبیر سنگھ کی یہ بات کہ میں ہندوستانی فوج کے شہید کی بیوہ ہوں۔۔۔ مجھے تاحیات پنشن ملے گی۔ میں سری نگر ہی میں رہ جاؤں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ بھرا رنبیر سنگھ کے ساتھ لدھیانے چلی جاؤں اور وہ کسی نہ کسی طرح مجھے سرحد پار کرا دے گا، لیکن اس پر اسے خود بھی پورا یقین نہیں تھا۔ کہتا تھا کہ جنھوں نے جانا تھا چلے گئے ہیں، اب سرحد پر سخت نگرانی ہے۔ آسانی سے سرحد پار نہیں کی جا سکے گی۔ پہلا راستہ ہی ٹھیک رہے گا۔ لیکن میں نے صاف صاف کہا کہ میں۔۔۔ مجھے ہر حال میں سرگودھے جانا ہے۔۔۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں اور رشتے داروں کے پاس جھاوریاں آنا ہے۔ کچھ بھی کر، مجھے سرحد پار کرا۔ بھرا رنبیر سنگھ نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور چلا گیا۔''

ماسی جیراں پھر خاموش ہو گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم میں سے کسی میں بھی کچھ پوچھنے کا حوصلہ باقی نہ تھا۔

''بی بی جی،'' ماسی جیراں نے ہی سکوت توڑا۔ ''ایک ایک بات یاد ہے مجھے، جیسے سب کچھ کل

ہی ہوا ہو۔۔۔ حوالدار جی اور بھرا دلبر چوہان کے قاتلوں کے نام میں کبھی نہ بھولوں گی — میجر احسان علی، کپتان بابر، شاہ خان، شیر علی — ان کی آل اولاد کو چین نہیں ملے گا جنھوں نے مجھے بیوہ اور گلنازی کو یتیم کیا تھا۔۔۔ راجہ تو ختم ہو چکا تھا۔۔۔ دشمنی تو مہاراجہ ہری سنگھ سے تھی — وہ تو ختم ہو چکا تھا۔ ہندوستانی فوج آ گئی تھی۔ ہندوستان سے سارے مسلمان تو مہاجر نہیں بن گئے تھے، زیادہ مسلمان تو ہندوستان ہی میں تھے۔ اور کشمیر میں تو سارے مسلمان تھے اور ہندوستان ہی میں رہنا چاہتے تھے۔ پر کس دشمنی کی وجہ سے مسلمان ہو کر قاتلوں نے مسلمانوں کو مارا؟ یہ سب بدمعاشی تھی، دھوکے بازی تھی۔''

ماسی سیاسی باتیں کرنے لگی — وہ شاید اس گاؤں کی اکلوتی عورت تھی جس نے تقسیمِ ہند کا زہر چکھا تھا۔

''پھر کیا ہوا ماسی؟'' اب میں ماسی کو واپس لایا۔ ''تم سرگودھا کیسے پہنچیں؟''

''ہاں۔۔۔'' ماسی نے چونک کر کہا، ''چار پانچ دن بعد بھرا زبیر سنگھ آیا۔ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اس نے گلنازی کو اٹھا کر اس کا سر چوما، پھر میری طرف دیکھا۔

''بہن میریے، دل تو نہیں چاہتا کہ تجھے بھیجوں، اتنے برسوں کا ساتھ ہے، ماں جائی لگتی ہے تو۔ میں تو سوچ رہا تھا، تیری بھرجائی پرم جیت کور اور بچوں کو بھی سری نگر لے آؤں۔ میرا تو یہ سفنا (سپنا) بھی ہے کہ بڑھاپا پہلگام میں گزرے۔۔۔ پر تو بھی سچی ہے۔ بہن بھائیوں اور رشتے داروں کے بغیر آخری عمر گزارنی بھی مشکل ہوگی۔۔۔ کر دیا ہے تیرے جانے کا انتظام۔ بس ایک ہفتہ ٹھہر جا۔ میں تیرے اور دلبر یار کے گھر کا سامان بیچ کر تجھے پونڈ خرید دوں گا۔ تو سرگودھے پہنچ تو جائے گی لیکن وہاں پنشن ہوگی نہ کوئی اور سہارا۔۔۔ میں نے کوشش کی ہے کہ فوج سے حوالدار نذر حسین اور حوالدار دلبر چوہان کے بقایا جات تجھے اور گلنازی کو ابھی دلا دوں، لیکن اس کے لیے چھ مہینے اور تجھے یہاں رہنا پڑے گا، اور میں جانتا ہوں کہ تو نہیں رہے گی، اور پھر شاید تجھے بھیجنا اور بھی مشکل ہو جائے۔ سرگودھے تو اب تو پہنچ ہی جائے گی۔۔۔ کر لیا ہے انتظام۔۔۔ آگے رب راکھا۔ اور ہاں۔۔۔ دیکھ بہن میریے، واہگورو نے تیری گود تو خالی رکھی ہے۔۔۔ شاید اسی لیے کہ یہ گلنازا اپنی کرپا سے اس نے تیری گود میں ڈالنی تھی۔ یہ بچی واہگورو نے تجھے سونپی ہے، بیٹی کی طرح دی ہے۔ اس کا یہاں کوئی نہیں۔ نہ ماں نہ باپ، نہ دادا دادی نہ نانا نانی۔ باغ کا علاقہ اب باغیوں کے قبضے میں ہے، پتا نہیں وہاں کوئی

اسے قبول کرے گا کہ نہیں۔ راجوڑی میں بھی یہی مسئلہ ہوگا۔ اگر یہ مسلمان کے گھر نہ پیدا ہوئی ہوتی تو میں اسے لدھیانے لے جا کر پرم جیت کور کے حوالے کر دیتا۔۔۔ واہگورو نے تجھے ہی اس کی ماں بنایا ہے۔ اس بچی کی زندگی کو بربادی سے تو ہی بچا سکتی ہے، لے جا۔۔۔ اسے ساتھ لے جا۔۔۔ دونوں کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ میں تجھے بارہ مولا، اوڑی، گڑھی دوپٹہ کے راستے مظفر آباد پہنچا دوں گا۔ میں نے رات کے وقت تم دونوں کو پل پار کرانے کا انتظام کرلیا ہے۔ اِدھر بھی بات ہو گئی ہے، اُدھر بھی — دس پونڈ اِدھر دینے ہوں گے، دس پونڈ اُدھر ۔۔۔ کیا کروں بہن، اس کے بغیر ان دنوں کوئی اور طریقہ ہی نہیں ہے۔ میں تجھے اُدھر کی کرنسی بھی دے دوں گا۔۔۔ نئے نئے نوٹ چھپ رہے ہیں، اِدھر بھی اور اُدھر بھی — باقی رب راکھا!''

ہم سب ہمہ تن گوش کبھی ماسی کو دیکھتے تھے کبھی ایک دوسرے کے چہروں کو۔ اس قصے کا سب سے اہم موڑ آ چکا تھا۔ بھابھی کے چہرے پر اداسی تھی، باجی زیبا نے یوں سر جھکایا ہوا تھا جیسے اونگھ رہی ہوں، عصمت ماسی جیراں کے چہرے کی سمت غور سے دیکھ رہی تھی۔ رقیہ بوبے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا، وہ یہ قصہ پہلے بھی کئی بار سن چکی ہوگی۔ ماسی جیراں نے پھر گہرا سانس لیا۔

''چھ سات دن بعد بھرا رنبیر آیا، اس کے ساتھ ایک کشمیری بھی تھا،'' ماسی نے کہنا شروع کیا،'' انھوں نے میرے اور شمشادہ کے گھر میں موجود سارے سامان کو دیکھا بھالا اور چلے گئے۔ کچھ دیر بعد بھرا رنبیر سنگھ پھر آیا۔ اس نے کہا، زیادہ چیزیں ساتھ نہ لینا بہن، بس کام کے کپڑے لتے، اپنے زیور سنبھال لے، کل گلنازی کے کام آئیں گے۔ شمشادہ کے زیور بھی اچھی طرح سنبھال لے۔ راستے میں کوئی زیور نہ پہننا، نہ کان کے بندے نہ انگوٹھی، حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کل شام تیار رہنا، میں رات ہی کو مظفر آباد بھجوانے کی کوشش کروں گا۔

''ایسا ہی ہوا بی بی جی۔ غضب کی سردی تھی۔ میں نے گرم کپڑے پہنا کر گلنازی کو دو کمبلوں میں لپیٹا۔ خود بھی جتنے گرم کپڑے پہن سکتی تھی، پہنے۔۔۔ شام کو جیپ آئی، بھرا رنبیر ہمارے ساتھ بارہ مولا کی طرف روانہ ہوا۔ جب اندھیرا چھا گیا تو مجھ پر مایوسی چھا گئی۔ انجان جگہ، سنسان رستہ، پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی ہوئی برف اور تیز ٹھنڈی ہوا۔۔۔ جیپ پر ترپال تو موجود تھا، پھر بھی گلنازی

مجھ سے یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے بہت ڈری ہوئی ہو... ڈر تو مجھے بھی تھا لیکن بھرا رنبیر سنگھ کا سہارا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ آدھی رات کے وقت ہم پل[12] پر پہنچے۔ جیپ رکی اور رنبیر سنگھ پل کے پاس بنے ایک مورچے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک سکھ فوجی بھی تھا۔

''اور نبیر سیاں،[13] میں کی کروں، ڈوگرہ سوری دا دس پونڈا ای منگدا اے۔

(او رنبیر سنگھ، میں کیا کروں، ڈوگرہ سُسر ی کا دس پونڈ ہی مانگتا ہے۔)

''لے لین دے بھوتنی دے نوں... (لے لینے دے بھوتنی کے کو...) رنبیر سنگھ نے بھی کسی ڈوگرے کو گالی دی جو شاید پل کا نگراں ہوگا۔ بہن میری، اس نے جیپ کے پاس آ کر کہا، دس پونڈ دے دے۔ بھرا رنبیر سنگھ نے مجھے ایک سو سے زیادہ پونڈ دیے تھے۔ میں نے گن کر دس پونڈ دے دیے۔ رنبیر سنگھ نے بابے کی تصویر والے نوٹ بھی دیے تھے، سو سو روپے اور پچاس پچاس والے... رنبیر سنگھ اور دوسرا سکھ پھر مورچے میں چلے گئے۔ جب واپس آئے تو بھرا رنبیر سنگھ بہت اداس تھا۔

''چنگا فیر بہن میریے، آ تجھے پُل پار کرادوں۔

''میں گلنازی کو اٹھا کر جیپ سے اتری۔ ہوا اتنی ٹھنڈی تھی کہ چہرے پر چھری کی طرح لگتی تھی۔ میں نے گلنازی کا منھ بھی کمبل میں چھپالیا۔ میرے دانت بجنے شروع ہو گئے تھے، سارا بدن کانپ رہا تھا۔

''یہ تیری مرضی ہے بہن، بھرا رنبیر سنگھ نے کہا، ورنہ... واہگورو کی قسم، تو میرے لیے ماں جائی سے کم نہیں ہے۔ تجھے بہت یاد کروں گا۔ اور ہاں، میرے یار چوہان کی اس نشانی کو سنبھال کر رکھنا۔ اس نے کمبل میں لپٹا ہوا گلنازی کا سر چوما اور اس سے مخاطب ہوا: جادِ جیے، واہگورو تیری راکھی کرے... اور تو... اس نے میری طرف دیکھا۔ اس بھائی کو بھول نہ جانا۔ کیا پتا یہ ہماری آخری ملاقات ہو... لگتا تو ایسا ہی ہے کہ آخری ہی ہے۔

''بہت ہی اچھا انسان تھا بی جی... رنبیر سنگھ جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں دنیا میں... کون تھی میں اس کی؟ سگی بہن جیسا برتاؤ کیا تھا اس نے، بلکہ سگی بہن سے بھی بڑھ کر... اندھیری

12۔ غالباً کمان پُل۔

13۔ مشرقی پنجاب کے سکھ ایک دوسرے کو سنگھ کی جگہ سیاں ہی کہتے ہیں۔

رات میں یا تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف چمکنے کا احساس ہو رہا تھا یا دریا کے بہتے پانی کی لہروں پر کسی لہر کے چمک جانے کا۔ دریا شور سے پل کے نیچے بہہ رہا تھا۔ پل کے درمیان تک بھرا رنبیر سنگھ میرے ساتھ آیا، دوسرا سکھ فوجی بھی ساتھ ہی تھا۔ پل کے درمیان پہلے سے ایک فوجی موجود تھا۔

''لے پائی (بھائی) خدا بخشا، تیرے وطن دی امانت اے... دوسرے سکھ نے کہا۔

''سمجھا دیا ہے اسے، رنبیر سنگھ نے کہا، دس پونڈ دے دے گی۔

''پہلی بار بھرا رنبیر سنگھ نے چھوٹی بہن کی طرح میرا سر چوما۔ میں رو پڑی۔ روتے ہوئے میں نے رنبیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ رنبیر سنگھ نے مڑتے ہوئے اپنی کپڑے سے بندھی گھنی ڈاڑھی کے اوپر اپنا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور واپس چلا گیا۔ پل کے ادھر بھی مورچہ تھا جس میں دو فوجی پہلے ہی موجود تھے۔ ایک چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا مجھے خاموشی سے مورچے میں لایا۔ مورچہ گرم تھا، انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ میں بہت سہمی ہوئی تھی۔ گلنازی کو گود میں لے کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

''مسلمان ہو؟ ایک بڑی بڑی آنکھوں والے نے پوچھا۔

''جی... میں بہت ڈر گئی تھی۔

''کلمہ سناؤ! اس نے کہا اور میں نے کلمہ سنا دیا۔

''ہوں، اس نے کہا، یہ تیری بیٹی ہے؟ اس نے میری گود میں بیٹھی گلنازی کو دیکھا۔ سنا ہے تیرا خاوند مر گیا ہے؟

''مجھے اس کی یہ بات بہت بری لگی لیکن میں بالکل خاموش تھی۔

''تجھ سے کچھ پوچھا ہے! تیسرے فوجی نے کہا جس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔

''جی، بیٹی ہے میری... میں نے جواب دیا۔

''نماز آتی ہے؟ پہلے والے فوجی نے بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے فوراً نماز سنا دی۔ نماز سنتے ہی ان کا انداز بدل گیا۔

''کہاں جانا ہے؟ ڈاڑھی والے نے نرم لہجے میں کہا۔

''جھاوریاں، میں نے کہا۔ سرگودھے میں... جو سپاہی مجھے پل سے لایا تھا، تیزی سے میری طرف مڑا۔

''پہلے بتانا تھا بھاگوانے! اس نے کہا۔ میں پدھڑار کا ہوں۔

''یہ سنتے ہی میرا ڈر کم ہو گیا۔ کٹھہ کالرہ سے کلر کہار جانے والی سڑک پر دو قصبے بہت مشہور ہیں: ایک پیل اور دوسرا پدھڑار۔

''بڑی نصیب والی ہے تو، اسی سپاہی نے پھر کہا۔ آج صبح ہی ایک جیپ مظفر آباد جا رہی ہے اور وہاں سے ایک ٹرک آج شام ہی راولپنڈی کے لیے جائے گا۔ ڈرائیور میرا یار ہے۔ پرسوں صبح وہ تجھے راولپنڈی سے سرگودھے والی بس پر بٹھا دے گا۔ بے فکر ہو جا۔ اب تو محفوظ ہے۔ ذرا بھی نہ ڈر۔

''بی بی جی، حوصلہ تو ہوا پر دل میں ڈر قائم تھا... جوان عورت، ساتھ ایک بچی... لاوارث، مورچے میں تین مرد... دل دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن وہ لوگ بُرے نہ تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں والا لالچی ضرور تھا، بُرا نہیں تھا۔ میں نے دس پونڈ اسے دے دیے۔ اس نے ڈاڑھی والے سے کہا کہ مجھے چائے دے۔ انھوں نے گلنازی کو ایک پیالی میں دودھ بھی دیا۔ گلنازی دودھ پی کر میری گود ہی میں سوگئی، حالانکہ جلتے ہوئے گیس کا شور مورچے میں پھیلا ہوا تھا۔ صبح پانچ بجے انھوں نے مجھے اور گلنازی کو ایک جیپ میں بٹھایا۔ پدھڑار والا سپاہی جیپ میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کسی کام سے مظفر آباد جا رہا تھا۔ میں پیچھے ترپال سے ڈھکی جیپ میں گلنازی کو گود میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ بہت سردی تھی لیکن جب سورج نکلا تو سردی کا احساس کچھ کم ہو گیا۔ جیپ مظفر آباد پہنچ گئی۔ میرے ساتھ آنے والے سپاہی نے مجھے ایک فوجی ٹرک کے ڈرائیور سے ملوایا۔

''یار افضل، اس نے کہا، اسے میری بہن ہی سمجھ۔ اس نے جھاوریاں جانا ہے۔ پنڈی جا کر اسے خود سرگودھے والی بس پر بٹھا دینا۔

''تو بے فکر رہ خدا بخشا، ڈرائیور نے کہا، تیری بہن میری بہن۔ خود جا کر سرگودھے والی بس پر بٹھا دوں گا۔ میرے ساتھ آنے والا سپاہی مجھے تسلی دے کر واپس چلا گیا۔ بھرار نبیر کی طرح وہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔

''وہ دن میں نے مظفر آباد میں، ٹرک ہی میں بیٹھ کر گزارا۔ ایک دو بار ضرورت کے لیے اتری۔ ڈرائیور نے مجھے کھانا لا دیا اور گلنازی کے لیے دودھ کا گلاس بھی دے گیا۔ شام کو ٹرک پنڈی کے لیے چلا۔ ٹرک پر پیچھے کچھ سامان بھی تھا، چھت پر ترپال بھی تھا، سردی بھی اتنی نہیں تھی جتنی سری نگر

سے آتے ہوے راستے میں تھی۔ ہوا سیدھی تو نہیں آ رہی تھی، لیکن پیچھے سے کھلے ٹرک کی وجہ سے کبھی کبھی چکر سا لگا جاتی تھی۔ ٹرک دریاے نیلم کے ساتھ ساتھ بہت آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ جلد ہی اندھیرا بڑھ گیا۔ مجھ پر پھر گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔ رفتار اتنی آہستہ تھی کہ لگتا تھا پنڈی پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ رات کی تاریکی میں ٹرک کے انجن کا شور سنائی دے رہا تھا جس میں دریاے نیلم کی لہروں کا شور بھی شامل تھا۔ گلنازی میری گود میں سوگئی۔ میں بھی پچھلے کئی گھنٹوں سے جاگ رہی تھی۔ اونگھ سی آئی اور میں سوگئی۔ ایک زورزور سے سنائی دینے والی آواز پر میں اٹھی۔ صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

''مری آ گیا ہے بہن! وہ ڈرائیور تھا۔ اٹھ جا۔ سامنے غسل خانہ ہے، بچی کا بھی منہ دھلوا لے۔ میں ناشتہ لے کر آتا ہوں۔

''مری میں ناشتے کے بعد ٹرک پنڈی کے لیے چلا۔ اس بار ٹرک کی رفتار تیز تھی۔ دوپہر سے بہت پہلے، بلکہ نو بجے کے قریب، ڈرائیور نے مجھے صدر راولپنڈی کے علاقے میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر پہنچایا۔ بس ساڑھے نو بجے چلتی تھی سرگودھے والی۔ مجھے اور گلنازی کو بس میں بٹھا کر ڈرائیور ہم سے رخصت ہوا۔

''خدا بخش کو میرا اسلام کہنا، میں نے کہا۔ کہنا کبھی جھاوریاں آئے تو حوالدار نذر حسین کا گھر پوچھ لے، یہ بہن بہت خوش ہوگی۔ پر بی بی جی، وہ آج تک نہیں آیا، پتا نہیں زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ شاہ پور کے اڈے پر اسلم کو چوان مل گیا۔ مجھے بس سے اترتے دیکھ کر میری طرف دوڑا۔ ہم بچپن میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔

''او بھرجائی! وہ چیخا۔ شکر ہے تم لوگ آ گئے۔ ہم تو آس ہی چھوڑ چکے تھے۔ حوالدار جی کہاں ہیں؟

''جب میں نے اسے بتایا کہ وہ شہید ہو چکے ہیں تو وہ لاری اڈے پر ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پہنچ گئی گلنازی کو لے کر میں جھاوریاں . . . '' ماسی جیراں نے کہا اور چونکی۔ ''وقت کیا ہوا ہے؟''

''ساڑھے نو،'' عصمت نے کمرے میں پیچھے کی جانب میز پر رکھے ٹائم پیس کو دیکھا۔

''لو بی بی جی!'' ماسی جیراں نے کہا،'' میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی . . . '' ماسی

میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی، مجھے غور سے دیکھا۔

''ہو گئی تسلی؟'' ماسی نے کہا، ''بیٹی ہے میری، کہیں سے اٹھا کر نہیں لائی ہوں۔ بہت پیاری ہے مجھے۔۔۔ اور تُو ہے تو میری گلنازی جتنا، پر۔۔۔ تیری نظریں بہت ڈونگھی (گہری) ہیں۔''

بھابھی اور عصمت مسکرا دیں۔ باجی زیبا نے جیسے ماسی کی بات پر توجہ ہی نہ دی۔ ماسی برآمدے کی چق اٹھا کر چلی گئی۔

''بہت رپھڑ (جھگڑا) ہو گیا تھا بی بی جی،'' رقیہ نے کہا، ''سارے خاندان والے آپا کے پیچھے پڑ گئے کہ گلنازی کون ہے۔ پھر آپا کو سچ بتانا ہی پڑا۔ آپا نے سب سے قرآن پر ہاتھ رکھوایا کہ گلنازی کو کبھی نہیں بتائیں گے کہ وہ کون ہے۔ پھر نام کا رولا (شور) پڑ گیا۔ سب کہتے تھے کہ نام بدلو، پر آپا اڑ گئی کہ جو نام اس کی سہیلی نے رکھا تھا، وہی رہے گا۔ پہلے سب نازو کہنے لگے، پھر گلنازو اور پھر گلنازی نام پکا ہو گیا۔ آپا جس گھر میں رہتی ہے، حوالدار جی کا تھا۔ وہ تو گاؤں میں حویلی بنانا چاہتے تھے، پر وہ تو کشمیر کی برفوں ہی میں دفن ہو گئے۔ آپا نے جب گھر کے باہر تندور لگایا تو خاندان والے جھگڑ پڑے۔ سب کہتے تھے کہ ہم راٹھ[14] ہیں، ماچھی[15] نہیں۔ آپا نے کہا، میں اتنی بے غیرت نہیں کہ ساری زندگی بھائی کے گھر بیٹھی روٹیاں کھاتی رہوں۔ مجھے اس بچی کو بھی پالنا ہے۔ تندور لگا کر بھی میں راٹھ ہی رہوں گی، کوئی کام چھوٹا نہیں ہوتا، اور ماچھی بھی انسان ہوتے ہیں۔ اس پر بھائی دلاور حسین نے اعلان کیا کہ وہ گلنازی کی شادی اپنے بیٹے محمد اکبر خان سے کرے گا۔ دونوں کی بچپن ہی میں منگنی ہو چکی ہے۔ اکبر ابھی فوج میں نائیک ہے، دسویں پاس ہے۔ سنا ہے اسے کسی فوجی سکول میں بھیج رہے ہیں۔ پاس ہو گیا تو لفٹینی مل جائے گی۔ گلنازی ہمارے خاندان کا حصہ بن چکی ہے۔ سارا گاؤں اسے آپا کی سگی بیٹی ہی سمجھتا ہے۔۔۔ بہت پیاری لڑکی ہے۔۔۔ بچی کی طرح بھولی بھالی۔''

رقیہ کے متعلق تو بھابھی ہمیں بتا ہی چکی تھیں کہ اس کا شوہر رفیق حسین بھی فوج میں لانس نائیک تھا۔ ایک روز ایک میجر کے ساتھ جیپ پر ناران سے جھیل سیف الملوک جا رہا تھا کہ ایک ڈھلوان پر جیپ کا ٹائر پھٹ گیا۔ جیپ کئی سو فٹ نیچے دریائے کنہار میں جا گری۔ میجر، ڈرائیور اور

14۔ راٹھ: راجپوتوں کی ایک گوت۔

15۔ ماچھی: نانبائی۔ تنوروں پر روٹیاں لگانے والے۔

لانس نائیک رفیق حسین موقعے پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ بُوبا اس وقت صرف دو ماہ کا تھا۔

''دونوں بہنوں کی قسمت بھی عجیب ہے،'' بھابھی نے کہا،'' دونوں ہی جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔''

7

دوپہر کے کھانے کے بعد میں میر صاحب کی ڈسپنسری جانے کے لیے تیار ہوا۔ کاپی پنسل ہاتھ میں تھی۔ نہ جانے کیوں، مجھے بچپن ہی سے انگریزی زبان سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ایک وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ پانچویں جماعت تک سکولوں میں انگریزی پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی۔ پھر گھر میں کوئی انگریزی بولتا بھی نہیں تھا۔ والد صاحب نے اگرچہ زندگی بھر امریکیوں اور انگریزوں کے ساتھ کام کیا تھا، لیکن ان کے دوستوں میں زیادہ جرمن شامل تھے۔ وہ بھی بہت کم انگریزی بولتے تھے۔ ہمارے گھر میں تو انگریزی کے لفظ 'کپ' کو بھی 'کوپ' کہا جاتا تھا۔ نہ جانے یہ جرمن لفظ ہے کہ فرانسیسی، مجھے معلوم نہیں۔

میں کمرے سے نکلا۔ رقیہ کسی بات پر بُوبے کو ڈانٹ رہی تھی۔ میری نظر پھر اس کے سر پر لٹکے بالوں کے گچھے پر ٹھہر گئی۔ بُوبا رو رہا تھا، کسی بات پر ضد کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر بالوں کے گچھے کو دیکھتا رہا، پھر باہر نکل گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' بالوں کا گچھا میرے تصور میں، میرے سامنے لٹک رہا تھا۔'' کس سے پوچھوں... رقیہ سے؟ نہیں، ابھی تو مجھے آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے ہیں، نہ جانے بالوں کے گچھے میں کیا راز سربستہ ہے۔ رقیہ بتائے یا نہ بتائے۔ اگر اس نے بتانے سے انکار کر دیا تو مجھے کبھی یہ بھید معلوم نہیں ہو سکے گا۔ مجھے کچھ دن خاموش ہی رہنا پڑے گا۔''

جون کی تپتی دوپہر میں شعاعیں ہر سمت کچھ زیادہ ہی چمکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہر سمت حدت آمیز روشنی سی پھیلی ہوئی تھی جس میں ایک سونا پن بھی تھا۔ یہ سونا پن مجھے اکثر اداس کر دیا کرتا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے مجھے بشیر نعل بند کی دکان سے ٹھک ٹھک، ٹھم ٹھک کی آوازیں آئیں۔ گداؤ نے بتایا تھا کہ بشیر لوہار نہیں ہے، کسی مجبوری کے تحت نعل بندی کرتا ہے۔ دکان کے باہر دھوپ میں ایک گھوڑا

کھڑا دم دائیں بائیں جھلا رہا تھا۔ جھاوریاں میں صرف تین مہاجر آباد ہوے تھے — ایک میر صاحب، ایک بشیر اور ایک اس کا پڑوسی دکاندار اسلم سائیکلوں والا۔ بشیر نعل بند بہت ہی خوش مزاج تھا۔ نعل بناتے ہوے اکثر گانے لگتا تھا — اس وقت بھی گا رہا تھا۔

''بھائی لوہاری بھئی، کلّی سواری بھئی، مال میکلوڈ جی، بیڈنگ روڈ جی...''[16]

پنجابی فلمی گانے کو وہ اپنے ہی انداز میں گا رہا تھا۔ وہ لاہور کی بیڈن روڈ کو بیڈنگ روڈ کہہ رہا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ گداؤ نے یہ بھی بتایا تھا کہ جتنا خوش مزاج بشیر نعل بند ہے، اتنا ہی مردم بیزار، سڑیل اور جھگڑالو اس کا پڑوسی اسلم سائیکلوں والا ہے۔ دونوں ہی مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

میدان نما احاطے سے گزر کر میں بازار جانے والی گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ مجھے گالی سنائی دی۔ دو سبزی فروش آپس میں لڑ رہے تھے۔

''حرامی کو لاکھ بار کہہ چکا ہوں کہ صبح ملیاروں کے آنے کے بعد جو قیمت طے ہو جائے، اسی پر سبزی بیچا کر!'' ایک موٹے اور چھوٹے قد کے سبزی فروش نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں چیخنے کا سا انداز تھا۔ ''پر نہیں، ہر روز گھپلا، ہر روز حرامزدگی — یہ غلط بات ہے...''

چند لوگ، جو شکل و صورت سے دکاندار ہی لگتے تھے، ارد گرد کھڑے جھگڑا ختم کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میری سبزی ہے!'' ایک دبلے پتلے دکاندار نے اپنی دکان کی سمت ہاتھ جھٹکا۔ ''میں جس بھاؤ بھی بیچوں، یہ ماما لگتا ہے؟''

موٹا دکاندار غصے سے آگے بڑھا۔ ''میں اپنی سبزی کوڑے میں پھینک دوں؟'' وہ چیخا۔ ''صبح کریلوں کی قیمت چھ آنے پر مقرر ہوئی تھی، یہ پانچ آنے کیوں بیچ رہا ہے؟''

وہ دبلے دکاندار کی سمت یوں بڑھا جیسے ہاتھاپائی کرنے لگا ہو۔ بازار میں آئے ہوے ایک بوڑھے دیہاتی نے دونوں کے درمیان میں آ کر بازو پھیلائے۔

16۔ فلمی گانے میں بھاٹی، لوہاری، مال، میکلوڈ روڈ اور بیڈن روڈ کے علاوہ لاہور کے بہت سے علاقوں کا ذکر آتا ہے اور اسے ایک کوچوان پر فلمایا گیا ہے۔

''نہیں بیچے گا!'' بوڑھے نے کہا۔ ''نہیں بیچے گا۔ ختم کرو جھگڑا، کہہ دیا نہیں بیچے گا۔''

''او چھوڑو بزرگو!'' ایک ادھیڑ عمر کے دکاندار نے کہا۔ ''یہ تو، ان کا روز کا کُت خانہ[17] ہے۔۔۔ شام کو پھر اکٹھے بیٹھے چلم پی رہے ہوں گے۔''

سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں ان کے قریب سے گزرا۔ دیہاتی زندگی کے یہ مناظر میرے لیے نئے نہیں تھے۔ میں بار بار بوبے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میرے تصور میں بار بار بالوں کا گچھا لہرا رہا تھا۔ پھر میرے تصور میں بشیر نعل بند آ ٹھہرا۔

''وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟ کس شہر یا گاؤں کا۔۔۔ کن حالات میں یہاں آیا ہوگا، اس کے خاندان والے کہاں ہیں؟''

میر صاحب کی ڈسپنسری آ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے مجھے اپنی میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ڈسپنسری میں ایک مریض موجود تھا۔

''آپ فکر نہ کریں،'' میر صاحب نے کہا، ''آپ کی گردن کے پٹھے میں دباؤ سے سوجن آ گئی ہے۔ وزن کم اٹھایا کریں۔''

''ڈاکٹر صاحب،'' مریض نے کہا، ''پہلے بھی تو ٹال سے ایک من لکڑیاں اٹھا کر گھروں میں لے جا تا رہا ہوں۔ چھ چھ پھیرے لگ جاتے ہیں۔ آج تو چوتھے پھیرے پر ہی گردن مڑ گئی ہے۔ کوئی طاقت کی دوائی دیں۔''

''ایک من لکڑیاں؟'' میر صاحب نے چونک کر کہا، ''اپنی گردن تڑوانی ہے آپ نے؟۔۔۔ ایک من، چھ چھ پھیرے۔۔۔ ارے نہیں۔۔۔ آپ اتنا وزن ہرگز نہ اٹھائیں، ہم نے گولیاں باندھ دی ہیں اس سفوف والی پڑیا میں۔ صبح شام لے لیں اور سفوف رات سونے سے پہلے پانی کے ساتھ پھانک لیں۔ سرسوں کا تیل گرم کر کے مالش بھی کر لیں۔ کم از کم تین دن آرام کریں۔''

''کیا کروں ڈاکٹر صاحب،'' مریض نے کہا، ''مزدوری کیے بغیر روٹی نہیں ملتی۔''

''بھیا، صحت ہوگی تو مزدوری بھی ہوگی،'' میر صاحب نے کہا۔ ''صحت ہی نہ رہی تو۔۔۔''

17۔ کُت خانہ: ڈاگ یارڈ۔ پنجابی میں جب یہ دو لفظ کسی جملے میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کا مطلب فضول بھونکنا ہوتا ہے۔

دیہاتی اٹھا، اس نے ایک روپیہ میر صاحب کو دیا۔ میر صاحب نے اٹھنی اسے واپس کردی۔
''آپ مزدوری کرتے ہیں،'' میر صاحب نے کہا،''فیس کے آٹھ آنے تو ہم نہیں لیں گے۔''

مریض کے جانے کے بعد میر صاحب نے پہلے ہی روز مجھے انگلش زبان کا فعل حال اتنی اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں خود حیران رہ گیا، کہ میں اسے سکول میں تین ماہ میں بھی نہ سیکھ پایا تھا۔
پھر میر صاحب نے مجھ سے میری دلچسپیوں سے متعلق پوچھا۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ مجھے اردو ادب، خصوصاً شاعری، اور موسیقی میں بہت دلچسپی ہے تو انھوں نے بہت سے سوال پوچھے۔ زیادہ تر سوال اردو کے کلاسیکی شاعروں سے متعلق تھے۔
شام کو میں اور بھائی ہسپتال کے صحن میں بیٹھے تھے کہ میر صاحب آ گئے۔ کچھ دیر بعد گداؤ بھی آ گیا۔

میں اس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جہاں سے تنور صاف نظر آ رہا تھا... ویسے بھی کون سا دور تھا۔ تنور پر اونچی آواز میں کہی ہوئی ہر بات ہسپتال کے صحن میں سنائی دیتی تھی۔ تنور پر ماسی سر پر دوپٹہ باندھے روٹیاں لگا رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھوں والی بھی تھی۔ اس نے آنکھوں میں گہرا سرمہ ڈالا ہوا تھا۔ ماسی کے دائیں جانب جہاں گلنازی بیٹھتی تھی وہاں نوراں بیٹھی تھی۔ نوراں پلکیں جھپکے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی۔ گلنازی نہ جانے کہاں تھی۔ نوراں کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا... میں گھبرا سا گیا اور میں نے تنور کی سمت آنے والی سڑک کو دیکھنا شروع کر دیا جس کا کچھ حصہ ہسپتال کے صحن سے نظر آتا تھا۔ اچانک میرے بدن نے پیچھے جھٹکا سا کھایا۔ سڑک پر ایک لڑکی نظر آئی... میں نے کبھی اس سے زیادہ بدصورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔
چھوٹے قد کی، موٹی، الٹے توے جیسا رنگ، تنگ پیشانی، تیل سے چپڑے ہوئے بال، موٹی موٹی بڑی بڑی گول گول آنکھیں، چہرہ موٹا بھرا بھرا سا، موٹی دبی ہوئی ناک، ہونٹ موٹے اور چرے ہوئے، گردن موٹی اور چھوٹی، کندھے چوڑے، بڑے بڑے پستان، پھیلا ہوا پیٹ، کمر تھی ہی نہیں، نچلا دھڑ بھی اوپر والے دھڑ کی طرح موٹا اور بھرا بھرا، اس نے موٹے موٹے ہاتھوں سے سر پر رکھی پرات پکڑی ہوئی تھی۔

''دتے تیلی کی بیٹی ہے،'' گداؤ کی آواز پر میں چونکا۔ بھائی اور میر صاحب نے بھی تنور کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

''ہمارے گاؤں کی سب سے کوجی (بدصورت) لڑکی ۔ ۔ ۔ ہمارے گاؤں کی بَج [18] ہے۔ لڑکیاں اسے کٹی [19] کہتی ہیں۔''

جون کی شام کا تاثر حدت کا احساس دلا رہا تھا، لیکن خلافِ معمول ہوا کے جھونکوں میں تیزی تھی۔ عموماً جون میں ہوا کے جھونکے مدھم ہی رہتے ہیں اور جولائی کے آخری دنوں میں ان میں تیزی نمودار ہوتی ہے۔ جون کی اس ہوا سے، جو شمالاً جنوباً چل رہی تھی، سب کے کپڑے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''بھیا، یہ تمھارے چھوٹے بھائی ۔ ۔ ۔ ''میر صاحب نے بھائی کی طرف دیکھا۔''یہ تو بڑے باذوق ہیں۔''

کیا دیکھ لیا ہے اس نکمے میں؟'' بھائی نے کہا۔

''نکما کہہ رہے ہیں آپ!'' میر صاحب نے کہا۔''انھوں نے تو آج ہمیں مرزا غالب کے وہ اشعار سنائے ہیں جو یاد ہی نہیں رہا کرتے۔ اس عمر میں انھوں نے غالب کے اتنے اشعار کیسے یاد کر لیے ہیں اور وہ بھی درست — بھیا، ہمیں تو حیرت ہوئی ہے۔''

بھائی نے غصے سے میری سمت دیکھا۔''تم انگلش کے مینرز سیکھنے گئے تھے کہ شعروشاعری کرنے؟'' انھوں نے غصے سے کہا۔

میر صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ تنور پر شور مچا۔ ہماری نگاہیں بے اختیار تنور کی سمت گئیں۔ موٹی بھدی لڑکی زور زور سے بول رہی تھی، وہ اڑنگ [20] لگا کر بول رہی تھی۔

''ماسی، پہلے میریاں روٹیاں لا، جلدی اے ۔ ۔ ۔ ''(ماسی پہلے میری روٹیاں لگا، جلدی

18۔ بَج کا پنجابی زبان میں مطلب بدہیئت ہے لیکن جملے میں اسے کجی کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اکثر کسی کمہار سے گھڑا ٹیڑھا بن جائے تو کہتے ہیں:''گھڑے نوں بج لگ گئی اے۔''(گھڑے میں کجی آ گئی ہے۔)

19۔ کٹی۔ بھینس کی مادہ بچی۔

20۔ اڑنگ لگا کر بولنا: بھینس کی طرح بولنا۔

ہے۔)

''تو نے ٹھیکہ لیا ہوا ہے تنور کا شریفاں؟'' نوراں نے غصے سے موٹی کالی بھدی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اچانک ماسی جیراں کے گھر کی پانچ فٹ اونچی دیوار پر دو ہاتھ نظر آئے، پھر اچک کر گلنازی دیوار پر چڑھی اور کھڑی ہوگئی۔ اس نے سرخ پھولوں والا کرتا اور کالا لاچا باندھا ہوا تھا جو ہوا کے تیز جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کی زلفیں بھی اڑ رہی تھیں۔ چھوٹی بچی کی طرح دیوار پر کھڑی وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔

''ماسی، تو پہلے میری روٹیاں لگا!'' موٹی بھدی شریفاں پھر اڑنگ لگا کر بولی۔ سرگودھا کی مقامی زبان اور لہجے میں اڑینگتی ہوئی آواز خاصی اونچی تھی۔ گلنازی کے ہاتھ میں ایک کڑاہی سی تھی، وہ تنور کے چھپر پر کڑاہی سے بھوسا نکال کر بکھیرنے لگی — شاید چھپر ٹوٹ گیا ہوگا . . . بھوسا گارے میں ملا ہوا تھا۔

''نہیں ماسی، بالکل نہیں!'' نوراں بولی۔ ''اس نے کیا روز روز کا تماشا بنا رکھا ہے۔ اسے ہی جلدی رہتی ہے۔''

''تو نے ٹھیکہ لے رکھا ہے تنور کا؟'' موٹی بدھی لڑکی پھر اڑینگی۔ ''ماسی میری روٹیاں لگا، میرے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''تیرے لیے سنڈے (بھینسے) کا رشتہ لائے ہیں!'' نوراں نے چیخ کر کہا۔ تنور پر قہقہے بلند ہوئے۔

''کیا کہا ہے؟'' شریفاں اچھلی۔ نوراں بھی اٹھی۔ ماسی نے تنور سے روٹیاں نکالنے والی لوہے کی سلاخ ہوا میں لہرائی۔

''بس!'' ماسی زور سے بولی۔ ''خبردار جو لڑائی کی — دونوں کو تنور سے نکال دوں گی۔ خبردار جو کوئی بولی۔''

''میں کب بولتی ہوں ماسی؟'' نوراں نے چیخ کر کہا۔ ''یہ شریفاں کٹی تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔'' لڑکیوں نے اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ شریفاں نے اپنا موٹا پاؤں زور سے زمین پر مارا۔

''تو کُتی، تیری ماں کُتی، تیری بہن کُتی... تو بُولن...''[21]

گلنازی چھپر کی جانب سے دیوار پر آ گئی۔اس کے کپڑے ہوا کے جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہے تھے،زلفیں اڑ رہی تھیں۔

''چپ کر شریفاں!'' گلنازی نے اپنی بہت ہی خوبصورت آواز میں، بلند لہجے میں کہا۔

شریفاں نے سر اٹھا کر اوپر گلنازی کو دیکھا۔نہ جانے اس نے گلنازی سے کیا کہا،نوراں نے اس کے تیل چپڑے بال پکڑ لیے،اسے دائیں ہاتھ سے جھٹکا دے کر کھینچا۔شریفاں نے نوراں کو دھکا دیا۔نوراں نے بال نہ چھوڑے اور شریفاں کے ساتھ آٹے والی پراتوں کے قریب گری۔اسی لمحے گلنازی نے دیوار سے چھلانگ لگا دی۔ہوا تیز تھی۔

ہوا کے تیز جھونکے سے گلنازی کا لاچا اوپر اٹھا اور کھل گیا۔

تنگ چھینٹ کے سرخ پھولوں والے کرتے نے گلنازی کی پتلی کمر کو جکڑ رکھا تھا۔کمر پر پھنسے کرتے نے اسے مکمل طور پر عریاں ہونے سے بچا لیا،لیکن وہ گھٹنوں سے اوپر تک ننگی ہو گئی۔لاچا چکر کھاتا ہوا گلنازی کے گھر کے بیرونی دروازے کے پاس گیا۔تنور پر بیٹھی لڑکیوں نے شور مچایا۔نوراں اور شریفاں بھی گلنازی کی طرف دیکھنے لگیں،پھر تنور پر زور زور سے قہقہے بلند ہوئے۔بھائی، میر صاحب اور گداؤ بھی ہنس رہے تھے۔ماسی جیراں غصے میں اٹھی،اس نے تنور سے روٹیاں نکالنے والی آہنی سلاخ پکڑی ہوئی تھی۔وہ تیزی سے گلنازی کی طرف بڑھی،آٹے کی پرات سے ٹکرائی، سنبھلی اور گلنازی کو گالیاں دیتے ہوئے تقریباً دوڑی۔گلنازی نے تیزی سے اٹھ کر دروازے کے قریب گرے لاچے کو بھوسا ملے گارے والے ہاتھ سے پکڑا،بیرونی دروازہ کھولا اور تیزی سے پٹ بند کر دیے۔شاید اندر سے کنڈی لگا دی تھی،کیونکہ ماسی زور زور سے دروازے پر ہاتھ مار رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی۔تنور پر شور مچا ہوا تھا۔ماسی کچھ دیر دروازے کے سامنے کھڑی رہی،پھر واپس تنور پر آئی۔بھائی،میر صاحب اور گداؤ ہنس رہے تھے۔میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔میں نے پہلی بار کسی لڑکی کو رانوں تک ننگی دیکھا تھا۔میرے چہرے پر تپش سی تھی،یقیناً سرخ ہو گیا ہوگا۔میر صاحب نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

21۔ بُولن: بُولی (بل ٹیریر) کی مادہ کتیا۔

''کم بخت کہیں کی!''انھوں نے ہنستے ہوے کہا اور بھائی نے قہقہہ لگایا۔

تنور پر ابھی تک شور مچا ہوا تھا۔ ماسی کے چہرے پر رنج اور غصہ دونوں نظر آ رہے تھے۔

''رب جانے...''ماسی نے روہانسی آواز میں کہا،''مرن جوگی[22] کب بڑی ہوگی۔''

لڑکیاں آہستہ آہستہ خاموش ہوگئیں۔ میرے چہرے پر تپش سی موجود تھی۔

''کیا لڑکیوں کی ٹانگیں اس قدر خوبصورت ہوتی ہیں...''اس خیال کے ساتھ ہی میں شرما سا گیا۔

8

گھر واپس آیا تو صحن میں داخل ہوتے ہی مجھے رقیہ بُوبے کو کھانا کھلاتی نظر آئی۔ ہرنوالے پر بُوبے کے مُنڈے ہوے سر کے پیچھے بالوں کا گچھا دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ قریب ہی گداؤ کل صبح کے لیے لکڑیاں چیر رہا تھا۔

''رقیہ...''مجھ سے رہا نہ گیا،''یہ... یہ...''

''جی نکے صاب،''(چھوٹے صاحب) رقیہ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''یہ بُوبے کے سر کے پیچھے بالوں کا گچھا کیوں ہے؟''میں نے پوچھ ہی لیا۔

''یہ میگھا پیر جی کی رَکھ (حفاظت) ہے،''رقیہ نے جواب دیا۔

''وہ کیا ہوتی ہے؟''میں نے کہا،''بُوبے کو کس سے خطرہ ہے؟''میں نے پوچھا اور رقیہ خاموش ہوگئی۔

گداؤ کی کلھاڑی ہوا ہی میں رک گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا، یوں لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو، پھر اس نے رقیہ اور بُوبے کی طرف دیکھا اور پھر سامنے پڑی مُڈھی[23] پر، جس کے اوپر موٹی سی لکڑی پڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کلھاڑی کو سر کے اوپر لے جا کر موٹی گول لکڑی پر نظریں جمائیں،

22۔ پنجابی زبان میں مرن جوگی کا مفہوم اچھا نہیں ہے، یعنی تجھے موت آئے، لیکن دیہات میں مائیں جب بیٹی کو مرن جوگی اور بیٹے کو مرن جوگا کہتی ہیں تو اس میں ان کا لاڈ اور پیار شامل ہوتا ہے۔

23۔ مُڈھی: درخت کے تنے سے کٹے ہوے دس بارہ انچ کے ٹکڑے کو کہتے ہیں جس پر لکڑ ہارے لکڑیاں چیرتے ہیں۔

بار بار اسے دیکھا اور پھر کھٹاک سے کلھاڑی سیدھی لکڑی پر گری اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ میں خاموشی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں بھابھی اور بہنیں ہاتھوں میں کھجور کے پتوں کے بنے ہوئے پنکھے لیے بیٹھی تھیں۔

رات کو چھت پر لیٹے ہوئے میں ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھ رہا تھا۔

سکول میں پڑھائے جانے والے مضامین میں میرا سب سے پسندیدہ مضمون اردو زبان و ادب ہی تھا۔ پھر مجھے تاریخ، جغرافیہ اور ڈرائنگ بھی پسند تھی۔ دینیات، انگلش اور ریاضی میں مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ریاضی میں حساب اور الجبرا میرے سر کے اوپر سے گزر جانے والے موضوع تھے۔ بس ایک جیومیٹری تھی جو مجھے ریاضی کے پیپر میں پاس کرادیا کرتی تھی۔

ستاروں کو دیکھتے ہوئے مجھے آسمان پر جیومیٹری کی کئی اشکال نظر آئیں — ستارے چوکور، مستطیل، تکون بناتے نظر آئے۔ میں ایک ستارے پر نظر جما کر ایسے ستاروں کو تلاش کرنے لگتا تھا جن کی سمت لکیریں کھنچ جانے پر تیسرے، چوتھے، پانچویں ستارے سے اشکال بنتی نظر آئیں۔ پھر میں آنکھیں بند کر کے تصوراتی اشکال بنانے لگتا تھا اور دوبارہ آسمان کی طرف دیکھنے پر مجھے کئی پانچ، چھ اور سات پہلوؤں والی اشکال کو تلاش کرنا آسان محسوس ہوتا تھا۔ چہرے پر کھیتوں کی طرف سے آنے والی ہوا کی خنکی کا احساس خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ پھر میری آنکھیں نیم وا ہوگئیں۔

مجھے اوپر فضا میں غبار کا احساس ہوا، دھند نما غبار کا۔ . . اس غبار میں مجھے دو پاؤں نظر آئے، سفید رنگ کے نازک سے دو پاؤں، پھر پنڈلیاں، گھٹنے اور پھر گھٹنوں سے کچھ اوپر تک عریاں ٹانگیں نظر آئیں۔ . . میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ کھولیں تو ان ہی ٹانگوں پر روشنی کی شعاعیں نظر آئیں جنھوں نے ٹانگوں کو کپڑے کی طرح ڈھانپ دیا تھا۔ میری آنکھیں لمحے بھر کے لیے بند ہوئیں، دوبارہ کھلیں تو کچھ بھی نہ تھا، آسمان پر ستارے بے شمار ہے تھے۔

9

اگلی صبح گدا وکپڑے کا تھیلا لیے باہر جانے لگا تو میں بھی ساتھ ہولیا۔

بازار جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں،'' گداؤ نے کہا،''لاری اڈے پر ملیاریاں آ گئی ہوں گی۔ان کے پاس سبزی تازہ ہوتی ہے، لینے جارہا ہوں۔''

''میں بھی چلتا ہوں،'' میں نے کہا۔ابھی ہم تنور کے پاس بھی نہیں پہنچے تھے کہ میں نے وہ بات پوچھ ہی لی جس نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔

''گداؤ،'' میں نے کہا،''یہ رَکھ کیا ہوتی ہے؟'' گداؤ نے چونک کر میری طرف دیکھا—یوں لگا جیسے اسے پہلے ہی سے میرے سوال کا انتظار تھا۔

''وہ... چھوٹے صاب جی، اُدھر...'' گداؤ نے پیچھے شمال کی سمت اشارہ کیا،''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ دس پندرہ میل دور دریا ہے۔دریا کے کنارے کو میگھا پتن کہتے ہیں۔جھاوریاں سے میگھا پتن تک بڑا خطرناک گھنا جنگل ہے... وہاں درندے بھی ہیں اور قدم قدم پر ناگ بھی۔ جھاوریاں سے میگھا پتن جانے والی کچی سڑک پر تو سردیوں میں جگہ جگہ الٹا چلنے والے جلیبی سانپ نظر آتے ہیں۔تانگہ صبح نو بجے جاتا ہے اور سورج ڈوبنے سے پہلے واپس آ جاتا ہے۔رات کو جنگل سے گزرنے والا کبھی زندہ واپس نہیں آتا۔'' گداؤ رکا۔تنور آ گیا تھا،لیکن ابھی تنور پر الٹی کڑاہی دھری ہوئی تھی — صبح کے شاید ساڑھے آٹھ ہوے ہوں گے۔تنور کے سامنے ہسپتال کے صحن میں چند دیہاتی بیمار جانوروں کو لائے ہوے تھے۔گداؤ اور میں لاری اڈے کی سمت جا رہے تھے۔''بہت خطرناک جنگل ہے،'' گداؤ نے بات جاری رکھی،''وہاں درندے اور ناگ ہی نہیں، بدروحیں اڑتی پھرتی ہیں اور کالی بلا بھی رہتی ہے جو بچوں کا خون پیتی ہے۔'' گداؤ کی آواز میں دھیما سا خوف ابھرا — یہ خوف میں پہلے بھی کئی دیہاتیوں کی آوازوں میں محسوس کر چکا ہوں جو جنوں بھوتوں کی باتیں کرتے ہیں۔''جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے،'' گداؤ نے کہا،''تو آنول کٹنے سے پہلے بدروحیں اس پر چکر لگانا شروع کر دیتی ہیں۔''

''کون کہتا ہے؟'' میں نے فوراً کہا۔

''یہی سنا ہے صاب جی،'' گداؤ نے کہا،''بچپن سے یہی سنتے آ رہے ہیں۔بچے پر بدروحیں چکر لگاتی ہیں، کسی پر ایک، کسی پر دو، کسی پر تین، کسی پر چار... چار چکر بدروحوں کے ہوتے ہیں اور پانچواں چکر کالی بلا کا ہوتا ہے، جو کسی کسی بچے پر ہی کالی بلا لگاتی ہے۔'' گداؤ نے اِدھر اُدھر یوں دیکھا

جیسے بدروحیں اور کالی بلا اس کی باتیں سن رہی ہوں۔ ''بچہ اگر کم قیمتی ہو... عام سا ہو تو... اس پر ایک بدروح چکر لگاتی ہے۔ اسی طرح جو بہت ہی قیمتی ہو، اس پر کالی بلا خود پانچواں چکر لگاتی ہے۔ ایک ہی چکر لگائے تو اس کی زندگی کو ایک سال کے لیے خطرہ ہوتا ہے، دو چکروں پر دو سال، تین پر تین سال... اور... '' لاری اڈہ آ گیا۔ گداؤ نے شاہ پور جانے والی سڑک کی طرف دیکھا۔

''دیر کردی ملیاریوں نے...'' پھر میری طرف دیکھا۔ ''کبھی کبھی دیر سے آتی ہیں، پر سبزی تازہ ہوتی ہے۔''

''تم بتا رہے تھے...'' میں اور گداؤ کھڑے ہو گئے۔

''ہاں... وہ...'' گداؤ نے کہا، ''جس بچے پر چار بدروحیں چار چکر لگائیں، اس بچے کی جان کو چار سال خطرہ رہتا ہے، اور جس پر کالی بلا پانچواں چکر لگائے اس کی جان کو بہت زیادہ خطرہ رہتا ہے۔'' گداؤ رکا، پھر اس نے سڑک کی سمت دیکھا، پھر شمال کی سمت ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''اُدھر میگھا پتن میں، دریا کے کنارے، پیر نور شریف کا دربار ہے۔ سب انھیں میگھا پیر کہتے ہیں۔ بدروحیں اور کالی بلا ان سے بہت ڈرتی ہے۔ انھوں نے بہت چلّے کاٹے ہوئے ہیں۔ انھیں کشف بھی ہوتا ہے۔ کشف ہی سے انھیں پتا چل جاتا ہے کہ کس بچے پر کتنی بدروحوں کا سایہ ہے اور کہیں اس پر کالی بلا نے تو چکر نہیں لگایا۔'' گداؤ نے پھر شاہ پور جانے والی سڑک کی طرف دیکھا۔

''آج دیر کردی ملیاریوں نے!'' گداؤ نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ ''رقیہ کو سبزی دے کر میں نے ڈیوٹی پر بھی جانا ہے۔''

''پھر کیا ہوتا ہے گداؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا ہوتا ہے؟'' گداؤ نے بے خیالی میں میرا سوال دہرایا، پھر چونکا۔ ''اچھا وہ... میگھا پیر جی کو پتا چل جاتا ہے کہ کس گاؤں میں لڑکا پیدا ہوا ہے، کس گاؤں میں لڑکی۔ انھیں تو یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ کس گاؤں میں کتنے بچے پیدا ہوئے ہیں، کتنے ہونے والے ہیں... لڑکیوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا، لیکن لڑکے کی پیدائش پر پیر نور شریف کے ملنگ میگھا پتن سے آتے ہیں۔ بچے کی ماں کو بتاتے ہیں کہ اس کے بیٹے پر کتنی بدروحوں کا خطرہ ہے اور کیا کالا سایہ ڈالنے والی کالی بلا سے تو خطرہ نہیں ہے۔ وہ بچے کی ماں سے کہتے ہیں کہ انھیں میگھا پیر نے بھیجا ہے اور یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ بچے کی

جان کو کتنے برسوں تک خطرہ ہے... اور پھر... '' گداؤ کہتے کہتے رک گیا۔

''کدھر چڑھائی ہے گدا حسین؟'' ایک دیہاتی نے اونچی آواز میں کہا۔''کہاں لے جا رہے ہو ڈاکٹر کے بھائی کو؟''

''کہیں نہیں لے جا رہا ہوں،'' گداؤ نے کہا۔''ملیاریوں کا انتظار ہے۔ چھوٹے صاب کو میں ساتھ لے آیا ہوں — اپنی پسند کی سبزی خریدنے کے لیے۔''

دیہاتیوں نے غور سے میری طرف دیکھا، ان کے چہروں پر مسکراہٹ آئی۔

''ملیاریاں کون سی نئی سبزی لائیں گی،'' ایک نے کہا''وہی بھنڈیاں، کریلے، کدو، ٹینڈے، کھیرے اور تراں۔''(ککڑیاں)

''اس گرمی کے موسم میں... '' گداؤ کا لہجہ طنزیہ تھا۔''کیا تیرے لیے گوبھی، مٹر، گاجریں اور مولیاں لے کر آئیں گی، کجلی دنبے؟''[24]

وہ دونوں ہنستے ہوئے چلے گئے۔

''ملنگ اور کیا کہتے ہیں بچے کی ماں کو؟'' میں نے پوچھا۔ گداؤ نے میری طرف دیکھا۔

''کہنا کیا ہے صاب... '' اس نے کہا،'' جتنے سال بچے کی جان کو خطرہ ہوتا ہے، اتنے سال کے لیے میگھا پیر کی رکھ حفاظت کے لیے رکھوا دیتے ہیں۔ جب بچے کی جھنڈ[25] اترتی ہے تو تالو پر بال چھوڑ دیتے ہیں۔ ان بالوں پر میگھا پیر کا دم کیا ہوا پانی قطرہ قطرہ ٹپکایا جاتا ہے۔ یہ پانی پیر جی کے دربار کے کنویں سے لایا جاتا ہے... '' گداؤ کچھ سوچنے لگا۔''ہاں... '' اس نے یوں کہا، جیسے اسے کوئی بات یاد آئی ہو۔

''اگر بچہ شیعہ ہو تو پانچ قطرے، اگر بچہ سنی ہو تو آٹھ قطرے... جتنے سال کے لیے رکھ رکھی گئی ہو، ماں کو اتنے برس بچے کے سر کے دوسرے بال منڈوانے پڑتے ہیں، بس رکھ ہی بڑھتی رہتی ہے۔ رکھ کی وجہ سے بدروحیں اور کالی بلا بچوں پر حملہ نہیں کرتی۔'' گداؤ نے پھر بے چینی سے شاہ پور

24۔ کجلی دنبہ: دنبے اور چھترے کی ایک قسم جس کی آنکھیں بہت سیاہ اور ناک اٹھی ہوتی ہے۔ کوہان نما ناک والا یہ جانور مولیاں اور گاجریں شوق سے کھاتا ہے۔

25۔ عقیقے پر بچے کے بال مونڈنا۔

جانے والی سڑک کی سمت دیکھنا شروع کر دیا۔

''کیا ہر گاؤں میں عورتیں اپنے بچوں کے سروں پر بالوں کے گچھے رکھواتی ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''جی صاب، اس علاقے میں تو ہر ماں رکھ ہی پر بھروسا کرتی ہے۔''

''جو بڑے بڑے زمیندار ہیں، ٹوانے، میکن، رانے — ان کے بچوں. . .''

''سنا ہے صاب . . .'' گداؤ نے میری بات کاٹ دی،''سنا ہے کہ پیر نور شریف کے کسی بڑے دادے پر دادے نے زمینداروں کی حویلیوں میں بیٹھ کر چلّے کاٹے تھے۔ بدروحیں اور کالی بلا حویلیوں کی طرف نہیں جاتی۔ پیر نور شریف بھی ہر مہینے دو مہینے بعد بڑے زمینداروں کی حویلیوں میں جا کر چالیس چالیس گھنٹوں کا چلہ کاٹتے ہیں۔ حویلیاں بدروحوں سے بھی محفوظ ہیں اور کالی بلا بھی اُدھر کا رخ نہیں کرتی۔'' گداؤ کے چہرے پر کھنچاؤ سا تھا، وہ شاہ پور والی سڑک کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔

''کبھی اتنی دیر نہیں کرتیں ملیاریاں. . .'' گداؤ نے کہا،''پتا نہیں آج کیا ہو گیا ہے۔''

''سال پورے ہو جانے پر کیا ہوتا ہے؟'' گداؤ میرے اس سوال پر کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''ہونا کیا ہے، رکھ کاٹ دی جاتی ہے. . .'' گداؤ نے کہا،''اور پھر رکھ کے بالوں کو تولا جاتا ہے۔ جتنا وزن ہو اس کے مطابق سونا یا چاندی پیر کے دربار میں ہدیے کے طور پر دی جاتی ہے۔''

''سونا یا چاندی؟''میں نے چونک کر کہا۔

''ہاں صاب،'' گداؤ بولا،''پیر نور شریف بچے کے ماں باپ کی حیثیت دیکھ کر ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ ہدیہ سونا ہو گا یا چاندی۔ اگر کوئی بہت غریب ہو تو وہ بالوں کے وزن کے مطابق روپے بھی دے سکتا ہے — روپے خالص چاندی کے تو ہوتے نہیں. . .''

گداؤ نے اپنے دائیں ہاتھ کو آنکھوں پر یوں رکھا جیسے سورج کی کرنوں کو آنکھوں تک آنے سے روک رہا ہو۔

''آ گئیں!'' وہ تقریباً چیخا۔''آ گئیں ملیاریاں!''

میں نے بھی سڑک کی سمت دیکھا۔ دور سڑک کے موڑ پر کچھ عورتیں نظر آئیں جنھوں نے سروں

پر ٹوکرے اٹھار کھے تھے۔ جیسے جیسے وہ نزدیک آتی گئیں، منظر صاف ہوتا گیا۔عورتوں نے مخصوص علاقائی لباس پہن رکھے تھے — کھلے کرتے اور لاچے۔ کرتے چھینٹ کے تھے اور لاچے سفید، نیلے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ ان میں ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی تھیں، جوان بھی اور نوعمر لڑکیاں بھی۔ انھوں نے ہمارے قریب آ کر ٹوکرے زمین پر رکھے۔ چھوٹے سے ہوٹل کا ملازم تقریباً دوڑتا ہوا سبزی فروش عورتوں کی سمت آیا۔ ہوٹل سے تین چار مرد بھی نکلے جو ملیاریوں کے انتظار میں ہوٹل میں بیٹھے شاید چلم پی رہے تھے۔

''واہ!'' گداؤ نے ٹوکروں کے کناروں سے باہر لٹکے ہوئے خوش رنگ، تازہ سبز پتوں کی طرف اشارہ کیا۔''آج تو پالک بھی آئی ہے!'' اس نے خوش ہو کر کہا۔''پالک آئی ہے اور پالک بھی زوردار۔''

گداؤ نے پالک خریدی، کھیرے اور ککڑیاں بھی خریدیں۔ ایک نوعمر لڑکی کے چھوٹے سے ٹوکرے میں ٹماٹر بھرے ہوئے تھے، گداؤ نے ٹماٹر بھی خریدے۔ ملیاریوں نے جتنے پیسے مانگے، گداؤ نے دیے۔ انھوں نے سبزی کے ساتھ مٹھی بھر سبز مرچیں اور دھنیا بھی کپڑے کے تھیلے میں ڈال دیا۔ نوعمر لڑکی ایک دوبار میری سمت دیکھ کر مجھے ہی دیکھنے لگی۔

''میں تو ہمیشہ ان ہی سے سبزی خریدتا ہوں،'' گداؤ نے کہا،''آلو پیاز بازار سے مل جاتے ہیں۔''

''ہاں گداؤ،'' میں نے کہا،''یہ سبزی دیکھ کر تو یوں لگتا ہے، جیسے ابھی ابھی کھیت سے نکالی گئی ہو۔''

''آج تو رقیہ بھی بڑی خوش ہوگی،'' گداؤ نے کہا۔''اسے پالک بہت پسند ہے۔''

ٹماٹروں والی نوعمر لڑکی مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں گھبرا سا گیا۔ بہت سے گاہک آ چکے تھے۔ میں گداؤ کے ساتھ مڑا۔ چند قدم چلنے پر ہی میرا ذہن پھر بوبے کی سمت گیا۔''عقیدتوں، خودغرضیوں اور خوف کو ہتھیار بنا کر...'' میں نے سوچا،''مذہب فروشی کا ایک انداز یہ بھی ہے۔'' مجھ پر بالوں کے گچھے کا سربستہ راز کھل چکا تھا۔

''ہر روز چار پانچ بالوں کے گچھے تو اترتے ہی ہوں گے،'' میں نے کہا،''ان کے وزن کے

مطابق سونا یا چاندی ہدیے کے طور پر پیر نور شریف کو دیے جاتے ہوں گے۔''

گداؤ کا سر جھٹکے سے میری طرف مڑا۔ وہ میری سمت اس انداز میں دیکھ رہا تھا، جیسے بالوں کے گچھے میں میری دلچسپی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''چار پانچ؟'' گداؤ نے کہا، ''صاب جی، یہ علاقہ سارے کا سارا پیر نور شریف کا ہے۔ ہر گاؤں میں اس کے مرید موجود ہیں۔ مرید کھسرے (ہیجڑے) نہیں ہیں۔ بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ روز پیدا ہوتے ہیں۔ دربار میں تو ہر روز درجنوں رَکھیں کٹتی ہیں۔ کئی مائیں تو رکھ کٹوانے کے بعد پھر رکھوا لیتی ہیں جو سر کے دوسرے بالوں سے لمبی نظر آتی ہے اور مر جانے پر غسل سے پہلے کاٹی جاتی ہے۔''

''کیا اسے بھی تولا جاتا ہے؟ وہ تو خاصی وزنی ہو جاتی ہوگی،'' میں نے پوچھا۔ ہم ہسپتال کے سامنے تنور کے قریب پہنچ چکے تھے۔ تنور پر ماسی جیراں من چھٹی کی سوکھی چھڑیاں تنور میں ڈال رہی تھی۔ گلنازی نظر نہ آئی۔

''مجھے معلوم نہیں صاب،'' گداؤ نے کہا۔ ''جو لوک فنکار عرسوں پر گیت اور کافیاں گاتے ہیں، قوالیاں کرتے ہیں، ان کے سروں پر دوسرے بالوں سے بڑھی ہوئی لٹیں نظر آتی ہیں۔''

''گداؤ،'' میں نے کہا، ''پیر کے ملنگ تو ہر گاؤں میں جاتے ہوں گے۔''

''ہاں صاب جی،'' گداؤ نے جواب دیا، ''ہر گاؤں میں جاتے ہیں، ہر گھر کے آگے ہرمل دھونی[26] دیتے ہیں۔''

''انھیں یہ تو پتا چل ہی جاتا ہوتا کہ کس گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے،'' میں نے کہا۔

''ہاں صاب، پتا تو چل جاتا ہی ہوگا،'' گداؤ نے کہا اور پھر چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ''آپ... یہ کیوں پوچھا ہے آپ نے؟''

''وہ پیر کو جا کر سب کچھ بتا دیتے ہوں گے،'' میں نے کہا۔ گداؤ کے چہرے پر کھنچاؤ سا نمودار ہوا۔

''یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا،'' گداؤ نے کہا۔ ''سب یہی کہتے ہیں کہ پیر نور شریف کو کشف

26۔ ہرمل دھونی: انگاروں پر اسپند کے دانے جلا کر دھواں پھیلانا۔

ہوتا ہے کہ کہاں بچی پیدا ہوئی ہے، کہاں بچہ پیدا ہوا ہے اور بچے پر کتنی بدروحوں نے چکر لگایا ہے اور کیا کالی بلا نے تو چکر نہیں لگایا... بوبا قیمتی بچہ ہے صاب — بوبے پر پہلے چار بدروحوں نے اور پھر کالی بلا نے چکر لگایا تھا۔ پانچ سال کے لیے رکھ رکھوائی گئی تھی، اب تو دوڈھائی مہینے ہی رہ گئے ہیں۔''

ہم ہسپتال اور تنور کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ میں نے ماسی جیراں کے گھر کی سمت دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔

''جب بوبے کی رکھ رکھوائی گئی تھی تو کیا بوبے کا باپ زندہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں... فوج میں تھا،'' گداؤ نے کہا۔

''یہ بات تو پیر کو ملنگوں کے ذریعے معلوم ہی ہوگی کہ بوبے کا باپ اس قابل ہے کہ بالوں کا گچھا کتنا ہی لمبا، موٹا اور وزنی ہو جائے، وہ سونا چاندی دے سکتا ہے۔''

گداؤ کی آنکھیں بھنچ سی گئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ چہرے پر کھنچاؤ بڑھ گیا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں صاب؟'' گداؤ کی آواز میں بھی کھنچاؤ نمودار ہو چکا تھا۔ ''کچھ کچھ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں۔''

''جو سمجھ رہے ہو گداؤ، وہی سچ ہے،'' میں نے کہا۔ ''لالچ آدمیوں سے بہت گھناؤنے کام کراتا ہے۔''

گداؤ مسلسل میری طرف بھنچی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ گھر قریب آ گیا۔

''سونے اور چاندی کی ہوس ہر وہ کام کرا سکتی ہے جو ناجائز ہے،'' میں نے مزید کہا۔ گداؤ کے چہرے پر کھنچاؤ میں پریشانی سی شامل ہوگئی۔ چوڑی گلی سے گھر کی طرف مڑتے ہوئے گداؤ نے کچھ کہنا چاہا، کہہ نہ پایا۔

10

شام کو میں بھائی اور میر صاحب کے ساتھ ہسپتال کے صحن میں بیٹھا تھا۔

میں اسی کرسی پر بیٹھا تھا جہاں سے تنور صاف نظر آ رہا تھا۔ ماسی جیراں کے آس پاس لڑکیاں

بیٹھی تھیں۔ ان میں نوراں بھی تھی اور موٹی کالی شریفاں بھی — گلنازی نہیں تھی۔ نوراں پھر پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی۔ بھائی اور میر صاحب جراثیم سے پیدا ہونے والی کسی بیماری پر سنجیدگی سے گفتگو کر رہے تھے۔ گداؤ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بخشو اپنی کوٹھڑی کے قریب بیٹھا چائے بنا رہا تھا۔ نوراں کی نظروں سے گھبرا کر میں نے دوسری جانب دیکھا تو ایک گندمی رنگ کی لڑکی بھی ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی نے آنکھوں میں گہرا سرمہ ڈالا ہوا تھا۔ آنکھیں گول گول، چھوٹی چھوٹی سی تھیں۔ مجھے گلنازی کی تلاش تھی — وہ تنور پر نہیں تھی۔

میں نہیں جانتا میرے دل میں گلنازی کو دیکھنے کی خواہش کس لیے پیدا ہو رہی تھی۔ یہ خواہش شدید ہوتی جا رہی تھی اور وہ تنور پر نہیں تھی۔

''شاید کل شام والے واقعے کے بعد ماسی نے اسے تنور پر آنے سے منع کر دیا ہوگا،'' میں نے سوچا۔ ''یا پھر وہ خود ہی اس قدر شرمندہ ہوگی کہ تنور پر آنے سے جھجک رہی ہوگی۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اگر گلنازی تنور پر آئی تو سب لڑکیاں پھر سے ہنسنے لگیں گی، اور یہ بات تو مجھے بھی اچھی نہیں لگے گی... لیکن کیوں؟ میں ہر شام اسی کرسی پر کیوں بیٹھ جاتا ہوں جہاں سے تنور صاف نظر آتا ہے؟ میں گلنازی کو کیوں دیکھنا چاہتا ہوں؟ یہ سب کیا ہے؟ مجھے کیا ہو گیا ہے؟

اچانک ہی میری نظریں دھندلا سی گئیں۔ یوں لگا جیسے تنور سے اٹھتا ہوا دھواں چھپر سے اوپر اٹھ کر کہرے کی صورت پھیل گیا ہے۔ سفید کہرے میں مجھے گلنازی کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی مسکراہٹ تھی جو اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی، روشنی کی مسکراتی کرنوں کی مانند۔ ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے اس کے بال خوبصورتی سے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ لمحے سے بھی کم وقت میں میری آنکھیں بند ہو کر کھلیں، وہاں کچھ بھی نہ تھا — نہ کہرا، نہ گلنازی کا خوبصورت چہرہ، ہی نہ مجھے دیکھتی ہوئی چمکتی مسکراتی آنکھیں...

ماسی جیراں کے گھر کا بیرونی دروازہ چرچرایا۔ میری نظریں تیزی سے دروازے کی سمت گئیں۔ ایک پٹ کھلا۔ ادھ کھلے دروازے میں گلنازی کھڑی تھی۔

اس نے مجھے، میں نے اسے دیکھا۔ اس کا گلابی چہرہ کچھ کچھ پریشان سا بھی دکھائی دیا۔ گھنی پلکوں والی خوبصورت آنکھیں دو تین بار جھپکا کر اس نے آگے بڑھ کر تنور کی سمت دیکھا۔ اس نے نیلے

پھولوں والا کرتا اور گہرے نیلے رنگ کا لاچا پہن رکھا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ چہرے پر دھیمی سی پریشانی میں وہ اور زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تنور کی سمت اس انداز سے گئی جیسے محتاط ہو کر قدم اٹھا رہی ہو۔ تنور کے قریب جا کر اس نے آہستگی سے سر گھما کر مجھے دیکھا — اس کے چہرے کا گلابی رنگ سرخی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر اپنی خوبصورت لمبی انگلیوں سے، ٹانگوں کو اچھی طرح ڈھانپنے کے لیے، لاچے کو گھٹنوں پر کھینچا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خود بھی چونکی۔ مجھے بھی یہی محسوس ہوا کہ اس کا یہ عمل دانستہ نہیں تھا، غیر ارادی ہی تھا۔ اس نے میری سمت دیکھا، چہرہ سرخ ہو گیا۔ مجھے بھی اپنے چہرے پر تپش کا احساس ہوا — میرا چہرہ بھی سرخ ہو گیا ہوگا۔ ماسی جیراں نے شاید گلنازی کی غیر ارادی حرکت دیکھ لی تھی۔ ماسی جیراں نے میری طرف دیکھا — مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ ماسی جیراں کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے مجھ سے نظریں ہٹا کر آہنی سلاخ روٹی نکالنے کے لیے تنور میں ڈالی۔

گلنازی نے اپنے دائیں گھٹنے پر بایاں رخسار رکھ کر، سر کو ترچھا کرتے ہوئے، خوبصورت لیکن کچھ کچھ ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے بالوں سے ایک لٹ دائیں رخسار پر گری، خم کھا کر رخسار پر پھسلی اور اس کے کنجِ دہن تک جا پہنچی۔ اس کی آنکھوں میں ڈر ختم ہو گیا اور ندامت کے ساتھ حیا کی ایسی آمیزش نظر آئی کہ میں اپنے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔

اگلے ہی لمحے وہ اس قدر خوبصورت نظر آئی کہ مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

''اس دنیا میں اس سے خوبصورت لڑکی کہیں بھی نہ ہوگی...'' میرے دل سے آواز سی ابھری۔ گلنازی کا حسن مجھے اس کے وجود سے بلند ہوتا ہوا محسوس ہوا جو حسن فطرت کی طرح وسعت میں پھیل رہا تھا — وہی حسن جس نے مجھے بچپن ہی سے لاشکل ہو کر اپنا احساس دلایا تھا۔ وہ حسن مجسم میرے سامنے تھا۔ مجھے اپنا وجود بھی اپنے مادی وجود سے بلند ہوتا ہوا محسوس ہوا — حسنِ فطرت کی وسعت میں — ایک لامحدود روح کی طرح — وہ مجھے اپنے بے حد قریب محسوس ہوئی۔

''چائے صاب!'' بخشو کی آواز پر سب کچھ کسی خواب کی مانند، آنکھ کھل جانے پر معدوم سا ہو گیا۔ چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے میری انگلیاں تھرتھرائیں، پرچ میں پیالی بھی تھرتھرائی۔ بخشو

مجھے پیالی پکڑا کر چلا گیا۔ بھائی اور میر صاحب کسی طبی بحث میں مصروف تھے — کسی کو میری حالت کا پتا نہ چلا۔

میری نظریں پھر تنور کی سمت گئیں۔ گلنازی سیدھی بیٹھی تھی۔ ماسی جیراں کو، آٹے کی پرات سامنے رکھے، پیڑے بنا بنا کر دے رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر پھر میری طرف دیکھا۔ نہ جانے اسے میرے چہرے پر کیا نظر آیا، اس کے ہونٹوں پر بہت دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، پھر وہ ماسی کی سمت دیکھنے لگی۔

حسنِ ابتدا کا جمالِ فطرت، گزرتے لمحوں کے ساتھ گزر چکا تھا — ان لمحوں کی مانند جو گزر تو جاتے ہیں لیکن احساسِ حسنِ فطرت کو لامحدود وسعت بھی دے جاتے ہیں۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے تنور پر گلنازی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

11

اگلی دوپہر بوبے کو دیکھ کر مجھے الجھن سی محسوس ہوئی۔ بار بار نظریں بالوں کے گچھے کی سمت جا رہی تھیں۔ باجی زیبا نے میرے ذہنی کھنچاؤ کو محسوس کر لیا۔

''کیا بات ہے؟'' انھوں نے پوچھا، ''کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔''

''وہ...'' میں نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا، ''مجھے انگلش کے ٹینسز بہت مشکل محسوس ہو رہے ہیں۔''

''ذرا سی کوشش کرو،'' عصمت نے کہا، ''سمجھ میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ پہلے پہلے مجھے بھی خاصے مشکل محسوس ہوا کرتے تھے — مجھ سے تو تم پڑھتے نہیں ہو ورنہ...''

میں نے کاپی پنسل اٹھائی اور گھر سے نکلا۔ ذہن میں کھنچاؤ سا تھا۔ بیرونی دروازے سے نکلتے ہی بشیر نعل بند کے ہتھوڑے کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ گا رہا تھا:

''کلّے دو کلّے بھئی، شاہی محلے بھئی، مال میکلوڈ جی، بیڈن رود جی...''

میر صاحب کی ڈسپنسری تک پہنچتے پہنچتے میرا ذہنی کھنچاؤ کم ہو چکا تھا۔ میر صاحب اپنے خوشگوار انداز میں مجھے دیر تک انگلش گرامر کی مشق کراتے رہے۔ پھر نہ جانے کیوں مجھے میر صاحب سے ایک

سوال پوچھنے کی خواہش محسوس ہوئی۔ میں رہ نہ سکا۔

''سر،'' میں نے قدرے جھجکتے ہوے کہا، ''جب آپ انڈیا سے آئے تھے، کیا ہوا تھا؟''

وہ یوں چونکے جیسے میں نے ان ہی کی میز پر پڑی ہوئی سرنج کی سوئی انھیں چبھو دی ہو۔ انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''اپنے ناخن تو دکھایئے...'' انھوں نے کہا۔ میں گھبرایا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میرے ناخن خاصے بڑھے ہوے تھے۔

''چھی چھی چھی چھی!'' میر صاحب نے ناک سکوڑی۔ ''اتنے لمبے ناخن؟ ایسے تو لڑکیوں کے ہوتے ہیں... تبھی آپ ہمارے زخم کریدنا چاہتے ہیں۔''

مجھے یوں محسوس ہوا، میں نے بہت غلط سوال پوچھ لیا ہے۔

''سر...'' میں نے گھبرائے ہوے لہجے میں کہا، ''وہ بھائی بتا رہے تھے کہ آپ یوپی بہار کے کسی میڈیکل کالج میں تھے... یہاں آ کر آپ نے تعلیم کیوں چھوڑ دی؟''

میر صاحب کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

''ہمارا تعلق اتر پردیش کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ ہمارے آبا و اجداد صدیوں سے وہیں رہتے تھے — بس بھول ہوگئی ہم سے۔ ہماری زمینیں تھیں، حویلیاں تھیں۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ ہم بہت بڑے زمیندار تھے یا کوئی جاگیردار تھے۔ نہیں — ایسی کوئی بات نہیں۔ ہماری گاؤں میں ساکھ تھی۔ ہمارے نام دس ایکڑ زمین تھی جس پر باغات لگے ہوے تھے۔ باقی زمینیں بہن بھائیوں کے نام تھیں۔ ہمیں زمینداری سے کہیں زیادہ پڑھنے میں دلچسپی تھی۔ 1947 میں ہم میڈیکل کالج میں فورتھ ایئر کے طالب علم تھے۔ ایک برس رہ گیا تھا ایم بی بی ایس ہونے میں۔ زمیندار گھرانوں کے رواج کے مطابق ہماری شادی میڈیکل کالج میں داخلہ لینے سے پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ ہماری بڑی بیٹی انڈیا ہی میں پیدا ہوئی تھیں... بس بھول ہوگئی ہم سے... چند جوشیلے دوستوں اور رشتے داروں کے ساتھ نکل پڑے گھر سے۔ ماں باپ نے روکا، بہن بھائیوں نے منع کیا، بوڑھی نانی اماں روتی رہیں، ہم نے کسی کی نہ سنی۔ حویلی اور زمین کے کاغذات، تعلیمی سرٹیفکیٹس اور جو زادِ راہ میسر آیا، ساتھ لیا، نکل پڑے نئی دنیا کی تلاش میں۔ بیوی کی گود میں چھ ماہ کی بچی تھی۔ جنون سا سر پہ سوار تھا۔

بچتے بچاتے لاہور پہنچ گئے۔'' میر صاحب رکے، میز پر کہنیاں ٹکائیں، میری طرف دیکھا۔ ''رات کا وقت تھا، مسافر خانوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پلیٹ فارم پر ہی رات بسر کرنا تھی۔ لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی ہجرت کر کے آنے والوں کا ہجوم تھا۔ اوپر سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ عجیب مصائب کا وقت تھا۔ پلیٹ فارم پر کتنے ہی خاندان موجود تھے۔ آدھی رات کو ذرا سی اونگھ آئی ہوگی کہ کوئی شقی القلب آدمی ہمارا سامان لے اڑا۔ آنکھ کھلی تو معلوم پڑا کہ ہم لٹ چکے ہیں۔ کچھ بھی تو پاس نہ تھا۔ چور سب کچھ لے گئے۔ سامان کے ساتھ ہمارا مستقبل بھی چوری ہوگیا۔ وہ سوٹ کیس بھی گیا جس میں ہمارے تعلیمی سرٹیفکیٹس تھے، حویلی اور زمین کے کاغذات، زیورات کے دوڈبے تھے، کچھ نقدی بھی تھی۔ ہماری اہلیہ پر غشی طاری تھی۔ ہر سمت نفسانفسی کا عالم تھا۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا۔ ہم نے اگلے روز پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ ایف آئی آر کی کاربن کاپی ہاتھ میں پکڑی، بیوی اور بچی کو ایک مہاجر کیمپ میں چھوڑا اور لاہور میں دوستوں اور رشتے داروں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ جیب میں جو کچھ تھا وہ تانگوں کے کرایوں پر خرچ ہو رہا تھا۔ نہ دوست ملے نہ رشتے دار۔ اب ہم نے اپنے حق کے لیے تگ ودو شروع کی۔ اب ہم تھے اور کلیم آفس کے چکر۔ پاؤں دکھ جاتے تھے۔ افسروں کو ایف آئی آر کی کاپی دکھاتے تھے تو وہ شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جو زیور ہماری اہلیہ کے تن پر تھے، سب بک گئے۔ پھر کلیم آفس کے ایک افسر کو ہم پر رحم آ ہی گیا۔ مختصر سے انٹرویو کے بعد انھوں نے ہمیں یہاں جھاوریاں میں ایک ہندو تاجر کا چھوڑا ہوا دو منزلہ مکان الاٹ کر دیا، ساتھ یہ دکان بھی — یہ دکان بھی اسی ہندو کی تھی۔ اس دکان کی زمین بھی ہمیں الاٹ ہوگئی... آپ نے شاید دھیان نہیں دیا، اس دکان کی چھت پر کوئی تعمیر نہیں ہے اور پیچھے دو منزلہ مکان ہے۔''

مجھے دھیما سا احساس ہوا کہ دکان کے اوپر کوئی کمرہ نہیں ہے۔ میر صاحب نے بازار کی گلی کی دوسری سمت سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے دو منزلہ مکان کو دیکھا۔

''خدا ان افسر کا بھلا کرے،'' میر صاحب نے کہا، ''کلیم کے کاغذات نہ ہونے پر بھی اس بے کسی کے عالم میں انھوں نے ہمیں سر چھپانے کی جگہ دے دی۔ یہاں آئے تو شروع شروع میں بہت تکلیفیں دیکھنا پڑیں۔ مقامی لوگ ہمیں پناہ گزین کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ ہمارے پاس اشیائے خورد ونوش کے لیے بھی رقم نہ تھی۔ دکاندار ادھار بھی نہیں دیتے تھے۔ اسی بے بسی میں ہم نے دکان

میں ڈسپنسری کھولنے کا فیصلہ کیا، لیکن کھانے کے لیے پیسے نہ تھے، ڈسپنسری مفت میں تو کھل نہیں سکتی تھی۔ ہم اس سلسلے میں گاؤں کے صاحبِ ثروت لوگوں سے ملے۔ ہمیں کم از کم ایک سو روپے کی ضرورت تھی، لیکن ہر سمت مایوسی ہی ملی، ہر سمت اندھیرا تھا۔ ہم نے الاٹ شدہ مکان اور یہ دکان بیچ دینے کا فیصلہ کیا۔ ہمارا ارادہ کراچی جانے کا تھا، کیونکہ وہاں ہجرت کر کے پہنچنے والوں کی اکثریت تھی۔ یہی سوچا کہ ممکن ہے وہاں زندگی کا کوئی روشن راستہ مل جائے۔ ہم یہ ارادہ کر ہی رہے تھے کہ مایوسی میں ایک روشنی کی کرن دکھائی دی۔ شاید خدا نے ہمارے لیے یہی قصبہ چنا ہوا تھا۔ یہاں ایک کپڑے کے تاجر تھے نظام دین بزاز... وفات پا چکے ہیں... وہ زیادہ تر سرگودھا ہی میں رہا کرتے تھے۔ مہینے میں ایک بار جھاوریاں آیا کرتے تھے۔ ہم ان سے ملے اور بتایا کہ ہم نے چار برس ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے۔

''انھوں نے فوراً اپنا کرتا اتارا، بازو اوپر اٹھائے۔ ڈاکٹر ہو تو یہ دیکھو — بہت پریشان ہوں۔ حکیموں سے بھی علاج کرایا ہے، سرگودھا کے سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر سے بھی ملا ہوں، یہاں کے ڈاکٹر سے بھی کچھ نہیں ہوا۔ یہ کس قسم کی خارش ہے؟ مجھے بہت تکلیف ہے۔

''ان کی بغل میں ایگزیما تھا جو پھیل کر بہت بری حالت میں تھا۔ ایگزیما کی خراشوں سے جراثیم والا پانی رس رس کر نیچے کی سمت پھیل رہا تھا، جس سے ان کی پسلیوں پر بھی یہ موذی جلدی بیماری پھیل سکتی تھی۔ ہم نے فوراً انھیں پنسلین کے سات انجکشن لکھ کر دیے کہ سرگودھا سے منگوا لیں اور دو سرنجوں کے علاوہ اسپرٹ کی شیشی بھی منگوا لیں۔ ان دنوں پنسلین کو انفیکشن کے خلاف بہت موثر سمجھا جاتا تھا۔ نظام دین بزاز نے اگلی صبح ہی اپنے بیٹے کو سرگودھا بھجوادیا اور ان کا ملازم ہمارے گھر آ کر آٹے کی آدھی بوری اور دس روپے دے گیا۔ شام کو انجکشن اور سرنجیں بھی آ گئیں۔ اسپرٹ بھی مل گئی۔ ہم نے فوراً علاج شروع کیا۔ ہر شام ہم نظام دین بزاز کے گھر جا کر انجکشن لگا آتے تھے۔ پانچویں انجکشن پر دوا کا اثر ظاہر ہوا۔ ایگزیما دب سا گیا۔ ساتویں انجکشن پر ایگزیما سمٹ سا گیا۔ نظام دین بزاز بہت خوش تھے۔ ہم نے انھیں تین مزید انجکشن منگوانے کے مشورہ دیا۔ انھوں نے انجکشنوں کے تین روپے دے کر کہا:

''یہ تو ہمارے ٹیکوں کے لیے، اور یہ تمھارا کرایہ۔ انھوں نے تین روپے مزید دیے اور پھر ان

کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ اور یہ ادھار... انھوں نے ہمیں ایک سو روپے دے دیے۔ جاؤ، ڈسپنسری کا سامان اور دوائیاں لے آؤ۔ ہمیں سٹیتھو اسکوپ کی ضرورت تھی، بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ درکار تھا، ادویات اور انجکشن درکار تھے، بینڈ یجز کی ضرورت تھی۔ ان دنوں ایک سو روپے میں مل جانا مشکل نہ تھا، ہم سب سامان لے آئے۔ کچھ روپے بچ گئے جن سے ہم نے گھر کے لیے راشن خرید لیا۔ اب مسئلہ ڈسپنسری کے چلنے کا تھا۔ کتنے دنوں تک کوئی مریض ہی نہ آیا۔ مایوسی بڑھ رہی تھی، لیکن ہماری امید قائم تھی۔ پھر حالات بدلے... ایک، دو، تین... مریض آنا شروع ہو گئے۔ کچھ ہماری چار برس تک طبی تعلیم کام آئی، کچھ نظام دین بزاز نے بھی گاؤں میں ہمارے تجربے اور قابلیت کا چرچا کیا۔ مریض شفایاب ہونے لگے تو ڈسپنسری چل نکلی، اور اب تو یہ عالم ہے کہ آس پاس کے دیہات سے بھی مریض ہمارے پاس ہی آتے ہیں۔ کوئی سرکاری ہسپتال کا رخ نہیں کرتا۔ اب تو صبح ڈسپنسری کھلنے سے پہلے ہی مریض ہمارے گھر پر دستک دینے لگتے ہیں۔'' میر صاحب کے چہرے پر مغموم سی مسکراہٹ بکھری۔ ''ہم بہت کم فیس لیتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس علاقے کے لوگ بہت غریب ہیں۔ کسی کے پاس نہ ہو تو ہم فیس بھی نہیں لیتے، صرف دوائیوں اور انجکشنوں کے پیسے لیتے ہیں۔ اب یہاں کے لوگ ہمیں چاہنے لگے ہیں، بہت عزت کرتے ہیں۔ نظام دین بزاز کے ایک سو روپے ہم نے لوٹا دیے تھے۔ ہماری اچھی گزر بسر ہو رہی ہے۔ زیادہ کی ہم نے کبھی خواہش ہی نہیں کی، جو ہے بہت ہے۔ دو بیٹیاں ہیں ہماری، انھیں ہم خود ہی پڑھاتے ہیں۔ دونوں نے سرگودھا بورڈ سے مڈل کا امتحان پاس کر لیا ہے، اب میٹرک کی تیاری کر رہی ہیں۔ میٹرک پاس کر لیں تو ہم انھیں کالج بھجوا دیں گے۔ بس ہمیں دکھ ہے تو یہی کہ...'' میر صاحب لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گئے۔

''ہم ایم بی بی ایس نہیں کر پائے۔ چار برس میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود، ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے، ہم خود اپنی نظروں میں بھی عطائی ہیں۔'' میر صاحب کے چہرے پر غم کا گہرا تاثر سا نمایاں ہوا، یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دیر کرسی سے ٹیک لگا کر ڈسپنسری کی چھت کو دیکھتے رہے، پھر انھوں نے میری طرف دیکھا۔

''ہم ایم بی بی ایس کر بھی لیتے تو بھی ضروری نہیں تھا کہ ہم کسی بڑے ہسپتال میں ہوتے... اگر دیہی علاقے میں سروس ملتی تو بخوشی کر لیتے، لیکن ہم پر عطائی ہونے کی تہمت تو نہ ہوتی۔'' جملہ ختم

ہوتے ہوتے میر صاحب کی آواز میں رقت سی نمودار ہوئی۔ان کی آواز میں موجود غم کے تاثر نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''یہ دکھ تو اب . . . ''میر صاحب نے دوسری جانب منھ موڑا،ان کے دائیں ہاتھ کی انگلی دائیں آنکھ تک گئی۔''یہ غم تو اب ہمارے ساتھ ہماری زندگی کے اختتام تک رہے گا۔''

''سر . . . ''میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا،''مجھے معاف کر دیں۔میں نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے . . . مجھے آپ سے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔'' مجھے یوں لگا جیسے میری آواز بہت گہرائی سے نکل رہی ہے۔

''ارے نہیں!''میر صاحب نے میری طرف چہرہ گھمایا،ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی۔''آپ نے تو ہمارے غم کے پودے کو پانی دیا ہے — غم کے پودے کو ہمیشہ شاداب رہنا چاہیے۔اور ہاں . . . ''میر صاحب کا لہجہ بدل گیا۔''آپ کے بھائی بتا رہے تھے کہ انھوں نے آپ کو ہسپتال میں موجود نسل کشی کے گھوڑے پر سواری کی اجازت دے دی ہے۔''اس بات پر میں چونکا۔

''ہاں سر . . . ''میں نے تیزی سے کہا،''مجھے تو آج ہی سے اسے گھمانے لے جانا ہے۔''

''برخوردار،''میر صاحب نے کہا،''وہ تو بہت خطرناک قسم کا گھوڑا ہے۔کم بخت پیچھے سے ہاتھی لگتا ہے۔''

''سر،میں گھڑسواری جانتا ہوں،''میں نے پھر تیزی سے کہا۔

''کہاں سے سیکھی؟''میر صاحب نے پوچھا۔

''بھائی پہلے ڈومیل کے قصبے میں تھے،ضلع اٹک میں۔وہاں بھی گھوڑا تھا۔پھر وہ بلکسر کے ہسپتال میں تھے۔وہاں دیسی نسل کا بہت ہی تیز گھوڑا تھا۔اور سر . . . ''میری آواز میں بچگانہ خوشی سی ابھری۔''میں تو زین کے بغیر بھی گھوڑے کو سرپٹ دوڑا لیتا ہوں۔''

''پھر بھی،احتیاط کیجیے گا،''میر صاحب نے کہا۔''گھوڑا خطرناک ہے۔''

سہ پہر ڈھلنے کے احساس سے مجھ پر گھڑسواری کا شوق ہیجانی سی کیفیت پیدا کرنے لگا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کاپی پنسل اٹھائی۔

''سر،میں جاؤں؟''میں نے تیزی سے کہا اور میر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

12

گھر پہنچ کر میں نے کاپی پنسل پھینکی۔ پتلون اتار کر نیکر پہنی اور ہسپتال کی طرف دوڑا۔ بھائی ہسپتال ہی میں تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی۔ قریب ہی ہسپتال کا سائیس بخشو کھڑا تھا۔

''بخشو'' بھائی نے کہا ''گھوڑے پر سپاٹ ڈالو۔''

بخشو اصطبل میں گیا اور پانچ منٹ کے اندر ہی تھارو بریڈ کو باہر لے آیا۔ میں نے باگ پکڑی۔ بخشو گھبرا گیا۔

''ڈاکٹر صاب... '' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا ''نکے صاب سواری کریں گے؟'' وہ حیرت زدہ تھا۔ ''گھوڑا بہت زور آور ہے۔''

''تو فکر نہ کر، یہ سنبھال لے گا، بہت اچھا سوار ہے'' بھائی نے کہا۔

میں نے رکاب پر پاؤں رکھا، گھوڑے پر سوار ہوا۔ بائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں باگیں پکڑیں، گھوڑے کو ایک چکر دیا۔

''کوئی شرارت نہیں!'' بھائی نے کہا۔ ''یہ تھارو بریڈ ہے — گیلپ بالکل نہیں، ٹراٹ بھی نہیں، اونلی کینٹر۔''[27]

''ٹھیک ہے بھائی جان'' میں نے جواب دیا۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے میں نے تنور کی سمت دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ماسی جیراں کے گھر کے بیرونی دروازے پر گلنازی اور نوراں کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر گلنازی کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ میں نہر کی سمت جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ نہر ہی کی سمت پگڈنڈی پر میں نے گھوڑے کو قدم قدم چلایا۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ایڑ کی کس مطلوبہ ضرب اور باگ کی کس جنبش سے گھوڑا چال کا تعین کرتا ہے۔ سہ پہر ابھی شام میں نہیں بدلی تھی۔ نہر بھی زیادہ دور نہ تھی۔ یہ نہر دریائے جہلم سے نکلنے والی بڑی نہر لوئر جہلم کی ذیلی نہر تھی۔ کھیتوں میں نباتات کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ خریف کی فصلیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہ خوشبو مجھے

27۔ گیلپ (Gallop): سرپٹ۔ ٹراٹ (Trot): دلکی۔ کینٹر (Canter): پویہ چال۔

بہت اچھی لگتی ہے۔ سردیوں میں سورج کی چمکتی دھوپ میں یہ مہک ہوا میں تیرتی محسوس ہوا کرتی ہے۔ حسنِ فطرت اپنے دلکش اور لطیف احساسات سے قلب و ذہن کو مخمور کر دیا کرتا ہے۔ نہر کے کنارے شیشم کے بلند اور گھنے پیڑ نظر آئے جن کے سائے، جون کے آخری ایام کی اس ڈھلتی سہ پہر میں، نہر کے پانی پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سائے مغربی کنارے کے درختوں کے تھے جنھیں میں نہر کی بہتی لہروں پر کسی ناؤ کی طرح ہچکولے کھاتا دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں، میرا دل نہانے کو چاہا۔ جسم پر پسینے کا احساس نہانے کی خواہش کو بڑھا رہا تھا۔ نہر کا کنارہ کھیتوں سے کچھ بلند تھا اور ڈھلوان کھیتوں کے کناروں تک چلی جاتی تھی۔ نہر سے ڈھلوان تک کنارے پر اتنی جگہ موجود تھی کہ گھوڑا کھڑا ہو سکے۔ میں نے گھوڑے سے اتر کر اس کی باگوں کو قریبی شیشم کی زیریں شاخوں سے باندھا۔ ہنہنا کر گھوڑا دو قدم پیچھے ہٹا۔ پھر قدم آگے بڑھائے، میری طرف دیکھا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے شرٹ اتاری، بنیان اتاری اور نہر میں چھلانگ لگا دی۔ نہر کا پانی میری گردن تک گہرا تھا اور بہت ٹھنڈا تھا۔ شاید درختوں کے سایوں میں بہتے بہتے، اس شدید گرم موسم میں بھی اس کی خنکی برقرار تھی۔ تیراکی مجھے اچھی طرح آتی تھی، لیکن پھر بھی پانی میں کودنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ نہر کی سطح پر ہموار نظر آنے والے مٹیالے دھارے اندر سے بہت تیز ہیں۔ ڈبکیاں لگاتے ہوئے بالوں سے گزرتا ہوا پانی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پانی مٹیالا تھا لیکن ہر قسم کی آلودگی سے پاک تھا۔ میں نے کتنی ہی ڈبکیاں لگائیں۔ کبھی میں دھاروں کی مخالف سمت میں زور لگا کر تیرتا ہوا جاتا تھا تو کبھی جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر دھاروں کے ساتھ بہنے لگتا تھا۔ اچانک گھوڑا ہنہنایا۔ میں نے گھوڑے کی سمت دیکھا۔ وہ ڈھلوان کی سمت منہ موڑے ہنہنا رہا تھا۔ میں چونکا، لیکن وہاں گھوڑے کے آس پاس کوئی نہ تھا۔

''شاید کھیتوں میں کوئی جانور ہوگا،'' میں نے سوچا اور ایک بار پھر ڈبکیاں لگانا شروع کر دیں۔ ڈبکی لگا کر جیسے ہی میں نے نہر کی گدلی مٹیالی سطح سے سر باہر نکالا تو آواز آئی۔

''وے ڈاکٹر نیاں بھراوا، منہ دھیان پراں کر!'' (او ڈاکٹر کے بھائی، منہ دھیان پرے کر۔) آواز نوراں کی تھی۔

میرا سر تیزی سے آواز کی سمت گھوما۔ گلنازی، نوراں کے ساتھ نہر کے کنارے پر کھڑی تھی۔ نوراں کرتا اتار چکی تھی اور اس کے ہاتھ لاچے پر تھے۔ اس کے سانولے بدن پر نظر پڑتے ہی میں

نے گھبرا کر ڈبکی لگائی۔ پانی کے اندر، دھاروں کی مخالف سمت میں زور لگا کر میں اندازاً بیس پچیس فٹ تک گیا۔ سانس اکھڑنے ہی والی تھی کہ میں نے پانی سے سر نکالا۔ کنارہ قریب تھا۔ زور زور سے سانس لیتے ہوئے میں کنارے پر چڑھا۔ چھپاکے کی آواز آئی — شاید نوراں کودی ہوگی۔ میں کنارے پر چڑھا، پھر چھپاکے کی آواز آئی — گلنازی نے چھلانگ لگائی ہوگی۔ میں نے نہر کی سمت دیکھے بغیر شرٹ اٹھائی اور پہن لی۔ بنیان اٹھا کر میں گھوڑے کو کھول کر سوار ہوا۔ مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ نہر سے ہنسنے کی آواز آئی، آواز نوراں ہی کی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کنکھیوں سے نہر کی سمت دیکھا۔ پانی کے دھاروں سے پہلے میری نظر کنارے پر پڑے ایک کرتے، ایک لاچے اور دو دوپٹوں پر پڑی۔ گلنازی نے کپڑے نہیں اتارے تھے، کپڑوں کے ساتھ ہی نہر میں اتری تھی۔ نوراں — بے شرم — سارے کپڑے اتار کر، ننگی ہو کر نہر میں کودی تھی۔ میری نظر پانی کی سمت گئی۔ دونوں کے جسم گدلے پانی میں گردنوں تک چھپے ہوئے تھے۔ گلنازی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں حواس باختہ سا تھا — میں نے پہلی بار کسی لڑکی کو ناف سے اوپر ننگی دیکھا تھا۔ ڈھلوان سے اترتے ہی میں نے گھوڑے کو سرپٹ کی ایڑ لگا دی۔

گھوڑا اُڑا — میں بھول گیا تھا کہ بھائی نے سرپٹ دوڑانے سے منع کیا تھا۔ گھوڑا پچاس ساٹھ قدم لمحوں ہی میں نکل گیا۔ میں نے باگیں کھینچیں، گھوڑے کا سر اوپر اٹھا، چھاتی باہر کی سمت نکلی اور وہ رکتے رکتے بھی پندرہ بیس قدم لے گیا۔ میں کچھ دیر اسے قدم قدم چلاتا رہا۔ سہ پہر شام میں بدل رہی تھی۔ جب ہسپتال ساٹھ ستر قدم دور رہ گیا تو میں نے گھوڑے کو پویہ چال میں ڈالا اور اسی رفتار سے ہسپتال کے صحن میں داخل ہوا۔ بھائی کرسی پر بیٹھے تھے — اُٹھے۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے،'' انھوں نے کہا، ''اس وقت گرمی زیادہ ہے، تم آج ذرا جلدی آ گئے ہو۔ کل سے شام کے وقت لے جایا کرنا۔ تھارو بریڈ کی ایکسرسائز کے لیے کنٹر سے بہتر کوئی چال نہیں ہوتی۔'' بھائی ہسپتال کے آفس میں چلے گئے۔ بخشو حیرت زدہ تھا۔

''صاب!'' اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے گھوڑے کی باگیں پکڑیں۔ ''یہ ہنٹر چال کیا ہوتی ہے؟''

''ہنٹر نہیں، کنٹر،'' میں نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

''کنٹر؟'' بخشو پریشان تھا۔ ''میں نے تو کبھی نہیں سنی، نہ دیکھی ہے — کیا ہوتی ہے؟''

اب میں الجھن میں تھا۔ پویہ چال کے الفاظ بخشو کے لیے کنٹر جیسے ہی تھے اور مجھے پنجابی زبان میں کنٹر کا متبادل لفظ نہیں سوجھ رہا تھا... پھر ایک دم سے میرے ذہن میں شتری کا لفظ آیا، لیکن شتری تو دیسی گھوڑوں کی تیز چال ہوتی ہے۔

''ہلکی شتری،'' میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''یوں کہیں ناجی!'' بخشو خوشی سے بولا۔ اس نے ہاتھ زور سے جھٹکا، باگیں جھولیں۔ ''میں تو جی...'' اس کی آواز میں بھی خوشی تھی۔ ''میں تو جی شتری کا پرانا کھڈیار (کھلاڑی) ہوں۔ میں نے چاچڑاں میں رانے کے اصطبل میں بھی کام کیا ہے۔ وہاں گھوڑوں کو، گھوڑیوں کو شتری پر میں نے ہی لگایا تھا۔''

''پرانے کھلاڑی ہو تو...'' میں نے کہا، ''جب گھوڑا ہسپتال میں داخل ہوا تھا، دیکھ کر سمجھ کیوں نہیں گئے تھے؟''

''سمجھ تو گیا تھا صاب،'' بخشو نے کہا، ''پر یہ نامراد... کنٹر کا لفظ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔''

مجھے گیلے کپڑوں کا احساس ہوا— خصوصاً نیکر کا۔ گھوڑے کی سپاٹ بھی قدرے گیلی تھی۔ بخشو نے محسوس تو کی ہوگی لیکن خاموش رہا۔ میں میر صاحب کے آنے سے پہلے نیکر اتار کر واپس آنا چاہتا تھا۔ گھر کی سمت جاتے ہوئے میں نے دیکھا۔ ماسی جیراں اکیلی بیٹھی پیڑے بنا رہی تھی۔

13

ہسپتال سے واپس جاتے ہوئے میرے ذہن پر گلنازی چھائی ہوئی تھی۔

نہر کے کنارے والے واقعے کا بوجھل سا تاثر خیالات کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا۔ نوراں نے مجھے آواز دینے سے پہلے ہی کرتا اتار دیا تھا۔ میں نے اسے صاف عریاں دیکھا تھا۔ سانولا بدن بار بار میرے تصور میں ابھرتا تھا، لیکن گلنازی کے تصور سے مٹ جاتا تھا۔ نوراں نے نہایت بے شرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ میرے دیکھنے پر لاچا بھی اتارنے لگی تھی۔

''نوراں اچھی لڑکی نہیں ہے،'' میں نے سوچا۔ ''بہت بے شرم ہے۔ اسے پہلے مجھے آواز دینا

چاہیے تھی اور پھر کرتا اتارنا چاہیے تھا۔ گلنازی بہت اچھی ہے۔اس نے کپڑے نہیں اتارے۔۔۔ دیوار سے نیچے گرنا ایک حادثہ تھا ورنہ اس کے چہرے پر ندامت کا اتنا گہرا اور خوبصورت احساس کیوں نمایاں ہوتا؟''

کپڑے بدل کر میں پھر واپس ہسپتال کی سمت آیا۔تنور کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے تنور کی سمت نہ دیکھا۔شرم کا انجانا سا احساس مجھ پر بھی اپنا تاثر چھوڑ چکا تھا۔ایک شام پہلے میں نے پہلی بار کسی لڑکی کو رانوں تک عریاں دیکھا تھا اور اب نوراں کا ننگا سانولا بدن۔۔۔ ''یہ گاؤں کی لڑکیاں— گلنازی کا لا چاہوا میں اڑنا اتفاق تھا،لیکن نوراں—وہ تو بڑی بے حیا ہے۔''

تنور پر گلنازی اور نوراں دونوں موجود تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی گلنازی کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہسپتال میں میر صاحب بھی موجود تھے۔میری مخصوص کرسی خالی تھی،جہاں سے تنور صاف دکھائی دیتا تھا۔گلنازی نے پھر ٹھوڑی گھٹنے پر رکھی،سر کو خوبصورت انداز میں ترچھا کیا اور میری سمت کنکھیوں سے دیکھا۔اس کے رخسار پر اس کی زلف گر کر جھول سی گئی۔

غیر متوقع طور پر میرے تصور میں بُوبے کا سرابھرا— بالوں کا گچھا نظر آیا۔مجھے شدت سے اس استحصال کا احساس ہوا جو پیروں کا طبقہ،سادہ لوح دیہاتیوں کو بے وقوف بنا کر،انھیں خوفزدہ کرتے ہوئے،انھیں خود غرضی کا اسیر بنا کر،صدیوں سے مذہب اور عقائد کے نام پر کر رہا ہے۔ کالے دھاگوں،تعویذوں اور نقش بندیوں کے ذریعے غیر محسوس انداز میں دولت کمانے والوں کو تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ وہ معاشرے میں گھناؤنا کاروبار کرنے کے باوجود کتنے باعزت ہیں۔ان کے ہتھکنڈوں سے تو میں آگاہ ہی تھا لیکن رَکھ کے ذریعے استحصال کا یہ بھیانک روپ بھی سامنے آچکا تھا— میں اب اس سے بھی واقف ہو چکا تھا۔

''بھیا ہم تو۔۔۔''میر صاحب کی آواز پر میں چونکا۔''ہم تو ڈر گئے تھے کہ برخوردار کہیں ٹانگ وانگ نہ تڑوا بیٹھیں۔''

''نہیں،''بھائی نے کہا،''میں جانتا تھا کہ یہ تھارو بریڈ کو سنبھال لے گا۔بہت اچھا سوار ہے۔''

''گھوڑا بہت عقلمند ہوتا ہے سر،''میں نے کہا،''سواری کرنے پر ہی جان جاتا ہے کہ سوار اناڑی ہے یا سواری جانتا ہے۔ایڑ لگانے میں بہت ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ایڑ کی ضرب اور

باگ کی جنبش ہی سے گھوڑا یہ تعین کرتا ہے کہ سوار کس چال کا خواہش مند ہے۔''

''برخوردار،'' میر صاحب نے کہا، ''ہم نے تو آج تک گھوڑے کی سواری نہیں کی، ہمیشہ بگھی یا تانگے پر ہی سوار ہوے ہیں۔ ہمیں یہ شہسواری کے گُر بھلا کہاں سے پتا چلتے۔''

بھائی نے کرسی پر کروٹ لی اور کرسی کے بازو پر کہنی ٹکائی۔

''آوارہ گردی اور ان کاموں میں یہ بہت تیز ہے،'' انھوں نے کہا۔ ''باقی پڑھنا لکھنا، تو اس میں یہ زیرو کا زیرو ہی رہے گا۔''

بھائی ہمیشہ کی طرح کڑوی باتوں سے ماحول خراب کرنے ہی والے تھے کہ میر صاحب نے ایک سوال کر کے بچا لیا۔

''کبھی گرے بھی؟''

''نہیں سر،'' میں نے جواب دیا، ''ابھی تک نہیں گرا — ہاں لاگا ضرور لگا تھا۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' میر صاحب نے پوچھا۔

''گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کرنے سے لاگا لگ جاتا ہے،''[28] میں نے جواب دیا۔

''کیا آپ کے پاس لاگے کا کبھی کیس نہیں آیا؟'' بھائی نے میر صاحب سے پوچھا۔

''نہیں،'' انھوں نے کہا، ''یہ ہے کیا — لاگا؟ پہلی بار نام سنا ہے۔''

''دیہاتی علاقوں میں،'' بھائی نے کہا، ''اکثر لڑکوں اور نوجوانوں کو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کرنے سے لاگا لگ جاتا ہے۔ زین پر کبھی لاگا نہیں لگتا۔ ایسی پیٹھ پر جس پر کوئی کپڑا بھی نہ ہو، سواری کرنے والے کے جسم کا وہ حصہ جو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ہو، رگڑ سے مسام کھل جانے پر خون آلود ہو جاتا ہے۔ مساموں سے خون رس کر پھیل جاتا ہے۔ اسے لاگا لگنا کہتے ہیں۔ یہ زندگی میں ایک بار ہی لگتا ہے۔ اسے... انھوں نے میری طرف اشارہ کیا، ''اسے تو سات آٹھ برس کی عمر ہی میں لاگا لگ گیا تھا۔''

28۔ لاگا: اس پنجابی زبان کے لفظ کے لیے مجھے کوئی مناسب متبادل نہیں ملا۔ کئی لغات دیکھ چکا ہوں۔ اردو میں لاگ لگنا یا لاگ بندھنا کے الفاظ ملتے ہیں، لیکن ان سے لاگا کا مفہوم نہیں نکلتا۔ شاید کوئی اردو بولنے والے دیہاتی متبادل بتا پائیں۔ ورنہ یہی سہی۔

''جب مجھے لاگا لگا تھ،''میں نے کہا،''میں نے سفید نیکر پہنی ہوئی تھی۔ سب لال ہوگئی تھی پیچھے سے۔۔۔بہت شرم آئی تھی مجھے۔''

میر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

''اگر آپ''بھائی نے کہا،''کبھی گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کرتے تو آپ کو بھی یہ تجربہ ہو جاتا۔''

''نہ بھیا!''میر صاحب نے کہا،''ہم تو ایسا تجربہ کبھی بھی نہ چاہیں گے۔''

سڑک پر گداؤ چپتا آ رہا تھا۔ وہ تنور پر روٹیاں ہی لینے آیا تھا۔ ماسی جیراں سے کچھ کہہ کر وہ ہمارے پاس آ بیٹھا۔

''او بخشو!''گداؤ نے بلند آواز میں کہا،''او کالیے۔۔۔ایک پیالی میری بھی۔''

''تیرے لیے کیتلی نہ لے آؤں؟''بخشو نے بھی دور سے بلند آواز میں کہا،''پیالی سے تیرا کیا بنے گا دہوش!''

بھائی اور میر صاحب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میری نگاہیں تنور کی سمت گئیں۔

تنور پر گلنازی اور نوراں موجود تھیں — مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اٹھ کر چلی گئی ہوں گی۔

گلنازی سے نظریں ملتے ہی، نہ جانے کیوں، مجھے خود یہ احساس ہوا کہ میری آنکھوں میں شکایت سی ہے۔ چہرے پر تپش سی محسوس ہو رہی تھی۔ گلنازی نے بھی اس شکایت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کی گلابی رنگت پھر سرخ ہوگئی۔

وہ اٹھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری سی تھی۔ اس نے اسی ناگوار کیفیت میں نوراں کی سمت دیکھی، گھر کے بیرونی دروازے کی سمت گئی۔ دروازے کے قریب اس نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں پھر ندامت اور حیا کی آمیزش تھی۔

اس کے بال ہوا کے دھیمے سے جھونکے سے اڑے۔ وہ پھر بہت ہی خوبصورت نظر آئی — بہت ہی خوبصورت۔ اس نے نظریں جھکائیں، دروازے کے پٹ کھولے اور اندر چلی گئی۔

تنور پر نوراں پلکیں جھپکے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی۔

''تو یہ شرارت نوراں کی تھی،''میں نے سوچا۔''وہی گلنازی کو میرے پیچھے نہر پر لے گئی ہوگی۔ خاصی تیز قسم کی لڑکی ہے اور بے شرم بھی۔۔۔''پھر میرے خیالات کا رخ بدلا۔''گلنازی ایک

رات ایک دن ہی میں کتنا بدل سی گئی ہے۔ پہلے دن میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ چھوٹی سی بچی کی طرح اپنے سلیپر کو مٹی میں دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی بچی کا تاثر تھا۔ دیوار والے واقعے کے بعد وہ شاید خود بھی اس حقیقت سے آشنا ہوگئی ہے کہ وہ اب بڑی ہوچکی ہے۔ اس کے اندر جو کھلنڈری بچی تھی وہ کہیں چھپ گئی ہے۔ گلنازی نے یقیناً میری طرح خود کو عالمِ شباب کی دہلیز پر محسوس کیا ہوگا، تبھی تو اس کے چہرے کا رنگ گلابی سے سرخ ہوا ہوگا... وہ کتنی خوبصورت ہے... میں نے کبھی کسی لڑکی کی سمت توجہ نہ دی تھی... جی چاہتا ہے گلنازی کو دیکھتا رہوں۔''

رات ہوئی۔ میں چھت پر لیٹا ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔ بوبے کے سر پر لٹکا ہوا بالوں کا گچھا بار بار میرے تصور میں جھول رہا تھا۔ بالوں کے اس گچھے کے ساتھ، استحصال کا وہ احساس بھی گھڑی کے پنڈولم کی طرح نامختتم انداز میں دائیں بائیں جھول رہا تھا جو صدیوں سے انسانی معاشرے میں موجود ہے اور مجھے ہمیشہ بے بسی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ یہ استحصال اس مضبوط اور گنجلک جال سے بندھا ہوا ہے جس میں سادہ لوح انسان صدیوں سے پرندوں کی طرح اسیر ہو کر پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں اور آخر اسی اسیری کو زندگی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس جال کا ہر حلقہ، ہر گانٹھ کسی نہ کسی مذہبی عقیدے سے پیوست ہے اور ان ہی عقائد سے صیاد اپنے جال کے مضبوط دھاگوں کو کستے رہتے ہیں۔ سادہ لوح انسانوں کو صدیوں سے لوٹا جا رہا ہے اور وہ سادگی سے لٹ رہے ہیں۔ خوف اور خود غرضی کی مضبوط ڈوروں سے بنا ہوا یہ جال کسی کے کاٹے نہیں کٹتا۔ انسانی معاشروں میں کوئی بھی انسانوں کو اس جال سے بچانے والا موجود نہیں۔ زبانوں پر لاشعوری کے پہرے ہیں، کوئی بول نہیں سکتا۔ جو لوگ اس ظلم کو محسوس کرتے ہیں، وہ بھی خاموش رہتے ہیں۔ انفرادی سوچ کبھی اجتماعی سوچ نہیں بن پائی۔ اشتراکیوں نے مذہب سے تو چھٹکارا حاصل کر لیا لیکن خوف اور خود غرضی ان کے معاشروں کو بھی جکڑے ہوئے ہے۔ انسانی معاشرے میں ہوس کا راس قدر مضبوط اور طاقتور ہیں کہ ان کے خلاف عمل تو کیا، سوچ کا بھی فقدان ہے۔

''یہ استحصال...'' میں نے ستاروں کے جھرمٹ پر نظریں جمائے، خیالات کو ذہن میں ٹمٹماتے ہوئے محسوس کیا۔ ''یہ استحصال جو آج اس پسماندہ علاقے میں پیر نور شریف کر رہا ہے، یہی ظلم و جبر اس کے آباؤ اجداد کا بھی استحصالی انداز رہا ہوگا۔ نسل در نسل بہیمانہ اندازِ جبر جاری ہے۔ یہ تشدد

ہے، بھیانک تشدد، جسے رکھوالی کا نام دیا گیا ہے۔ دنیا میں ماں کے لیے بچے سے زیادہ پیاری چیز کوئی نہیں ہوتی۔ ماں کو اندیشے کے تشدد میں مبتلا کرنا اور مسلسل خوفزدہ رکھنا اور اس کی مامتا کو آلۂ کار بنا کر، اپنی ہوس کے لیے ذریعہ بنا کر، اپنی تجوریوں کو سونے اور چاندی سے بھرنا — اس سے بڑھ کر اور کیا مذموم عمل ہوسکتا ہے! کیا دن رات انسانوں کے لیے اسی فلاح کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے؟''

بچے کی پیدائش پر اگر ماں کو یہ خوف دلایا جائے کہ اس کا بچہ مر جائے گا تو ماں کے ہوش و حواس کہاں ٹھکانے پر رہیں گے! وہ تو اس قدر ڈر جائے گی کہ اس کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے گی۔ وہ ہر ممکن طریقہ اختیار کرے گی جس سے اس کے بچے پر منڈلاتا خطرہ ٹل جائے۔ مامتا کو اپنی ہوس کا ذریعہ بنانا کسی نہایت چالاک اور مکار آدمی کے ذہن کی پیداوار ہوگی۔ وہ مکار آدمی، جو آج بہت باعزت سمجھا جاتا ہوگا، اپنی آل اولاد کے لیے ایک ایسا طریقہ چھوڑ گیا ہے کہ وہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر، کسی محنت کے بغیر، گدی پر بیٹھ کر عیش و آرام کی زندگی گزار سکے اور معاشرے میں باعزت بھی رہے۔ اس کی آل اولاد کا گھر سونے چاندی سے بھرتا رہے اور وہ ڈکیت ہونے کے باوجود عقیدت مندوں کے لیے رہنما بننے کا فخر بھی حاصل کرتا رہے۔ مذہب کو ہوس کے لیے استعمال کرنا مذہب فروشی نہیں تو اور کیا ہے؟

''پیروں اور ان کے ملنگوں کے ہتھکنڈوں کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں،'' میں نے سوچا۔ ''کھوڑ، بلکسر اور چکوال میں، ایسے کئی ملنگوں کو میں جانتا ہوں جو ملنگ بننے سے پہلے سزا یافتہ مجرم تھے — چھٹے ہوئے بدمعاش... پیروں نے انھیں اپنے ڈیروں میں پناہ دے رکھی ہے۔ پھر یہی بدمعاش سادہ لوح دیہاتی نوجوانوں کو نشہ آور مشروب پلا کر، ان کے جسم میں ٹائیفس (محرقۂ دماغی) کے جراثیم ڈالتے ہیں، انھیں اپاہج بنا کر ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ اسے ریاضت اور سلاسلِ طریقت کا نام دیا جاتا ہے۔ بھنگ، چرس، گانجے، افیون اور دیگر منشیات کے عادی ہو کر جوان اپاہج ہو کر زندگی بھر پیروں کے اشاروں پر ناچتے رہتے ہیں۔ پیروں کے ڈیرے جرائم پیشہ لوگوں کی پناہ گاہیں بن جاتے ہیں۔ لوگ انھیں جاننے کے باوجود یہی سمجھتے ہیں کہ وہ جرائم سے تائب ہو کر پیر کے مرید ہو گئے ہیں۔ اسے بھی پیر کی کرامت سمجھا جاتا ہے۔ پیر ان ہی جرائم پیشہ افراد کو ملنگ بنا کر اپنے مذموم مقاصد پورے کرتے ہیں، اپنے مخالفین کی سرکوبی کرتے ہیں۔ کوئی عام آدمی تو مخالفت کر نہیں

پاتا۔ پیروں میں باہمی رقابت بھی ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں ان ہی جرائم پیشہ افراد سے کام لیتے ہیں۔''

آسمان پر چاند اپنے عروج کی سمت سفر کا آغاز کر چکا تھا۔ آسمان پر خوبصورت نیلاہٹیں تھی، لیکن میرے ذہن میں تلخی سی تھی۔ دیہاتی معاشروں میں پیروں کی دہشت کا احساس ہمیشہ میرے ذہن میں کڑواہٹ سی پیدا کرتا رہا ہے۔ وہ بظاہر مذہبی رہنما اور مشائخِ عظام کہلاتے ہیں، لیکن بباطن خطرناک دہشت گرد ہیں۔ معذور ملنگوں سے بھیک منگوائی جاتی ہے تاکہ پیروں کے ڈیروں پر موجود دوسرے ملنگوں کی روٹی چلتی رہے۔ معذور ملنگ ریاضت اور سلاسلِ طریقت کے نام پر سیاہ کشتی نما کشکولوں میں آٹا اور چاول بھر بھر کے لاتے ہیں اور ملنگوں کی خوراک کا بوجھ پیر پر نہیں پڑتا۔ سزا یافتہ مجرم، ملنگوں کے بھیس میں، پیروں کے خاص کارندے ہوتے ہیں۔ ان ہی کارندوں کی وجہ سے دیہات میں پیر کی دہشت قائم رہتی ہے۔

''یہی ملنگ...''میں نے سوچا،''گاؤں گاؤں گھومتے ہوں گے اور پیر کے لیے جاسوسی کرتے ہوں گے۔ یہی پیر تک تمام خبریں پہنچاتے ہوں گے کہ فلاں فلاں گاؤں میں لڑکے پیدا ہوئے ہیں اور پیر کشف کا فریب دے کر سادہ لوح دیہاتیوں کو پھانس لیتا ہوگا۔ رکھ کا فریب دے کر اپنے لیے سونے اور چاندی کا انتظام کرتا ہوگا۔ یہی پیر کے ملنگ دیہات میں منشیات فروشی بھی کرتے ہیں۔ پیر کے مریدوں میں اضافے کی خدمات بھی سرانجام دیتے ہیں اور کوئی انھیں روکنے والا نہیں ہے۔''

اچانک ایک خیال بجلی کی مانند میرے غبار آلود ذہن میں چمکا — تیز شعاع کی مانند تاریکی کو چیرتا ہوا... میں نے بستر پر تھوڑا سا اٹھ کر منڈیر سے صحن میں جھانکا۔ چارپائی پر رقیہ اور بوبا سوئے ہوئے تھے۔ بجلی کی طرح لپکنے والا خیال ہر سمت چھائی تاریکی کو مٹاتا ہوا، روشنی پھیلاتا ہوا، بار بار میرے ذہن میں چمک رہا تھا...

''میں بوبے کے سر سے بالوں کا گچھا اتار دوں گا، کاٹ دوں گا!''

14

اپنی عادت کے برعکس، میں نے اگلا دن گھر پر گزارا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ رقیہ کی دن بھر کی

مصروفیات کیا ہیں۔ کس وقت وہ کیا کرتی ہے۔ گھر سے کب باہر نکلتی ہے۔ کتنی دیر کے لیے باہر جاتی ہے۔ مجھے موقعے کی تلاش تھی۔ دوپہر کے بعد مجھے میر صاحب کی ڈسپنسری بھی جانا تھا اور شام کو گھوڑے کو ورزش کے لیے بھی لے جانا تھا۔ ایک بات تو مکمل طور پر میرے مشاہدے میں آئی کہ رقیہ ہر وقت بُوبے پر نظریں جمائے رکھتی ہے۔ بوبا بھی شاید اس بات کا عادی ہو چکا تھا۔ ہر وقت ماں سے چمٹا رہتا تھا۔ ایسی صورت حال میں بالوں کا گچھا کاٹنا تقریباً ناممکن نظر آیا۔ میں سوچتا رہا، سوچتا رہا... بھابھی کی سلائی مشین میں کپڑا کاٹنے والی بڑی قینچی موجود تھی، لیکن بوبے کا بالوں کا گچھا کاٹنا انتہائی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ رقیہ سارا دن گھر پر رہتی تھی، باہر کا سارا کام گداؤ کرتا تھا۔ رقیہ بوبے کو گھر کا بیرونی دروازہ پار نہیں کرنے دیتی تھی۔ گداؤ ملیاریوں سے سبزی لاتا تھا تو رقیہ برآمدے میں بیٹھ کر سبزیاں کاٹتی تھی، بوبا اس کے پاس گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہتا تھا۔ گداؤ کے معمولات میں چھت سے بستر اتارنا، پانی بھرنا، بازار سے سامان خورد ونوش لانا اور لکڑیاں چیرنا تھا۔ سبزیاں کاٹ کر رقیہ باورچی خانے میں دوپہر کا کھانا تیار کرتی تھی۔ سہ پہر کو وہ بوبے کو کھجور کے پتوں والا پنکھا جھلا جھلا کر برآمدے ہی میں سلا دیتی تھی، خود بھی آرام کرتی تھی۔ شام کو چائے بناتی، رات کو کھانا تیار کرتی۔ روٹیاں ماسی کے تنور سے آجاتی تھیں۔ رات کو صحن میں سوتی تھی۔ اس تمام عرصے میں بوبا اس کے ساتھ رہتا تھا۔

''اب کیا کروں...'' میں نے صورت حال کی مشکل کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچا۔ ''رات کو اگر بالوں کا گچھا کاٹنے کی کوشش میں رقیہ بیدار ہوگئی تو بہت ہنگامہ ہوگا، جو خطرناک بھی ہوگا۔ ہنگامہ تو بالوں کا گچھا کٹ جانے پر ہر حال میں ہونا ہی تھا، لیکن بہتر یہی ہوگا کہ رقیہ کو جلد پتا نہ چلے... ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا... کیا کروں... مجھے اب ہر حال میں بوبے کے سر سے جبر کی یہ نشانی، یہ بالوں کا گچھا اتارنا ہے۔''

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے بوبے کے سر سے بالوں کا گچھا نہیں اتارنا، پیرنور شریف کے کندھوں سے اس کا سر، ملنگوں اور مریدوں کی موجودگی میں اتارنا ہے۔ صدیوں سے قائم جبر واستحصال کی رسی کو قینچی سے چند لمحوں میں کاٹ پھینکنا ہے...

دو بجے میں میر صاحب کی ڈسپنسری میں گیا۔ شام کو ہسپتال پہنچا۔ بخشو نے گھوڑے پر سپاٹ

پہلے سے ڈال رکھی تھی۔ میں اپنے ساتھ پتلون بھی لے آیا تھا تا کہ گیلی نیکر سے سپاٹ کا چمڑا نہ بھیگے۔ نہانا تو مجھے ضرور تھا۔ تنور پر مجھے گلنازی نظر آئی۔ گلنازی مجھے نیکر اور شرٹ میں دیکھ کر دھیما سا مسکرائی، پھر نظریں جھکالیں۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی سی نمایاں تھی۔ نوراں تنور پر موجود نہ تھی۔ نہر کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر گھوڑا موڑتے ہوئے میں نے پھر سر گھما کر تنور کی سمت دیکھا۔ گلنازی میری سمت ہی دیکھ رہی تھی... کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر گھوڑے کو پویہ چال میں ڈال کر میں نے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نہر کے کنارے پہنچ کر، شیشم کی نچلی شاخ سے گھوڑے کی باگیں باندھتے ہوئے، میری نظریں نہر کی سمت آنے والی پگڈنڈی پر تھیں۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں گلنازی میرے پیچھے تو نہیں آ رہی ہے... میں دیر تک نہر کے کنارے سوکھی گھاس پر بیٹھا رہا۔ جون کی دوپہروں نے نہر کے کنارے پر گھاس اور جڑی بوٹیوں کو خشک کر دیا تھا۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اگر گلنازی نہر کی سمت آئی تو میں نہائے بغیر ہی واپس چلا جاؤں گا۔ گلنازی دیر تک نہ آئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کل والی شرارت میں گلنازی کی مرضی شامل نہ تھی — نوراں نے اسے میرے پیچھے آنے پر اکسایا ہوگا۔

میں نے شرٹ اتاری اور نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میں دیر تک ٹھنڈے پانی میں نہاتا رہا۔ پھر باہر نکل کر شرٹ پہنی، گیلی نیکر اتار کر پتلون پہنی۔ نیکر کو اچھی طرح نچوڑ کر سپاٹ پر آگے کی سمت رکھا۔ نہر کے کنارے سے گھوڑا ڈھلوان پر اترا تو مجھے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں خریف کی فصلیں دکھائی دیں اور اس کے ساتھ ہی ایک خیال پر میں چونکا، گھوڑے کی باگیں خود بخود کھنچ گئیں، گھوڑا رک گیا۔ میرے پورے بدن نے آگے کی سمت جھٹکا سا کھایا...

''رقیہ صبح کے وقت تو کھیتوں میں جاتی ہو گی۔''

اس خیال کے ساتھ ہی یقیناً میری آنکھیں بھی چمکی ہوں گی۔ میں نے گھوڑے کو پگڈنڈی پر قدم قدم چلانا شروع کر دیا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ دیہاتی عورتیں صبح کے وقت کھیتوں میں ضرور جاتی ہیں۔ ان کے گھروں میں لیٹرینیں نہیں ہوا کرتیں۔ بھائی کے گھر لیٹرین ہے، لیکن عادت پھر بھی عادت ہوتی ہے۔

''رقیہ یقیناً صبح کے وقت کھیتوں میں جاتی ہو گی...'' میں نے سوچا، ''اور کھیت بھی گھر سے کون سے دور ہیں، بیرونی دیوار کے ساتھ ہی سے تو کھیت شروع ہو جاتے ہیں... بس وہی مناسب

وقت ہے بوبے کو رکھ سے آزاد کرنے کا...''

خیال میں تندی سی نمودار ہوئی۔ مجھے جس موقعے کی تلاش تھی، اس کا دھیما سا احساس یقین میں بدلنے لگا تھا۔

''وہی وقت ہے بوبے کے بالوں کا گچھا کاٹنے کا، اسے اور رقیہ کو وہم سے آزاد کرنے کا... رقیہ باہر گئی ہوگی... بوبا گہری نیند سویا ہوگا... وہی وقت ہے جب میں اپنے خیال کو عملی شکل دوں گا۔ مجھے ہر حال میں پیر کی مکاری کے خلاف قدم اٹھانا ہے اور کسی نتیجے کے خوف سے آزاد ہو کر اٹھانا ہے۔''

15

اس رات کا ہر لمحہ بے چین تھا۔

میں نے شام ہی سے کمرے میں جا کر اس بات کی تسلی کر لی تھی کہ بھابھی کی سلائی مشین میں قینچی موجود ہے۔ کپڑا کاٹنے والی بڑی قینچی آسانی سے بال کاٹ سکتی تھی۔ رات کو جب سب چھت پر اپنی اپنی چار پائی پر لیٹ گئے، میں واپس کمرے میں آیا اور سلائی مشین سے قینچی نکال لی۔ لباس میں چھپا کر میں قینچی چھت پر لے گیا اور تکیے کے نیچے بستر کی چادر اٹھا کر چھپا دی۔ میں جلد سونا چاہتا تھا تاکہ صبح جلد اٹھ سکوں لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ نیند ہمیشہ بے چینی کے لمحات کے ساتھ اڑتی چلی جاتی ہے...

''مجھے فکر ہے تو بہن زیبا کی،'' میں نے سوچا'' وہ اکثر فجر کے وقت اٹھ کر وضو کرتی ہیں... کیا مجھے موقع مل جائے گا؟''

بے چینی کے ساتھ ساتھ میری سونے کی تمام کوششیں رائیگاں جا رہی تھیں۔ ہر رات کی طرح بھائی، بھابھی اور بہنیں کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی۔ میں نے بازار کی طرف جانے والے میدان کی سمت دیکھا۔ بشیر نعل بند کی چار پائی اندھیرے میں روپوش تھی۔ صحن میں جھانکا تو ہر سمت اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں نے کتنی بار آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی لیکن اس خیال نے کہ میں سونا چاہتا ہوں، میری نیند اڑا دی تھی۔ بے چینی مجھے سونے نہیں دے رہی تھی... پھر ایک خیال اس بے چینی میں یوں گزرا جیسے بوجھل حبس میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا

ہو... اگر صبح کہیں جانے کا ارادہ ہو اور یہ فکر ہو کہ صبح جلدی اٹھنا ہے تو چاہے کتنی دیر نیند نہ آئے، صبح آنکھ ضرور کھل جاتی ہے... مجھے اس کا تجربہ کئی بار ہو چکا ہے۔ خصوصاً سکول کے امتحانوں کے دنوں میں رات کو دیر تک جاگنے کے بعد بھی صبح پیپر کے وقت سے بہت پہلے خود بخود آنکھ کھل جایا کرتی ہے۔ یہ تو کئی بار ہو چکا ہے... میں رات کو دیر سے سونے کے باوجود صبح وقت پر اٹھ جایا کرتا ہوں۔

''مجھے فجر سے پہلے اٹھنا ہے۔''

میں نے چارپائی پر سیدھا لیٹ کر ستاروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر سب کچھ معدوم ہو گیا۔

16

نہ جانے وہ کون سی آواز تھی جس نے مجھے جگایا تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دور سے میں نے گھنٹی کی آواز سنی تھی، شاید کسی بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی کی آواز... ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں خنکی تھی۔ میں نے چھت پر بچھی چارپائیوں کی طرف دیکھا۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ چاند مغربی افق کی سمت جا چکا تھا۔ چاند کو مغربی افق کی سمت جھکا دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ صبح ہونے والی ہے۔

میں نے چارپائی سے جسم کو تھوڑا سا اٹھایا، صحن کی سمت دیکھا۔ دھیمی دھیمی روشنی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ چارپائی پر بوبے کے ساتھ رقیہ موجود ہے۔ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سیڑھیوں پر کوئی چڑھتا آ رہا تھا۔ میں نے فوراً تھوڑا سا اٹھ کر دیکھا۔ وہ ٹائیگر تھا — جسے میں بھولا ہوا تھا۔ وہ بھونکے بغیر سیدھا میری چارپائی کے پاس آیا اور اگلے دونوں پیر اٹھا کر چارپائی پر رکھ دیے۔ اس کی گچھے دار دم دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ میں نے ٹائیگر کے سر اور گردن پر ہاتھ پھیرا۔ خنک ہوا کے باوجود اس کا منھ کھلا تھا اور زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ میرے پیار کرنے پر وہ بہت خوش نظر آیا۔ پھر جب میں تکیے پر سر رکھ کر آسمان پر مدھم ہوتے ہوئے ستاروں کو دیکھنے لگا تو اس نے چارپائی سے دونوں پیر اتارے اور دوڑ کر سیڑھیاں اتر گیا۔ اگر وہ بھونکتا تو سب جاگ اٹھتے...

''مجھے بوبے کے بالوں کا گچھا کاٹنے سے پہلے ٹائیگر کو باندھنا ہوگا،'' میں نے سوچا۔ ''اگر وہ بھونک اٹھا تو میرا سارا کام خراب ہو جائے گا۔ سب اٹھ جائیں گے... بہانہ تو میں بنا ہی لوں گا کہ

ٹائیگر بار بار چھت پر چڑھ جاتا ہے اور نیند کھل جاتی ہے... لیکن ایسا پہلے کبھی ہوا تو نہ ہوگا... خیر، بہانہ اور بھی بن سکتا ہے۔''

میں نے صحن میں چارپائی کی سمت دیکھ کر بہن زیبا کی چارپائی کی سمت دیکھا۔ وہ سو رہی تھیں۔ دراصل چکوال اور بلکسر میں امی ہی بہن زیبا کو جگا دیا کرتی تھیں۔ یہاں تو فجر کی نماز ادا کرنے والا ایک فرد بھی نہ تھا۔ بہن زیبا بھی یہاں کچھ سست ہوگئی تھیں، اور یہی بات میرے لیے بہتر بھی تھی۔ میری نیند بھری آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں۔ پھر میں نے مسلسل صحن میں چارپائی کی سمت دیکھنا شروع کر دیا۔ رقیہ اور بوبا دونوں سوئے ہوئے تھے۔ وقت گزر رہا تھا۔ چارپائی پر ہلکی سی جنبش بھی نہ تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے ارادے میں ناکام ہو جاؤں گا۔

دور کہیں سے مرغ کے بولنے کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ دیوار کے پار ہوا کے کسی تیز جھونکے سے کھیت میں سرسراہٹ بھی نمودار ہو رہی تھی۔ شاید ایک منٹ سے بھی کم مدت کے بعد مرغ کی آواز پھر سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی قریب سے بھی کسی مرغ نے اپنے بیدار ہونے کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی رقیہ نے بستر پر کروٹ لی۔ میں نے جسم کو فوراً نیچے جھکایا۔ اب میں دو فٹ اونچی منڈیر کی اوٹ میں تھا، لیکن میری نظر صحن میں بچھی چارپائی پر مرکوز تھی۔ مرغ کی آواز پھر ابھری... لمحے مجھ پر بہت گراں تھے... رقیہ اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ پاؤں ادھر اُدھر پھرا کر اس نے اپنے سلیپر تلاش کیے اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ٹائیگر دوڑ کر اس کے پاس آیا۔

میرا اندازہ درست تھا۔ وہ گاؤں کی عورتوں کی طرح کھیتوں ہی میں جانے والی تھی۔ اس نے بوبے کی طرف دیکھا اور صحن میں موجود لیٹرین کی سمت جانے کے بجائے بیرونی دروازے کی سمت گئی۔ مرغ کی آواز پھر سنائی دی۔ رقیہ نے اپنا دوپٹہ سر پر لیا، دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر جاتے ہوئے دروازے کے پٹ بند کر گئی۔ بوبے کا چہرہ بیرونی دیوار کی سمت تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ٹائیگر بھی رقیہ کے ساتھ باہر چلا گیا ہے۔ دھیمی دھیمی روشنی میں میں اسے دیکھ نہ سکا تھا۔ میرے پاس بہترین موقع تھا۔ بوبے کے بالوں کا گچھا تکیے پر تھا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ میرے پاس وقت کی کمی تھی۔ اس انداز سے کہ کوئی بیدار نہ ہو جائے، میں قینچی لے کر سیڑھیوں سے دبے پاؤں اترا۔ اترتے ہوئے میں نے سر گھما کر پھر چھت کی سمت دیکھا... صحن میں آ کر میری نظریں پھر

چھت کی سمت گئیں۔

''رقیہ فوراً تو نہیں آئے گی...'' میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔''پھر بھی مجھے فوراً ہی سب کچھ کرنا ہے۔''

میں تیزی سے بوبے کی سمت گیا۔ تکیے پر پڑے بالوں کے گچھے کو احتیاط سے پکڑا، بائیں ہاتھ میں گچھا پکڑ کر میں نے دائیں ہاتھ سے کاٹنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ بالوں کا گچھا کافی بڑا تھا۔ ایک ہی بار میں کٹنا مشکل تھا۔ مجھے بوبے کے بیدار ہونے کا بھی اندیشہ تھا، لیکن میں نے گھبرائے بغیر ایک چوتھائی بال پکڑے اور کاٹ دیے۔ نہایت احتیاط کے ساتھ چار بار قینچی چلائی...

بوبے کے سر پر سے بالوں کا گچھا اتر گیا۔ بال اس طرح کٹے کہ سر پر باقی ایک سینٹی میٹر سے زیادہ نہ تھے۔

بالوں کا گچھا کم از کم چھ انچ لمبا تھا، وزن میں ایک چھٹانک کے برابر تھا۔ میرا ذہن کئی سمتوں میں تیزی سے آ جا رہا تھا... مجھے بالوں کے گچھے کو غائب کرنا تھا، ورنہ رقیہ اسے باقی ڈھائی مہینے چھپا کر، پانچ سال پورے ہونے پر پیر نور شریف کو سونا نہ سہی، چاندی تو ضرور دے آتی۔ میں تیزی سے برآمدے میں آیا۔ وہاں پڑی میز پر میں نے قینچی رکھی اور بالوں کا گچھا دائیں ہاتھ میں پکڑے، صحن میں آیا اور بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ منطقی بات تھی کہ میرا رخ کھیتوں کی مخالف سمت تھا۔ بائیں ہاتھ ہسپتال کی سمت جانا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ میں دائیں ہاتھ بشیر نعل بند کی دکان کے سامنے سڑک پر سیدھا چل دیا۔ میں بالوں کے گچھے کو نہر میں بہا دینا چاہتا تھا۔ صبح کی مدھم روشنی میں گاؤں ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ میں پہلے روز ہی دیکھ چکا تھا کہ شمال کی جانب، میگھا پتن جانے والے تانگوں کے اڈے سے ایک سو قدم پہلے، ایک کھلی گلی کھیتوں کی طرف مڑتی ہے، جہاں سے پگڈنڈی سیدھی نہر کی سمت جاتی ہے۔ میرے قدم تیز ہو گئے۔ خطرہ اب صرف کتوں کا تھا، لیکن کہیں کوئی کتا نظر نہ آیا۔ کھیتوں سے گزرتے ہوئے میں بہت محتاط تھا کہ کہیں کھیتوں میں آئی ہوئی کوئی عورت مجھے دیکھ نہ لے۔ بالوں کا گچھا میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔

میں اس قدر تیز چل رہا تھا کہ خود مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی میدان میں صبح کی سیر

کے دوران جوگنگ کر رہا ہوں۔ میں سات آٹھ منٹ میں نہر پر پہنچ گیا۔ صبح کی روشنی بڑھ رہی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ مجھے اپنے ماتھے اور جسم پر پسینے کا احساس ہوا۔ میں کچھ دیر نہر کے گدلے بہتے دھاروں کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے بالوں کا گچھا پانی میں پھینک دیا، جسے نہر کا پانی بہا لے گیا...

میں بہت کم خوفزدہ ہوتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں ایک سنسنی سی میرے بدن میں نمودار ہو چکی تھی۔ یہ خوف اس صورت حال کا تھا جو گھر پر میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں واپس مڑا۔ دور کھیتوں میں دو عورتیں نظر آئیں۔ ایک عورت نے دائیں بائیں دیکھا اور کھیت میں بیٹھ گئی۔ دوسری چند قدم آگے جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گاؤں کی سمت جانے والی پگڈنڈی سے کتنی دور ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ پگڈنڈی سے دو کھیت دور ہیں۔ پھر مجھے ان سے بھی آگے کی سمت جاتا ہوا ایک مرد بھی نظر آیا۔

''اگر عورتیں مجھے دیکھ بھی لیں،'' میں نے سوچا،'' تو یہی سمجھیں گی کہ میں بھی ان ہی کی طرح انسانی ضرورت کے تحت کھیتوں میں آیا ہوا ہوں۔''

واپسی پر بھی میرے قدم تیز تھے۔ میں نے تقریباً آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ شمال مغرب کی جانب مسجد سے اذان کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دی۔ گاؤں میں لاؤڈ سپیکر نہیں تھا؛ مولوی پانچوں وقت مسجد کی چھت پر بنے ایک چبوترے میں کھڑے ہو کر اذان دیا کرتا تھا۔

''میں بُوبے کا سر چادر سے اچھی طرح ڈھک آیا ہوں،'' میں نے سوچا۔'' رقیہ کو فوراً پتا نہیں چلے گا۔ وہ پہلے غسل خانے میں جائے گی۔ ممکن ہے ہینڈ پمپ سے بالٹی بھرے، پھر غسل خانے میں جائے۔ اسے کچھ وقت ضرور لگے گا۔''

کھیتوں سے کچی سڑک پر آتے ہی میرے قدم خود بخود آہستہ ہو گئے۔ گاؤں پر صبح کی دھیمی دھیمی روشنی اب آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ مجھ پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔

''کیا گھر میں سب اٹھ چکے ہوں گے؟'' میں نے گھبراہٹ میں سوچا۔'' کیا سب کو پتا چل چکا ہوگا؟ اگر رقیہ کو پتا چل چکا ہے تو وہ سب کو جگا چکی ہوگی۔''

میرے قدم اور آہستہ ہو گئے۔ میں اب جلدی گھر پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں بھائی کے غصے کو

اچھی طرح جانتا تھا؛ وہ بھڑک کر ہوش وحواس کھودیا کرتے ہیں... میں کچھوے کی چال چل رہا تھا، لیکن انسان کتنا بھی آہستہ چلے، فاصلے کو ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ میں بشیر نعل بند کی دکان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ میدان میں بچھی چارپائی پر سو رہا تھا۔ میں گھر کے سامنے چوڑی گلی میں پہنچا۔ میرے قدم رک گئے... یوں محسوس ہوا جیسے گھر سے دھیمی دھیمی لیکن تیز لہجے میں آوازیں آرہی ہیں... ملی جلی آوازیں... میں بیرونی دروازے تک پہنچا۔ دروازے کے سامنے میرے قدم پھر رک گئے۔ ہمت جواب دے رہی تھی۔ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکیلا تو میرے پورے بدن میں سرد سنسناتی لہر دوڑی... اندر کہرام مچا ہوا تھا...

کمرے سے رقیہ کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یوں لگا جیسے رقیہ چھاتی پیٹ رہی ہے۔

''کس نے کیا ہے؟'' بھائی کی غصے سے بھری، لیکن دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''خدا کی قسم...'' بھابی نے کہا، ''مجھے نہیں معلوم۔''

''خالد کہاں ہے؟'' بھائی کی غصیلی آواز ابھری۔ مجھے پورے بدن میں کپکپاہٹ سی محسوس ہوئی۔

''چھت پر ہوگا،'' بھابی نے کہا۔

''ہال نی میرا بوبا!'' رقیہ کی کربناک آواز سنائی دی۔

''میں نے چھت پر اسے نہیں دیکھا۔'' باجی زیبا کی آواز آئی۔

''ٹھہریں، میں دیکھتی ہوں،'' عصمت نے کہا۔ میں بیرونی دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ عصمت سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر گئی اور پھر تیزی سے نیچے آئی۔

''ہال نی میں کے کرساں!'' (ہائے ری، میں کیا کروں گی!) رقیہ کی آواز میں کرب کے ساتھ خوف بھی تھا۔ ''ہائے میرا بوبا!''

عصمت برآمدے سے کمرے میں گئی۔ ''چھت پر نہیں ہے،'' اس نے کہا۔

''یہ اسی کا کام ہے!'' بھائی کی آواز میں شدید غصہ تھا۔ ''اسی نے کاٹی ہے لٹ۔''

میں اس قدر گھبرا گیا تھا کہ یہ سوچنے سے بھی قاصر تھا کہ کیا کروں۔

''یہ اسی نے کیا ہے!'' بھائی نے پھر کہا۔

''تیرا ککھ نہ روے ظالما... ''(تیرا کچھ نہ رہے ظالم!) رقیہ نے روتے ہوئے کہا۔''تیرا بیڑا غرق ہو... ہائے میرا بُوبا۔'' اس کے ساتھ ہی بوبے کے رونے کی آواز آئی۔ اب میرے لیے کوئی راستہ نہ تھا۔ میں نے دروازہ کھولا، صحن میں آیا، دروازہ بند کیا۔ ٹائیگر دوڑ کر میری طرف آیا اور اگلے پیر اٹھا کر میرے پیٹ پر رکھ دیے۔ عصمت نے پہلے ٹائیگر کو اور پھر مجھے دیکھ لیا۔

''وہ...'' عصمت نے تیزی سے کہا،'' آ گیا!''

میں برآمدے سے ہو کر کمرے میں داخل ہوا۔ رقیہ کمرے میں بوبے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ کمرے کی گرمی سے سب کے بدن پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ رقیہ کے چہرے پر وحشت سی تھی... شدید دکھ کا احساس تھا۔ بھائی، بھابھی اور بہنیں کھڑی تھیں۔ بھائی کے چہرے پر شدید غصہ اور بھابھی بہنوں کے چہروں پر گھبراہٹ تھی۔ بوبا رقیہ کی گود میں صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے رو رہا تھا۔

''بوبے کی لٹ تو نے کاٹی ہے؟'' بھائی نے سختی سے کہا۔

''ہاں،'' میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا،''میں نے ہی کاٹی ہے۔''

میرے اس اعتراف پر کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ بُوبا بھی سہمی سہمی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں سب کے چہروں پر خوف سا نمایاں ہوا۔ پھر رقیہ پھٹ پڑی۔

''کیڑے پڑیں تیرے ہاتھوں میں...'' وہ چیخی۔''کتے کی موت مرے تو... ظالما... میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟''

''رقیہ...'' بھابھی نے قدرے سختی سے کہا، لیکن رقیہ نے جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔

''اللہ کرے تو آج ہی مر جائے!'' رقیہ نے رونا شروع کر دیا۔''ہاتھ ٹوٹیں تیرے... کیا دشمنی تھی مجھ سے؟ اسی لیے پوچھ رہا تھا کہ یہ رکھ کیا ہوتی ہے؟ ہائے میرا بُوبا!'' رقیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بوبے کو زور سے اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچا۔ میری طرف جلتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''کیا دشمنی تھی میرے ساتھ؟''

''تجھ سے اس کی کوئی دشمنی نہیں ہے!'' بھائی کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ ''میں جانتا ہوں اس کی دشمنی کس کے ساتھ ہے۔''

رقیہ نے پھر ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''وے ظالما، میرے بوبے کی رکھ کیوں کاٹی ہے؟''

''ظالم میں نہیں،'' میں نے ہمت کرتے ہوئے کہا، ''ظالم وہ پیر ہے جس نے بوبے جیسے لاکھوں بچوں کو اپنی ہوس کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ میں نے تو بوبے کو آزاد کیا ہے۔''

بھائی میرے سامنے آئے۔ چہرے پر شدید غصہ اور ماتھے پر شکنیں تھیں۔

''چین سے جینے دے گا ہمیں کہ نہیں؟'' بھائی کا زناٹے دار تھپڑ میرے بائیں رخسار پر پڑا۔ ''کیوں کاٹی ہے لٹ — کیا تکلیف تھی تجھے؟''

اس سے پہلے کہ میرے چہرے پر دوسرا تھپڑ پڑتا، عصمت دوڑ کر میرے اور بھائی کے بیچ میں آ گئی۔ بھابھی نے بھائی کا بازو پکڑ کر انھیں پیچھے کھینچا۔ مجھے چہرے پر تھپڑ کی ضرب کا احساس جلن سے ہوا۔ میرا بایاں رخسار جل رہا تھا۔

''کیا کر رہے ہیں آپ!'' بھابھی نے تیزی سے کہا۔

''بھائی جان... بھائی جان...'' عصمت تقریباً چیخی۔

''ہٹ جا آگے سے!'' بھائی کا غصہ انتہا کی طرف جا رہا تھا۔ ''میں آج اسے نہیں چھوڑوں گا۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' بھابھی نے کہا، ''کیا ہوگا... کیوں معاملہ بگاڑ رہے ہیں؟''

''تو نہیں جانتی!'' بھائی نے بھابھی کی طرف مڑتے ہوئے کہا، ''تو کچھ نہیں جانتی۔ اس نے ہم سب گھر والوں کو کتنا ستایا ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک اس نے ہمیں چین نہیں لینے دیا۔ ابا جی کو، اماں جی کو، مجھے... تو کچھ نہیں جانتی... اس نے کیا کیا تماشے کیے ہیں... ہمیں کتنا پریشان کیا ہے... دماغ خراب ہے اس کا۔''

''ہائے میں کیا کروں!'' رقیہ نے روتے ہوئے کہا، ''صرف ڈھائی مہینے رہ گئے تھے۔ ہائے میرا بوبا... کس طرح میں نے سال گزارے ہیں... ہائے ظالم، تجھے ذرا رحم نہیں آیا۔ اب کالی بلا کو کون روکے گا؟ ہائے میرا بوبا... ظالما، تجھے کفن نصیب نہ ہو، تیری لاش میں کیڑے پڑیں۔''

''بس کر رقیہ... بس!'' باجی زیبا بولیں، ''اب کیا ہو سکتا ہے، اللہ کو یہی منظور تھا۔''

بھائی پھر میری طرف بڑھے، لیکن بھابھی نے پھر انھیں بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔

''اسے مارنے سے اب کیا ہوگا؟'' اس بار عصمت نے کہا، ''بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں، معاملہ بگڑ جائے گا۔''

''اس معاملے کو اب دبانے کی ضرورت ہے،'' بھابھی نے کہا، ''اچھالنے کی نہیں۔''

بھائی پھر بھابھی کی طرف مڑے۔ ''تو نہیں جانتی،'' انھوں نے غصے سے کہا، ''تُو تو چار دیواری میں رہتی ہے... تو نہیں جانتی اس نے میرے لیے کیا مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ یہ مصیبت آج کی نہیں... بچپن سے لے کر آج تک ایک سے بڑھ کر ایک مسئلہ کھڑا کیا ہے اس نے۔ میں نے کبھی تجھے بتایا نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم نے کیا کیا پریشانیاں دیکھی ہیں۔'' بھائی کی آواز میں طیش کم ہو گیا۔

رقیہ کا رونا سسکیوں میں بدل چکا تھا۔ بھابھی حیرت سے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھیں، پھر انھوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے گھر کے لیے بہت بڑی مشکلیں پیدا کی ہوئی ہیں۔

''یہ پانچ سال کا تھا،'' بھائی نے کہا ''شاید پانچ برس سے بھی کم عمر کا تھا، جب یہ گجرات شہر سے بڑی آپا کے سسرال جوڑے جلال پور[29] اکیلا بھاگ گیا تھا، گجرات سے کم از کم بارہ میل دور... اماں جی رو رو کر بے ہوش ہو گئی تھیں... وہ یہی سمجھتی تھیں کہ اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔ تجھے کچھ معلوم نہیں... کھوڑ میں اس نے احمدال گاؤں کے ایک چرواہے[30] کو ہاکیاں مار مار کر لہولہان

29۔ بڑی آپا گجرات شہر سے بارہ میل دور ایک گاؤں جوڑے جلال پور میں ایک سکول ماسٹر سے بیاہی گئی تھیں۔ ایک بار دریائے چناب میں سیلاب آیا۔ پانی گجرات شہر میں گھس آنے پر ہم قدرے بلندی پر واقع آپا کے سسرالی گاؤں چلے گئے۔ مجھے راستہ یاد ہو گیا۔ واپسی پر مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں اکیلا ہی آپا کے گاؤں کی سمت چلا گیا۔ گجرات میں ایک فوجی ہوائی اڈہ تھا۔ وہاں ایک سائیکل سوار نے مجھ سے پوچھ کر کہ میں نے کہاں جانا ہے، مجھے جوڑے جلال پور پہنچا دیا۔ بعد میں والد صاحب ایک فوجی ٹرک پر مجھے واپس گجرات لے آئے۔

30۔ جب والد صاحب کھوڑ میں تھے تو ہمارے خاکروب سمیرا کی بیٹی بملا ہم عمر ہونے کی وجہ سے میری دوست بن گئی تھی۔ ان دنوں میں سات برس کا تھا۔ سمیرا تقسیم ہند سے پہلے ہی کمپنی کی کالونی میں رہتا تھا۔ بملا کی ماں مر چکی تھی۔ ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ گھر والے ہماری دوستی کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ ہریجن ہندو تھی۔ لیکن میں نے دوستی نہ چھوڑی۔ ہماری دوپہریں درختوں کے نیچے گزرا کرتی تھیں۔ جب بملا سترہ برس کی ہوئی تو سمیرا نے خوفزدہ ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا نام غلام محمد رکھا گیا اور بملا بھی کسی اسلامی نام کے ساتھ بلکسر کے قریب ایک گاؤں بکھاری کے رہنے والے بس ڈرائیور کی بیوی بن گئی۔

کر دیا تھا، صرف اس بات پر کہ اس نے ہمارے ہندو خاکروب کمیرا کی بیٹی بملا کو چوہڑی کہہ دیا تھا۔ احمدال کے دیہاتیوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا، پولیس کو لے آئے تھے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہمارے پڑوسی ولی اللہ خان [31] صاحب کی تھانیدار سے گہری دوستی تھی، ورنہ یہ حوالات میں ہوتا۔ ابا جی کو چرواہے کا علاج کمپنی کے ہسپتال میں کرانا پڑا تھا اور اس کے باپ کو تیس روپے بھی دینا پڑے تھے۔''

بھائی رکے... پھر انھوں نے آہستہ لہجے میں بھابھی سے کچھ کہا جو میں سن نہ پایا۔ پھر انھوں نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں غصہ موجود تھا۔

''ہمارے لیے یہ مسلسل پریشانی کا باعث رہا ہے۔ بلکسر میں یہ وہاں کے، اس علاقے کے بڑے پیر قدرت شاہ [32] کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا اور اس کی بے عزتی کر دی تھی، صرف اس بات پر کہ ہماری نوکرانی نارو نے پیر کے جوتوں پر سر رکھ دیا تھا۔''

رقیہ کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''پر بھائی جان،'' باجی زیبا بولیں۔ ''کیا غلط کیا تھا اس نے؟ کسی آدمی کو سجدہ کرنا شرک ہے،

31۔ ولی اللہ خان کھوڑ میں ہمارے پڑوسی تھے۔ میں ان کا چہیتا تھا۔ ہر معاملے میں وہ میری ڈھال بن جایا کرتے تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے احسان اللہ خان کی شادی بھارتی فلم انڈسٹری کے نامور ہیرو دلیپ کمار (یوسف خان) کے تایا آغا جی کی بیٹی سے ہوئی تھی جنھیں میں شہناز آپا کہا کرتا تھا۔ والد صاحب کی ولی اللہ خان صاحب اور آغا جی سے گہری دوستی تھی۔ ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں ہر سال پشاور شہر میں آغا جی کے گھر جایا کرتے تھے۔ پشاور کے قصہ خوانی بازار میں آغا جی کی خشک میووں کی دکان تھی اور عقب میں ان کا دومنزلہ مکان تھا۔ آغا جی دوسرے بچوں کے مقابلے میں مجھے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ انگلی پکڑا کر وہ مجھے قصہ خوانی بازار کی سیر کرایا کرتے تھے۔ ہر دوپہر اور رات کو کھانے پر مجھے وہ اپنے پہلو میں بٹھایا کرتے تھے اور اس بات کا خصوصی خیال رکھتے تھے کہ میں نے ٹھیک سے کھانا کھایا ہے کہ نہیں۔

32۔ پیر قدرت شاہ بلکسر کے علاقے کا بڑا پیر تھا۔ ہماری نوکرانی نارو (اناراں) آوارہ گردی میں میری ساتھی تھی۔ سفید رنگ، گول چہرے اونچی اٹھی ہوئی ناک اور معمولی خدوخال والی نارو ایک دن کمپنی کے پاور ہاؤس کے پاس اپنی جیپ کے قریب کھڑے پیر قدرت شاہ کو دیکھ کر بھاگی اور اس کے جوتوں پر سر رکھ دیا۔ میں غصے سے آگے بڑھا اور پیر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ''کیا اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہو؟'' میں نے غصے میں کہا۔ ''تمھیں شرم نہیں آتی... اپنے جوتوں پر دوسروں کا ماتھا رکھواتے ہو۔ کیا اس سے تمھاری شان بڑھ جاتی ہے؟ تم صرف ایک آدمی ہو، اور بے شرم آدمی ہو۔'' اس شام ہمارے بنگلے کے سامنے پیر قدرت شاہ کے مریدوں نے بہت ہنگامہ کیا تھا۔

کفر ہے۔اس نے پیر کو شرک ہی سے تو روکا تھا... کیا غلط کیا تھا اس نے؟''

''غلط صحیح میں نہیں جانتا۔'' بھائی نے مڑ کر باجی زیبا کی طرف دیکھا۔ان کی آواز میں اب غصے کی جگہ پریشانی تھی۔''تو نہیں جانتی اس نے اب میرے لیے کیا مصیبت کھڑی کر دی ہے... بھول گئی ہے تو... پیر قدرت شاہ کے مرید ہمارے بنگلے کے آگے جمع ہو گئے تھے۔ہجوم مرنے مارنے پر تیار ہو گیا تھا۔اگر کمپنی کا لیبر افسر میجر سرور صورتحال کو نہ سنبھالتا تو شاید یہ اسی دن قتل ہو جاتا۔''

''قتل تو یہ اب ہو گا... '' رقیہ نے غصے سے کہا،''اگر میرے بُوبے کو کچھ ہوا تو یہ بھی نہیں بچے گا۔''

''رقیہ!'' بھابھی نے غصے سے کہا۔

''باندھ سامان!'' بھائی نے پھر غصے بھری آواز میں کہا۔میری طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں طیش سا نمایاں ہوا۔''سامان باندھ اور دفع ہو جا یہاں سے۔''

''اس سے کیا مصیبت ختم ہو جائے گی؟'' بہن عصمت بولی۔''آئی ہے تو مقابلہ بھی کرنا ہو گا۔''

''ہائے میری بدبختی!'' رقیہ نے کہا،'' کیوں آئی یہاں کام کرنے،مر رہتی آپا کے پاس... ہائے،میرے بُوبے کو اب کالی بلا سے کون بچائے گا۔'' رقیہ کی آواز میں خوف تھا۔''ڈھائی مہینے رہ گئے تھے... ایک رکھ کا سہارا تھا،وہ اس ظالم نے کاٹ دی ہے... اب میں کیا کروں گی... میرا بُوبا۔''

بھائی تیزی سے رقیہ کی طرف مڑے۔

''گولی مار کالی بلا کو!'' ان کی آواز میں غصہ موجود تھا۔'' تجھے کالی بلا کی پڑی ہے اور میں...'' بھائی کی آواز میں غصے کے مقابلے میں پریشانی بڑھ گئی۔'' کیسے سنبھالوں گا پیر نور شریف کے مریدوں کو... ہزاروں کی تعداد میں ہیں اس علاقے میں۔'' ان کی آواز دھیمی پڑ گئی۔پھر وہ رقیہ کی طرف ایک دو قدم بڑھے۔''دیکھ رقیہ... ''انھوں نے بہت دھیمی آواز میں کہا،''اب تیری،بوبے کی،میری اور میری بیوی کی بھلائی اسی میں ہے کہ یہ بات کسی کو پتا نہ چلے۔بہنیں اور یہ پاگل...'' بھائی نے میری طرف اشارہ کیا،''یہ تو چلے جائیں گے،ہم نے یہیں رہنا ہے۔بات پھیل گئی تو پیر نور شریف کے مرید تجھے اور بوبے کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔'' رقیہ کے چہرے پر دہشت سی نمودار ہوئی۔ ''ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ یہ بات چھپی رہے۔میں معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔اپنے غصے پر قابو رکھ... کسی کو اس بات کا پتا نہ چلے،میں نقلی بالوں کا انتظام کرتا ہوں۔''

بھائی کمرے سے برآمدے میں گئے اور پھر گھر سے باہر چلے گئے۔

''ہائے بی بی جی۔۔۔'' بھائی کے جاتے ہی رقیہ نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ''کیا کروں گی میں نقلی بالوں کا! اصلی رَکھ تو گئی۔۔۔ کون بچائے گا کالی بلا سے میرے بوبے کو!''

بہن زیبا رقیہ کی طرف بڑھی۔ اس کے قریب بیٹھ کر بہن زیبا نے اپنا دایاں بازو اس کے گلے میں حمائل کیا۔ رقیہ کی گود میں بوبا بہت سہما ہوا تھا، لیکن اس نے رونا چھوڑ دیا تھا۔ سہمی سہمی نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

''ہائے میرا بُوبا۔۔۔'' رقیہ نے روتے ہوئے بہن زیبا کی سمت دیکھا۔

''کچھ نہیں ہوگا تیرے بوبے کو،'' بہن زیبا نے کہا۔ ''تو فکر نہ کر، اللہ سب سے بڑا ہے۔۔۔ اللہ سے بڑا کوئی نہیں۔۔۔ بس اللہ کی طرف دھیان لگا۔۔۔ اللہ سے مدد مانگ۔۔۔ کوئی بدروح، کوئی کالی بلا تیرے بوبے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ میں ہر نماز کے بعد بوبے کی سلامتی کے لیے دعا مانگوں گی۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں تین مہینے تک۔۔۔ کتنی دیر ہے بوبے کے پانچ سال کا ہونے میں؟''

بہن زیبا کے اس جملے پر میں چونکا۔ رقیہ نے رکھ کے متعلق بہنوں کو بھی سب کچھ بتا رکھا تھا۔

''ڈھائی مہینے رہ گئے تھے۔'' رقیہ کی آواز میں اب بے بسی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں،'' بہن زیبا نے کہا، ''میں اڑھائی مہینے تک ہر روز ایک سپارہ پڑھ کر بوبے کی سلامتی کے لیے دعا مانگوں گی۔۔۔ تو فکر نہ کر، کچھ نہیں ہوگا بوبے کو۔۔۔ تو بالکل نہ ڈر۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔''

بہن زیبا نے اپنے دوپٹے سے رقیہ کے آنسو پونچھے۔ زیبا نے اپنے مذہبی رجحانات کے مطابق جو تسلی رقیہ کو دی وہ کارگر ثابت ہوئی۔ رقیہ نے رونا بند کر دیا۔ بوبے کو چوما اور پھر میری طرف دیکھا۔

''رکھ کہاں ہے؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''کہاں ہے لٹ؟'' عصمت کے لہجے میں بھی غصہ تھا۔

''وہ تو میں۔۔۔'' میرا لہجہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ ''میں نہر میں پھینک آیا ہوں۔''

میرے اس جملے پر رقیہ پھٹ پڑی۔

''رب کرے ڈوب کے مرے تو۔۔۔'' وہ قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''پیروں سے

دشمنی تھی تو میں نے کیا بگاڑا تھا تیرا؟... رب کرے تو تڑپ تڑپ کر مرے، کفن نصیب نہ ہو تجھے...''

''رقیہ!'' بھابھی غصے سے بولیں۔

''آپ کا بچہ ہوتا تو میں پوچھتی بی بی جی!'' رقیہ نے بھی غصے سے کہا،''کیسی آگ لگتی ہے ہِک (سینے) میں... ''اس نے بوبے کو سینے سے چمٹایا۔''میرے بوبے کو کچھ ہو گیا تو...'' رقیہ نے میری طرف دیکھا۔''زندہ نہ چھوڑوں گی تجھے... لُگی لتھی (لاوارث) نہیں ہوں میں... ماما چاچے ہیں میرے۔ تجھے نہیں چھوڑیں گے... جہاں بھی جائے گا، تیرے پیچھے جائیں گے۔'' رقیہ نے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کی انگلیاں زور زور سے مارنا شروع کر دیں۔

''ڈکرے (ٹکڑے) کریں گے تیرے ڈکرے۔''

''بس کر رقیہ،'' بہن عصمت نے کہا اور رقیہ نے پھر رونا شروع کر دیا۔

''چار سال نو مہینے ہو گئے ہیں،'' اس نے روتے ہوئے کہا،''اتنی سنبھال کے رکھی ہوئی تھی رکھ... اسے رحم نہیں آیا... نہر میں پھینک آیا ہے۔ کالی بلا ہے...''

''رقیہ، میں نے کہا ہے نا...'' بہن زیبا نے رقیہ کی بات کاٹ دی،''کہا ہے نا، کچھ نہیں ہوگا، باقی دن بھی گزر جائیں گے۔ دیکھو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ...''

عصمت نے مجھے دھکا دیا۔''نکل کمرے سے!'' اس نے غصے سے کہا،''بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں، تو نے سب کو پریشان کیا ہوا ہے۔''

بہن زیبا رقیہ کو قرآنی آیات سنا رہی تھی۔ میں برآمدے سے صحن میں آیا۔ ٹائیگر چھپر کے نیچے آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ میں بیرونی دروازے سے باہر نکل کر کھیتوں کی سمت چل دیا۔ چہرے پر بائیں جانب بھائی کے تھپڑ سے رخسار پر سوجن محسوس ہوئی — ڈانٹ، تھپڑ، گالیوں، بددعاؤں اور دھمکیوں کو ساتھ لیے میں نے نہر کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر قدم رکھا۔

''کہاں جاؤں؟'' میرے اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔ کچھ دور سامنے بشیر نعل بند نظر آیا جو لوٹا ہاتھ میں پکڑے چلا آ رہا تھا۔

''اوئے تئیں کدھر؟... تیرے گھر تے انتظام ہے گاوا...'' (او تو کدھر؟ تیرے گھر میں تو انتظام موجود ہے۔) بشیر نے مشرقی پنجاب کی پنجابی زبان اور مخصوص لہجے میں کہا۔ کوئی اور دن ہوتا تو

میں کوئی مزاحیہ جواب دیتا،لیکن میری ذہنی حالت ابتر تھی۔دھیما سا مسکرا کر میں اس کے پاس سے گزر گیا۔

17

نہر سے پہلے شمالی سمت، کھیتوں میں رہٹ پر مجھے بیل گھومتے نظر آئے جنھیں کسی ملیار نے ابھی ابھی جوتا تھا۔ میں رہٹ کی سمت چل دیا۔ذہن میں کچھ نہیں تھا۔بائیں رخسار کی ہڈی میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس قدر خالی الذہن تھا کہ مجھے اپنے تمام خیالات، ڈانٹ ڈپٹ، پھٹکار، گالیوں، بددعاؤں اور دھمکیوں کے ساتھ تیز آندھی میں اڑتے ہوئے خشک پتوں کی مانند دور جاتے محسوس ہو رہے تھے۔میری تمام سوچ جامد سی ہو چکی تھی۔

کنویں پر جا کر میں نے منھ دھویا۔رہٹ کی چوں چوں چیں پھٹ اور پانی کی مسلسل گرتی ہوئی دھار دیکھ کر مجھے اپنے گلے میں پھانس کا احساس ہوا۔ میں نے بہت سا پانی پیا اور نہر کی سمت چلا گیا۔کھیتوں میں نباتات کی مہک تیر رہی تھی۔سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مجھے بار بار اپنی سانس کھنچی کھنچی سی محسوس ہو رہی تھی۔کھیتوں میں سورج کی دھیمی کرنوں سے نباتات کا رنگ یقیناً گہرا سبز ہوگا،لیکن مجھے ہر شے دھندلی محسوس ہو رہی تھی۔اس دھندلائی ہوئی فضا میں میں صورتحال کو سمجھنے کے لیے سوچنا چاہتا تھا،لیکن یوں لگتا تھا کہ میری سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی ہے... اتنی بے عزتی... بھائی نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ بھائی کا جملہ بار بار میرے ذہن کے خالی گنبد میں گونج رہا تھا:''سامان باندھو... دفع ہو جاؤ۔''

میں آہستہ آہستہ نہر کی سمت جا رہا تھا— مایوس، افسردہ، بےبسی کے اذیت دہ احساس کے ساتھ۔میرے قدم آہستہ آہستہ بوجھ کی مانند اٹھ رہے تھے۔

''دکھ انسان کا محسن ہے،'' بےحسی کے گنبد میں گونجتی آواز اور اس سے پیدا ہونے والے دکھ کے شدید احساس نے جیسے دراڑ ڈالی۔''رنج ہی انسان کو بےحسی کی اس گراں جانی سے نجات دلاتا ہے جو بظاہر محسوس نہیں ہوتی،لیکن دل ودماغ کی گہرائیوں اور غیر مرئی سطحوں پر اس لاوے کی طرح جم جاتی ہے جو کسی مردہ آتش فشاں کی تہہ میں کروٹیں لیتا رہتا ہے۔''

نہر تک پہنچتے پہنچتے میرے ذہن پر موجود بے حسی کا گنبد تڑخ چکا تھا۔ میرا سوچنے کا سلسلہ پھر سے پیش آنے والے واقعات سے جڑ رہا تھا۔ میری سمجھنے کی صلاحیت لوٹ تو آئی تھی لیکن دکھ کا یہ احساس اس گہرے زخم کی طرح تھا جس میں زخم لگانے والے ہتھیار کے ٹوٹے ہوئے ذرے... آہنی ذرے سوزش پیدا کر رہے ہوں، چبھ رہے ہوں، اور ان میں نمو پاتا ہوا ز ہر زخم کو جلا رہا ہو۔

''میں نے کیا جرم کیا ہے؟'' میں کھیتوں کے کنارے پر، پگڈنڈی سے نہر کی سمت بلند ہوتی ہوئی چڑھائی پر قدم رکھ چکا تھا۔ ''کیا جرم کیا ہے میں نے جس کی پاداش میں مجھے یہ سب کچھ سہنا پڑا ہے؟'' میں نہر کے کنارے پر کھڑا ہو کر ان دھاروں کو دیکھنے لگا جو سطحِ آب پر آہستہ رو، لیکن سطح کے نیچے بہت تیز ہوتے ہیں۔ ''درست ہے، میں نے ایک ماں کو دکھ پہنچایا ہے، لیکن یہ دکھ اُس دکھ سے کہیں چھوٹا ہے جو ان فرسودہ روایات والے پسماندہ علاقے میں ماؤں کو صدیوں سے مل رہا ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا... معاشرے میں پھیلی تاریکی میں درندوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو، ان کے خون آلود تیز پنجوں کو، ان کے ہڈیاں توڑتے ہوئے دانتوں کو دکھانے کی کوشش میں پہلا قدم ہی تو اٹھایا ہے۔ کیا جرم کیا ہے میں نے؟ سادہ لوح انسانوں کو صدیوں سے اپنے مذموم ہتھکنڈوں سے لوٹنے والے ان نقاب پوش ڈاکوؤں کے نقاب اتارنے کی کوشش ہی تو کی ہے۔ کیا یہ جرم ہے؟ میں نے ان عیار لوگوں کے خلاف ایک چھوٹا سا اقدام ہی تو کیا ہے جو سیدھے سادے دیہاتیوں کو مذہب کے نام پر خوف اور خودغرضی کا اسیر بنا کر اپنی تجوریاں سونے اور چاندی سے بھر رہے ہیں۔''

اچانک میرے دل پر لگے زخم میں، زخم لگانے والے ہتھیار کے آہنی ذروں نے آپس میں جڑ کر ایک اور خراش لگائی۔

''یہ سب کچھ ان مذہبی نظریات کی وجہ سے ہو رہا ہے جنھوں نے فرسودہ عقائد اور اندھی عقیدتوں کو انسانی معاشروں میں بتدریج پروان چڑھایا ہے، جو صدیوں سے اس دنیا کے انسانوں کو تاریک گہراؤ کی سمت دھکیل رہے ہیں۔ انسانوں کو خوف اور خودغرضی کا اسیر بنانے میں مذہبی نظریات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں: ان دیکھے کا خوف، سزا کا خوف، جہنم کا خوف اور پھر سب سے زیادہ فرسودہ عقائد سے انحراف پر، اندھی عقیدتوں کو نہ ماننے پر تعذیب کا خوف... ان کے خلاف آواز اٹھانے پر واجب القتل ٹھہرانا فرسودہ عقائد اور اندھی عقیدتوں کو ماننے والوں کا آخری ہتھیار ہوتا

ہے۔ دوسری جانب لالچ کی دلدل ہے: کبھی رجا، کبھی ثواب، کبھی نعمتوں کا حصول تو کبھی جنت کی آرزو... خودغرضی کے کتنے ہی روپ ہیں — اچھے کام کرو، جنت ملے گی؛ برے کام نہ کرو، دوزخ میں جلائے جاؤ گے۔ رہی عزت نفس تو اسے اس دنیا کے انسانی معاشروں میں ممنوع قرار دے دیا گیا ہے، کیونکہ انسان کی سچی عزت نفس ہوس کی تمام قوتوں کے لیے مبارز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہوس کی تمام جابر قوتوں کو یہ احساس ہمیشہ سے ہے کہ ان کی حاکمیت کو اگر کسی قوت سے خطرہ ہے تو انسان کی عزتِ نفس سے ہے جو انسان کو اس کے مقام سے گرنے نہیں دیتی... وہ کوئی برا کام کر ہی نہیں سکتا، اس پر کوئی خوف بھی نہیں ہوتا، پھر بھی وہ برے کام سے اجتناب کرتا ہے، اسے کوئی لالچ نہیں ہوتا، پھر بھی وہ اچھے کام کرتا ہے۔''

میں نہر کے کنارے پر جون جولائی کی جھلسی ہوئی گھاس پر بیٹھ گیا۔

''بچہ ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالتا کہ اس پر ان دیکھے کا خوف سائے کی طرح منڈلانے لگتا ہے۔ اس کے ننھے سے ذہن پر خوف کا گنبد قائم ہو جاتا ہے۔ یہ خوف اس کے والدین اس پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ زندگی بھر اپنے ذہن پر آہنی کٹورے کی موجودگی میں، جو اُلٹا دھر دیا جاتا ہے، خوفزدہ رہتا ہے۔ وہ آہنی کٹورے میں اسیر مچھر کی طرح چکر لگاتا رہتا ہے اور پھر اسی میں جلد یا بدیر مر بھی جاتا ہے، لیکن زندگی بھر خوف سے نجات نہیں پا سکتا۔ یہ کس قسم کے مذہبی نظریات ہیں جو انسان کو پیدائش ہی سے ہر قسم کی آزادی سے محروم کر دیتے ہیں؟ پھر خوف کا اسیر ہونے والے بچے کو لالچ سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کی تمام خواہشات کو، اس کی ذات کے گرد، اس کے وجود کے گرد حصار بنا دیا گیا ہوتا ہے... ثواب اور جنت کی خواہش میں اسیر بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے تو اس کے وجود میں خودغرضی بھی بڑی ہوتی جاتی ہے، اور جب یہ خودغرضی جوان ہو جاتی ہے تو وہ اسی لالچ کی تحریک پر ہر وہ کام کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے جس کا تعلق اس کی ذات اور وجود سے ہو۔ اس سلسلے میں، اس کے نزدیک، اچھائی برائی کا کوئی امتیاز ہی قائم نہیں رہتا۔

''یہی وہ قوتِ شر کا مقصد ہے جس نے انسانی دل و دماغ کو صدیوں سے ہوس کا اسیر بنا رکھا ہے۔ وہ تمام نظریات جو ہوس کی اساس پر قائم ہیں، انسان کی ذہنی آزادی سلب کر لیتے ہیں۔ یہ غلامی ان سے بھی مضبوطی کے ساتھ جڑی رہتی ہے جن سے منحرف ہونے پر نہ صرف اغراض سے محروم

ہونے کا، بلکہ تعذیب کا خوف بھی پیوستہ رہتا ہے۔''

مشرقی افق سے سورج بلند ہو چکا تھا۔ سورج کی کرنیں شیشم کے لمبے درختوں کی گھنی شاخوں میں دھیمی دھیمی ہوا کے جھونکوں سے جھولتے پتوں میں چمک رہی تھیں۔

''وہ بچہ جسے شعور کی پختگی سے پہلے ہی خوف اور خودغرضی کا اسیر بنا دیا جاتا ہے، عزت نفس کے احساس ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی آئندہ زندگی کا ہر لمحہ، اس کی ہر سوچ، اس کا ہر عمل یا تو خوف کے تابع ہوتا ہے یا خودغرضی کے حصار میں رہتا ہے۔''

میری سوچ میں نہر کے اندر سطح سے نیچے بہتے دھاروں کی طرح تیزی نمودار ہو رہی تھی، خیالات بظاہر آہستہ رو لیکن بباطن بہت تیز ہوتے جا رہے تھے۔

''بچہ، جو ہوش سنبھالتے ہی اپنے ذہن پر گنبد کی طرح بن جانے والے آہنی کٹورے میں مچھر کی طرح پھنس جاتا ہے اور خودغرضی کے بلوریں گنبد میں لالچی مکھی کی طرح چکر لگانے لگتا ہے، کبھی سکون محسوس نہیں کر پاتا۔ اسے چین نہیں ملتا۔ وہ بے چین مکھی کی طرح بھنبھنانے لگتا ہے، اس مکھی کی طرح جو ہر شے پر بار بار بیٹھتی ہے، جسے لالچ سکون نہیں لینے دیتا؛ پیٹ بھر جانے کے باوجود وہ ہر شے پر بھنبھناتی رہتی ہے اور اسی طرح بھنبھناتے ہوئے، چکر لگاتے لگاتے گر جاتی ہے۔ وہ مرنے سے پہلے بھی اپنے پروں کو تیزی سے جھلا کر ایک ہی جگہ گھومتی ہے اور پھر مر جاتی ہے . . . خودغرضی میں اسیر شخص کی داخلی کیفیت اسی مکھی جیسی ہوتی ہے۔ وہ بچہ جسے بچپن ہی میں خودغرضی اپنا اسیر بنا لیتی ہے، صرف اپنی ذات تک محدود ہو جاتا ہے — حاصل کا اسیر۔ نیکی بھی کرتا ہے تو صلے کی امید پر، برائی سے بچنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو سزا کے خوف سے۔ بیم و رجا اس کی زندگی میں، اس کے شعور کو دائمی شکنجے میں کس دیتے ہیں۔ اس کے ذہن میں زندگی بھر عزتِ نفس جگہ نہیں بنا سکتی۔ عزتِ نفس تو اس کے شعور کی پختگی سے پہلے ہی مر جاتی ہے — یا پھر مار دی جاتی ہے۔ مذہبی نظریات اس کی عزتِ نفس کو اس کے سنِ شعور سے پہلے ہی ہلاک کر دیتے ہیں . . . کیا یہی مذاہب انسانی فلاح کے دعویدار ہیں؟''

ہوا کے ایک جھونکے سے شیشم کی ٹہنیوں میں ارتعاش سا نمودار ہوا اور پتوں سے چھن چھن کر آنے والی کرنیں نہر کے کنارے پر سوکھی گھاس پر مرتعش ہو گئیں۔

''فطرتِ لطیف تو خود انسان کو اس کی عزتِ نفس سے آشنا کرتی ہے۔فطرت تو خود انسان کی تربیت کرتی ہے، لیکن فطرتِ شدید، یعنی قوتِ شر، ایسی تربیت کو ہمیشہ سے روکتی چلی آ رہی ہے۔ فطرتِ لطیف، یعنی قوتِ خیر، تو انسان کی ذاتِ اعلیٰ اور وجودِ ارفع سے آگاہ کرتی ہے، اسے بتاتی ہے کہ اس کا مقام کیا ہے: وہ ایک اعلیٰ اور ارفع ہستی ہے اور اسے کسی صورت میں بھی ہوس کے دو ہتھیار، خوف اور خود غرضی، اس کے ارفع مقام سے نہیں گرا سکتے۔ اس کے اچھے اعمال کسی خوف کی وجہ سے نہیں ہوتے؛ اس لیے اس کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ اسے اپنے ارفع مقام کا احساس رہتا ہے۔ اس کے اچھے اعمال کسی لالچ کی وجہ سے نہیں ہوتے — وہ تو خود غرضی سے بلند ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے اچھے اعمال کی وجہ صرف ایک ہوتی ہے کہ وہ خود اچھا ہوتا ہے اور اسے اپنے وجود کی اس اچھائی کا احساس بھی رہتا ہے۔ نہ اسے خوف ہوتا ہے، نہ لالچ نہ کوئی اور غرض . . . اس کے سامنے فطرتِ لطیف اعلیٰ انسانی اقدار اس کے اکتساب کی خاطر، روشن کر دیتی ہے۔''

میں نے نہر کے کنارے بیٹھے بیٹھے سلیپر اتارے، شلوار کو گھٹنوں تک کھینچا اور پاؤں بہتے ہوئے گدلے پانی میں ڈبو دیے . . . مجھ پر ندامت کا احساس چھا گیا۔

''کچھ بھی ہو . . . ''میں نے سوچا۔''آج میں نے ایک ماں کو تکلیف دی ہے۔ میری وجہ سے ایک ماں کو شدید دکھ سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ میں نے رقیہ کو دکھ دیا ہے . . . مجھے اس کا قطعی طور پر اندازہ نہ تھا . . . نہ جانے کیوں میں یہ بات پہلے کیوں نہیں سوچ پایا تھا کہ بچے کے سر پر موجود بالوں کا گچھا کاٹ کر میں اس کی ماں کو . . . تو ہم زدہ ماں کو شدید دکھ پہنچاؤں گا . . . مجھے پہلے اس کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کرنا چاہیے تھا . . . لیکن کیا وہ تیار ہوتی؟''

مجھے اپنے ارد گرد دھند کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے میں کسی خواب آلود کیفیت میں ہوں اور میرے چاروں سمت دھند پھیل رہی ہے، لیکن پاؤں اور گھٹنوں سے نیچے ٹانگوں پر ٹھنڈے پانی کی بہتی لہروں کے ٹکرانے سے یہ احساس بھی میرے ذہن میں موجود تھا کہ میں سویا ہوا نہیں ہوں . . . بیدار ہوں۔

دھند چاروں سمت گہری ہوگئی اور پھر مجھے اپنے سر کے اوپر، سامنے، دھند میں مسکراتا، شعاعوں میں چمکتا، گلنازی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی چمکتی مسکراتی آنکھوں میں ایسی کیفیت تھی جیسے وہ

میری پریشانی پر اضطراب میں ہو۔

''تم کیا کرتے؟ سب کچھ جانتے ہوئے کیا آنکھیں موند لیتے؟ تم جانتے ہو، بدروحوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کالی بلا ہے جس سے بچے کی جان کو خطرہ ہو۔ یہ سب خوف کے روپ ہیں۔ خوف ہوس کا ایک ہاتھ ہے، اور ہوس کائنات میں موجود قوتِ شر کا ذریعۂ کارِ بد ہے۔ یہ کارِ بد، یہ برائی، یہ بدی، انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی، حیوانیت اور درندگی سے قوتِ شر کا کارندہ بنا دیتی ہے۔ تم نے جو کچھ دیکھا وہ سب ایک ہوس کے اسیر شخص کے ہتھکنڈوں میں سے ایک ہے۔ یہ طریقے، یہ ہتھکنڈے اسے اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کا ذریعۂ معاش ہے، اس کی پرآسائش زندگی اور عیاشانہ شب و روز کا ضامن ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم اپنے ہاتھ کیوں روک لیتے؟ تمھیں یقین ہے کہ بچے کو کچھ نہیں ہوگا — بچے کو واقعی کچھ نہیں ہوگا... نہ کوئی بدروح ہے، نہ کالی بلا... یہ سب ان دیکھے خوف کے بھیانک روپ ہیں...''

دھند میں روشنی کی شعاعیں دھیمی دھیمی گردش کرتی نظر آ رہی تھیں۔ خوبصورت اور بے انتہا دلکش چہرے پر مسکراہٹ روشن تھی۔ آنکھیں بے انتہا خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔

پل بھر کے لیے میری آنکھیں بند ہوئیں۔ دوبارہ کھلیں تو روشنی کی شعاعیں میرے چہرے کے بہت قریب دھیمی دھیمی گردش کر رہی تھیں۔

''تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ بچے کی ماں کا دکھ عارضی ہے۔ یہی دکھ اس کے لیے آزادی کے ہمیشہ رہنے والے سکھ کا احساس بن جائے گا۔ تم ندامت کا بوجھ اپنے دل پر نہ رکھو۔ تم نے جو کیا یہی درست اقدام تھا۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دھند سے ایک نازک، خوبصورت انگلیوں والا ہاتھ باہر آیا ہے اور اس نے میرے اس رخسار کو سہلایا ہے جہاں مجھے بھائی نے تھپڑ مارا تھا۔ پھر مجھے اپنے بہت قریب مسکراتی ہوئی، چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں جن میں خمار آلودگی تھی۔

پل بھر کے لیے میری آنکھیں بند ہوئیں۔ دوبارہ کھلیں تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ میں نہر میں ٹانگیں لٹکائے تنہا بیٹھا تھا۔ شیشم کی چھاؤں میں خنکی تھی۔ قریبی شیشم کے تنے پر بڑے بڑے سروں والے کالے چیونٹے اوپر نیچے آتے جاتے نظر آئے۔ پھر میں نے نہر کے پانی سے پاؤں نکالے۔

کچھ دیر بیٹھا رہا۔ دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ پھر میں شیشم کی چھاؤں میں، تپشِ آفتاب سے سوکھ جانے والی گھاس اور شیشم کے گرے ہوئے سوکھے پتوں پر لیٹ گیا۔ میں رات کو بہت دیر سے سویا تھا، صبح بہت جلدی اٹھا تھا، پھر بھی مجھے نیند نہیں آئی — بس ایک غنودگی سی چھائی ہوئی تھی جس میں مجھے اپنے بیدار ہونے کا احساس بھی تھا۔

میں کتنی دیر اس کیفیت میں لیٹا رہا، مجھے یاد نہیں۔

18

سہ پہر ہو چلی تھی۔

غنودگی ہی میں ساری دوپہر گزر گئی۔ فضا میں حدت تھی۔ تیز دھوپ کی سمت دیکھنے پر آنکھیں چندھیانے لگتی تھیں۔ پورے بدن پر پسینے کی تہہ کا احساس ناگوار سا تھا۔ قمیض کمر کے پاس جسم سے چپکی ہوئی تھی۔ اسی طرح چھاتی پر بھی قمیض میں پانی کا احساس ہو رہا تھا — یہ پانی میرے پسینے کا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شیشم کے درخت کی چھاؤں آہستہ آہستہ کھیتوں کی سمت جا رہی تھی اور نہر کے مغربی کنارے کے درختوں کی چھاؤں اور سائے نہر کے مٹیالے دھاروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں اٹھا، مڑ کر کھیتوں کی طرف دیکھا۔ ہر سمت تیز چمکتی ہوئی دھوپ تمازت کا احساس دلا رہی تھی۔ اس تمازت میں بھی ایک حسنِ تمازت ہوتا ہے، جسے بیان کرنا نہایت مشکل ہے — اسے محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے نہ صبح ناشتہ کیا تھا نہ دوپہر کا کھانا کھایا تھا، پھر بھی بھوک نہیں تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں واپس جانا چاہتا تھا۔ ''نہ جانے وہاں کیا ہو رہا ہوگا،'' میں نے سوچا، ''بھائی ہسپتال سے واپس آ چکے ہوں گے... گھر جانے پر پھر اسی صورت حال کا سامنا ہوگا۔''

میں پھر نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ صبح کے واقعات ایک بار پھر اپنے شدید تاثر کے ساتھ مجھ پر جیسے حملہ آور ہوئے، لیکن یہ بات میرے لیے باعثِ حیرت تھی کہ میرے بائیں رخسار پر نہ سوجن تھی نہ ہڈی میں درد تھا۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا،'' مکمل یقین کے ساتھ میں نے سوچا۔ ''عالمِ انسانیت پر چھائی

ہوئی تاریکیوں کا شعور رکھنا جرم ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے اس غلامی کا بھی مکمل شعور ہے جس میں مذاہب نے اپنے اپنے ماننے والوں کو جکڑ رکھا ہے۔ مجھے انسانی معاشروں میں موجود دوسرے نظریات کی تاریکیوں کا بھی شعور ہے جن کی اساس خوف ہے، خودغرضی ہے۔''

مجھے اشتراکیوں کا خیال آیا۔ ان کے معاشرتی رویوں سے متعلق میں چار پانچ ناول اور شاعری کی کتابوں کے تراجم پڑھ چکا تھا۔ یہ تراجم مجھے چکوال کی میونسپل لائبریری میں مل گئے تھے۔[33] اشتراکیوں کی تحریروں سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کے معاشرتی رویے بھی خوف اور خودغرضی ہی کے تابع ہیں۔ وہ آزادی کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں، لیکن آزاد نہیں ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں۔ اکائی کی حد تک تو اسے کسی نہ کسی صورت بے ضرر مانا جاسکتا ہے، لیکن جب یہ اکائیاں ایک جگہ باہمی اشتراک سے ملتی ہیں تو یہ خوف حکمران کمیونسٹ پارٹی کا خوف بن جاتا ہے۔ وہ خودغرضی کے بھی تابع ہوجاتے ہیں۔ اسی دنیا میں سزا کا خوف اور صلے کی زبردست خواہش ان کے اذہان کو بھی بالیدہ نہیں ہونے دیتی۔ پھر بدھ ازم کے ماننے والے ہیں، جن کی تعلیمات سے بھی میں چند کتابوں کے ذریعے آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی عزتِ نفس کے حصول کے بہت قریب پہنچ کر اسے حاصل نہیں کر پاتے۔ ''ان کی حالت اس کوہ پیما کی سی ہے،'' میں نے سوچا، ''جو پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ کر برف پر پھسل جاتا ہے اور گہری گھاٹیاں اس کے لیے منھ کھول دیتی ہیں۔ خودغرضی کو ختم کرنے کے لیے بدھ کے پیروکار اپنی خواہشات ہی کو ختم کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہی سمجھتے ہیں کہ خواہشات سے نجات ہر قسم کے خوف سے نجات کا باعث ہوگی۔ خواہشات پر قابو پالینا اگرچہ عزتِ نفس کے حصول کا ذریعہ ضرور بن جاتا ہے، لیکن اس میں وہ پھسلن موجود رہتی ہے جو برفانی چوٹی کے قریب کوہ پیما کے پاؤں جمنے نہیں دیتی۔ جب عزتِ نفس کے حصول کی جدوجہد میں، یہ خوف ذہن پر مسلط ہوجائے کہ اگر خواہشات کا مکمل تیاگ نہ ہو پایا تو خواہشات کے طوفانی برفشار

33۔ ملک کے پہلے کمیونسٹ لیڈر جنرل محمد اکبر خان کے ساتھیوں نے تحصیل کی سطح پر میونسپل لائبریریوں میں سوویت یونین کے ادیبوں کی کتابیں رکھوادی تھیں۔ چکوال کی میونسپل لائبریری میں بھی مایخل شولوخوف، الیگزنڈر پشکن، میکسم گورکی اور دوستوفسکی کے ناول اور شاعری کے تراجم موجود تھے۔ جن میں سے مجھے پشکن کی ایک نظم ''بنجارے'' بہت پسند تھی۔ بعد میں ایک مولانا کی شکل وصورت والے مجسٹریٹ نے لائبریری میں موجود غیر اسلامی مواد جلا دیا تھا۔

(avalanche) کے سامنے عزتِ نفس ٹھہر نہ پائے گی اور فنا ہو جائے گی۔ یہ خوف عزتِ نفس کے حصول کو ناکام بناتا رہتا ہے۔ کوہ پیما چوٹی کے قریب پھسل کر گہری گھاٹیوں میں جا گرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ معاشروں میں بھکشوؤں کے علاوہ خواہشات کا تیاگ بہت کم لوگ ہی کر پاتے ہیں۔ خود بھکشو بھی زندگی بھر خوف ہی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کا تیاگ مکمل ہو پائے گا کہ نہیں۔ اگر ناکامی کا یہ خوف اندیشے کی مانند بدھ ازم میں نہ ہوتا تو وہ خواہشات کی موجودگی میں بھی عزتِ نفس کے حصول سے انسانی اقدار سے وہ آگاہی حاصل کر لیتے جو فطرتِ لطیف کا روشن اور لا انتہا راستہ ہے۔ خوف کی تو اصلیت ہی یہی ہے کہ وہ خود کو قائم رکھنے کے لیے نشیب میں گریز پائی رکھتا ہے۔''

میں نے کھیتوں کے پار دیکھا۔ دور مجھے گداؤ نظر آیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، میری سمت ہی آ رہا تھا۔ سات آٹھ منٹ میں وہ قریب پہنچ گیا۔

''کہاں تھے صاب؟'' اس نے دور ہی سے کہا، ''ہر جگہ دیکھ آیا ہوں۔ بی بی جی بہت پریشان ہیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا... '' گداؤ نے گہری سانس لی۔

''کیا گاؤں میں سب کو تمھاری طرح معلوم ہو چکا ہے؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں!'' گداؤ نے کہا، ''یہ بے وقوفی ہم نہیں کر سکتے صاب، اس بات کو ہر حال میں چھپانا ہے۔'' گداؤ میری سمت اس انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہتے ہوئے جھجک رہا ہے۔

''آپ کو... '' گداؤ نے خاموشی ختم کی، ''وہ بڑے صاب جی نے ہسپتال میں بلایا ہے... پہلے گھر چلیں، بی بی جی پریشان ہیں۔''

میں گداؤ کے ساتھ پگڈنڈی پر گھر کی سمت چل دیا۔ شعاعوں کی تمازت نے چند قدموں پر ہی پورے بدن پر اپنا اثر دکھایا، پسینے کے قطرے پورے بدن پر لڑھکنا شروع ہو گئے۔

''تو بھائی نے فیصلہ کر ہی لیا!'' میں نے سوچا، ''سامان باندھو اور دفع ہو جاؤ۔'' میرے ذہن میں تلخی سی ابھری۔ ''ٹھیک ہے، چلا جاؤں گا... جو مجھے کرنا تھا وہ تو میں کر ہی چکا ہوں اور مجھے یقین بھی ہے کہ بوبے کو کچھ نہیں ہوگا۔ باقی دن بھی گزر جائیں گے اور سب کو یقین ہو جائے گا کہ بچے کی جان بالوں کا گچھا نہیں بچایا کرتا۔''

مجھ پر ایک بار پھر صبح والی کیفیت طاری ہوگئی۔

''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا صاب،'' گداؤ نے کہا۔'' ٹھیک ہے ہم ہر حال میں اس بات کو چھپائیں گے، ہر طریقے سے چھپائیں گے، کسی کو پتا نہیں چلنے دیں گے — پر سہ جن سہ دشمن (سو دوست، سو دشمن)... مخبری ہوگئی تو بہت بڑی مصیبت آجائے گی...'' گداؤ پریشان سا لگ رہا تھا۔'' اچھا نہیں کیا آپ نے...''

میں خاموش تھا— کیا کہتا۔ گداؤ نے ٹھیک ہی کہا تھا:'' جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے۔''

''رقیہ بہت ڈر گئی ہے صاب،'' گداؤ نے کہا۔'' صبح سے کمرے میں بوبے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ برآمدے میں بھی نہیں نکلتی۔ ایک دوبار صحن میں گئی تو ہے لیکن بوبے کا سر ڈھانپ کے... ڈرتے ڈرتے... کھانا بی جی نے خود بنایا ہے۔ رکھ تو کٹ چکی ہے... ڈر تو لگے گا صاب جی۔''

''کیا تم بھی بدروحوں اور کالی بلا سے ڈرتے ہو؟'' میں نے گداؤ سے پوچھا۔

''ڈر تو ہے صاب،'' گداؤ نے کہا، اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چلتے چلتے میرا ایک قدم اٹک سا گیا ہے، لیکن میں نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے چلنا شروع کر دیا۔

''یہ بات چھپی تو نہیں رہے گی...'' اندیشے سے میری ٹانگوں میں دھیمی سی کپکپاہٹ نمودار ہوئی۔'' یہ بات پیر نور شریف تک پہنچ جائے گی...''

مجھے ایک لمحے ہی میں نہر کے کنارے ذہن میں ابھرنے والے خیال نے سنسنا دیا۔

''خوف کی تو اصلیت ہی یہی ہے کہ وہ خود کو قائم رکھنے کے لیے نشیب کی سمت گریزپا ہوتا ہے۔'' مجھے پورے بدن میں سنسناہٹ کے ساتھ کپکپاہٹ بھی محسوس ہوئی۔'' اگر پیر نے خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے نشیب کی سمت گریزپائی اختیار کی تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے، اپنی دہشت قائم رکھنے کے لیے، اپنے مذموم کاروبار کے لیے، وہ کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ اگر پیر نے بوبے کو مروا دیا تو...'' میرے بدن میں جھرجھری سی نمودار ہوئی جو کپکپاہٹ سے کئی گنا زیادہ تھی۔'' اگر پیر نے اپنے پیشہ ور سزا یافتہ ملنگوں کے ذریعے بوبے کو مروا دیا تو... اڑھائی مہینے باقی ہیں... اور بھائی مجھے یہاں سے بھیج دینا چاہتے ہیں۔''

صبح والی کیفیت میں اب ڈانٹ پھٹکار، گالیوں، بددعاؤں اور دھمکیوں کے ساتھ بھیانک

اندیشے نے بھی میرے ذہن پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔

''میں ڈرپوک نہیں ہوں صاب جی . . . '' گداؤ ابھی تک میرے سوال میں الجھا ہوا تھا۔ ''لیکن کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''پیرنور شریف خود بھی تو کالی بلا بن کر بوبے کو مروا سکتا ہے،'' میں نے کہا اور گداؤ چلتے چلتے رک سا گیا۔

''کیا؟'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''کالی بلا مارے نہ مارے،'' میں نے کہا،'' اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے، رکھ کو سچی ثابت کرنے کے لیے، اپنی دھاک جمائے رکھنے کے لیے، سونے چاندی کی نذر کے لیے — وہ آپ بھی تو بوبے کی جان لے سکتا ہے۔''

گداؤ کے چہرے پر خوف نمایاں ہوا۔ اس کے ہونٹ دو تین بار ہلے، لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ بھائی کا گھر نزدیک آ گیا۔

''ڈاکٹر صاب نے . . . '' گداؤ نے خوفزدہ آواز میں کہا،'' مجھے ڈاکٹر صاب نے کہا ہے کہ میں نقلی بالوں کا انتظام کروں، لیکن میں نے انھیں کہا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گلنازی اکثر بوبے کا منھ دھلواتی ہے اور ساتھ ہی رکھ بھی دھو کر اسے کنگھی کیا کرتی ہے۔ نقلی رکھ پکڑی جائے گی . . . یہ آپ نے اچھا نہیں کیا صاب . . . ''

میں خاموش رہا۔ میرے ذہن میں اب صرف بوبے کی سلامتی کی فکر سب خیالات پر چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے میں قدرے گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ چق لگے برآمدے میں رقیہ کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ہاتھ والا پنکھا لیے بیٹھی تھی۔ بوبا اس کی گود میں تھا۔ رقیہ نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ میں تیزی سے کمرے میں چلا گیا۔

''کہاں تھے تم؟'' بہن عصمت نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ باجی زیبا اٹھ کر برآمدے میں چلی گئیں۔'' ایک تو ہم سب صبح سے پریشان ہیں، ایک تم صبح سے غائب ہو۔''

''رقیہ صبح سے رو رہی ہے،'' بھابھی نے کہا۔'' تسلیاں دیتے دیتے ہم تھک گئے ہیں۔''

باجی زیبا ایک ٹرے میں کھانا لے آئیں۔ مجھے بھوک نہیں تھی، لیکن روایتی انداز میں ''مجھے بھوک نہیں'' کہنا مجھے اچھا نہ لگا۔ آدھی روٹی کھا کر میں نے پانی پیا۔

''صبح سے تم نے کچھ نہیں کھایا،'' بھابھی نے کہا۔

''بس بھابھی،'' میں نے کہا،''جی نہیں چاہتا، اور پھر بھائی جان نے مجھے ہسپتال میں بلایا ہے۔''

''شام کو بلایا ہے،'' بھابھی نے کہا۔''بہتر ہے تم کچھ دیر سو جاؤ۔''

''میر صاحب کی طرف چلے جاؤ،'' عصمت نے کہا،''اس ذہنی کھنچاؤ میں تمھیں نیند کہاں آئے گی۔''

''نہیں، میں . . . '' میں نے کہا،'' پڑھنے کا موڈ نہیں ہے میرا۔''

''تو سو جاؤ،'' بھابھی نے کہا اور برآمدے سے پھر رقیہ کی سسکیاں سنائی دیں۔

''میں ذرا نہر پر جا رہا ہوں،'' میں نے کہا۔''وہاں سے ہسپتال چلا جاؤں گا۔''

''دن بھی تو تم نے وہیں گزارا ہوگا،'' بہن عصمت نے کہا۔

''نہر کے کنارے درختوں کی چھاؤں بہت ٹھنڈی ہوتی ہے،'' میں نے کہا اور آہستگی سے کمرے سے برآمدے میں آیا۔ رقیہ اور بوبے کی سمت دیکھے بغیر میں صحن میں آیا۔ ٹائیگر ہینڈ پمپ کے پاس چھاؤں میں بیٹھا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ میں دروازے سے نکل کر کھیتوں کی سمت چل دیا۔

''شام کو کیوں بلایا ہے؟'' میں نے نہر کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر پاؤں رکھتے ہوئے سوچا۔

''واپس بھیجنا ہے تو ابھی بھی بھابھی کہہ سکتی تھیں . . . یہ تو اب طے ہے کہ مجھے یہاں سے آج یا کل جانا ہی ہوگا . . . لیکن اگر بچے کی جان کو پیر کی طرف سے خطرہ لاحق ہوگا تو بھائی اسے کیسے بچائیں گے . . . ممکن ہے مجھے بھائی واپس جانے کے لیے نہ کہیں — کوئی اور بات سوچ رکھی ہو انھوں نے۔ میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ درخت کے تنے کی طرح ہیں — دن بھر انھیں مجھ پر غصہ آیا ہوگا لیکن ان کے دل میں مجھے تھپڑ مارنے پر ندامت بھی رہی ہوگی۔''

گداؤ کی باتوں سے مجھے یہ تو پتا چل ہی چکا تھا کہ بھائی نے اسے اعتماد میں لے لیا ہے۔ وہ مجھ سے ایک دو بار پہلے بھی اپنے بھروسے کا ذکر کر چکے ہیں کہ گداؤ بہت پرخلوص ہے اور اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے — میراثی ہونے کے باوجود وہ کسی بات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔

''شاید بھائی مجھ سے یہ کہیں کہ میں رقیہ کے سامنے کم سے کم جاؤں،''میں نے سوچا اور پھر خود ہی اپنے اس خیال کی تردید بھی کردی۔''میں پہلے ہی گھر پر کہاں رہتا ہوں۔ میری عادت ہی نہیں گھر رہنے کی۔ کھوڑ، بلکسر اور چکوال میں میں پہلے ہی سے آوارہ گرد مشہور ہوں۔ چار دیواری میں میرا دم گھٹتا ہے۔ اگر بھائی نے مجھے رقیہ کے سامنے نہ آنے کا کہا تو یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی... بھابھی یہ تو نہیں پوچھ سکیں گی کہ دن بھر کہاں رہے؟''

گرمی کا احساس ڈھلتی سہ پہر میں بہت زیادہ تھا۔ خصوصاً پسلیوں سے جب کوئی پسینے کا قطرہ جسم پر لڑھک کر کمر سے نیچے کی سمت جاتا تھا تو ناگواری سی محسوس ہوتی تھی۔ نہر کا کنارہ آ گیا۔ میں اب اس جگہ کھڑا تھا جہاں میں نے پہلی بار گھوڑے کو شیشم کی شاخوں سے باندھا تھا اور نہر میں چھلانگ لگائی تھی... جہاں گلنازی کی سہیلی نوراں، میرے دیکھنے سے پہلے ہی، کرتا اتار کر آدھی ننگی ہوگئی تھی... میں گھاس پر بیٹھ گیا۔ میرے ذہن پر بُو با چھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں گھاس پر لیٹ کر شیشم کے گھنے پتوں کو دیکھنے لگا۔ نہر کے مغربی کنارے کے درختوں کے سائے لمبے ہو کر مشرقی کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ میرا چہرہ دھوپ میں تھا۔ میں اٹھ کر پھر نہر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

بے چینی کی کیفیت کا کوئی نام نہیں ہوتا کہ اسے لے کر انسان اپنی بے چینی کا مناسب اظہار کر سکے۔ ہوا کے گرم جھونکوں سے نہر کے پانی پر، لہروں میں کچھ ارتعاش تھا۔ درختوں کے سائے گدلے پانی پر مچھلیوں اور کچھوؤں کی طرح تیرتے محسوس ہو رہے تھے۔ درختوں پر چند کوّوں نے شور مچا رکھا تھا۔ سورج کا سفر مغرب کی سمت جاری تھا۔

''خبر چھپی تو نہ رہے گی،'' میں نے سوچا۔''کسی صورت بھی نہیں۔ ہر شام گلنازی بھائی کے گھر روٹیاں دینے آتی ہے — وہ جا کر ماں کو بتادے گی۔ ماسی جیراں نے اگر اپنی ایک رشتے دار عورت کو بھی یہ بات بتادی تو اگلے دن پورے جھاوریاں میں یہ بات پھیل چکی ہوگی۔ پھر یہ خبر جھاوریاں سے نکل کر پورے علاقے میں پھیل جائے گی۔ پیر کسی صورت بھی خود کو جھوٹا ہوتے نہیں دیکھ پائے گا۔ وہ بُوبے کو فوراً مروادے گا، کیونکہ رکھ تو کٹ چکی ہے اور اس کی کالی بلا کو روکنے والی کوئی شے تو ہے نہیں۔ پھر وہ دیر کیوں کرے گا! فوراً ہی، چند دنوں ہی میں بچے کو مروادے گا... خبر کو پھیلنے سے روکنا بہت مشکل ہوگا۔ اگر بھابھی نے ماسی جیراں اور گلنازی کو اعتماد میں لے بھی لیا تو بھی فیکے (رفیق) نائی کو

کون رو کے گا؟ وہ ہر مہینے بُو بے کا رکھ کے علاوہ موذن کے لیے آتا ہے۔ اسے اجرت میں دو آنے ملتے ہیں۔ وہ اپنی دوئی کی خاطر، شک میں مبتلا ہو کر سارا کام خراب کر دے گا۔''

میں کچھ دیر مغربی کنارے کے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آنے والی کرنوں کو دیکھتا رہا جو سیدھی لکیریں سی بنا کر نہر کے گدلے پانی پر اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر مجھ پر میرا اندیشہ خوف بن کر اترا۔

''خبر جیسے ہی پیر نور شریف تک پہنچے گی، اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ جائے گا کہ وہ بُو بے کو مروا دے،'' میں نے گھبراہٹ میں سوچا،'' کیونکہ گداؤ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ پیر نے یہ بھی مشہور کر رکھا ہے کہ بدروحوں سے تو وہ بچے کو اور طریقوں سے بچا سکتا ہے، لیکن پانچویں برس کالی بلا سے رَکھ کے بغیر وہ بچے کو نہیں بچا سکتا... پیر بُو بے کو مروانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اڑھائی مہینے رہ گئے ہیں، لیکن وہ دیر نہیں کرے گا— بہت جلد بو بے کو مروائے گا۔ وہ یقیناً اپنے جرائم پیشہ ملنگوں کے ذریعے ہی بچے پر حملہ کرائے گا... اس کا طریقِ کار کیا ہوگا؟''

میرے ذہن میں کئی متوقع طریقِ کار آئے اور میں نے ہر طریقِ کار سے بچنے کے لیے دفاعی تدابیر بھی سوچنا شروع کر دیں۔

''کیا بھابھی اور بہنیں کسی بہانے سے رقیہ کو ساتھ لے کر والد صاحب کے پاس کھوڑ چلی جائیں؟ لیکن کیا رقیہ مانے گی، اور اڑھائی مہینے بعد رکھ کاٹنے کے وقت پر وہ کیا بہانہ بنائے گی؟ اس وقت بھی تو ہنگامہ ہو سکتا ہے۔ رکھ تو پیر کو نذرانہ دے کر ہی کاٹی جاتی ہے۔ پیر اس موقعے پر بھی تو کوئی مذموم حرکت کر سکتا ہے... یہ تو طے ہے کہ پیر اپنے چھٹے ہوئے بدمعاشوں ملنگوں کے ذریعے ہی بُو بے کو مروانے کی کوشش کرے گا... وہ کس اندار سے حملہ کر سکتے ہیں؟ بوبا سارا دن گھر پر ہی رہتا ہے، اور اب تو رقیہ کسی حالت میں بھی اسے گھر سے باہر نہیں لے کر جائے گی— وہ کالی بلا کے خوف سے بو بے کو چھپائے گی۔ ملنگ کیا کریں گے؟ ان میں اتنی جرأت تو نہ ہوگی کہ وہ ایک سرکاری ڈاکٹر کے گھر میں گھس کر بچے پر حملہ کریں— ایسی حرکت تو ان کا مکار پیر بھی انھیں نہیں کرنے دے گا۔ وہ بیرونی دروازے سے کوئی زہریلی چیز بو بے کو کھانے کے لیے دے سکتے ہیں، رقیہ سے یہ کہہ کر کہ یہ مٹھائی پیر کے دربار کی ہے اور بچے کے لیے ہے۔ بعد میں وہ مکر سکتے ہیں کہ انھوں نے تو کوئی شے

کھانے کو نہیں دی۔۔۔ اس صورت حال سے تو بچنا مشکل نہیں۔ رقیہ کو منع کیا جا سکتا ہے کہ وہ بوبے کو باہر کی کوئی چیز کھانے کو نہ دے، چاہے وہ ملنگ ہی کیوں نہ دیں۔ گداؤ ہر روز بازار سے دودھ لے کر آتا ہے۔ ملنگ دودھ بیچنے والے کی بالٹی میں تو زہر ملا نہیں سکیں گے۔۔۔ ان کا طریقِ کار کیا ہوگا؟ اب اس بات سے تو انکار ممکن ہی نہیں کہ پیر نور شریف، خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے اور اپنی دہشت قائم رکھنے کے لیے، بوبے کو مروانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔''

اچانک ایک خیال میرے تھکے ہوئے مایوس ذہن کی تاریکی میں جگنو کی طرح چمکا۔ یقیناً میری آنکھیں بھی چمکی ہوں گی۔ میں فوراً اٹھا اور ہسپتال کی طرف چل دیا۔

19

گھر کے سامنے سے گزر کر میں ہسپتال کی سمت جانے والی سڑک پر پہنچا اور آہستہ آہستہ قدموں سے متوقع صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے چلنے لگا۔ شام ہو رہی تھی۔ تنور پر ماسی جیراں دوپٹے سے سر باندھے روٹیاں لگا رہی تھی۔ ارد گرد لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں نوراں بھی تھی اور موٹی کالی شریفاں بھی۔ شریفاں کے قریب ایک لمبوترے چہرے والی قدرے صاف رنگت والی لڑکی مجھے آتا دیکھ کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ لمبی ناک والی اس لڑکی نے آنکھوں میں بہت زیادہ سُرمہ ڈالا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی اس لڑکی کو میں پہلے بھی تنور پر دیکھ چکا تھا، لیکن کبھی اس کی طرف توجہ ہی نہ گئی تھی۔ گلنازی کی تلاش میں میری نگاہیں اس کی سمت چلی گئی تھیں۔ میں نے فوراً تنور کی دوسری جانب دیکھا— گلنازی وہاں بھی نہیں تھی۔ نوراں ہمیشہ کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی— نوراں اس انداز سے دیکھتی تھی کہ میں گھبرا سا جاتا تھا۔ جب سے نہر پر وہ میرے سامنے آدھا جسم ننگا کر چکی تھی، مجھے اس سے گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ نوراں نے مجھ سے نظریں ہٹائیں اور ماسی جیراں کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ تو اچھی بات ہے،'' میں نے سوچا، ''گلنازی تنور پر نہیں ہے، ورنہ آج میرا حال دیکھ کر، میرا اترا ہوا مایوس چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیا سوچتی۔۔۔''

ہسپتال کے صحن میں بچھی کرسیوں پر بھائی اور میر صاحب بیٹھے تھے۔ دونوں کے چہروں پر

پریشانی تھی۔ بخشو کہیں بھی نظر نہ آیا۔ شاید بھائی نے اسے کہیں بھیج دیا تھا۔ میں ان کے قریب گیا۔ بھائی کے چہرے پر غصے سے شکنیں سی ابھریں جو جلد ہی پریشانی میں بدل گئیں، جس میں مایوسی سی تھی۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر میر صاحب کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اس کرسی کے قریب پہنچا جہاں بیٹھا کرتا تھا۔

''آیئے آیئے،'' میر صاحب نے دھیمی آواز میں کہا،''تشریف لایئے، سماج سدھارک!'' ان کے لہجے میں مجھے پہلی بار سختی کا احساس ہوا۔''شرم نہیں آتی آپ کو؟'' میں میر صاحب سے اس جملے کی توقع بھی نہ کر سکتا تھا۔''اپنے بھائی کو کس قدر پریشان کر دیا ہے آپ نے — کس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس قسم کی حرکتوں سے کیا کر لیں گے آپ؟ سدھار لیں گے اس جاہل معاشرے کو؟''

خاموشی سی چھا گئی۔ میر صاحب نے بھائی کی طرف دیکھا۔''ہمارے خیال میں،'' انھوں نے کہا،''ہمیں یہاں بیٹھ کر اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے۔ آیئے گھومنے چلتے ہیں، رستے میں بات ہوگی... آیئے صاحبزادے۔''

میر صاحب کے ساتھ بھائی بھی اٹھے، میں بھی اٹھا۔ مایوسی اور بھی گہری ہوگئی۔ میں نے تنور کی سمت دیکھا تاکہ گلنازی کا چہرہ مجھے حوصلہ دلا سکے — گلنازی تنور پر نہ تھی۔ ہسپتال سے لاری اڈے کی سمت جاتے ہوئے مجھے بار بار یہی محسوس ہو رہا تھا کہ بھائی مجھے کل جھاوریاں سے جانے کا حتمی فیصلہ سنائیں گے۔ ہم ہسپتال میں بیٹھ کر واقعی اس موضوع پر بات نہیں کر سکتے تھے۔

''روٹیاں دینے،'' میر صاحب نے کہا،''کیا گلنازی جاتی ہیں؟''

''ہاں... لیکن اس کا انتظام میں نے کر دیا ہے،'' بھائی نے کہا،''گداؤ ایک دو دن روٹیاں لے جائے گا۔''

''اچھا کیا آپ نے،'' میر صاحب نے کہا۔''جو تدبیر ہم نے سوچی ہے — ایک دو دن تو لگیں گے۔''

میں چونکا۔ کیا تدبیر سوچ رکھی ہے میر صاحب اور بھائی نے؟ اب میرے مایوس ذہن پر بوجھ سا بھی تھا۔ ہم لاری اڈے سے شاہ پور جانے والی سڑک کی سمت مڑ گئے۔ سڑک کے کنارے شیشم کے لمبے گھنے درختوں پر چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ ایک درخت پر کوے بھی اڑ اڑ کر بیٹھ رہے تھے۔

''اس ایک مہینے میں،'' میر صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا،''ہم نے یہ اندازہ لگالیا ہے کہ آپ بہت ذہین ہیں . . . ''انھوں نے میری طرف دیکھا،''لیکن آپ اپنی ذہانت کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکے۔ پھر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا۔''اگر آپ اپنی ذہانت کا درست استعمال کریں تو زندگی میں بہت اونچا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔''

بھائی نے پہلے میری اور پھر میر صاحب کی سمت دیکھا۔''یہی تو میں اسے سمجھاتا رہتا ہوں،'' بھائی بولے۔ آواز میں غصہ نہیں، متانت تھی۔''اس کی تمام حرکتیں فضول ہیں۔ چکوال میں یہ ہوم ورک کرنے کے بجائے میونسپل لائبریری میں جا کر فضول اور بے ہودہ کتابیں پڑھتا رہتا ہے۔ لائبریرین نے والد صاحب کو بتایا تھا کہ یہ لائبریری میں ہندوؤں کے وید، شاستر، بدھ ازم کی کتابیں اور سوویت لٹریچر کے ترجمے پڑھتا رہتا ہے — دماغ خراب نہ ہوگا تو کیا ہوگا!'' بھائی کے لہجے میں پھر تلخی سی ابھری۔''میں کہتا ہوں اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو، کورس کی کتابیں پڑھو، لیکن نہیں . . . فضول قسم کی سوچ نے اس کی فطری صلاحیت کو دبا رکھا ہے۔''

ہم آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میر صاحب نے پھر میری طرف دیکھا۔''ذہانت کا رستہ بدل جائے تو انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی . . . ہماری ذہانت کا رستہ اگر نہ بدلتا تو ہم کسی بڑے ہسپتال میں سرجن ہوتے،'' میر صاحب نے کہا۔''آپ کے پاس وسائل ہیں۔ آپ کے گھر والے آپ کی پڑھائی کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہیں۔ میٹرک کے بعد کالج جائیے۔ ایف ایس سی کے مضامین میں میڈیکل رکھیے، پھر میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کیجیے، پھر میڈیکل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کیجیے، بڑے سرجن بن جائیے۔ آپ کے سامنے زندگی کھلی شاہراہ کی طرح ہے — آپ کن چکروں میں پڑ گئے ہیں؟''

مجھے یوں محسوس ہوا کہ میر صاحب جو تمہید باندھ رہے ہیں وہ بھائی کے فیصلے ہی پر ختم ہوگی کہ سامان باندھو اور واپس چلے جاؤ۔

''یہ نہیں سمجھتا،'' بھائی نے کہا،''اس کی بے ہودہ حرکتوں سے ہم کس قدر نالاں ہیں۔ آج جو کچھ ہوا ہے، مجھے ابھی سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اب مجھے یہاں سے ٹرانسفر کرانے کے لیے کتنی ہی بار ہیڈ کوارٹر جانا پڑے گا۔ بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ یہ علاقہ پیر نور شریف کے عقیدت مندوں کا ہے۔

ہزاروں لاکھوں مرید ہیں اس کے ... ٹوانے، میکن، رانے۔ کبھی جاگیردار بھی اس سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اگر یہ بات کھل گئی تو مجھے یہاں سے جان بچا کر بیوی اور بہنوں کے ساتھ بھاگنا ہوگا۔''

بھائی نے میرا نام نہیں لیا تھا، نہ ہی ذکر کیا تھا — یوں محسوس ہوا کہ یہ شام جھاوریاں میں میری آخری شام ہے، کل صبح مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔

''اب جو ہم کہنے جا رہے ہیں...'' میر صاحب نے کہا اور پھر خاموش ہو گئے۔

''میں زندگی میں کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا،'' بھائی نے کہا، ''جتنا آج ہوا ہوں۔''

''بات ہی ایسی ہے،'' میر صاحب نے کہا، ''کب تک چھپائیں گے ہم؟''

''میں اتنے لوگوں کی دشمنی کیسے سہہ پاؤں گا؟'' بھائی نے کہا۔

''تو پھر وہی کیجیے،'' میر صاحب نے کہا، ''جو سوچا ہے۔''

میں نے گھبرا کر میر صاحب کی طرف دیکھا۔ میر صاحب نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''کیا؟'' میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔

بھائی اور میر صاحب نے چلتے چلتے میری طرف دیکھا۔ بھائی کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ ایک جھجک سی ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔

''چلیے ہم ہی کہہ دیتے ہیں،'' میر صاحب نے کہا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کو ہماری بات بہت بری محسوس ہوگی، لیکن اب ہمارے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ ہم نے سوچا ہے کہ آپ کو فوراً واپس بھجوا دیا جائے۔''

وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میر صاحب نے چلتے چلتے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''دیکھیے،'' میر صاحب کی آواز دھیمی ہو گئی، ''کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں بہت سمجھداری کی ضرورت ہوتی ہے... ہمیں آپ سے اس سلسلے میں اچھی توقعات ہیں کہ آپ ہمارے لیے دل میں کوئی رنجش نہ رکھیں گے... آپ واپس چلے جائیں... ہم یہاں مشہور کر دیں گے...''

میر صاحب خاموش ہو گئے۔ مجھ پر جانے کا صدمہ تھا — اس پر بوبے کی سلامتی کی فکر مستزاد تھی۔

''اب جو بات ہم کہنے جا رہے ہیں،'' میر صاحب نے پھر کہا، ''امید ہے کہ آپ ہماری بات ٹھنڈے دل و دماغ سے سنیں گے اور سمجھیں گے۔ حالات بہت بگڑ سکتے ہیں... آپ ہماری بات کو

سمجھیں، اسی میں آپ کے بھائی اور بھابھی بہنوں کی سلامتی ہے اور ماں بچے کی بھی۔۔۔''

''آپ صاف صاف کہیے،'' میں نے پہلی بار ہمت سے کام لے کر کہا،'' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''دیکھیے،'' میر صاحب کچھ جھجکے، پھر انھوں نے بے باکانہ انداز اختیار کیا۔'' ہم جانتے ہیں، آپ بہت ذہین ہیں۔ ہم آپ کو صحیح الدماغ سمجھتے ہیں، کیونکہ آپ ہیں، لیکن اس وقت صورتحال کا یہی تقاضا ہے کہ ہم آپ کے جانے بعد گاؤں میں مشہور کر دیں کہ۔۔۔ کہ آپ ذہنی مریض ہیں۔ آپ پر دورے پڑتے ہیں اور اسی قسم کے دورے کے دوران میں آپ نے بچے کی لٹ کاٹ دی ہے۔ یہ حربہ کام کر جائے گا۔ دیوانگی میں کیے ہوئے کام پر کسی کو کتنا غصہ آئے گا؟ آپ کے بھائی کہہ دیں گے کہ انھوں نے آپ کو واپس بھجوا دیا ہے، کیونکہ آپ مزید کوئی خرابی پیدا کر سکتے تھے۔۔۔ پیر نور شریف کے مرید بھڑکیں گے، لیکن کچھ کر نہ پائیں گے۔ کسی دیوانے پر کوئی کتنی دیر بھڑک سکتا ہے؟ پھر یہ واقعہ گاؤں میں ایک مزاحیہ واقعہ بن جائے گا۔ لوگ ہنس ہنس کر اس واقعے کو یاد کریں گے۔۔۔ پیر نور شریف بھی کچھ نہ کر پائیں گے۔ مصیبت بھی ٹل جائے گی اور بات بھی دب جائے گی۔ آپ برا نہ مانیں۔۔۔ ہمارے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔''

اس بار خاموشی دیر تک رہی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ بھائی واپس پلٹے۔ میر صاحب کے ساتھ میں بھی واپس مڑا۔ ہمیں اندھیرا چھانے سے پہلے واپس ہسپتال پہنچنا تھا۔

''بہت اچھا فیصلہ کیا ہے آپ نے،'' میں نے بھائی کی سمت دیکھتے ہوئے خاموشی کو توڑا۔

''بھیج دیجیے مجھے، چلا جاؤں گا، کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔'' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے میں چھپے آتش فشاں کے لاوے نے حرکت کی ہے۔'' کر دیجیے مشہور کہ میرا ذہنی توازن درست نہیں ہے، پاگل ہوں میں۔۔۔ گھر میں برتن توڑتا ہوں، گالیاں بکتا ہوں، اپنے کپڑے پھاڑتا ہوں۔۔۔''

''دیکھیے، دیکھیے،'' میر صاحب تیزی سے بولے، لیکن مجھے اپنے سینے میں کروٹیں لیتا ہوا لاوا ابلتا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ دو چار بار ابل کر پھٹ جائے گا۔

''کہہ دیجیے کہ میں۔۔۔'' مجھے خود اپنا لہجہ بدلا بدلا سا لگا۔'' کہہ دیجیے کہ مجھ پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اسی دیوانگی میں میں نے بالوں کا گچھا کاٹ دیا ہے۔ سب سے کہہ دیجیے کہ

میں آج کا نہیں، بچپن سے پاگل ہوں۔ بلکہ واپس بھیجنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ مجھے لاہور جا کر پاگل خانے میں داخل کرا دیجیے۔۔۔ یا پھر میگھا پتن لے جا کر پیر کے قدموں میں پھینک دیجیے اور کہیے کہ اس پر کالی بلا نے چکر لگائے ہیں، اس کا بھی بالوں کا گچھا رکھ دیں۔۔۔ ''میرے اندر آتش فشاں پھٹ گیا۔'' کرا دیجیے میری ٹنڈ، رکھ چھوڑ کر — آپ کی جان بچ جائے گی۔۔۔ سلامت رہیں گے آپ۔۔۔ لیکن کیا یہاں کے ہزاروں لاکھوں سادہ لوح، سیدھے سادے دیہاتی اس تاریک فریب سے بچ جائیں گے جو اندھیرے کی پرتوں کی مانند، صدیوں سے ان کے وجود پر محیط ہے؟ کیا وہ خوف کے ان نوکیلے دانتوں سے بچ جائیں گے جو ان کے دماغوں میں پیوست ہیں اور جن سے پیر لوگ صدیوں سے ان کا خون اپنی ہوس کی زبانوں سے چاٹ رہے ہیں؟ کیا وہ خودغرضی کے ان تیز ناخنوں والے پنجوں سے بچ جائیں گے جن سے مکار پیروں نے انھیں دبوچ رکھا ہے؟ کیا یہ سادہ لوح دیہاتی کبھی ان دلدلوں سے نکل پائیں گے جن میں ہوس کی جونکیں ان کے جسموں سے چمٹی ہوئی ہیں؟ بنا دیجیے مجھے یہاں کے لوگوں کے لیے باعثِ تضحیک، اڑانے دیجیے میرا مذاق۔۔۔ لیکن مت بھولیے کہ یہ اندھیرا عارضی ہے، یہ خوف کے سفاک دانت، یہ خودغرضی کے خون آلود ناخنوں والے پنجے، یہ ہوس کی دلدلیں، سب عارضی ہیں، ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ زمانہ بدلے گا، یہ تاریکی چھٹے گی۔۔۔ اس وقت تاریخِ انسانیت آپ جیسے تعلیم یافتہ، روشن خیال لوگوں پر ضرور ہنسے گی کہ تمام تر روشن خیالی کے باوجود، آپ نے اس تاریک جنگل میں درندوں کے لیے خود راہیں ہموار کی تھیں، راستے بنائے تھے۔۔۔ تاریخ ہنسے گی کہ آپ کی روشن خیالی پر تاریکی حاکم تھی، آپ کی روشن خیالی محکوم تھی، غلام تھی۔۔۔ آپ خوف کے اسیر تھے، خودغرضی نے آپ کو اپنے وجود کے دائرے میں قید کر رکھا تھا۔ اس غلامی میں بھی آپ روشن خیالی کا دعویٰ کرتے تھے۔۔۔ اس سے بڑی خودفریبی کیا ہوگی! میں ابھی جا کر اپنا بیگ تیار کرتا ہوں، کل صبح چلا جاؤں گا۔''

میر صاحب میری سمت غور سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر چلتے چلتے رک گئے، بھائی بھی رکے۔

''اپنی عمر سے بہت ہی آگے نکل چکے ہیں آپ، صاحبزادے!'' میں نے میر صاحب کی سمت دیکھا، جن کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔'' پندرہ سولہ برس کے انڈر میٹرک لڑکے میں یہ

شعور نا قابل یقین ہے۔ ہمیں آپ جیسے سکول کے لڑکے سے اس شعور کی توقع نہ تھی،لیکن صاحبزادے . . . آپ نے خود ہی کہا ہے کہ یہ تاریکی صدیوں پرانی ہے،تو اسے ختم ہونے میں بھی صدیاں ہی لگیں گی۔اس علاقے میں خواندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔شعور تعلیم سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ ہمارے نواسوں کے نواسے، پھر ان کے نواسوں کے نواسے اور پھر ان کے نواسوں کے نواسے بھی وہ صبح نہیں دیکھ پائیں گے جس کا تصور آپ اپنے ذہن میں بسائے ہوئے ہیں۔'' میر صاحب خاموش ہو گئے۔ بھائی بہت آزردہ اور خاموش تھے۔ہم پھر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

''میری ایک بات اور سن لیں،'' میں نے کہا،''میرے یہاں سے چلے جانے سے،گاؤں میں مجھے دیوانہ مشہور کر دینے سے یہ مصیبت نہیں ٹلے گی۔آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ معاملہ دب جائے گا۔کیا آپ کے خیال میں پیر نور شریف بھی اس بات کو ہنسی میں اڑائے گا—اسے چھٹانک بھر سونے یا چاندی کی فکر نہیں ہوگی؟ اسے تو اس علاقے میں اپنے خاندان کی صدیوں سے قائم اندھی عقیدت اور دہشت کے ختم ہو جانے کا شدید اندیشہ دبوچ لے گا۔اس کی تو نینداس فکر سے اڑ جائے گی کہ اس کے فریب کا پردہ چاک ہونے والا ہے۔ بچے کی رکھ جو اس نے مکاری سے نہ جانے کتنے بچوں کے سر پر بالوں کے گچھوں کی صورت میں بنا رکھی ہے، اس کا بھید کھل جائے گا۔ بچے کی رکھ کٹنے میں ابھی اڑھائی ماہ باقی ہیں۔کیا پیر نور شریف یہ نہیں سوچے گا کہ بچے کے زندہ بچ جانے سے اس کے عقیدت مندوں پر بدروحوں اور کالی بلا کا خوف ختم ہو جائے گا؟ وہ خوف جو اس کی ہوس کا اَچُوک ہتھیار ہے۔ وہ اپنی بدروحوں اور کالی بلا کا خوف دلا کر،لوگوں میں خود غرضی کو شدید بنا کر،اپنی تجوریاں،سونے اور چاندی سے بھر رہا ہے . . . آپ مجھے تو واپس بھجوا رہے ہیں،لیکن میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پیر بہت جلد ہی اپنے پالے ہوئے جرائم پیشہ سزا یافتہ ملنگوں کے ذریعے بچے کو مروانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔''

بھائی اور میر صاحب پھر چلتے چلتے رک گئے۔دونوں کے چہرے پر پریشانی خوف میں بدل گئی۔

''اب بچے کی جان بچانا بھی میری ذمے داری ہے!'' بھائی کے چہرے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے!'' ان کی آواز میں غصہ ابھرا۔

''عصمت بہن نے صبح بہت اچھی بات کہی تھی،'' میں نے کہا۔''مصیبت آئی ہے تو مقابلہ تو

کرنا ہی پڑے گا۔''

''کیا ہم مقابلہ کریں گے؟'' بھائی نے غصے سے کہا،''میں — ہمارے یہ دھان پان جیسے میر صاحب اور تم؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمھارا!''

خاموشی سی چھا گئی۔ شیشم کے درختوں کے تنوں کے پاس اندھیرے کا احساس ہونے لگا تھا۔ شاخوں میں آہستہ آہستہ پرندے بھی خاموش ہو رہے تھے۔

''بچہ گھر پر محفوظ ہے،'' میر صاحب نے خاموشی توڑی۔'' کیسے ماریں گے اسے؟''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں،'' میں نے کہا،'' پیر مجرموں کو پناہ دیتے ہیں۔ آپ نے . . .'' میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔'' آپ نے بلکسر میں پیر کوثر شاہ کی ڈھوک میں ایک لکڑی کی ٹانگ والا ملنگ سائیں اللہ داد تو دیکھا ہوگا۔ وہ ڈکیت تھا — چکوال میں ڈاکا ڈال کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو رہا تھا کہ کلر کہار کے قریب پولیس مقابلہ ہو گیا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی لیکن وہ دو ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک مہینے تک روپوش رہا۔ اس کے ساتھیوں نے گولی تو نکال دی لیکن اس کی ٹانگ میں زہر پھیل گیا۔ اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں اسے چکوال کے ہسپتال کے برآمدے میں ایک بنچ پر لٹا کر بھاگ گئے۔ ہسپتال میں پولیس کے مخبر کی اطلاع پر پولیس پہنچ گئی۔ ڈاکٹر کو اس کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔ ٹھیک ہونے پر عدالت نے اسے سات سال قید کی سزا سنائی۔ سزا کاٹنے کے بعد وہ کوثر شاہ سے ملا۔ پیر کوثر شاہ نے اسے مرید بنا کر ڈھوک میں رکھ لیا، اس کی لکڑی کی ٹانگ بنوا دی، اور اب پیر کوثر شاہ جہاں بھی جاتا ہے، وہ دونالی بندوق کندھے پر لٹکائے، بائیں ہاتھ میں کھونڈی (عصا) پکڑے، جھٹکے کھاتا ہوا، پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ علاقے میں اس کی دہشت بھی ہے . . . اور وہ سائیں ڈورو، پیر کوثر شاہ کا ملنگ، پکا چور تھا . . . تین برس قید کاٹنے کے بعد وہ اب پیر کی پناہ میں ہے۔ پیر نور شریف کے پاس بھی جرائم پیشہ سزا یافتہ مجرم ہوں گے . . . وہ بچے کو مروانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔ چہروں پر پریشانی کے سائے تھے۔

''یہ بات تو ہم نے سوچی ہی نہ تھی،'' میر صاحب بولے۔

''اب کیا کریں؟'' بھائی نے جیسے خود سے سوال کیا،'' میں اکیلا کیا کر پاؤں گا؟'' انھوں نے

غصے سے میری سمت دیکھا۔''اس نے کبھی زندگی میں سکون نہیں لینے دیا... مجھے تو لگتا ہے سب کچھ ختم ہو جائے گا...'' بھائی کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو گئیں۔''کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے!'' ان کی آواز میں غصہ ابھرا۔

''بھیا... بھیا...'' میر صاحب نے کہا،''اب غصے سے کیا ہوگا؟... ہمیں کچھ تو کرنا ہے... سوچنے دیجیے۔''

''میں نے سوچ لیا ہے...'' میں نے کہا،''دن بھر اور کیا کرتا رہا ہوں۔''

''تم پیر نور شریف کا مقابلہ کرو گے؟'' بھائی نے غصے سے کہا۔''دماغ خراب ہو چکا ہے تمھارا!''

''خوابوں سے نکلیں صاحبزادے!'' میر صاحب نے کہا،''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''کاش میں نے اسے یہاں نہ بلوایا ہوتا،'' بھائی نے کہا،''غلطی ہو گئی مجھ سے۔''

''ٹھہریے،'' میر صاحب نے کہا،''کیا سوچ رکھا ہے، آپ نے؟''

ہم لاری اڈے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شام بہت گہری ہو چکی تھی، لیکن مکمل تاریکی نہیں پھیلی تھی۔ ہمارے قدم آہستہ تھے۔

''سر...'' میرا لہجہ رفتار کی مانند دھیما تھا۔''آپ نے کہا تھا کہ یہ بات چھپی نہ رہے گی۔ گلنازی اکثر روٹیاں لے کر ہمارے گھر جاتی رہتی ہے۔ ماسی جیراں کو خبر ہو گئی تو بات پورے گاؤں میں پھیل جائے گی۔''

''یہ تو ہے،'' میر صاحب نے کہا۔''خواتین کے لیے بات چھپانا بہت دشوار ہوتا ہے۔''

''یہ ایک روایتی بات ہے سر...'' میں نے کہا،''میرے خیال میں ماسی جیراں اور گلنازی کو اعتماد میں لیا جا سکتا ہے اور گلنازی اتنی بچی بھی نہیں ہے کہ...''

میر صاحب نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر پریشان سی مسکراہٹ آئی۔

''آپ نے یہ کیسے جانا کہ وہ بچی نہیں ہے؟'' انھوں نے پوچھا اور میں گھبرا گیا۔

''وہ... وہ...'' میں نے کہا،''بہن عصمت بتا رہی تھیں کہ گلنازی کو اس علاقے کے بہت سے ڈھولے اور ماہیے یاد ہیں — بچیوں کو ڈھولے اور ماہیے گانے نہیں آتے۔''

میر صاحب کے ہونٹوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ مٹ سی گئی۔ آہستہ قدموں کے ساتھ بھی ہم لاری اڈے پر اس جگہ پہنچ گئے جہاں ملیاریاں سبزی کے ٹوکرے لے کر بیٹھتی تھیں۔

''گلنازی اور اس کی ماں کو اعتماد میں لیا جا سکتا ہے،'' بھائی نے کہا۔ ''چلو یہ بات مان لی۔ پھر بھی یہ بات کب تک چھپائی جا سکے گی؟ پورے پچھتر دن باقی ہیں بچے کے پانچ برس پورے ہونے میں۔''

''میں بات چھپانے کے حق ہی میں نہیں،'' میں نے کہا۔ بھائی نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ میر صاحب بھی چونکے۔ ''کیا؟''

بھائی نے غصے سے کہا، ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ پیر کے ہزاروں مرید مجھے گھسیٹتے ہوئے میگھا پتن لے جائیں اور اس کے سامنے قتل کر دیں؟''

''میں لوگوں سے یہ بات چھپانا چاہتا ہوں، لیکن گاؤں میں یہ خبر پھیلنے سے پہلے خود پیر نور شریف تک پہنچانا چاہتا ہوں۔''

میرے اس جملے پر بھائی اور میر صاحب یوں چونکے جیسے بات نہ تھی، کوئی بچھو تھا جس نے ان کے ذہنوں پر ڈنک مارا۔ وہ دونوں لاری اڈے کے ہوٹل کے مقابل سڑک کی دوسری جانب رک گئے۔

''مجھے کوئی شک نہیں رہا!'' بھائی نے تلخی سے کہا، ''تمھارا دماغ واقعی خراب ہو چکا ہے!''

''یعنی، آ بیل مجھے مار؟'' میر صاحب نے کہا۔

''میری پوری بات تو سن لیں،'' میں نے کہا۔

''کیا سنیں؟'' بھائی کا لہجہ درشت تھا۔ ''ایسی احمقانہ باتیں سننے کے لیے نہ تو ہمارے پاس وقت ہے نہ برداشت۔''

''آپ بات کرنے ہی نہیں دیں گے تو . . .'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''ایک تو اچھی خاصی مصیبت کھڑی کر دی ہے، اوپر سے یہ فضول باتیں . . . ہمارا دماغ بھی خراب کرنا چاہتے ہو!''

''اچھا اچھا . . .'' میر صاحب نے قدم بڑھایا اور ہم ہسپتال کی سمت مڑنے والی سڑک کی سمت میں چلنے لگے، لیکن بہت ہی آہستہ۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ . . . دیکھیں بھیا،'' میر صاحب

نے بھائی کی طرف دیکھا۔''انھیں پوری بات کر لینے دیجیے — چلیے بقول آپ کے ہم نے یہ خبر خود ہی پیر تک پہنچا دی، پھر کیا ہوگا؟''

''جو ہوگا، بہت اہم ہوگا،''میں نے کہا،''میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر پیر کا ارادہ بچے کے لیے گھناؤنا ہو — جو مجھے یقین ہے کہ ہوگا — تو ہمیں اس کی خبر پہلے سے ہو۔ ہمیں بالوں کا گچھا کٹنے کی خبر کل ہی اپنے کسی بااعتماد شخص کے ذریعے پیر تک پہنچا دینی چاہیے، اور میرے خیال میں گداؤ سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ آپ خود بھی تو...''میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔''آپ ہی نے کہا تھا کہ گداؤ بہت بھروسے کا آدمی ہے۔ پیر تک خبر پہنچنے اور اس کا ردِعمل ظاہر ہونے تک ہی ہمیں یہ خبر چھپانے کی ضرورت ہوگی۔''

بھائی نے غصے سے میری سمت دیکھا۔''کھوڑ اور بلکسر کے کلبوں میں جاسوسی فلمیں دیکھ دیکھ کر تم خبطی ہو چکے ہو۔ اپنے تصورات کو یوں پیش کر رہے ہو جیسے یہ حقیقت ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا — ایک اور مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ تم سامان باندھو اور واپس چلے جاؤ۔ جو ہوگا میں دیکھ لوں گا۔''

''وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا،''میں نے کہا،''لیکن بچے کی زندگی بچانا میرے دفع ہو جانے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ آپ کہتے ہیں کچھ نہیں ہوگا...''مجھے اپنے لہجے میں سختی کا احساس ہوا اور میں نے فوراً لہجے کو بدتمیز ہونے سے بچانے کے لیے دھیما کیا۔''اگر کچھ نہیں ہوگا تو آپ کے پاس بہانہ تو موجود ہی ہے کہ میں پاگل ہوں، دورے پڑتے ہیں مجھے... میں اپنے تصورات کو اس لیے حقیقت کہہ رہا ہوں کہ پیرنور شریف اپنی دہشت اور ساکھ بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرے گا۔ انتہائی اقدام بچے کو جان سے مروا دینا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ کالی بلا کا خوف قائم رکھنے کے لیے وہ انتہائی قدم ہی اٹھائے گا... علاقے میں مشہور ہے — مجھے گداؤ نے بتایا تھا — یہ بات مشہور ہے کہ صرف رکھ ہی کالی بلا سے بچا سکتی ہے... اب بچے کے سر پر بالوں کا گچھا نہیں ہے تو پیر خود کالی بلا بن کر کچھ نہ کچھ تو کرے گا۔''

پچاس قدم دور تنور پر ماسی جیراں کا چہرہ، تنور میں دہکتے کوئلوں کی دھیمی سی عنابی رنگت میں دور سے بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ماسی کے پاس تین لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ میں نیم تاریکی میں نہ دیکھ سکا کہ ان میں گلنازی ہے یا نہیں۔

''ہمارے خیال میں . . . ''میر صاحب نے کہا،''برخوردار کی بات میں وزن ہے۔ اگر ہم پیر کے ذہن کے مطابق سوچیں تو یہ بات سچ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساکھ بچانے کی خاطر کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کوئی تعویذ دے دے، یا چلہ کاٹ کر نیا ڈھونگ بنالے،'' بھائی نے کہا۔

بھائی کی اس بات پر میں چونکا۔ وہ غیر شعوری طور پر مان گئے تھے کہ ہمیں پیر تک یہ خبر خود ہی پہنچا دینی چاہیے۔ ہم تنور سے پندرہ قدم دور تھے۔ تنور پر گلنازی موجود تھی۔

''کیا گداؤ میاں یہ کام کر پائیں گے؟'' میر صاحب نے کہا۔

مشہور ہے کہ جس شخص کا ذکر ہو رہا ہو اور وہ سامنے آ جائے تو کہا جاتا ہے، بھئی تمھاری عمر تو بہت لمبی ہوگی . . . گداؤ کو دیکھ کر اس توہماتی خیال پر میں مسکرایا۔ گلنازی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور پھر یہی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھی نمودار ہوئی، پھر اس نے ماسی جیراں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گداؤ ہسپتال سے نکل کر تنور کی سمت جا رہا تھا، روٹیاں لینے . . . بھابھی نے گلنازی کو روکنے کا انتظام کر دیا تھا۔

''اسے زیادہ دن تو نہیں روکا جا سکے گا،'' میں نے سوچا۔'' گلنازی دن کے وقت بھی تو جا سکتی ہے۔ مجھے جلد ہی ماسی اور گلنازی کو اعتماد میں لینا ہوگا۔''

بھائی نے گداؤ کو اشارے سے بلایا۔ ہم ہسپتال کے صحن میں داخل ہو رہے تھے۔''اپنے لیے بھی روٹیاں لے جاؤ،'' بھائی نے کہا،'' کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا۔ کچھ کام ہے تم سے، مجھ سے مل کر گھر جانا۔''

گداؤ کی آنکھوں میں سوال تھا اور چہرے پر حیرت بھی۔''اچھا صاب جی۔'' وہ تنور کی سمت گیا۔'' لگ گئیں روٹیاں؟ دو اور لگا دے۔''

''میں دے آؤں گی،'' گلنازی نے اپنی بہت خوبصورت آواز میں کہا۔

''میں گھر ہی جا رہا ہوں۔ تو کہاں جائے گی، اندھیرا ہو رہا ہے!'' گداؤ نے کہا اور ماسی نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا۔

''ماں . . . '' گلنازی نے اس انداز میں کہا جیسے کوئی چھوٹی بچی ماں سے لاڈ کے ساتھ ضد کر رہی ہو۔ ''وہ چھوٹی بی بی میری سہیلی بن گئی ہے، اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' گلنازی کی زبان اور لہجہ سرگودھا کی لڑکیوں جیسا تھا۔ گلنازی کا اشارہ عصمت بہن کی سمت تھا — باجی زیبا تو اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتی تھیں۔

''کل کر لینا باتیں!'' ماسی جیراں نے کہا۔ ''نہیں بھاگی جاتی تیری چھوٹی بی بی۔''

گلنازی کے چہرے پر اداسی سی آ گئی۔ تنور میں کسی بجھتے ہوئے کوئلے کے تڑخنے پر جو شعلہ سا لپکا کرتا ہے، اس کی دھیمی سی روشنی میں گلنازی کا اداس چہرہ بے انتہا خوبصورت دکھائی دیا۔ میں بھائی اور میر صاحب کے ساتھ صحن میں بچھی کرسیوں پر جا بیٹھا۔

''بڑی دیر لگا دی صاب!'' بخشو نے قریب آتے ہوئے کہا، ''چائے کا پانی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔''

''پھر گرم کر لے،'' بھائی نے کہا۔

بخشو اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔ میر صاحب نے کرسی کے بازو پر کہنی ٹکائی۔

''چلیے . . . ہم نے یہ تو مان لیا،'' انھوں نے کہا، ''پیر نور شریف اپنی ساکھ بچانے اور دہشت قائم رکھنے کے لیے بچے کی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ لیکن صاحبزادے . . . اگر پیر کے بدمعاش ملنگ بچے کو مارنے گاؤں میں آ ہی گئے تو ہم اسے کیسے بچا پائیں گے؟ دفاع کیسے کریں گے؟ وہ بچے کو گھر سے نکالنے کے لیے کوئی نہ کوئی کامیاب چال چل ہی جائیں گے۔''

میں نے میر صاحب کی آنکھوں میں دیکھا۔

''سر . . . '' میرا لہجہ اب پراعتماد تھا۔ ''وہ پورے گاؤں کے سامنے بچے پر حملہ نہیں کر سکتے۔ وہ پورے گاؤں کو ہمارے گھر کے سامنے اکٹھا کر بھی لیں تو بھی بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ لوگوں کی موجودگی میں وہ بچے کو نہیں مار سکیں گے . . . خطرہ صرف میری جان جانے کا ہو گا — بپھرا ہوا ہجوم کچھ بھی کر سکتا ہے . . . پیر لوگ بے حد مکار ہوتے ہیں، وہ کوئی اور طریقہ ہی اختیار کریں گے جو انھیں پیر نور شریف بتا کر بھیجے گا۔ میں نے اُس ہر طریقے سے متعلق سوچا ہے جو پیر اختیار کر سکتا ہے۔''

میر صاحب نے پہلے بھائی کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔

''تو ہمیں بھی بتائیے،'' انھوں نے کہا۔

''ہاں ہاں۔۔۔'' بھائی کے لہجے میں طنز سا تھا۔ ''ہمیں بھی بتاؤ مسٹر شرلاک ہومز۔[34]''

میر صاحب نے قہقہہ لگایا۔ مجھے بھائی کا طنز بہت ناگوار گزرا، لیکن میں نے اپنی ناگواری کو پس پشت ڈال دیا۔ مجھے بُوبے کی جان کی فکر ہر قسم کی ناگواری سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ایک خیال ذہن سے گزرا۔ میری نظریں تنور کی سمت گئیں، تنور کی دھیمی روشنی میں بیٹھی گلنازی مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی نظر آئی — پہلی مسکراہٹ جو اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ میرے ذہن میں آیا ہوا خیال جگنو کی طرح چمکا۔

''ہم گداؤ سے کہیں گے،'' گلنازی سے نظریں ہٹا کر میں نے میر صاحب اور بھائی کی طرف دیکھا۔

'' کچھ نہیں ہوگا،'' بھائی نے کہا، '' مجھے سب کچھ فضول سا لگ رہا ہے۔''

نہیں بھیا،' میر صاحب نے کہا، ''ہمیں اس میں آپ کی سلامتی نظر آ رہی ہے۔ کہیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میر صاحب نے میری طرف دیکھا۔

''ہم گداؤ سے کہیں گے کہ وہ پیر نور شریف کے ڈیرے پر جائے،'' میں نے کہا، ''پیر کے قدموں میں گر کر گڑگڑائے کہ جھاوریاں میں بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔ پوری بات بتائے اور کہے کہ جانوروں کے ڈاکٹر کا چھوٹا بھائی پاگل ہے۔ بہنوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آیا ہوا ہے۔ بہنیں تو ٹھیک ہیں، لیکن اس پر دورے پڑتے ہیں۔ جب دورہ پڑتا ہے تو پیروں فقیروں کو گالیاں دیتا ہے۔ آتے ہی بچے کی رکھ کے پیچھے پڑ گیا۔ بہت سمجھایا کہ چار سال دس مہینے ہو گئے ہیں، چار بدروحیں ٹل چکی ہیں، ایک کالی بلا رہ گئی ہے، تو اس نے بدروحوں اور کالی بلا کو گندی گندی گالیاں دیں۔۔۔ مرشد، وہ پاگل ہے، ہوا سے باتیں کرتا ہے، اونچی اونچی آواز میں گاتا ہے اور کبھی مِن مِن کرنے لگتا ہے۔ اس کی تو آنکھوں ہی میں جنون ہے، سارا سارا دن جلتی دھوپ میں گھر سے باہر نکل کر گھومتا رہتا ہے۔'' میر صاحب میری باتوں پر مسکرا رہے تھے۔

''گداؤ خاص طور پر یہ بتائے کہ ڈاکٹر صاحب، ان کی بیوی، بہنیں اور پاگل چھت پر سوتے

34۔ سر آرتھر کانن ڈائل کی جاسوسی کہانیوں کا کردار۔ بچپن میں اکثر والد صاحب بہنوں کو اور مجھے رات سونے سے پہلے جاسوسی کردار شرلک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

ہیں، رقیہ اور بچہ صحن میں بچھی چار پائی پر۔ صبح جب ماں باہر کھیتوں میں گئی تو پاگل کو موقع مل گیا۔ کپڑا کاٹنے والی قینچی سے اس نے رکھ کاٹ دی ہے اور بال نہر میں پھینک آیا ہے۔ بچے کی ماں کا رورو کے براحال ہو گیا ہے۔ آنکھیں سوج گئی ہیں۔ اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے... مرشد کچھ کریں، بچے کو بچائیں مرشد... کالی بلا سے بچائیں۔ اب تو رکھ بھی نہیں جو کالی بلا کو روکے... بچے کی سلامتی آپ کے رحم اور کرم پر ہے مرشد۔ پچھتر دن رہ گئے ہیں... سب یہی کہتے ہیں کہ آخری سال بہت خطرناک ہوتا ہے، کالی بلا کو روکنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہتا... رحم مرشد، رحم... بچے کے بغیر ماں بھی مرجائے گی، وہ پہلے سے ہی بیوہ ہے... ایک بچے کا سہارا ہے۔ کس کے لیے جیے گی مرشد؟ کرم کریں... بچے کی جان بچائیں... پھر دیکھیں وہ چالاک پیر کیا کرتا ہے۔''

میر صاحب کے چہرے پر سنجیدگی سی نمودار ہوئی۔

''تدبیر بہت اچھی ہے آپ کی... آپ کے پاگل پن کا ذکر موثر ہوگا۔ پیر نور شریف کو گداؤ ہی کی بات پر یقین ہوگا کہ آپ پر دورے پڑتے ہیں، ورنہ ہمارے کہنے پر وہ اسے ہمارا بہانہ سمجھیں گے... تدبیر اچھی ہے، لیکن ایک بات جو ہمیں کھٹک رہی ہے...'' میر صاحب لمحہ بھر کو رکے۔ ''پیر لوگ بڑے گھاگ قسم کے ہوتے ہیں اور ہمارے گداؤ میاں ٹھہرے سیدھے سادے دیہاتی۔ پکڑے گئے تو معاملہ بہت بگڑ جائے گا۔''

بھائی کے چہرے پر تذبذب تھا۔ انھوں نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔

''وہ اتنا سیدھا سادا بھی نہیں ہے،'' انھوں نے قدرے اعتماد سے کہا۔ ''بہت تیز ہے۔ ہسپتال کی نوکری سے پہلے تھیٹر میں اداکاری اور گلوکاری کرتا تھا۔ اسے پکڑنا آسان کام نہیں ہے۔''

مجھے اندرونی طور پر خوشی اور اطمینان کا احساس ہوا۔ بالآخر بھائی نے میری تائید کر ہی دی۔

''اگر ایسا ہے،'' میر صاحب نے کہا، ''تو پھر کوئی دشواری نہیں ہے۔ ہاں، ایک بات اب بھی باعثِ تشویش ہے۔ گداؤ میاں پڑھے لکھے نہیں، اسی پسماندہ علاقے کے رہنے والے ہیں۔ کیا ان کے دل و دماغ پر، پیر کا خوف نہیں ہوگا؟ کیا آسانی سے جانے پر رضامند ہو جائیں گے؟''

''سر...'' میں نے کہا، ''میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں جو گداؤ کو خوفزدہ کرے گی۔ اس نے پیر کے پاس جا کر سچ ہی تو بتانا ہے۔ یہ بات جھوٹ تو ہے نہیں — بالوں کا گچھا کٹ چکا ہے۔

گداؤ کو صرف یہ چھپانا ہے کہ اسے ہم نے بھیجا ہے۔''

میر صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''صاحبزادے،'' انھوں نے کہا،'' مان لیا کہ گداؤ وہاں جاتے ہیں، پیر کو ساری بات بتاتے ہیں اور اگر ان کا ارادہ خطرناک ہے تو اس کا اندازہ بھی ساتھ لے آتے ہیں... اس کے بعد بچے کی جان کو اگر خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو اسے بچانے میں کامیابی اور ناکامی، دونوں کے ذمے دار آپ ہوں گے۔''

''میں یہ ذمے داری لینے کو تیار ہوں... میں...'' بخشو کو آتے دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔

''آج تو دیر کر دی آپ نے صاب جی،'' بخشو نے چائے کی پیالیاں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔'' اب تو کھانے کا ٹیم ہے۔''

''اب بنا ہی لائے ہو تو پینی پڑے گی،'' بھائی نے کہا۔ بخشو پھر اپنی کوٹھری کی سمت چلا گیا۔

''ہم رقیہ اور بچے کو کہیں بھجوا بھی نہیں سکتے...'' بھائی نے کہا۔

''میں نے سب سوچ رکھا ہے،'' میں نے کہا،'' بچے کو کچھ نہیں ہوگا، پانچ برس تک زندہ رہے گا۔ میں نے ہر اس طریقے پر غور کیا ہے جو پیر اختیار کر سکتا ہے۔ میں نے ہر طریقے کے برعکس بچاؤ کی تدبیریں بھی سوچ لی ہیں۔''

میر صاحب مسکرائے۔ بھائی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ پیر بہت احتیاط سے کام لے گا۔ اپنے بہت بھروسے کے جرائم پیشہ ملنگوں کو یہ کام سونپے گا جو اس کے مذموم ارادے کو ہر حالت میں پوشیدہ رکھیں اور بہت محتاط بھی رہیں۔ وہ گاؤں میں ضرور آئیں گے اور دن کے وقت کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے ان کا مذموم ارادہ ظاہر ہو۔''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو،'' بھائی کا لہجہ ابھی تک طنزیہ تھا،'' جیسے تمھیں ان کا شیڈول معلوم ہو۔''

میر صاحب دھیما سا ہنسے۔

''بھیا، انھیں اپنی بات پوری کر لینے دیں،'' میر صاحب نے کہا۔

''وہ بچے کو رات کی تاریکی ہی میں مارنے کی کوشش کریں گے،'' میں نے کہا۔'' میں گداؤ کو اچھی طرح سمجھا دوں گا کہ وہ پیر کو ہمارے گھر کے اندر چارپائیوں کی جگہیں تک اس انداز میں بتا

دے جیسے بچے کی رکھ کٹ جانے کے واقعے میں میرا طریق کار بتا رہا ہو۔ اس طرح وہ مکار پیر اپنے گھناؤنے ارادے کے لیے گھر کی اندرونی صورت حال پر نہ صرف غور کرے گا، بلکہ اسے اپنے مذموم مقصد کے لیے استعمال بھی کرے گا۔ ملنگ جب بھی گاؤں آئیں گے، پرانے مندر والی حویلی ہی میں ٹھہریں گے۔''

میر صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟'' میر صاحب نے کہا۔ ''یہ بات درست ہے، وہ وہیں ٹھہرتے ہیں۔''

''گداؤنے،'' میں نے کہا۔

''یہاں بھی جاسوسی شروع کر دی!'' بھائی نے غصے سے کہا، ''تمھیں چین کیوں نہیں ملتا؟ مجھے تو پہلے ہی حیرت ہو رہی ہے کہ بلکسر میں پیر کوثر شاہ کی ڈھوک کے ملنگوں سے متعلق تم اس قدر معلومات رکھتے ہو... چاہتے کیا ہو؟ پیروں سے یہ دشمنی تمھیں مہنگی پڑے گی۔ خطرناک ہے — بہت ہی خطرناک۔ اس میں تمھاری جان بھی جا سکتی ہے!'' بھائی کے غصے میں تشویش بھی شامل تھی۔

میر صاحب نے چائے کی پیالی میز پر رکھی۔

''کیا بتا رہے تھے آپ؟'' انھوں نے پوچھا۔

''چھاوریاں سے جو تانگہ صبح نو بجے میگھا پتن جاتا ہے، شام چار بجے واپس آ جاتا ہے،'' میں نے کہا۔

''تم نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ تانگہ کب جاتا ہے، کب آتا ہے؟'' بھائی نے کہا۔ میں نے ان کی بات ان سنی کر دی۔

''وہ چار بجے آئیں گے، سیدھے حویلی کے کھنڈر میں جائیں گے۔ شام کو وہ کبھی بھی گاؤں میں نہیں آئیں گے۔ اگلا دن وہ یقیناً گاؤں میں گزاریں گے۔ انھیں یہ بھی تو معلوم کرنا ہو گا کہ ہمارا گھر کہاں ہے؟''

''تم تو یوں بتا رہے ہو جیسے ملنگوں نے تمھارے ساتھ بیٹھ کر پروگرام طے کیا ہو،'' بھائی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''میں قیاس آرائی کرسکتا ہوں جو اکثر درست بھی ہوتی ہے،'' میں نے کہا۔'' انھیں یہ تو پتا چل گیا ہوگا کہ ہمارا گھر کھیتوں کے سامنے ہے — گداؤ وہاں ان کے پیر کو یہ بات بتا چکا ہوگا۔ پیر کے ڈیرے پر مویشی تو ہوں گے۔ وہ گاؤں میں مویشیوں کے حوالے سے، کسی سے بھی مویشیوں کے ڈاکٹر کا پتا پوچھ لیں گے۔ وہ گاؤں میں آئیں گے تو گداؤ ان پر نظر رکھے گا۔ اگر وہ ہمارے گھر کے پاس آئے اور ان کی حرکات مشکوک ہوئیں تو ہمیں یقین کرنا ہوگا کہ ان کا ارادہ بد ہے۔''

میر صاحب نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''ان کی باتوں پر . . . '' انھوں نے میری طرف دیکھا،'' اسی صورت میں یقین کیا جا سکتا ہے اگر، بقول ان کے، پیر اپنے ملنگ گاؤں میں بھیج دے . . . ارادہ کچھ بھی ہو . . . ان کی آمد مشکوک ہوسکتی ہے۔''

بھائی نے پہلے میری سمت اور پھر میر صاحب کی طرف دیکھا۔

'' کچھ نہیں ہوگا،'' انھوں نے کہا۔'' گداؤ کو پیر کے پاس بھیجنے کا ایک ہی فائدہ نظر آرہا ہے کہ اسے یقین ہو جائے گا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کے . . . '' بھائی نے میری طرف دیکھا،'' پاگل پن کی وجہ سے ہوا ہے۔''

بھائی کے طنز، ان کی سمت سے ہونے والی توہین کی مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''اور وہ یہ جان کر چپ چاپ بیٹھ جائے گا؟ اس کی ساکھ، اس کی دہشت، اس کا مستقبل کا کاروبار، سب کچھ داؤ پر لگا ہوگا اور وہ خاموش بیٹھ جائے گا؟ ملنگ ضرور جھاوریاں میں آئیں گے اور برے ارادے ہی سے آئیں گے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ ہمارے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیں گے۔ حملے کی رات بھی اس بات کی تسلی کرلیں گے کہ رقیہ اور بچہ صحن ہی میں سو رہے ہیں۔ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں سوچیں گے کہ بالوں کا گچھا کٹ جانے کے بعد رقیہ بچے کو لے کر صحن میں کیوں سوئے گی — میرے خیال میں وہ ایسا نہیں سوچیں گے، کیونکہ کالی بلا کو، پیر کے کہنے کے مطابق، کوئی حفاظت نہیں روک سکتی، نہ یہاں سے کہیں دور چلے جانا، نہ ہی کسی بند کمرے میں چھپ جانا . . . یہی وہم اس علاقے میں موجود ہے کہ کالی بلا کو صرف رکھ یعنی بالوں کا گچھا روک سکتا ہے۔ میرے

خیال میں ان کی آمد کے بعد اگلی رات خطرناک ہوگی۔ جس رات ملنگوں کی طرف سے خطرہ ہوگا، اس رات بھابھی اور بہنیں گھر پر نہیں ہونی چاہییں۔ اس رات۔۔۔ ''میں نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔ ''وہ آپ کے گھر پر رہیں گی۔ آپ اپنی بیگم سے کہہ کر انھیں بلوا لیجیے گا — بہانہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بھائی جان خود ان سے کہہ دیں گے کہ وہ رات آپ کے گھر رہیں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ خطرے کی رات وہ گھر کی چھت پر ہوں۔''

''کیوں؟'' بھائی نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ رقیہ اور بُوبا چھت پر ہوں،'' میں نے کہا، ''باقی دو چارپائیوں پر سونے کے لیے میں ماسی جیراں اور گلنازی کو اعتماد میں لے کر بلوا لوں گا۔''

بھائی کرسی پر آگے بڑھے، انھوں نے تنور کی سمت دیکھا۔

''ایسا کسی صورت بھی نہیں ہوسکتا،'' انھوں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ ''فضول وقت ضائع کر رہے ہو۔ گاؤں کی عورت، نوجوانی کے قریب پہنچی ہوئی لڑکی اور ہمارے گھر رات گزارنے آ جائے — قطعی فضول۔ وہ کبھی بھی نہیں آئیں گی اور تم میرے لیے ایک اور مصیبت لے آؤ گے۔''

''انھیں آمادہ کرنا میرا کام ہے،'' میں نے کہا، ''میں انھیں اعتماد میں لے لوں گا۔''

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے!'' بھائی نے سختی سے کہا۔

''صاحبزادے،'' میر صاحب نے کہا، ''یہ چھوٹا سا گاؤں ہے، کسی کو بھنک پڑ گئی تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ اور آپ اپنی بھابھی اور بہنوں کو چھت سے کیوں ہٹانا چاہتے ہیں؟''

میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بیزاری کا احساس نمایاں ہو چکا تھا۔

''مجھے بھابھی اور بہنوں پر، خصوصاً باجی زیبا پر بھروسا نہیں ہے۔ وہ کمزور دل کی ہیں، ملنگوں کو دیکھ کر شور مچا دیں گی۔۔۔ اور باجی زیبا۔۔۔ وہ تو زور زور سے تلاوت شروع کر دیں گی۔''

بھائی نے غصے سے میری طرف دیکھا، لیکن میں نے ان کی خفگی کی کوئی پروا نہ کی۔

''رقیہ اکیلی کبھی بھی بھائی جان اور میرے ساتھ چھت پر نہیں سوئے گی،'' میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ماسی جیراں اور گلنازی ہوں گی تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں صحن میں چارپائی پر ایک لحاف گول کر کے اور اس کے ساتھ ایک گاؤتکیہ رکھ دوں گا، وہ ماں بچہ ہی لگیں گے۔ ملنگ کھنڈر ہی

میں ٹھہرتے ہیں، وہاں سے گھر تک کھیت ہیں۔ وہ کھیتوں کے راستے ہی آئیں گے۔ غسل خانے اور لیٹرین کی چھت پر گداؤ اینٹوں اور پتھروں کے ساتھ موجود ہوگا۔ اماوس[35] میں دو راتیں باقی ہیں۔ اماوس ملنگوں کے لیے بچے پر حملہ کرنے کے لیے بہترین رات ہوگی اور ہمارے لیے بھی... کیونکہ وہ گداؤ کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ اگر کوئی ملنگ کھیت سے ملحق دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرے گا تو..."

"ٹائیگر بھونک بھونک کر سب کو جگا دے گا!" بھائی کے بیزار لہجے میں طنز موجود تھا۔

"اس رات ٹائیگر گھر پر نہیں ہوگا،" میں نے کہا۔ "یہاں ہسپتال میں ہوگا... آپ میری بات سن تو لیں۔"

"کیا اپنے ہاؤنڈ آف باسکرولز (Hound of Baskervilles) سے کوئی کام نہیں لو گے؟" اس بار بھائی کا طنز بہت کڑوا تھا۔

"میں کسی برائی کی خاطر نہیں، اچھائی کی خاطر یہ سب کچھ کر رہا ہوں،" میں نے کہا، "مجھے کسی کو قتل نہیں کرنا ہے۔"

میر صاحب نے میرے لہجے کی ناگواری کو محسوس کر لیا۔

"ارے آپ برا مان گئے!" انھوں نے کہا، "آپ اپنی بات جاری رکھیں۔"

"ہونا کچھ بھی نہیں،" بھائی نے کہا، "مجھے تو اس کی باتیں ٹین ایج کی فیسی نیشن لگ رہی ہیں۔ میں صرف گداؤ کو میگھا پتن بھیجنے تک اس کے ساتھ ہوں — باقی جانتا ہوں، کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوگا،" میں نے کہا، "تو آپ کے پاس مجھے واپس بھجوانے کا معقول بہانہ تو ہوگا۔"

میر صاحب نے بھائی کی سمت سر گھما کر دیکھا۔

"بھیا،" انھوں نے کہا، "یہ بات آپ نے درست کہی ہے کہ گداؤ میاں کو میگھا پتن بھیجنا نہایت معقول بات ہے، کیونکہ اس میں آپ کی سلامتی کی ضمانت موجود ہے۔ ہاں اگر گاؤں میں ملنگ آ گئے تو ہمیں سنجیدہ ہونا ہی پڑے گا۔"

35۔ اماوس: وہ رات جب چاند نہ ہو۔ سیاہ رات۔

''وہ آئیں گے،'' میں نے کہا۔ ''وہ نہ گلی کی سمت سے آئیں گے نہ خالی پلاٹ کی طرف سے — وہ کھیتوں کے راستے آئیں گے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ بخشو چائے کی پیالیاں اٹھانے آرہا تھا۔ اس کے جانے تک خاموشی رہی۔ اس کے لیے اتنی دیر ہمارا بیٹھے رہنا باعثِ حیرت ضرور تھا، لیکن اس میں استفسار کی ہمت نہ تھی۔

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے،'' بخشو کے دور چلے جانے پر میں نے کہا، ''وہ حملہ کس انداز میں کریں گے؟ نہ تو وہ گولی چلا سکتے ہیں، نہ ہی کوئی اور ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں... گداؤ نے مجھے بتایا ہے کہ تمام علاقے میں یہ بات مشہور ہے کہ کالی بلا بچوں کا خون پیتی ہے، بچے کے بدن میں خون خشک ہوجاتا ہے... خون زہر ہی سے خشک ہوتا ہے... ملنگ بچے کو زہر نہیں دے سکیں گے... گداؤ دودھ بازار سے لاتا ہے، دودھ میں بھی زہر نہیں ملایا جاسکتا۔ نہ ہی کوئی ملنگ رات کے وقت باورچی خانے میں جاکر ابلے ہوئے دودھ کی چاٹی[36] میں زہر ملا سکتا ہے۔ وہ یقیناً کوئی اور ہی طریقہ اختیار کریں گے... ذرا سا غور کریں تو آپ کو خود بھی احساس ہوجائے گا کہ اس صورت حال میں ان کے پاس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی دیوار سے دبے پاؤں اترے اور کسی تیز، موثر، بے ہوش کردینے والے سفوف سے رقیہ اور بوبے کو بے ہوش کرے۔ پھر تکیے سے ناک اور منھ دبا کر بُوبے کو ہلاک کردے اور واپس دیوار پر چڑھ کر کھیتوں کے راستے بھاگ جائے۔ اماوس میں کسی کے دیکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... ہم تو رقیہ اور بچے کو محفوظ کرچکے ہوں گے۔ صحن میں اترنے والے ملنگ کو جب یہ احساس ہوگا کہ ماں اور بچہ چارپائی پر موجود نہیں تو وہ بہت گھبرا جائے گا، واپس بیرونی دیوار کی جانب بھاگے گا۔ وہاں وہ گداؤ کی اینٹوں اور پتھروں کی زد پر ہوگا۔ وہ بیرونی دروازے کی سمت جائے گا، جہاں میں اندر سے تالا لگادوں گا۔ تالا دیکھ کر وہ نروس ہوجائے گا، سیدھا سیڑھیوں کی سمت آئے گا تاکہ خالی پلاٹ میں کود سکے۔ خالی پلاٹ میں وہ خود ہی پھنس جائے گا۔ دیواریں اونچی ہیں۔ ہم اسے آسانی سے پکڑ لیں گے۔ پھر آپ کی مرضی، اسے پولیس کے حوالے کریں یا گاؤں والے کے سامنے سچ اگلوائیں۔ میرا ایک ہی اندیشہ ہے۔ کیا میگھا پتن جاکر گداؤ کامیابی سے لوٹ پائے گا؟ اسی پر اور ملنگوں کے آنے پر ہی ہماری تدبیر کا انحصار ہے۔ اگر

36۔ مٹی کا کھلے منھ والا گھڑا، چھوٹا بڑا۔ گرمیوں میں دودھ کو بچانے کے لیے اسے پانی کی بھری ہوئی پرات میں رکھ دیتے ہیں۔

ملنگ اماوس سے پہلے گاؤں میں آ گئے تو سب کچھ آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا۔ اماوس میں دو دن رات ہیں یا تین راتیں؟''

میر صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا، ''صاحبزادے، ہمیں کیا معلوم... چاند دیکھے بھی مدت ہو چکی ہے۔''

بھائی بھی اٹھے۔ کرسی کو پیچھے ہٹایا۔ میر صاحب کی طرف دیکھا۔

''اس کی باتوں سے تو یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ اسے پہلے ہی سے کسی نے کان میں سرگوشی کر کے بتا دیا ہے۔ مجھے ابھی کوئی یقین نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہاں، گداؤ کا وہاں جانا ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔''

تنور پر ماسی جیراں الٹی کڑاہی رکھ رہی تھی۔ گلنازی کب گھر کے اندر گئی، مجھے احساس تک نہ ہوا تھا۔ ہم واپس چل دیے۔

''آپ کی ساری منصوبہ بندی کا دارومدار گداؤ میاں کی کامیابی پر ہے... کیا وہ مان جائیں گے؟'' میر صاحب نے کہا۔

''کوشش تو یہی ہوگی،'' بھائی نے کہا۔ گھر کے قریب آنے پر میر صاحب بازار کی سمت جانے کے لیے میدان میں چلے گئے۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ بشیر نعل بند کچی سڑک کے پار دھیمی دھیمی روشنی میں بستر بچھا رہا تھا۔

20

رات کا کھانا گداؤ نے ہمارے ساتھ کھایا۔ پھر بھائی، گداؤ اور میں صحن میں چارپائی کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بہنیں، رقیہ اور بُوبا بھابھی کے ساتھ چھت پر چلی گئیں۔ بھائی نے دھیمے لہجے میں گداؤ کو سب کچھ بتایا۔ چھت سے رقیہ نے ایک دو بار نیچے دیکھا۔ یہ صورت حال اس کے لیے یقیناً حیران کن رہی ہوگی، لیکن وہ یہ تو سمجھ ہی گئی ہوگی کہ ہم بالوں کا گچھا کٹ جانے سے متعلق ہی بات چیت کر رہے ہیں۔

بھائی گداؤ کو تو اعتماد میں لے ہی چکے تھے، اس لیے انھیں مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہ

تھی۔ جب وہ گداؤ کو اعتماد میں دوبارہ لینے کے لیے ہماری تدبیر بتارہے تھے، میں نے ایک دو بار بولنے کی کوشش کی لیکن بھائی نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ انھوں نے پہلے تو گداؤ کو اپنے انداز میں سمجھایا کہ بدروحوں اور کالی بلا کا خوف محض ایک فریب ہے، دھوکا ہے اور پھر انھوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کالی بلا بُوبے کو مارے نہ مارے، پیر نور شریف اپنے ملنگوں کے ذریعے ضرور مروادے گا، اور اس لیے ہم نے یہ تدبیر اختیار کی ہے۔

''تمھیں بس اتنا ہی کرنا ہے کہ میگھا پتن جا کر پیر نور شریف کو یہ بتانا ہے کہ ڈاکٹر کا پاگل بھائی ان دنوں جھاوریاں آیا ہوا ہے، اس نے بچے کی رکھ کاٹ دی ہے۔''

گداؤ کے چہرے پر خوف سا نمودار ہوا۔ خوف اس کی آنکھوں میں کہیں زیادہ تھا جو لالٹین کی روشنی میں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ اسے خوفزدہ دیکھ کر میں مایوس سا ہو گیا۔ یوں لگا جیسے گداؤ میں میگھا پتن جانے کا حوصلہ نہیں ہے۔ پھر گداؤ کی سرگوشی ابھری، ''وہ وڈے (بڑے) پیر ہیں . . . مجھ پر کوئی آفت نہ آ جائے . . . بال بچوں والا ہوں۔''

گداؤ کی یہ بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے جانے سے پہلے مجھے جھاوریاں کے بازار میں کھڑے ہو کر بدروحوں اور کالی بلا کو گالیاں دینا ہوں گی، آتے جاتے لوگوں کو پتھر مارنا ہوں گے، خود کو پاگل ثابت کرنا ہوگا . . . گداؤ کی آواز میں خوف مجھے بار بار یہی احساس دلا رہا تھا کہ مجھے واپس جانا ہی ہوگا۔ میں ذہنی طور پر شکست خوردہ ہو چکا تھا . . . اچانک بھائی نے ایسا انداز اختیار کیا، جسے وہ دیہاتیوں کے ساتھ رہ رہ کر سیکھ گئے تھے۔ انھوں نے معمولی سی تمہید کے بعد گداؤ کو طعنہ دیا۔ وہ گداؤ کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

''میں نے سن رکھا تھا . . . '' بھائی نے کہا، ''سب کہتے ہیں کہ میراثی لوگ بہت ڈرپوک ہوتے ہیں لیکن گداؤ . . . میں نے یہ بات کبھی نہیں مانی۔ کیونکہ کوئی شخص پیدائشی طور پر ڈرپوک نہیں ہوتا، ماحول اور حالات اسے خوفزدہ کرتے ہیں۔ تم تو مجھے کبھی بھی تھُڑ دِلے نہیں لگے . . . تم پر تو ماحول اور حالات کا اثر محسوس نہیں ہوتا . . . تم جب ہسپتال میں اڑیل بیل یا بھینسے کو سینگوں کی سمت سے رسّہ ڈال کر نیچے گرا دیتے ہو تو میں کمپاؤنڈر سے کہا کرتا ہوں کہ کون کہتا ہے گانے بجانے والے ڈرپوک لوگ ہوتے ہیں؟ اور آج یہاں ہمارے سامنے تم سہمے ہوئے ہو — چوہے کی طرح! میں بے خوف

ہوں . . . یہ بے خوف ہے،'' بھائی نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''میری بیوی ہے، بہنیں ہیں — پھر بھی میں نہیں ڈرتا، اور تم . . . بس اتنی سی بات پر سہم گئے ہو کہ تمھیں میں میگھا پتن بھیجنا چاہتا ہوں! تم نے وہاں جا کر صرف یہ بتانا ہے کہ رکھ کٹ چکی ہے۔''

گداؤ نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''میں ڈرپوک نہیں ہوں صاب جی . . . '' اس نے قدرے بہتر آواز میں کہا، ''بال بچوں والا ہوں۔''

''دلیر انسان نہ اپنے لیے ڈرتا ہے نہ بال بچوں کے لیے،'' بھائی نے کہا۔ ''یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ جو شخص اپنی زندگی میں ایک بار ڈر جائے . . . کہیں بھی، کسی حالت میں بھی، تو ڈر زندگی بھر اس کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ وہ لاکھ بچنے کی کوشش کرے، ڈر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہاں ایک بچے کی زندگی کا سوال ہے اور تم اس قدر ڈرے ہوئے ہو کہ مجھے حیرت ہو رہی ہے . . . دیکھو گداؤ، ہم یہ سب کچھ ایک بچے کی زندگی بچانے کے لیے کر رہے ہیں۔ ایک یتیم بچے کی جان بچانے کا سوال ہمارے سامنے ہے . . . کیا ایک بچے کی زندگی بچانے میں مدد کرنا تمھارا فرض نہیں ہے؟''

مجھے ایک بات سوجھی۔ میں نے گداؤ کا بازو پکڑا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔

''گداؤ،'' میں نے کہنا شروع کیا، ''اس گاؤں میں صرف ایک ہی شخص ہے جو یہ کام کر سکتا ہے، اور وہ تم ہو — کوئی ایک بھی ہوتا تو ہم تمھیں نہ کہتے۔ تمھیں میگھا پتن جا کر پیر کو صرف یہ بتانا ہے کہ بچے کی رکھ کٹ گئی ہے اور بچے کی ماں نے تمھیں بھیجا ہے . . . یہ بات تو جھوٹ نہیں ہے کہ بالوں کا گچھا کٹ چکا ہے . . . بس یہ بات چھپانی ہے کہ ہمیں یہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ تمھیں بھیجا۔ بس یہی بات چھپانی ہے کہ ہم نے تمھیں بھیجا ہے، اور یہ صرف تم ہی کر سکتے ہو — کیونکہ یہ کام کوئی فنکار ہی کر سکتا ہے، سچا اداکار ہی کر سکتا ہے، اور وہ فنکار تم ہو۔ تم سچے اداکار ہو۔ تم ہی اپنی اداکاری سے یہ بات چھپا سکتے ہو۔ تم پکے اور منجھے ہوئے تھیٹر کے اداکار ہو، سینکڑوں لوگوں کے سامنے کردار میں جان ڈال سکتے ہو . . . فرض کرو، ہم بخشو کو بھیج دیتے ہیں تو اسے تو پیر کے ملنگ ہی پکڑ لیں گے۔ وہ ان سے بھی یہ بات نہیں چھپا سکے گا کہ اسے ہم نے بھیجا ہے۔ لیکن تم . . . تم پیر کے ڈیرے پر پیر کے سامنے بیٹھ کر بھی یہ بات چھپا سکتے ہو، کیونکہ تم فنکار ہو . . . اداکار ہو۔ تمھیں کون پکڑ سکتا ہے! اس گاؤں میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں جو یہ کام کر سکے، سوائے تمھارے کوئی بھی یہ بات نہیں چھپا

سکتا۔ لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ چھپا سکتے ہو، یہ کام کسی بڑے اداکار کا ہے، اور وہ تم ہو گداؤ۔ تمھیں پیر بھی نہیں پکڑ سکے گا۔ اور تم نے صرف یہ بتانا ہے کہ رکھ کٹ چکی ہے۔ تمھیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ رکھ تم نے تو نہیں کاٹی، میں نے کاٹی ہے، اور یہ بات جھوٹ بھی نہیں ہے۔''

گداؤ کی آنکھوں میں خوف کا تاثر کم ہوتا دکھائی دیا، میری ہمت بڑھی۔

''وہاں تمھاری باتوں سے، چہرے سے . . . ''میں نے بات جاری رکھی، ''تمھاری آنکھوں سے کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ تمھیں ہم نے بھیجا ہے۔ بس یہی کام تمھیں کرنا ہے۔ باقی تم وہاں سچ ہی بولو گے — مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو . . . یہ زندگی بھی تھیٹر کی سٹیج ہے، گداؤ . . . یہاں اداکاری دکھاؤ، اپنا سچا فن پیش کرو، جو تم کر سکتے ہو۔''

''اگر اتنا ہی کرنا ہے تو یہ تو میں کرلوں گا،'' گداؤ نے کہا، ''میں نے کون سا جھوٹ بولنا ہے!''

مجھے صحن میں دھیمی دھیمی روشنی پھیلی محسوس ہوئی۔

''تمھیں وہاں جا کر پیر سے یہ کہنا ہے کہ بچے کی ماں رو رو کر بے حال ہو چکی ہے — اور یہ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ تم یہ کہنا کہ بچے کی ماں کو بھی علم ہے کہ پانچویں برس اگر رکھ نہ رہے تو کالی بلا سے بچے کو کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ تم نے وہاں جا کر پیر کو یقین دلانا ہے کہ میں پاگل ہوں، دورے پڑتے ہیں مجھ پر۔''

گداؤ نے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا۔

''سمجھ گیا ہوں صاب،'' گداؤ نے کہا۔ ''درست سوچا ہے آپ نے۔ یہ بات ہی معاملہ سنبھال سکتی ہے۔''

''کہنا کہ ڈاکٹر کی بہنیں بالکل درست ذہن رکھتی ہیں، بھائی نیم پاگل ہے،'' میں نے کہا۔

''وہ کون ہوتا ہے؟'' گداؤ نے فوراً پوچھا۔

''ایسا پاگل جو کبھی تو بہت سمجھدار اور ٹھیک نظر آتا ہے اور کبھی پاگل ہو جاتا ہے،'' میں نے جواب دیا۔

''سمجھ گیا صاب،'' گداؤ نے کہا، ''دوروں والا پاگل۔''

''ہاں،'' میں نے اپنی بات پھر جاری رکھی، ''وہاں پیر سے کہنا کہ جب ڈاکٹر کے بھائی پر دورہ پڑتا ہے، وہ پیروں فقیروں کو گالیاں دیتا ہے، بدروحوں اور کالی بلا کو گندی گالیاں دیتا ہے، سمجھ میں نہ آنے والے عجیب عجیب سے منتر پڑھنے لگتا ہے، کبھی ہوا سے باتیں کرتا ہے، کبھی اونچے سروں میں گانے لگتا ہے — پاگل ہے مرشد۔ جب سے چھٹیاں... نہیں، چھٹیوں کا ذکر نہ کرنا... پاگل سکول میں تو نہیں پڑھ سکتا... کہنا کہ جب سے بہنوں کے ساتھ جھاوریاں آیا ہے، عجیب عجیب سی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ آتے ہی بچے کی رکھ کے پیچھے پڑ گیا۔ یہ بھی بتانا کہ ماں اور بچہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہتے ہیں۔ گھر کے بارے میں ساری معلومات پیر کو اسی طرح بتانا جیسے رکھ کاٹے جانے کے واقعے میں میرا طریقِ کار بتا رہے ہو — چارپائیاں کہاں ہوتی ہیں، ماں اور بچے کی چارپائی کہاں تھی... بھول کر بھی ٹائیگر کا ذکر نہ کرنا... بہت ضروری ہے... میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا کہ ٹائیگر کا ذکر کیوں نہیں کرنا... یہ کہنا کہ صبح جب ماں باہر کھیتوں میں گئی، کھیت گھر کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں، پاگل کو موقع مل گیا اور اس نے کپڑا کاٹنے والی بڑی قینچی سے رکھ کاٹ دی اور نہر میں پھینک آیا۔''

گداؤ کی آنکھیں چمکیں۔ اس کی دلچسپی بیدار ہو چکی تھی، اس کے اندر کا اداکار آنکھیں کھول چکا تھا۔

''سمجھ گیا ہوں،'' گداؤ نے کہا، پھر بھائی کی طرف دیکھا۔ ''اتنی سی بات! صاب، اس میں کیا ڈر ہے... میں نے کون سا جھوٹ بولنا ہے۔ رکھ تو کٹ ہی چکی ہے — پیر نور شریف کو یہی اطلاع دینی ہے۔''

''اور مدد بھی مانگنی ہے،'' میں نے کہا۔

''مانگوں گا صاب، اور ایسی مانگوں گا کہ پیر کو بھی میری اداکاری کا پتا نہیں چلے گا،'' گداؤ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، جاؤں گا صاب۔'' بھائی کے چہرے پر سکون نمودار ہوا۔

میں نے گداؤ کا ہاتھ پکڑا۔ ''تم نے وہاں جا کر صورتِ حال کو سنجیدگی سے پیش کرنا ہے،'' میں نے کہا۔ ''تم پیر سے کہنا کہ تمھیں بچے کی ماں کی بہت فکر ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے، اسی نے تمھیں بھیجا ہے۔ پیر کے پاؤں پکڑ لینا اور رو رو کر کہنا کہ مرشد، مدد کریں، بہت پیارا بچہ ہے، اسے کالی

بلا سے بچائیں۔ پھر جو کچھ پیر کہے، واپس آ کر ہمیں بتا دینا — بس یہی کام ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا،'' گداؤ نے حوصلے سے کہا،'' آپ فکر نہ کریں۔''

مجھے حیرت آمیز خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ مدتوں سے اس گاؤں کے پسماندہ ماحول میں رہنے والا، ناخواندہ، یہاں کے فرسودہ معاشرے میں پلا بڑھا، یہاں کے ماحول میں پروان چڑھا گدا حسین اتنی جلدی مان کیسے گیا ہے!

''دھوکا تو نہ دو گے؟'' بھائی نے کہا اور گداؤ کا چہرہ تیزی سے بھائی کی سمت گھوما۔

''صاب،'' گداؤ نے کہا،'' یہ کیا بات کی ہے آپ نے! بڑے ڈاکٹر آئے یہاں پر۔ میں نے ان کے گھروں میں بھی نوکروں کی طرح کام کیا تھا۔ وہ سرکاری تنخواہ پر گھر کا کام کراتے تھے۔ بی بی جی مجھے الگ سے تنخواہ دیتی ہیں۔ بیوی بچوں کے لیے کپڑے دیتی ہیں... میں روپے پیسے، کپڑے لتے کا بھوکا نہیں ہوں صاب... مجھے تو آپ کے گھر میں جو عزت ملی ہے، پیار ملا ہے، مجھے تو اس نے خرید لیا ہے... میں نے تو کبھی کوئی آس ہی نہیں رکھی تھی... یہ کیا بات کی آپ نے صاب... میں آپ کا وفادار ہوں... جان بھی دے سکتا ہوں... ڈائیلاگ نہیں بول رہا ہوں، صاب، دل سے کہہ رہا ہوں...'' بھائی مسکرائے۔'' میں تو دعائیں مانگتا ہوں کہ آپ جھاوریاں ہی میں رہیں، کبھی نہ جائیں... دھوکا — میں دوں گا؟ آپ ایسا سوچیں بھی مت... آپ نے تو بہت چھوٹا سا کام دیا ہے... میں کل صبح ہی میگھا پتن چلا جاؤں گا۔''

میں نے گداؤ کی سمت دیکھا۔

''دیکھو،'' میں نے کہا،'' یہ کام ایک فنکار کا ہے، اپنی اداکاری سے سنبھال لینا۔''

گداؤ نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔ اس نے اپنی پہلے ہی سے مجھے بتائی ہوئی باتیں دہرائیں۔

''خوشاب کے تھیٹر میں،'' گداؤ کا لہجہ خاصا خوشگوار ہو گیا۔'' جب میں تھیٹر میں ملازم تھا تو وہاں مرزا صاحباں کا کھیل ہوا تھا۔ پورے میلے میں دھوم مچ گئی تھی۔ شانی (شاہانہ) کے ڈانس نے لوگوں کو پاگل کر دیا تھا — وہ صاحباں بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس کھیل میں کرمو باہمن کا رول بھی کیا تھا صاب۔ تین مہینے تک لوگ مجھے ہندو سمجھتے رہے تھے۔ میں تو رہ گیا... شانی کے ساتھ بمبئی چلا جاتا تو پورے ہندوستان میں دھوم مچا دیتا۔ بس رہ گیا... آپ فکر نہ کریں، وہاں کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ وہاں

کے ملنگوں کو ایسا چکر دوں گا کہ ان کی سرت (مت) ماری جائے گی۔ پیر کو پتا نہیں لگنے دوں گا کہ مجھے آپ نے بھیجا ہے۔''

بھائی نے میری طرف دیکھا۔

''بس یہی بات چھپانی ہے،'' انھوں نے کہا۔

''باقی تو سب کچھ سچ ہی بتانا ہے... پر...'' میں نے کہا۔

''میں نے کون سا جھوٹ بولنا ہے،'' گداؤ نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہی بتانا ہے کہ رکھ کٹ گئی ہے، اور مدد مانگنی ہے۔''

''دو جھوٹ تو تمھیں بولنا ہی ہوں گے گداؤ،'' میں نے کہا۔ ''ایک یہ کہ تمھیں رقیہ نے بھیجا ہے اور دوسرا یہ کہ میں پاگل ہوں۔''

گداؤ نے قہقہہ لگایا۔ رقیہ نے چھت کی منڈیر سے نیچے جھانکا۔

''اور یہی دو جھوٹ تمھاری اداکاری کا امتحان ہوں گے،'' میں نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں۔'' گداؤ اٹھا اور ہینڈ پمپ کی طرف گیا۔ اس نے ٹائیگر کے پٹے سے زنجیر کھولی، مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''یاد ہے نکے صاب، ٹائیگر کا ذکر نہیں کرنا۔''

''اس بات کا ذکر اپنے گھر میں بیوی بچوں سے بھی نہ کرنا،'' بھائی نے کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاب جی!'' گداؤ نے ٹائیگر کا ہاتھ میں پکڑا ہوا پٹا چھوڑ دیا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔'' ٹائیگر نے ہر رات کی طرح زنجیر کھلتے ہی دوڑ کر صحن کا ایک چکر لگایا۔ وہ غسل خانے کی سمت گیا، پھر بیرونی دروازے کی طرف گیا، پھر برآمدے میں گھس کر باہر نکلا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر چلا گیا۔ میں اور بھائی کرسیوں سے اٹھے۔ رقیہ بوبے کو لے کر سیڑھیوں سے نیچے آئی اور صحن میں اپنی چارپائی پر بستر بچھانے کے بجائے بُوبے کو اندر کمرے میں لے گئی اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

شدید گرمی کا احساس صحن میں تو نہ تھا، لیکن کمرے میں...

مجھ پر ایک بار پھر ندامت سی اتری۔ ''کچھ بھی ہو، میں نے رقیہ کو تکلیف ضرور پہنچائی ہے۔''

21

اگلی صبح نو بجے والے تانگے پر بیٹھ کر گداؤ میگھا پتن چلا گیا۔

دن بہت بے چینی سے گزر رہا تھا۔ میں گھر پر رہ نہیں سکتا تھا۔ کھیتوں میں، نہر کے کنارے پر گھومتے گھومتے دوپہر ڈھل گئی۔ میں گھر آیا اور کاپی پنسل لے کر میر صاحب کی ڈسپنسری پہنچ گیا۔ پڑھنے میں نہ میری محویت تھی نہ ہی میر صاحب کا انداز پہلے جیسا تھا۔ ان پر اضطرابی کیفیت نمایاں تھی۔ تانگے نے میگھا پتن سے تین بجے واپس آنا تھا اور تین بجنے میں چھ سات منٹ ہی باقی تھے۔

''آج اگر گداؤ کی پیر سے ملاقات نہ ہو سکی تو . . . ''میں نے سوچا،''ایک دن اور گزر جائے گا۔''میں نے اندیشے کو محسوس کیا۔''گلنازی کو اتنے دن روکنا بہت دشوار ہوگا، اور گلنازی کو اگر پتا چل گیا کہ بُوبے کا بالوں کا گچھا کٹ گیا ہے تو وہ ہر حال میں ماسی جیراں کو بتادے گی۔''

میری نظریں بار بار شمال کی سمت، گلی میں دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ میں ڈسپنسری کے اندر میر صاحب کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ میر صاحب شاید گلی میں بیس تیس قدم تک دیکھ سکتے تھے۔ تین بج کر پندرہ منٹ پر میر صاحب گلی کی سمت دیکھتے ہوئے چونکے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جائیے،''میر صاحب نے کہا،''گداؤ میاں آ رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد گداؤ ڈسپنسری کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پوٹلی سی اٹھا رکھی تھی۔ پوٹلی میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ میں چونکا۔ میر صاحب کرسی پر سیدھے بیٹھ گئے۔ گداؤ دکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہ تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مجھے ایک لمحے سے بھی کم مدت میں احساس ہوا کہ گداؤ کامیاب لوٹا ہے۔

''کیا ہوا؟''میر صاحب نے جیسے سرگوشی میں گداؤ سے پوچھا۔

''میں اپنے گھر جا رہا ہوں،''گداؤ نے پراعتماد آواز میں جواب دیا۔''پھر ہسپتال جاؤں گا۔''

گداؤ اس قدر نارمل تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور یہی بات میرے لیے باعث سکون بھی تھی۔ وہ اگلی گلی میں مڑ کر اپنے گھر کی سمت چلا گیا۔ میں نے میر صاحب کی سمت اور میر صاحب نے تشویش بھری نظروں سے میری سمت دیکھا۔

''آپ گھر جائیں،''میر صاحب نے کہا۔''ہم شام کو ہسپتال پہنچ جائیں گے۔''

میں نے گرامر کی کتاب اٹھائی، کاپی پنسل سنبھالی اور گھر کی سمت چل دیا۔ بازار میں بہت سے دکاندار، بجلی نہ ہونے کی وجہ سے، کھجور کے پتوں والے ہتھ پنکھے لیے نظر آئے۔ گراؤنڈ سے گزرتے ہوئے مجھے ہر سمت حدت آمیز تیز روشنی کا احساس ہوا۔ بشیر نعل بند کی دکان سامنے سے کھلی رہتی تھی۔ وہ دکان کے اندر نیم دراز اونگھ رہا تھا۔ بیرونی دروازے کے قریب میرے قدم رک گئے۔ گزشتہ کئی روز سے، شاید یہ دوسرا ہی دن تھا، میں رقیہ کا سامنا کرتے ہوئے بے حد گھبرا رہا تھا۔ سامنا تو میں پہلے بھی نہیں کر پاتا تھا، کیونکہ میرے سامنے بُوبے کا بالوں کا گچھا آ جایا کرتا تھا، لیکن کاٹنے کے بعد میں رقیہ کے سامنے بالکل ہی نہ جا پاتا تھا۔ میں واپس مڑا اور ہسپتال کی سمت چل دیا۔ جولائی کی جھلستی دوپہر کے بعد تمازت کا احساس شام تک پھیلا رہتا ہے۔ ہر سمت خاموشی تھی۔ کوئی دیہاتی کہیں نظر نہ آیا۔ ہسپتال کی سمت جانے والی سڑک سنسان تھی۔ میرے قدم آہستہ تھے۔ دھوپ میرے سر پر، جسم کے کبھی حصوں پر، اپنی حدت کا احساس ترچھی شعاعوں سے پھیلا رہی تھی۔ پسینے کے قطرے سارے بدن پر لڑھک رہے تھے۔ کمر پر میری قمیض بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ ہر سمت تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ تمازت کے اس احساس سے میں ناآشنا نہیں تھا، پہلے بھی کئی بار جھلس چکا تھا، لیکن اس بار یہ احساس عجیب سا تھا، جسے میں محسوس کرتے ہوئے بھی ناآشنا سا تھا، بیگانہ سا تھا۔ اچانک میرے تصور میں وہ پوٹلی ابھری جو گداؤ کے ہاتھ میں تھی... میں ٹھٹکا۔

''کیا پیر نور شریف نے رقیہ کو، بُوبے کو کھلانے کے لیے کوئی چیز تو نہیں بھیجی؟'' اس خیال کے ساتھ ہی میرے اٹھتے قدم رک گئے۔ میں واپس پلٹا، لیکن پھر رک گیا۔ ''بھائی گھر پر ہی ہیں... بھائی ہمیشہ سے مجھے شکی مزاج سمجھتے ہیں... اگر میں واپس گیا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھے ان کی ذہانت پر بھی شک ہے۔ اگر پیر نے بُوبے کو کھلانے کے لیے کوئی چیز بھیجی ہے تو بھائی کسی صورت میں بھی بچے کو نہیں کھلانے دیں گے۔ اور ابھی تو گداؤ اپنے گھر گیا ہے، وہ شام ہی کو بھائی کے گھر پہنچے گا۔''

میں دوبارہ ہسپتال کی سمت چل دیا۔ ماسی جیراں کا تنور اور ہسپتال کا صحن سنسان تھے۔ ماسی جیراں صبح نو بجے سے دس بجے کے درمیان تنور میں لکڑیاں ڈالا کرتی تھی۔ اڑھائی بجے تنور بند ہو جاتا تھا۔ ہسپتال میں بخشو بھی موجود نہ تھا۔ ہسپتال کے شمال مشرقی کونے میں اس کی کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے بند تھا، تالا لگا ہوا تھا۔ میں ہسپتال کے صحن میں، گھنے پتوں والے شیشم کے درخت کے نیچے،

سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھ گیا... بیٹھتے ہی فوراً اٹھا، چھاؤں میں ہونے کے باوجود بنچ تپی ہوئی تھی۔ مجھے بنچ پر بیٹھنے کے لیے کئی بار بیٹھ کر اٹھنا پڑا، پھر میرے جسم کی بیرونی جلد بنچ کی تپش کو برداشت کرنے کے قابل ہوگئی۔ میری نظریں تنور کی سمت گئیں۔

''گلنازی تو گھر کے اندر، کمرے میں سو رہی ہوگی،'' میں نے سوچا۔ ''کمرے میں تو بہت گرمی اور گھٹن ہوگی۔ گلنازی کو سب دوپہریں، سب سہ پہریں گرمی اور گھٹن میں ہی گزارنا ہوتی ہوں گی۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ، اس کے ہاتھ... اس کی ٹانگیں...'' مجھے پھر دھیمی سی شرم کا احساس ہوا۔ ''اس کا رنگ کھلتے ہوئے گلابی پھول کی مانند ہے۔ وہ تو چہرے پر کوئی کریم بھی نہیں لگاتی، ہونٹوں پر بھی ہونٹوں کو نرم رکھنے والی کوئی چیز نہیں لگاتی، پھر بھی اس کا چہرہ نکھرا رہتا ہے... اس کی گھنی پلکوں والی آنکھیں کاجل بن کجراری ہیں... وہ بے انتہا خوبصورت ہے۔ شاید میری طرح وہ بھی موسموں کی شدت سہنے کی عادی ہوچکی ہوگی اور موسم اس کا حسن خود اپنی شدت سے نکھارتے رہتے ہوں گے۔ شاید وہ یہ شدت کسی نامعلوم تغیر سے لطافت میں بدلتے رہتے ہیں، جس کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔''

گلنازی کا خوبصورت چہرہ، چمکتی مسکراتی آنکھیں، میرے تصور میں ابھریں۔

''وہ مجھے دیکھ کر جب بھی مسکراتی ہے،'' میں نے سوچا، ''مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے کہیں زیادہ اس کی خوبصورت آنکھوں میں چمکتی ہے — کیا میں اسے بہت اچھا... کیا وہ مجھے چاہتی ہے؟''

میرے خیالات کا مرکز گلنازی تھی۔ قصے کہانیوں میں پڑھا تھا کہ اسی طرح محبت ہوجایا کرتی ہے، لیکن میں نے تو ابھی تک اپنے دل میں کسی ایسے جذبے کو محسوس نہیں کیا تھا جو مجھے یہ احساس دلائے کہ میں گلنازی کی سمت کھنچتا جا رہا ہوں۔ خصوصاً یہ جاننے کے بعد کہ وہ ماسی جیراں کے بھتیجے محمد اکبر خان کی منگیتر ہے، مجھے اپنے دل میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔

''شاید میں اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں،'' میں نے سوچا۔ میری نظریں گلنازی کے گھر کے بیرونی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ ''شاید میں چاہتے ہوئے بھی اپنے دل میں کسی جذبے کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ شاید میں خود کو فریب دے رہا ہوں۔ گلنازی میں اگر کوئی کشش نہیں ہے تو ہر رات سونے سے پہلے وہ مجھے کیوں یاد آتی ہے؟ اس کا خوبصورت چہرہ اور چمکتی ہوئی مسکراتی آنکھیں مجھے

کیوں دکھائی دیتی ہیں؟ مجھے اس کی بھولی بھالی شرارتیں کیوں یاد آتی ہیں؟ آٹے کا پیڑا بنا کر میری طرف دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر گرا دینا اور پھر ماسی سے ڈانٹ کھا کر مسکرانا، کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی سی لکڑی جلتے ہوئے تنور میں پھینک دینا اور چنگاریاں اڑنے پر ماسی کے تھپڑ سے بچنے کے لیے اٹھ کر دوڑنا اور دور کھڑے ہو کر ہنستے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ کر مجھے مسکرانے کے لیے بے بس کر دینا— وہ اتنی پیاری سی شرارتیں کیوں کرتی ہے؟''

اس سوال کا جواب میرا ذہن تو نہیں دے پاتا تھا، لیکن دل سے یہی جواب ملتا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور مجھے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے ہی بھولی بھالی سی شرارتیں کرتی ہے۔

''وہ بے حد خوبصورت ہے،'' میں نے گلنازی سے متعلق اپنے احساس کو خیالات کا روپ دیا۔''وہ بہت خوبصورت ہے، اپنے نام کی طرح۔ دیہاتی لڑکیوں سے بالکل الگ سی، دبلی پتلی، نازک سی... اس علاقے میں اتنی خوبصورت لڑکی شاید ہی کہیں ہو... اس علاقے میں کیا، مجھے تو یوں لگتا ہے شاید اس دنیا میں گلنازی جیسی خوبصورت لڑکی کہیں اور نہیں ہوگی۔ اس علاقے کی لڑکیاں مینڈھیاں بنا کر بال باندھتی ہیں۔ وہ ایک ہی لمبی چوٹی بناتی ہے اور اس کے بالوں سے کچھ بال زلف سی بنا کر اس کے دائیں رخسار پر بکھرے رہتے ہیں۔ اس کی بے حد خوبصورت آنکھوں پر گھنی پلکیں چھاؤں سی کیے رہتی ہیں۔ وہ سب سے جدا لگتی ہے... لیکن میں یہ کیوں سوچ رہا ہوں؟ میں تو جانتا ہی ہوں کہ وہ کشمیر کی بیٹی ہے۔''

گلنازی کے رخسار پر بکھرے بالوں کا خیال آتے ہی میرے تصور میں بُوبا نمایاں ہوا۔ گداؤ کے ہاتھ میں پوٹلی کا خیال آتے ہی پھر اندیشے نے سر اٹھایا، لیکن اس احساس سے کہ بھائی گھر پر ہی ہیں، اندیشہ پوری طرح میرے ذہن کو نہ دبوچ سکا۔ میری نظریں تنور کی سمت گئیں... میرے خیالات کا ہر بہاؤ گلنازی ہی کی سمت بہے جا رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی پلکوں والی خوبصورت چمکتی ہوئی مسکراتی آنکھیں مجھے قریب آتی محسوس ہوئیں۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ مجھے چاروں سمت فضا میں پھیلتی محسوس ہوئی۔

''وہ اس علاقے کی لڑکیوں سے کس قدر مختلف ہے! یہاں ہی کی زبان بولتی ہے، اس کا لہجہ بھی یہاں کا ہے، لیکن اس کی آواز میں جو خوبصورت سا ترنم ہے، جو دلکش سی نغمگی ہے وہ تو کسی دوسری

لڑکی کی آواز میں نہیں ہے۔ میں نے کبھی اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی جس کی ہر شے ... آنکھیں، اندازِ دید، آواز، ادائیں، سب ہی میں حسن اور دلکشی، لاانتہا جمال کا احساس دلاتی ہے۔ کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں کیا اس قدر خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ پہاڑی لڑکیاں، چٹانوں اور پتھروں کی طرح سخت مزاج اور کرخت ہوتی ہوں گی، لیکن گلنازی — یہ تو بہت ہی نازک سی ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ گھر کی دیوار کے پار، اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی گلنازی مجھے دیکھ رہی ہے۔

''میں خود سے خود کو چھپا رہا ہوں،'' میں نے سوچا۔ ''مان کیوں نہیں لیتا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ گلنازی کسی اور کی منگیتر ہے، وہ میرے تصورات کی وادی میں، میرے احساسات کی آبجو کے کنارے، میرے جذبات کے پودے پر نیم واکلی کی طرح اپنی جگہ بنا چکی ہے — جسے کھلنے میں دیر نہیں لگے گی۔'' پھر اچانک ہی ریڈیو پر سنا ہوا ایک پہاڑی گیت، جو کشمیر کے پہاڑی علاقوں ہی میں گایا جاتا ہے، میرے ہونٹوں پر آ گیا۔

''پل پل بہی جانا، بہی جانا، ہوجندے ... '' (پل بھر بیٹھ جا — اے میری زندگی ...)

مجھ پر آہستہ آہستہ اس لوک گیت کی دھن سے اداسی سی چھا گئی جو لمحہ لمحہ گہری ہوتی چلی گئی ... میں مایوسی کی حد تک اداس ہو گیا۔

''مجھے تو یہاں سے چلے جانا ہے،'' میں نے اداسی سے سوچا۔ ''چھٹیوں میں پچیس دن رہ گئے ہیں ... مجھے کون سا یہاں رہنا ہے۔ یہ ساتھ تو پل بھر ہی کا ہے۔ میں تو یہاں سے چلا جاؤں گا ... پل بھر کا ساتھ تو بس ایک یاد بن کر رہ جائے گا ... میرے لیے بھی اور گلنازی کے لیے بھی ... مجھے گلنازی کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے ... یہ بات گلنازی کو کیسے بتاؤں کہ ہمارا ساتھ پل بھر ہی کا ہے۔''

جولائی کی سہ پہر اداسی سے بوجھل ہو گئی۔ ہسپتال کی مشرقی جانب چھپر کے نیچے ایک بہت ہی کمزور گائے بندھی ہوئی تھی۔ سرخ رنگ کی اس گائے کو نہ جانے کیا بیماری تھی، ڈھانچہ بن چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مریل سا بیل بندھا ہوا تھا — چند گز دور۔ بیل کی بھی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں، خصوصاً پسلیوں پر اس کے انتہائی کمزور ہونے کا احساس زیادہ تھا۔ دونوں کو شاید ایک ہی بیماری نے

دبوچ رکھا تھا۔ بھائی نے ایک بار بتایا تھا کہ جانور جب بیمار ہو جاتے ہیں تو کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں — یا شاید انھیں بھوک ہی نہیں لگتی ہوگی۔ راتب سامنے پڑا رہتا ہے اور وہ اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی سے مایوس ہو چکے ہیں۔

بیل سے ایک دو گز دور ایک گدھا بندھا ہوا تھا، جس کی گردن پر خارش تھی، بال جھڑ چکے تھے۔ کمپاؤنڈر نے اس کی گردن کے خارش زدہ حصے پر کوئی تیل نما دوائی لگادی تھی جو چمک رہی تھی اور مکھیاں خارش زدہ حصے پر بیٹھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ گدھے سے آگے ایک موٹا تازہ، سفید رنگ کا بیل کھڑا تھا جس کے جسم پر ران کے قریب زخم تھا، جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دھنی کے خوبصورت بیلوں کے برعکس، اس بیل کے سینگ بڑے بڑے تھے۔ زخم پر پٹی کو پلاسٹر سے اس کی کھال پر چپکا یا گیا تھا۔ پٹی پر بار بار مکھیاں بیٹھ رہی تھیں اور بیل بار بار اپنے دُم کو پٹی پر مار رہا تھا۔

''اسے زخم پر اپنی دُم کوڑے کی طرح لگ رہی ہوگی،'' میں نے سوچا،''اسے تو بہت درد ہو رہا ہوگا۔ کمپاؤنڈر کو چاہیے تھا کہ مکھیوں سے بچاؤ کا بھی کوئی انتظام کر دیتا۔''

ہسپتال کا کمپاؤنڈر خاموش قسم کا بوڑھا شخص تھا، ریٹائرمنٹ میں چند مہینے ہی رہ گئے تھے۔ مجھ سے شاید ایک آدھ بار ہی علیک سلیک ہوئی تھی۔ بہت ہی سنجیدہ قسم کا تھا۔ میری نظریں چھپر کی سمت تھیں۔

زخمی بیل کے آگے ایک بڑی جسامت کا بُولی کتا (بُل ٹیریر) بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کے چوڑے جبڑے سے نکلے ہوئے دو دانت نمایاں تھے اور ان دانتوں کے درمیان سے اس کی زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے بہتا ہوا گندا مواد دور سے بھی نظر آ رہا تھا... گرمی کے احساس میں یہ منظر خاصا کراہت انگیز تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ نہ بھائی آئے نہ میر صاحب، نہ گداؤ اور نہ بخشو... ''بہتر ہے کہ میں گھر واپس چلا جاؤں،'' میں نے سوچا،''نہ جانے یہاں اور کتنی دیر بیٹھنا ہوگا۔'' مجھے رقیہ کا خیال آیا۔ ''کیا کروں، رقیہ کا سامنا بھی خاصا پریشان کن محسوس ہو رہا ہے۔''

میری نظریں پھر ماسی جیراں کے گھر کی دیوار سے ٹکرائیں اور پھر بیرونی دروازے پر ٹھہر گئیں۔

''مجھے گلنازی کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے،'' خیالات پھر رواں ہوے۔ ''یہاں سے جانے کے بعد شاید میں اسے دیکھ بھی نہ پاؤں گا... موسم سرما کی چھٹیوں تک نہ جانے بھائی یہاں رہتے بھی ہیں کہ ٹرانسفر ہو جاتے ہیں۔ وہ کئی بار اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکے ہیں کہ وہ فیلڈ کے بجاے لاہور کے وٹرنری کالج میں جانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں طالب علموں کو پڑھا سکیں۔ اگر بھائی ٹرانسفر نہ ہوے تو بھی... کیا خبر موسم سرما میں ہمارا یہاں آنے کا پروگرام بنتا ہے یا نہیں۔ کیا خبر میں پھر کبھی گلنازی جیسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ سکوں گا یا نہیں... اس سراپا حسن کی بس یاد ہی رہ جائے گی... میں گلنازی کے متعلق کیوں سوچوں... اس راستے پر کیا چلنا جس کی منزل ہی نہیں۔''

میں خود کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا، لیکن میرے چہرے پر اداسی بہت گہری ہو چکی ہوگی۔

''نہ بھائی آئے ہیں نہ گداؤ...'' اداسی پھر اندیشے میں بدلی۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی؟ نہیں، ایسا ہوتا تو گداؤ اتنا مطمئن نہ ہوتا۔ پتا نہیں گداؤ کی پیر سے ملاقات ہوئی بھی ہے یا نہیں... اس کے ہاتھ میں پوٹلی تھی — پوٹلی میں کیا تھا؟ پیر لوگ بہت متکبر قسم کے ہوتے ہیں۔ غریب دیہاتیوں کو ان کے ڈیروں پر ملاقات کے لیے کئی کئی دن ٹھہرنا پڑتا ہے۔ میراثیوں، مصلیوں کو تو وہ انسان ہی نہیں سمجھتے — انھیں تو پیر کے دربان ہی بھگا دیتے ہیں جیسے وہ انسان نہیں، کتے بلے ہوں۔''

اداسی، اندیشہ، چاروں جانب جولائی کی ڈھلتی سہ پہر کی دھوپ... شعاعوں سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ ہوا کے ایک گرم جھونکے میں مجھے حدت کا احساس ہوا۔ مغرب کی سمت جانے کے باوجود سورج کی شعاعیں، تیز ترچھی شعاعیں، زمین پر ہر ذرے کو تنور میں موجود مٹی کی دیواروں کے ذروں کی مانند جھلسا رہی تھیں، جنھیں سوکھی لکڑیوں سے اٹھتے ہوے شعلے جھلسایا کرتے ہیں۔

''گلنازی کا خیال میں دل سے کیسے نکالوں،'' میں نے سوچا۔ ''وہ میرے وجود میں سما رہی ہے... اس قدر تیزی سے وہ میرے وجود میں اپنی جگہ بنا رہی ہے کہ اب میں نے اس کی آنکھوں سے، اس کی نگاہوں سے تنور کے اندر جھانکنا شروع کر دیا ہے... لیکن یہ درست نہیں ہوگا... یہ غلط ہے... میں غلطی کر رہا ہوں۔ میری حالت تو اس مسافر کی سی ہے جو پل بھر کے لیے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا ہو... میں کیوں اپنے تصورات میں ایک ایسے تصور کو جگہ دے رہا ہوں جو میرے وجود میں سما رہا ہے... اس کے نتیجے میں مجھے دکھ ہی ملے گا، ایسا دکھ جو یاد بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔''

میرا جی چاہا کہ میں بنچ پر لیٹ جاؤں لیکن سیمنٹ کی بنچ فضا کی حدت میں جھلسی ہوئی تھی۔ ہسپتال کے تمام کمروں پر تالے لگے ہوئے تھے۔ مجھ پر اداسی گہری ہوتی جارہی تھی۔ پھر اس گہرائی میں مجھے چاروں سمت تیز شعاعوں کی طرح پھیلتا ہوا وسعت کا احساس ہوا، جس میں بہت دور تک پھیلی ہوئی تنہائی ہوا کرتی ہے۔ تنہائی کا یہ احساس تیز شعاعوں کی مانند، میرے وجود کے گرد گھیرا سا ڈالتا، پھیلتا، ہر شے پر چھا رہا تھا۔ میں اس احساس سے ناآشنا نہیں تھا، لیکن اس بار اس میں شدت سی تھی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ تنہائی نے میرے دل کے گرد حصار بنالیا تھا۔ مجھے کھلی آنکھوں سے نظر آنے والی ہر شے اداس اور غمزدہ محسوس ہورہی تھی۔

''شاید یہی وہ کیفیت ہے جس میں کائنات کی ہر شے اداس نظر آتی ہے...'' اس خیال کے ساتھ ہی میری چندھیائی ہوئی آنکھیں پوری کھل گئیں، لیکن احساس کی شدت میں کوئی کمی نہ آئی۔ جولائی کی تپیدہ زمین، پیڑ، پیڑ کی چھاؤں، ہسپتال کی تپی ہوئی دیواریں، کھلی کچی سڑک، سڑک کے پار ماسی جیراں کا تنور، ماسی جیراں کے گھر کی بیرونی دیواریں، زخمی بیل، ہانپتا کتا، بخشو کی کوٹھڑی، چاروں سمت پھیلی ہوئی دھوپ — ہر شے غم میں ڈوبی محسوس ہورہی تھی۔ ''یہ غم ہے کیا؟'' میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔ ''غم تو کسی چیز کے کھوجانے پر ہوا کرتا ہے — وہ مادی ہو یا روحانی... میں نے کیا کھویا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ غم تو محرومی سے پیدا ہوتا ہے۔ میں کس محرومی کا شکار ہوں؟ غم تو کسی سے بچھڑ جانے کا ہوا کرتا ہے۔ جب میں کسی سے ملا ہی نہیں تو پھر بچھڑنے کا غم مجھے کیوں ہوگا۔ ہاں یہاں سے جانے کا خیال مجھے اداس ضرور کردیتا ہے۔ کیا اس کا باعث گلنازی تو نہیں ہے؟''

مجھے اپنے گھر والوں کا خیال آیا۔ ''وہ مجھے چاہتے ہیں۔ بار بار پریشان اور تنگ کرنے کے باوجود انھوں نے کبھی مجھے خود سے جدا نہیں ہونے دیا... میں اپنے گھر کا اٹوٹ انگ ہوں۔ میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ تو پھر مجھے محرومی کا دکھ کیوں ہوگا۔ میرا اپنا ایک وجود ہے، زندگی ہے، ذہن ہے جو انفرادی سوچ بھی رکھتا ہے، سینے میں دل ہے جو اپنوں اور دوسروں کے لیے برابر دھڑکتا ہے... تو میں نے زندگی میں اب تک کیا کھویا ہے؟ یہ اداسی اور غم کیوں مجھ پر چھا جاتا ہے؟'' خیالات تیز شعاعوں کی طرح محسوس ہورہے تھے جو میری چاروں جانب اور اوپر، پیڑ کے گھنے پتوں میں چمک چمک جاتی تھیں۔

''درست سہی کہ میں اپنی عمر سے بہت آگے نکل چکا ہوں، لیکن یہ حقیقت بھی میرے کسی دکھ کا باعث تو نہیں ہو سکتی۔ یہ اداسی، یہ غم کیا ہے جس کا کوئی سبب بھی نہیں، نہ ہی اس کا کوئی نام ہے؟ یہ بے نام اداسی مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ میں خود سے کیا چاہتا ہوں؟ شاید میں اپنے وجود کو کسی بڑے وجود سے جدا محسوس کرتا ہوں، ایک جزو کی طرح جو کل سے جدا ہے... وہ وجودِ کل کیا ہے، کہاں ہے؟ شاید وہ اس کائنات میں حسنِ فطرت کی طرح ہر جگہ موجود ہے اور میں اسی سے جدا ہوں۔''

میرے ذہن میں سر پر پھیلے شیشم کے گھنے پیڑ کی شاخوں میں پھیلے ہوئے پتوں کی طرح کئی سوال ابھر آئے۔ اداسی میں تنہائی کا احساس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اداسی اور تنہائی میں بے بسی بھی شامل ہو رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کچھ دیر بعد یہ کیفیت یقیناً اذیت دہ ہو کر ذہنی انتشار میں بدل جاتی، لیکن بخشو کی آواز نے خیالات کا سلسلہ توڑ کر کیفیت کو کم کر دیا۔

''آپ؟'' اس کی آواز میں حیرت تھی۔ ''اس گرمی میں یہاں بیٹھے ہیں؟ کیوں، کیا ہوا؟''

''بھائی اور میر صاحب آتے ہوں گے،'' میں نے کہا۔ ''ان ہی کی راہ دیکھ رہا ہوں۔''

''وہ تو ساڑھے چھ بجے آئیں گے،'' بخشو نے کہا، ''ابھی تو بڑی دیر ہے۔'' اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ ''بڑی گرمی ہے، آپ گھر چلے جائیں۔''

''نہیں بخشو،'' میں نے کہا، ''چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ گھر میں بھی تو گرمی سے جان نکلتی ہے۔ پنکھا جھلا جھلا کر برا حال ہو جاتا ہے۔''

''ہاں صاب،'' بخشو نے کہا، ''دیواریں تپ جانے پر کمرے بھی تندور بن جاتے ہیں۔''

''کیا وقت ہو گیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا، ''میں گھڑی ساتھ نہیں لایا۔''

''گھڑی کیا کرنی ہے صاب،'' بخشو نے کہا، ''میں تو دیوار کا سایہ دیکھ کر ہی وقت کا اندازہ لگا لیتا ہوں... میں آپ کے لیے کرسی لے آتا ہوں۔''

بخشو ہسپتال کے بند کمروں کی طرف گیا، ایک کمرے کا تالا کھولا، ایک کرسی لا کر چھاؤں میں رکھ دی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ جہاں بنچ پر میں بیٹھا تھا، وہاں بخشو بیٹھ گیا۔ پھر اٹھا اور کمرے سے دو کرسیاں اٹھا لایا، پھر گیا اور میز کے ساتھ ایک سٹول بھی لے آیا۔ دوبارہ بنچ پر اسی جگہ بیٹھ کر، جہاں میں بیٹھا تھا، بخشو نے سٹول کی سمت دیکھا، مسکرایا۔

''طبیبی کو بھی کہاں چین ملتا ہے!'' بخشو نے گداؤ کی سمت اشارہ کیا۔'' شرط لگالیں، چائے پینے ضرور آئے گا۔''

میں نے غیر شعوری طور پر کرسی کو کھینچ کر شیشم کی چھاؤں میں یوں ترچھا کیا کہ مجھے تنور صاف نظر آنے لگا۔ بخشو کچھ دیر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر چھپر میں بندھے مریض جانوروں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اس نے سبز چارا مریل گائے، ہڈیوں والے بیل، گدھے اور زخمی بیل کی ناندوں میں ڈالا۔ زخمی بیل نے فوراً ناند میں منھ ڈالا۔ گائے، کمزور بیل اور گدھے نے چارے کی سمت دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ وہ بیزار نظر آرہے تھے۔ بخشو کتے کی سمت گیا۔ کچھ دیر کتے کے قریب کھڑا رہا، پھر ہسپتال کے ایک کمرے میں گیا۔ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں کٹورا تھا۔ وہ سیدھا اپنی کوٹھری میں گیا۔ دوبارہ کتے کی سمت آیا اور کٹورے کو مٹی کے ایک ہانڈی نما برتن میں انڈیلا۔ دور سے گرتا ہوا دودھ صاف نظر آیا۔ بخشو نے یقیناً اپنی کوٹھری میں دودھ والی چائی کو پانی میں رکھا ہوگا۔ بل ٹیریر اٹھا، ہانڈی نما برتن کو سونگھا اور سر اوپر اٹھالیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ دودھ پیوں، نہ پیوں۔ بخشو نے یقیناً دودھ میں کوئی دوائی ملا دی ہوگی۔ کتا کچھ دیر برتن کو دیکھتا رہا، پھر بھوک سے مجبور ہو کر اس نے برتن میں منھ ڈالا اور شڑپ شڑپ کرنے لگا۔ بخشو میرے قریب آکر بنچ پر بیٹھ گیا۔

''صاب،'' اس نے اصطبل کی سمت دیکھتے ہوئے کہا،'' آپ نے گھڑسواری کہاں سے سیکھی ہے؟''

''کہیں سے بھی نہیں،'' میں نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے!'' بخشو نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ''آپ کو تو گھوڑے کی ہر چال کا پتا ہے۔''

''بس سواری کرتے کرتے سیکھ گیا ہوں،'' میں نے جواب دیا۔'' پہلے بھائی ڈومیل کے قصبے میں تھے۔ وہاں کے ہسپتال میں دیسی نسل کا گھوڑا تھا، اسی پر سواری شروع کی تھی۔ پھر بھائی بلکسر کے ہسپتال میں ٹرانسفر ہوئے۔ وہاں دیسی نسل کا بہت ہی اچھا گھوڑا ملا، بہت صحت منداور بہت ہی تیز۔ اسی گھوڑے پر میں نے شتری، ڈلکی اور سرپٹ چالیں سیکھی تھیں۔ اسی گھوڑے پر میں نے زین کے بغیر ننگی پیٹھ پر سواری شروع کی تھی اور سرپٹ دوڑانا بھی سیکھ لیا تھا۔ ویسے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر شتری سب سے اچھی چال ہوتی ہے۔''

''شتری مجھے بھی بہت پسند ہے،'' بخشو نے کہا۔

''ہاں بخشو،'' میں نے کہا،'' سب سے آرام دہ چال ہے۔ ڈلکی کی طرح سوار کو بار بار اچھلنا نہیں پڑتا۔''

بخشو نے پھر اصطبل کی سمت دیکھا۔

''کبھی گرے بھی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، گرا تو نہیں۔'' میں نے بلکسر کا ایک واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا،'' بلکسر میں ایک بار چنے کے دو کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر میں سرپٹ گھوڑا دوڑا رہا تھا کہ سامنے ایک کھائی سی آ گئی، چار فٹ تک چوڑی۔ میری طرح گھوڑا بھی گھبرایا لیکن رکنے کے بجائے کود گیا۔ کھائی زیادہ چوڑی نہیں تھی، لیکن سب کچھ ایک دم سے ہوا۔ میرا دایاں پاؤں رکاب سے نکل گیا۔ میں نے فوراً بایاں پاؤں بھی رکاب سے نکالا اور اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے کچھ دور جا کر گھوڑا روک لیا تھا۔''

بخشو ایک دم سے آگے کی سمت جھکا۔

''آپ واقعی سوار ہیں،'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا،'' یہ بات تو اچھے اچھے سواروں کو بھی معلوم نہیں ہوتی صاب، کہ اگر ایک رکاب سے پاؤں نکل جائے تو رکاب میں پاؤں ڈالنے کی کوشش کرنا بے وقوفی ہوتی ہے۔ ایسا کرنے سے سوار قلابازی کھا جاتا ہے، اور اگر دوسری رکاب میں پاؤں پھنس جائے تو پھر رب کے حوالے۔''

''کیا تم بھی کبھی گرے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک بار؟'' بخشو نے سوالیہ لہجے میں کہا،'' کئی بار صاب، کئی بار... '' بخشو نے ہنستے ہوئے کہا۔'' جب میں چاچڑاں میں تھا، رانے افضل کے پاس، وہاں اصطبل میں ایک گھوڑی تھی۔ وہاں کا بڈھا سائیس کرم دین اس گھوڑی کو چڑی (چڑیا) کہا کرتا تھا۔ چھوٹے قد کی، سرخ عنابی رنگ کی، تیز تیز آنکھوں والی چڑی چڑی کیا تھی صاب، چڑیل تھی چڑیل... '' بخشو نے قصہ چھیڑ دیا اور قصے کو اتنا طول دیا کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ میری نظریں تنور کی سمت گئیں۔ ماسی جیراں تنور میں لکڑیاں ڈال رہی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ اس وقت مجھے اکیلا ہسپتال کے صحن میں دیکھ کر ماسی جیراں کیا سوچتی ہوگی؟ مجھے اپنے چہرے پر تپش کا احساس ہوا۔ اسی لمحے گلنازی گھر کے بیرونی دروازے پر نظر آئی۔ اس نے

بازوؤں پر من چھٹی کی چھڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ دروازے ہی میں رک گئی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی اس کے چہرے کا گلابی رنگ نکھر سا گیا۔ گھنی پلکوں کے نیچے، اس کی خوبصورت آنکھوں میں پہلی بار مسکراہٹ روشنی کی مانند چمکی۔ اس کے چہرے پر خوشی مسکراہٹ بن کر بکھر گئی۔ اس نے اپنی خوبصورت پلکیں دو تین بار جھپکائیں اور باہر آ کر تنور کی سمت مڑ گئی۔ تنور کے قریب اس نے میری سمت کنکھیوں سے دیکھا — میرا چہرہ یقیناً سرخ ہو گیا ہوگا۔ بخشو اپنے قصے میں اتنا محو تھا کہ اس نے میرے چہرے کے تاثر کی تبدیلی کو محسوس تک نہ کیا۔

''بس صاب، شامت آ گئی تھی میری۔ . . '' بخشو قصے کو کلائمکس کی سمت لے جا رہا تھا۔ ''کرم دِینے نے منع بھی کیا، لیکن میں نے چڑی پر کاٹھی (زین) ڈال دی۔ جھاوریاں سے یہ جو سڑک۔ . . '' بخشو نے لاری اڈے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ جو سڑک شاہ پور جاتی ہے، چاچڑاں سے آدھے میل کے فاصلے پر ہے۔ چاچڑاں سے اس پکی سڑک تک کچی سڑک ہے۔ حویلی سے کچی سڑک تک تو چڑی پیدل آئی۔ . . کچی سڑک پر آتے ہی چڑیل نے ایڑ لگائے بغیر ہی سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ یوں لگا جیسے چڑی شُوں سے اڑی ہو۔ صاب، اسے تو ریس میں دوڑانا چاہیے۔ اتنی تیز کہ میں نے ڈر گیا۔ زور سے باگیں کھینچیں، پر کہاں صاب جی، آسمان کی طرف منھ اٹھا لیا چڑیل نے، پر رفتار میں ذرا سا بھی فرق نہ آنے دیا۔ دائیں ہاتھ ایک کھلا کھیت تھا۔ میں نے دائیں باگ کھینچ کر چڑی کو کھیت میں لے جا کر دائرے میں ڈال دیا کہ نامراد تھک کر تو رکے گی۔''

تنور کے قریب دو لڑکے نظر آئے۔ ایک لمبوترے منھ والا گندمی رنگ کا تھا، دوسرا بہت کالا تھا اور اس کے بال گھنگھریالے تھے۔ دونوں کے کندھوں پر چادریں تھیں جو بھیگی ہوئی تھیں — یقیناً نہر سے نہا کر آ رہے تھے۔ بخشو ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تنور کے پاس پہنچے تو ماسی جیراں نے انھیں گھور کر دیکھا۔ ان کے قدم تیز ہو گئے۔

''ماسی نے سارے گاؤں کے لڑکوں کو منع کیا ہوا ہے کہ تندور کی طرف نہ آئیں،'' بخشو نے مقامی زبان کے مخصوص لوچ سے فقرہ مکمل کیا۔ ''تندور پر لڑکیاں آتی ہیں۔''

''میں بھی تو لڑکا ہوں،'' میں نے کہا۔

''آپ نے تو چلے جانا ہے صاب،'' بخشو نے کہا، ''آپ کو تو کوئی نہیں روک سکتا۔ . . ہاں، میں

بتا رہا تھا کہ کہ میں چڑی کو دائرے میں تو ڈال دیا، پر وہ رکتی ہی نہ تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا صاب، دے چکر پہ چکر... دے چکر پر چکر... مغز پھر گیا میرا...''

بخشو قصہ سناتے سناتے کھڑا ہو گیا۔ سڑک پر بھائی، میر صاحب اور گداؤ آرہے تھے اور ان کے پیچھے دو لڑکیاں سروں پر کنالیاں (پراتیں) رکھے تنور کی سمت آرہی تھیں۔ سورج مغرب کی سمت جا چکا تھا۔

''تم اتنی گرمی میں یہاں کب سے بیٹھے ہو؟'' بھائی نے آتے ہی کہا۔ بخشو اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔

''میں رقیہ کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا ہوں،'' میں نے سچ بولا۔

''اتنا بڑا قدم اٹھا کر بھی آپ گھبرا رہے ہیں!'' میر صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ ماں ہے، تو ہم کا شکار ہے،'' میں نے کہا۔ بخشو آرہا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ گداؤ سٹول پر بیٹھا بہت خوش لگ رہا تھا۔

''آج تو بڑی گرمی پڑی ہے صاب جی،'' بخشو نے آتے ہی بھائی کو مخاطب کیا۔ ''چھوٹے صاب نے تو ساری گرمی یہاں ہی سہاری ہے...'' بخشو اپنا اور چڑیل چڑی والا قصہ بھول چکا تھا۔

''شیشم کی چھاؤں تو بہت ٹھنڈی ہوتی ہے بخشو،'' میں نے کہا۔

''پر ہوا تو لُو ہی ہوتی ہے،'' بخشو نے کہا، ''چھاؤں لُو کو تو نہیں روک سکتی۔''

''چائے نہیں پلائیں گے بخشو میاں؟'' میر صاحب نے کہا، ''گرمی میں چائے کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔''

''کیوں نہیں جی،'' بخشو نے کہا۔ ''وہ خوشاب کے لاری اڈے پر ہے نا چائے والا — یہی ہانک تو لگاتا ہے کہ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے!'' بخشو نے ہانک لگائی۔ سب ہنسنے لگے۔

بھائی نے ہنستے ہوئے گداؤ کی سمت دیکھا۔

''تو پھر گرم چائے ہی کیوں؟'' بھائی کا لہجہ خوشگوار تھا۔ انھوں نے بخشو کو دیکھا، کرسی سے ٹیک

لگائی۔ ''فضلو حلوائی نے سموسے تو نکالنے شروع کر دیے ہوں گے۔''

''نہیں نکالے ہوں گے تو نکلوا لوں گا،'' بخشو نے کہا۔

''شام ہو رہی ہے بخشو،'' گداؤ نے کہا۔ ''فضلو تو تین بجے ہی کڑاہ میں سموسے ڈال دیتا ہے۔''

''جا،'' بھائی نے بخشو کو ایک روپے چار آنے دیتے ہوئے کہا، ''دس سموسے لے آ۔''

''دس کس لیے صاب؟'' بخشو نے پیسے پکڑتے ہوئے کہا۔

''تجھے گداؤ اور اپنا آپ نظر نہیں آتا؟'' بھائی نے کہا اور سیاہ فام بخشو نے سفید دانت نکالے۔

''فضلو سے کہنا،'' گداؤ نے کہا، ''چٹنی زیادہ دے۔ . . وہ چٹنی کے معاملے میں بڑا خسیس ہے۔''

''تو فکر نہ کر،'' بخشو نے کہا، ''تیرے لیے چٹنی کی ہانڈی لے آؤں گا، چائے کی جگہ آج چٹنی ہی پی لینا۔''

''بک بک نہ کر!'' گداؤ نے کہا اور بخشو ہنستا ہوا بازار کی سمت چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ بھائی نے بخشو کو کیوں بھیجا ہے۔

فضلو حلوائی کی دکان بازار کے آخر میں بائیں جانب جانے والی گلی میں ہے۔ بخشو کو لوٹنے میں دیر ہو جانی تھی۔

''صاحبزادے،'' میر صاحب نے کہا، ''آپ کے گداؤ میاں تو بہت کامیاب لوٹے ہیں۔''

میں نے گداؤ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔

''میں دس بجے پیر کے ڈیرے پر پہنچا،'' گداؤ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس نے پیر نور شریف کو پیر جی کے بجائے پیر کہا، مجھے اندر ہی اندر خوشی کی لہر کا احساس ہوا جو اکثر کامیابی پر اٹھا کرتی ہے۔ ''پہلے تو ملنگوں نے مجھے باہر ہی روک دیا۔ دو تین ہٹے کٹے ملنگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیوں آیا ہوں؟ جب میں نے بتایا کہ میں ایک بہت ہی بری خبر لایا ہوں تو وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ کیا خبر ہے؟ تو میں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں تو مرشد ہی کو بتاؤں گا۔ قصبہ جھاوریاں میں ایک بڑا حادثہ ہو گیا ہے، جس کی خبر مرشد تک پہنچانی بہت ضروری ہے۔ ملنگ مجھے ایک بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی کے پاس لے گئے۔ اس نے سر پر بہت بڑا کالا پٹکا باندھ رکھا تھا۔ اس نے بھی پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ میں نے پھر بتانے سے انکار کر دیا کہ میں تو

مرشد ہی کو بتاؤں گا۔ وہ غصے میں آ گیا۔

''میں مرشد کا خاص آدمی ہوں، اس نے غصے سے کہا اور میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''مجھے ان کے پاس لے چلو، میں نے کہا، بات ایسی ہے کہ مرشد کے علاوہ اگر میں نے ان کی اجازت کے بغیر کسی کو بتائی تو کیا خبر مرشد مجھ سے ناراض ہو جائیں۔ غریب آدمی ہوں... بال بچوں والا ہوں... مرشد کی ناراضگی سے برباد ہو جاؤں گا۔ جھاوریاں میں بہت ہی بُری بات ہو گئی ہے۔

''وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو وہ ڈیرے کے اندر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد باہر آیا اور میری تلاشی لی۔

''بڑے قسمت والے ہو گدا حسین، اس نے بہتر لہجے میں کہا،'' مرشد کو تمھارے آنے کا پہلے ہی سے پتا لگ چکا ہے... دیدار ہو جائے گا... اوئے شرفو! ایک چھوٹے اور لمبے لمبے کھلے بالوں والا ملنگ دوڑتا آیا۔

''اسے وضو کرا! مونچھوں والے نے حکم دیا۔ پیر اچھی طرح دھلوا۔ وضو کراتے ہوئے اسے پانچ بار کلمہ پڑھوا اور پھر مجھے بتا۔ وہ اندر ڈیرے میں چلا گیا، جس کے اندر ایک عمارت اونچی اور سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ میں پہلے کبھی میگھا پتن نہیں گیا تھا صاب۔ عمارت کی چھتیں بہت اونچی ہیں، باہر پتھروں کی دس بارہ فٹ اونچی دیوار ہے اور لوہے کا مضبوط کالا گیٹ بھی بہت اونچا ہے۔ ملنگ مجھے پانی کی بھری ہوئی بالٹیوں کے پاس لے گیا۔ میں وضو کرنے بیٹھا ہی تھا کہ ملنگ نے گردن کے پاس میری قمیض کو پکڑ کر اوپر کھینچا۔

''استنجا تیرا پیو (باپ) کرے گا؟ اس نے غصے سے کہا اور مجھے اینٹوں کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی کمرہ نما چار دیواری میں لے گیا جس کی چھت نہیں تھی۔ اندر پانی کی دو بالٹیاں پڑی تھیں۔ اچھی طرح طہارت کر! ملنگ نے پھر غصے سے کہا۔ بولتے ہوئے اس کے لمبے بال دائیں بائیں جھولتے تھے۔ میں اندر گیا۔ مجھے بہت پیشاب آیا ہوا تھا، میں نے کھل کر کیا اور ہاتھ دھو کر باہر آ گیا — میں نے کوئی استنجا وستنجا نہیں کیا۔''

میر صاحب نے قہقہہ لگایا۔ بھائی بھی ہنس رہے تھے، میرا تجسس بڑھ چکا تھا۔

''پھر میں نے ملنگ کے سامنے وضو کیا،'' گدا نے کہا۔'' پانچ بار کلمہ پڑھا۔ پاؤں مل مل کے

دھوئے۔ ملنگ نے مجھے ربڑ کے کالے سلیپر دیے اور کہا کہ ربڑ کے یہ سلیپر پہن کر میں مرشد کے حجرے تک جاؤں۔ باقی باتیں اندر معلوم ہوں گی۔ وہ مجھے گیٹ تک لے کر گیا۔ اندر بھی ایک ملنگ تھا، جس نے گیٹ کھولا۔ سرخ اینٹوں کا بڑا سا صحن نظر آیا جس میں ایک فوارہ بھی لگا ہوا تھا۔ چاروں جانب کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ صحن کے تین طرف، برآمدوں کے اندر، کمروں کے دروازے نظر آئے۔ دائیں ہاتھ والے برآمدے میں مونچھوں والا آدمی موجود تھا۔ اس نے مجھے اشارے سے بلایا اور برآمدے کی بائیں طرف اونچی عمارت سے جڑے ہوئے ایک کمرے تک لے گیا۔

''جو بات تو مرشد کو بتانے آیا ہے، مونچھوں والے نے کہا، اس کا کشف مرشد کو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ یہ بات سن کر میں ذرا سا گھبرایا ضرور، پر حوصلہ قائم رہا۔ پھر وہ بولا، مرشد نے تجھے حجرے میں بلایا ہے۔ یہ سعادت کسی کسی کو ملتی ہے۔ بہت نصیبوں والا ہے تو۔۔۔ اس نے مجھے ٹھہرنے کو کہا، کچھ دیر ایک اور ملنگ سے باتیں کرتا رہا جو تیز تیز قدموں سے برآمدے میں دائیں جانب چلا گیا۔ مونچھوں والا میری طرف مڑا۔

''غور سے سن، اس نے کہا، حجرے میں داخل ہوتے وقت تیری نظریں نیچی رہیں۔ جب تک مرشد کا حکم نہ ہو، دہلیز پر ہی کھڑے رہنا۔ حکم ہوتے ہی سلیپر اتار کر، سر جھکا کر، مرشد کے تخت تک جانا۔ تخت کے سامنے قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ جانا۔ سامنے مرشد کے کھسّے پڑے ہوں گے۔ پہلے گھٹنے ٹیک کر مرشد کے دائیں کھسے کو اٹھا کر چومنا۔۔۔ غلطی نہ ہو۔۔۔ مرشد کا دایاں کھسہ تیرے بائیں ہاتھ ہوگا، پھر اسے رکھ کر بایاں کھسہ چومنا اور آنکھوں سے لگانا۔ اس وقت تک مرشد کی طرف نہ دیکھنا جب تک وہ سوال نہ کریں۔ اِدھر اُدھر کی بکواس نہ کرنا۔ بس جو بتانا ہے، نیچی آواز میں وہی بتانا اور خاموش ہو جانا۔ اگر مرشد کوئی سوال پوچھیں تو لمبا جواب نہ دینا۔ اگر جواب ہاں یا نہ میں دینا ہو تو بس جی یا نہیں مرشد کہنا۔ یہ کہہ کر مونچھوں والا حجرے کے اندر چلا گیا۔ اس بار وہ فوراً ہی باہر آیا۔

''چل حجرے میں، اس نے کہا، بلایا ہے مرشد نے۔۔۔ لیکن ٹھہر۔۔۔ اس نے اس انداز میں کہا کہ میرا دل دھڑکنے لگا۔ جو جو باتیں تجھے بتائی ہیں، اچھی طرح یاد کر لے۔ کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ مرشد ناراض ہو گئے تو تجھ پر قہر ٹوٹے گا۔ بس اب آگے تو نے اکیلے ہی جانا ہے۔

''میرا دل دھڑک رہا تھا صاب، لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور بڑے حوصلے سے، سلیپر اتار

کر، دروازے کا ایک پٹ کھول کر دہلیز پر ہی کھڑا ہوگیا۔ نظریں تو نیچی تھیں، لیکن میں نے حجرے سے اندرونی کمروں کی سمت کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھ ہی لیا۔ . . ایک سرخ دوپٹہ لہراتا ہوا اندر گیا اور اندرونی دروازے کے دونوں پٹ دو سفید ہاتھوں نے بند کیے — کوئی عورت تھی۔''

بھائی نے میر صاحب اور میر صاحب نے بھائی کی طرف دیکھا۔ گداؤ نے میری طرف دیکھا۔

''میں اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ ایک بار تو مجھے یوں لگا کہ میری اداکاری فیل ہو جائے گی۔

''اندر آجا گدا حسین! پیر کی آواز آئی، نہ موٹی نہ پتلی — یوں لگا جیسے بولنے والے نے نشہ کیا ہوا ہے۔ میں نے حجرے میں قدم رکھا۔ اتنا موٹا اور نرم قالین میں نے پہلے بھلا کہاں دیکھا تھا، پاؤں اندر دھنس دھنس جاتے تھے۔ ہر طرف اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف مجھے صوفہ نظر آ گیا۔ صوفے پر سبز مخمل کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ سامنے دیکھنے سے مجھے منع کیا گیا تھا۔ میں نظریں جھکائے تخت تک پہنچا، گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ہدایت کے مطابق دایاں کھسہ چوما، بایاں چوما، آنکھوں سے لگایا۔ پیر کے ہاتھ مجھے نظر آرہے تھے — ان میں تسبیح تھی، کالے دانوں والی تسبیح۔

''تو گدا حسین . . . پیر کی آواز آئی۔ میں جانتا ہوں تو کیا کہنے آیا ہے۔ اسی لیے اس وقت حجرے میں آیا ہوں۔ جھاوریاں میں جو کچھ ہوا ہے، میرے موکلوں نے مجھے بتادیا ہے۔ لیکن تو اتنی دور سے آیا ہے، کچھ باتیں تیرے دماغ میں بھی ہوں گی، کئی سوال بھی ہوں گے جنھوں نے تجھے پریشان کیا ہوگا۔ تجھے بات کرنے کا موقع تو ملنا ہی چاہیے۔ بول — تو کیا کہنا چاہتا ہے؟

''صاب، میں گھبرایا ہوا تھا، لیکن ہمت قائم تھی۔ ایک بار تو جی چاہا کہوں کہ مرشد، جب آپ کو سب کچھ معلوم ہی ہے تو پھر میرے بتانے کی کیا ضرورت ہے، لیکن آپ کی بات یاد آئی کہ پیر کو سارا واقعہ بتاتے ہوئے گھر کا نقشہ اور رات کو سونے کا طریقہ بھی بتانا ہے، اور ٹائیگر کا ذکر ہرگز نہیں کرنا . . . صاب، میں نے ڈری ہوئی چیکنی[37] آواز بنائی اور اس طرح بولا جیسے الفاظ میرے گلے میں پھنسے ہوئے ہوں۔''

بھائی ہنسے، میر صاب نے گداؤ کی طرف دیکھا۔

''گداؤ میاں،'' انھوں نے سوالیہ انداز میں کہا، ''یہ چیکنی کیا ہوتی ہے؟''

37۔ چیکنی: نہایت پتلی چیختی آواز جو عموماً ڈر کی حالت میں گلے سے نکلتی ہے۔

''ایسی ہوتی ہے،'' گداؤ نے نہایت پتلی چیخ جیسی آواز میں کہا، جسے سن کر شاید ہر شخص کو ہنسی آ جائے۔ میر صاحب نے قہقہہ لگایا۔ گداؤ مسکرایا۔

''ڈرمت! پیر نے مجھے حوصلہ دیا۔۔۔'' گداؤ نے بیان جاری رکھا۔''ساری بات بتا۔ میں نے ڈری ڈری آواز میں رکھ کٹنے کا تمام واقعہ آہستہ آہستہ اس طرح بتایا کہ گھر کا نقشہ، چارپائیوں کی جگہیں، سب کچھ بتادیا۔ بس ٹائیگر کا ذکر گول کر گیا۔ پیر کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس نے تخت پر جیسے کروٹ لی۔

''مجھے سب معلوم ہے، اس نے کہا۔ کالی بلا نے ہر طرف سے مایوس ہو کر آخری کامیاب وار کیا ہے۔ کالی بلا نے معمول [38] پکڑ لیا ہے۔

''اس بات پر میں نے بے اختیار پیر کی طرف دیکھا— گول چہرہ، بھرا بھرا سا، سفید رنگ جس میں سرخی بھی تھی، کالی چھوٹی خط والی ڈاڑھی جس میں کانوں کے قریب سفید بال نظر آ رہے تھے، بڑی بڑی آنکھیں جن میں لال لال ڈورے تھے، ناک موٹی جو آگے سے کچھ جھکی جھکی سی تھی، موٹا جسم۔ پیر نے سفید کرتا پہن رکھا تھا، ململ کی طرح کسی چمکدار باریک کپڑے کا۔ یہ کرتا اتنا لمبا تھا کہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے پیر کے پیروں تک، ٹانگوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ پیر کے گلے میں سفید، سرخ، عنابی، سبز، نیلے اور پیلے رنگ کے منکوں والی مالائیں تھیں، سر پر کوئی عمامہ نہ تھا اور بال پیچھے کندھوں تک لمبے اور کٹے ہوئے تھے — چھتے سے بنے ہوئے تھے۔ تخت کے پیچھے کھڑکی تھی، جس پر ململ ہی کی طرح کا پردہ، باہر سے آنے والی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ کھڑکی میں سے باہر درختوں کا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ ان درختوں کے پیچھے دریائے جہلم بہہ رہا ہوگا، جس کے دوسرے کنارے پر کالا چٹا پہاڑ ہے۔'' گداؤ پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بات بتانے سے جھجک رہا ہے۔

''پھر کیا ہوا گداؤ؟'' میں نے پوچھا۔

38۔ معمول: لغوی طور پر اس لفظ کا مفہوم یہی ہے کہ جس پر کوئی عمل کیا گیا ہو— لیکن قدیم زمانے کے ساحر اور موجودہ زمانے کے پیر اس کے دو مفہوم بتاتے ہیں۔ ایک تو وہ مرد یا عورت جس کے جسم میں خود پیر نے جن یا چڑیل ڈال دی ہو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ مرد یا عورت جس کے جسم میں کوئی بدروح یا کالی بلا گھس جائے اور قبضہ کر لے۔

''پیر میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں ڈر گیا صاب۔

''مجھ سے نہ ڈر! پیر نے کہا۔ ڈر تو اب کالی بلا کا ہے۔

''پیر نے بھی ڈراؤنی سی آواز بنائی۔

''مرشد، میں نے کہا، اب کیا ہو گا؟

''بچہ کہاں ہے؟ پیر نے کہا۔ کیا جھاوریاں ہی میں ہے؟

''جی مرشد، میں نے پھر کہا، ڈاکٹر کے گھر پر ہی ہے۔ ماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا ہے۔ وہ تو خود بچے کے ساتھ آنا چاہتی تھی، لیکن بہت سہمی ہوئی ہے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ کمرے میں بہت زیادہ گرمی ہوتی ہے، ورنہ وہ کمرے میں ہی رات دن رہنا چاہتی ہے۔ بچہ گرمی میں سو نہیں سکتا، اس لیے سوتی تو صحن ہی میں ہے، لیکن بہت ڈری ڈری رہتی ہے۔

''پیر کچھ دیر سوچتا رہا، خاموشی سی رہی۔

''بہت اچھا کیا اس نے جو خود بچے کے ساتھ نہیں آئی، پیر نے کہا۔ میگھا پتن کا جنگل بدروحوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ درختوں پر رہتی ہیں، ٹہنیوں پر بیٹھتی ہیں، کسی کو نظر نہیں آتی ہیں اور کالی بلا تو سارے جنگل میں اڑتی پھرتی ہے۔ . . بہت اچھا کیا اس نے جو یہاں بچے کو نہیں لائی، ورنہ بچہ میرے پاس پہنچنے سے پہلے ہی کالی بلا کا شکار ہو جاتا، خون پی جاتی بچے کا . . . بچے کی چار بدروحیں تو ٹل چکی ہیں، پانچواں سال کالی بلا کا ہوتا ہے۔ ابھی رکھ کٹنے میں دن باقی ہیں . . . کالی بلا اپنا کام کر گئی، رکھ کٹوا گئی۔

''میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مرشد، میں ایک کم عقل آدمی ہوں، آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، تو پیر نے پھر کروٹ بدلی۔

''گدا حسین! اس نے کہا۔ تو نے یہی بتایا ہے کہ ڈاکٹر کا بھائی پاگل ہے؟

''جی مرشد، میں نے فوراً کہا، دورے پڑتے ہیں اسے۔ پیروں فقیروں کو . . . توبہ توبہ . . . گالیاں دیتا ہے۔

''وہ پاگل . . . پیر نے کہا، پیدائشی پاگل نہیں ہے۔ تو نہیں جانتا کہ کالی بلا کا آخری وار کیا ہوتا ہے — وہ کسی کمزور دماغ والے کو اپنا معمول بنا لیتی ہے۔ اس کے جسم میں گھس جاتی ہے اور وہ پاگلوں

جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ تو نے بتایا ہے کہ وہ پاک روحوں کو گالیاں دیتا ہے... وہ نہیں دیتا— اس کے بدن میں گھس کر کالی بلا دیتی ہے۔ کالی بلا اس کے دماغ پر قبضہ کر کے اپنی مرضی کا کوئی کام بھی کروا سکتی ہے۔ اس نے ڈاکٹر کے بھائی کے ہاتھوں بچے کی رکھ کٹوادی ہے۔ اب وہ آزاد ہے، اب اسے بچے کا خون پینے سے کوئی نہیں روک سکتا... میں بھی نہیں۔

''مرشد، میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا، اب کیا ہوگا مرشد؟ رحم کریں، بچے کا باپ نہیں ہے۔ ماں تو بچے کے ساتھ ہی مر جائے گی، ایک ہی سہارا ہے اس کا۔ کوئی تو بچنے کا طریقہ ہوگا مرشد، کرم کریں! میں نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔

''میں اب کیا کر سکتا ہوں، گدا حسین، پیر نے کہا۔ رکھ ہی بچا سکتی تھی، رکھ پر دم کیا ہوا پانی ٹپکایا جاتا ہے۔ دم[39] ایک بار ہی ہو سکتا ہے۔ اب تو میں بھی کالی بلا کو نہیں روک سکوں گا۔ اب بچے یا ماں، دونوں میں سے ایک کی موت یقینی ہے۔

''ماں کی بھی مرشد؟ میں نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں، پیر نے کہا، کالی بلا رات کو خون پیتی ہے۔ ماں جاگ اٹھے تو ماں کو بھی مار جاتی ہے۔ مار کر بھاگ جاتی ہے اور دوبارہ بچے پر حملہ کرنے آتی ہے۔ کیا نام بتایا ہے تو نے بچے کا؟

''محبوب، میں نے نام بتایا۔

''م ح ب... پیر نے ہجے کیے۔ محب یعنی پیارا— یہ تو بہت غلط بات ہوگئی۔ کالی بلا اس نام سے بہت چڑتی ہے... بہت مشکل ہے— ماں یا بچے میں سے ایک کی موت پکی ہے۔

''رحم مرشد... کرم کریں... بیوہ پر رحم کریں! میں نے پھر ہاتھ جوڑے۔

''میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ چالیس چالیس گھنٹوں کا چلہ کئی بار کاٹوں، شاید کالی بلا رک جائے، لیکن امید کوئی نہیں۔ گدا حسین، آخری سال میں رکھ کی بہت احتیاط کرنی چاہیے — آخری سال کالی بلا کا ہوتا ہے۔

''مرشد، میں نے کہا، اصل قاتل تو ڈاکٹر کا بھائی ہوگا، جس نے رکھ کاٹی ہے، مرنا تو اسے

39۔ دم کا مفہوم سانس ہے لیکن پیر لوگ کچھ پڑھ کر جب پھونکتے ہیں تو وہ دم کہلاتا ہے۔ اس طرح اس لفظ کا مفہوم افسوں، منتر یا جادو کے انچھر ہو جاتا ہے۔

چاہیے۔

''معاف کرنا صاب، معاملے کو کچھ کچھ میں بھی سمجھ چکا ہوں، اس لیے یہ بات بھی کہنی پڑی۔

''پیر نے پھر پہلو بدلا۔ قاتل اور ظالم تو کالی بلا ہے گدا حسین، پیر نے کہا۔ وہ تو معمول ہے، پر بڑا بدنصیب ہے — مرے گا تو نہیں، پر اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ اس کا پاک روحوں کو گالیاں دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے اندر کالی بلا گھس جاتی ہے۔ وہ بہت بدنصیب ہے، کیونکہ جب کالی بلا کسی کو معمول بنا کر، اپنی مرضی کا کام کرا کے چھوڑ دیتی ہے تو اس معمول کے دماغ میں بدروحیں گھس جاتی ہیں۔ وہ پھر بچے دیتی ہیں۔ یہ دیکھ کر کالی بلا کو غصہ آتا ہے۔ وہ دوبارہ معمول کے جسم میں گھس کر بدروحوں کے بچے کھا جاتی ہے اور خود بچہ جنتی ہے۔ کالی بلا کا بچہ پہلے تو دماغ میں پرورش پاتا ہے، پھر وہ دماغ سے کھسک کر نیچے کی سمت آتا ہے اور ریڑھ کی ہڈی پر سانپ کی طرح بل ڈال کر لپٹ جاتا ہے اور حرام مغز چوسنے لگتا ہے، ساتھ ساتھ حرام مغز کا گودا بھی کھانے لگتا ہے۔ معمول کو اپنا ہوش نہیں رہتا۔ اس کے بال لمبے ہو کر مٹی سے بھر کر بھورے ہو جاتے ہیں، ڈاڑھی بھی لمبی ہو جاتی ہے اور مٹی سے بھر کر بھوری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر الف للا ہو کر سردیوں گرمیوں، ہر موسم میں سڑکوں گلیوں میں پھرتا ہے، پھر اسی حالت میں مر جاتا ہے۔

''پیر کچھ دیر رکا، کھانسا، پھر کروٹ لی۔

''تم واپس جا کر... اس کی آواز سرگوشی جیسی ہو گئی، ڈاکٹر سے اکیلے میں ملنا اور کہنا، اگر بھائی کو بچانا چاہتا ہے تو بھائی کو میرے پاس لے آئے۔ میں دم کر کے پانی دوں گا اور تعویذ بھی گھول کر پینے کے لیے۔ سات تعویذ ہوں گے... انشا اللہ ساتویں تعویذ پر کالی بلا کا بچہ مر جائے گا اور پیشاب کے رستے نکل جائے گا۔ اس کا جو گند دماغ میں رہ جائے گا وہ بھی ناک کے مواد کے ساتھ بہہ کر خارج ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کا نقشِ سلیمانی بنا دوں گا، چاندی کے تعویذ میں، جسے وہ موت تک اگر گلے میں پہنے رکھے گا تو کالی بلا اس پر حملہ نہیں کر سکے گی... ڈاکٹر کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دینا۔''

''ربش! (rubbish)'' بھائی نے کہا۔

''یہی تو ڈھنگ ہیں سیدھے سادے دیہاتیوں کو پھانسنے کے،'' میں نے کہا۔

''ایسا خوفناک نقشہ!'' میر صاحب نے کہا۔''بھیا، اس سے تو پڑھا لکھا انسان بھی پریشان ہو جائے گا، ناخواندہ دیہاتیوں کا خوف سے برا حال ہو جاتا ہوگا۔ بھئی ہم تو گداؤ میاں کے حوصلے کو داد دیتے ہیں... کوئی اور ہوتا تو خوفزدہ ہو کر بتا دیتا کہ اسے ہم نے بھیجا ہے۔''

''میں ڈرپوک نہیں ہوں،'' گداؤ نے کہا۔''لیکن جھوٹ کیوں کہوں... گھبرا تو میں بھی گیا تھا۔''

میر صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''آپ کی تو خیر نہیں صاحبزادے!'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔''آپ کے سر میں تو اب بدروحیں بچے دیں گی۔ پھر کالی بلا انھیں کھا جائے گی اور خود بچہ جنے گی۔ کالی بلا کا بچہ آپ کی ریڑھ کی ہڈی پر سانپ کی طرح بل ڈال کر لپٹ جائے گا اور حرام مغز کو چوسے گا... آپ تو گئے، صاحبزادے!''

بھائی بھی ہنس رہے تھے۔

''اب تو آپ کو یقین ہو گیا ہوگا،'' میں نے کہا۔''پیروں سے متعلق میری باتیں جھوٹی نہیں ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ دماغ میں بدروحوں کے بچے دینا، کالی بلا کو غصہ آنا، اس کا بدروحوں کے بچے کھا جانا اور خود بچے کو جنم دینا اور پھر اس بچے کا ریڑھ کی ہڈی پر بل کھا کر ناگ کی طرح لپٹ جانا اور حرام مغز کو چوسنا... سیدھے سادے دیہاتی تو یہ سن کر خوف سے لرزنے لگتے ہوں گے۔ پھر جو کچھ بھی پیر کہتا ہوگا، وہ اسی کو اپنی نجات سمجھتے ہوں گے... وہ جو مجھے تعویذ گھول کر پلانا چاہتا ہے، وہ تعویذ سادہ لوح دیہاتیوں کو مفت تو نہیں دیتا ہوگا، وہ تعویذوں کی قیمت سینکڑوں ہزاروں روپے میں وصول کرتا ہوگا۔ اس کے کارندے، سائلوں کو ہدیہ اور نذر کے نام پر قیمت بتاتے ہوں گے... دکان تو شرک کی ہے، قیمت کو کوئی نام کیوں نہ دے دیا جائے... ہے تو دکانداری ہی۔''

میر صاحب بڑے غور سے میری بات سن رہے تھے۔ تھوڑا سا آگے جھکے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں،'' انھوں نے کہا۔''خوف سے بڑا کوئی ہتھیار ہو ہی نہیں سکتا۔''

''اس جاہل معاشرے میں کوئی کرے تو کیا کرے!'' بھائی نے کہا۔''یہاں تو یہ عالم ہے کہ علاقے کے بڑے بڑے جاگیردار پیر نور شریف کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں، نذر دیتے ہیں اور ہر فصل پر اناج کی بوریاں میگھا پتن بھجواتے ہیں۔''

''وہ تو یہ سب کچھ کریں گے،'' میں نے کہا۔''ان کی حکمرانی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک اس علاقے کے لوگ ناخواندگی کے ساتھ ساتھ فرسودہ عقائد کے غلام رہیں گے، اور یہ فرض پیر بخوبی ادا کر رہا ہے۔''

میر صاحب نے گداؤ کی سمت دیکھا۔

''گداؤ میاں،'' انھوں نے کہا،''آگے کیا ہوا، وہ بھی تو بتایئے۔''

''بس جی،'' گداؤ نے کہا،''مجھے پیر نے حکم دیا کہ زبان بند رکھوں۔ کسی سے نہ واقعے سے متعلق بات کروں نہ ہی ملاقات کا ذکر کسی سے کروں۔ اگر میں نے کسی سے بھی پیر سے ہونے والی ملاقات کا ذکر کیا تو بچے سے پہلے کالی بلا مجھ پر حملہ کرے گی۔ یہ حکم دے کر پیر نے تالی بجائی۔ مونچھوں والا اندر آیا۔

''گدا حسین کو برکت کے لیے گڑ اور چاول دے دو۔ واپسی کا کرایہ بھی دے دو۔ اور تو نے بہت اچھا کیا گدا حسین کہ یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ اپنے ہونٹوں پر تروپے (ٹانکے) لگا لے۔

''میں اٹھا۔ کھڑکی کی سمت سے بڑی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں الٹے قدموں حجرے کے دروازے تک آیا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے حجرے کو نظر بھر کر دیکھا... صاب، حجرے میں اتنی قیمتی چیزیں تھیں کہ میں حیران رہ گیا۔ سنہری پھولدان خالص سونے کے لگ رہے تھے۔ کتنی ہی چیزیں تھیں، مجھے تو نام تک معلوم نہیں... کتنے ہی رنگوں کی۔ اب کیا بتاؤں، ٹوانوں، میکنوں اور رانوں کی حویلیوں میں بھی اتنی قیمتی چیزیں نہیں ہوں گی... میں باہر برآمدے میں آیا تو مونچھوں والے نے حجرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ مجھے برآمدے ہی میں ایک طرف کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک ملنگ سے مجھے چاول اور گڑ دینے کو کہا۔ مونچھوں والے نے مجھے آٹھ آنے بھی دیے ... واپسی کا کرایہ۔ باہر دس بارہ عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھیں، رکھیں کٹوانے کے لیے...''

''تو وہ گٹھڑی،'' میں نے کہا،''جو تم ساتھ لائے ہو، چاول اور گڑ کی تھی؟''

''ہاں جی،'' گداؤ نے کہا،''بیوی کو دے آیا ہوں، پیر کے میٹھے چاول ہی سہی۔''

بھائی ہنسے۔ میر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

''تم نے بیوی کو کچھ بتایا تو نہیں؟'' بھائی نے پوچھا۔

''نہ جی!'' گداؤ نے تیزی سے کہا،'' بے وقوف نہیں ہوں۔ کہہ دیا ہے کہ چاول اور گڑ خوشاب سے ایک دوست نے بھیجے ہیں اور . . . '' گداؤ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بخشو آ رہا تھا۔

''گرما گرم سموسے،'' بخشو نے دور ہی سے ہانک لگائی،''بہت سی چٹنی بھی لایا ہوں۔'' اس نے گداؤ کی طرف دیکھا۔'' چائے کی جگہ چٹنی پی لے . . . '' بخشو نے اپنی بات دہرائی۔

''بک بک نہ کر!'' گداؤ نے کہا،'' جا، چائے بنا۔''

میری نگاہیں تنور کی سمت گئیں۔ گلنازی اپنے بائیں گھٹنے پر بایاں رخسار رکھے نہ جانے کب سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملنے پر اس نے فوراً گھٹنے سے رخسار اٹھایا اور ماسی جیراں کی سمت دیکھنے لگی۔

''گداؤ،'' میں نے کہا۔

''جی صاب؟'' گداؤ نے میری نظروں کا تعاقب کیا۔ خاصا ذہین تھا۔'' فکر نہ کریں، چائے پی کر روٹیاں لے جاؤں گا۔''

بخشو ایک بڑی سی پلیٹ اور کٹورا لایا۔ سموسے رکھے۔ چٹنی والا کٹورا تو وہ شاید ساتھ لے کر ہی فضلو کی دکان پر گیا تھا۔ کٹورا لبالب بھرا ہوا تھا، چٹنی میں پودینے کی سبزی نمایاں تھی۔ بخشو پلٹ کر چائے بنانے کے لیے اپنی کوٹھڑی کی سمت چلا گیا۔

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے،'' میر صاحب نے کہا،'' کیا واقعی پیر نور شریف بچے کو مروانے کی کوشش کریں گے؟''

''سو فی صد!'' میں نے کہا۔'' کیا آپ کو گداؤ کی بتائی ہوئی باتوں سے اس کا اندازہ نہیں ہوا؟ پیر نے صاف صاف کہا ہے کہ بچے اور اس کی ماں کی جان بچانا اب بہت مشکل ہے۔''

''یہ بات کچھ الجھی ہوئی ہے،'' بھائی نے کہا،'' ماں کی جان کو کیوں خطرہ ہے؟''

''بچے پر حملہ دن کے وقت تو ہو نہیں سکتا،'' میں نے کہا،'' رات کو اگر حملے کے وقت ماں جاگ اٹھی تو کیا اس کی جان کو خطرہ نہ ہو گا؟''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے،'' میر صاحب نے کہا۔'' حملہ آور ماں کو بھی ختم کر سکتے ہیں۔''

''خطرہ تو ہے صاب،'' گداؤ نے کہا اور میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔'' میں نے آپ کے کہنے کے مطابق گھر میں سونے کا انتظام بھی پیر کو بتا دیا ہے کہ رقیہ اور بُو با صحن میں سوتے ہیں۔''

''گداؤ میاں،'' میر صاحب نے شاید میری اور بھائی کی مشترکہ سوچ کو محسوس کرلیا تھا۔ ''گداؤ میاں، ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ پڑھے لکھے نہیں ہیں، اسی علاقے میں پلے بڑھے ہیں... آپ پر عام دیہاتیوں کی طرح پیر کا خوف نہیں ہے اور آپ اس کو اچھا بھی نہیں سمجھتے... کیا بات ہے؟''

گداؤ کے چہرے پر اداسی سی پھیل گئی، جیسے میر صاحب کی بات نے اس کی کسی بری یاد کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا ہو۔

''ویسے ہی...'' گداؤ نے کہا، ''کوئی خاص بات نہیں... میں پیروں فقیروں کو بہت نہیں مانتا۔''

گداؤ کے چہرے کے تاثر اور لہجے نے صاف بتایا کہ وہ کوئی اہم بات چھپا رہا ہے۔

''کسی دن،'' میں نے سوچا، ''گداؤ سے اگلوا لوں گا، کوئی بات ہے ضرور۔''

''ہم تو یہ سوچ رہے ہیں،'' میر صاحب نے کہا، ''اگر واقعی پیر نے بچے کو مروانے کا مذموم ارادہ کرلیا تو وہ کیا طریقہ اختیار کریں گے؟'' انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ''ضروری نہیں کہ جو کچھ آپ نے سوچا ہے وہی درست ہو۔''

''یہ بات تو اب میں بھی مانتا ہوں،'' بھائی نے کہا۔ ''رقیہ اور بچے کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔''

''یہ بات بھی ہمیں درست معلوم ہورہی ہے،'' میر صاحب نے کہا۔ ''حملہ رات ہی کو ہوسکتا ہے۔''

''مجھے یقین ہے،'' میں نے کہا، ''پیر اپنے چھٹے ہوئے بدمعاش ملنگ ضرور بھیجے گا اور حملہ صحن ہی میں ہوگا۔ دو دن بعد اماوس ہے — خطرہ اسی رات کو ہے۔''

بھائی نے کرسی پر پہلو بدلا۔

''جب تک ملنگ آ نہیں جاتے،'' انھوں نے کہا، ''سب قیاس آرائی ہے۔''

''آپ پیر اور گداؤ کے درمیان ہونے والی گفتگو پر غور کریں،'' میں نے کہا، ''اس نے گداؤ کو زبان بند رکھنے کے لیے کہا ہے... کیوں؟ صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی ساکھ، دہشت اور پیری کو سچ ثابت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرے گا۔ اس نے چالیس گھنٹے کے چلّے کی بات کی ہے۔ وہ اس مدت میں بچے کو مروانے کی منصوبہ بندی کرے گا۔ چالیس گھنٹوں بعد ہی اماوس کی رات بھی ہے — چالیس

گھنٹے وہ کالی بلا کو روکنے کے لیے چلے کی بات کر رہا ہے... کیونکہ اس کے بعد اس کی کالی بلا... یعنی وہ اپنی کالی بلا سے مزید انتظار نہیں کرائے گا۔ سارا معاملہ صاف ہے — اگر میں غلط نہیں ہوں تو کل ملنگ جھاوریاں میں آ جائیں گے۔''

''یہ اوور کانفیڈنس ہے،'' بھائی نے کہا۔''ممکن ہے ایسا کچھ بھی نہ ہو۔''

میر صاحب نے کرسی پر کہنی ٹکائی۔

''کچھ بھی ہو بھیا،'' انھوں نے کہا،''ان صاحبزادے کی تجویز نے آپ کی تو تمام پریشانی ختم کر ہی دی۔''

''ہاں،'' بھائی نے کہا،''میں اب خود کو محفوظ محسوس کر رہا ہوں۔ کم از کم اب میرے خلاف نہ پیر کوئی کارروائی کرے گا نہ اس کے مرید۔''

''اگر اس کے ملنگ جھاوریاں آ گئے،'' میر صاحب نے کہا،''تو ہمیں فوراً چوکنا ہونا پڑے گا۔''

بھائی نے مڑ کر بخشو کو دیکھا جو دور بیٹھا پیالیوں میں چائے ڈال رہا تھا۔ پھر بھائی نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔''اگر واقعی ملنگ آ گئے تو پھر سوچیں گے،'' انھوں نے کہا،''مجھے تو ابھی تک اس بات پر یقین نہیں ہے۔''

''چلیں ہم قیاس کرتے ہیں،'' میر صاحب نے کہا۔''قیاس کرتے ہیں کہ ملنگ بچے کو مارنے کے لیے آ ہی جاتے ہیں، تو ایک ہی بات باعثِ تشویش ہوگی کہ ان کا طریق کار کیا ہوگا۔''

لمحہ بھر کے لیے خاموشی رہی۔ میر صاحب کھانسے، جیسے کچھ اور کہنا چاہتے ہیں۔ اب میں ان کی بات کرنے کی خواہش میں خاموش تھا... لمحہ بھر کی خاموشی کئی لمحوں تک طول پکڑ گئی۔

''نہ وہ گولی چلا سکتے ہیں، نہ ہی کوئی ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔'' میں نے اپنی بات دہرائی اور یہ دیکھ کر کہ میر صاحب خاموش ہو گئے ہیں، خاموشی کو ختم کیا۔''پیر یقیناً بہت ہی مکار اور چالاک ملنگ بھیجے گا۔ گداؤ پیر کو بتا چکا ہے کہ رقیہ اور بُوبا صحن میں سوتے ہیں اور گھر کی بیرونی دیوار کھیت سے ملتی ہے۔ ملنگوں کے لیے اس صورت حال میں وار کرنا بہت آسان ہوگا۔ پرسوں اماوس ہے، ملنگ دیوار کود کر صحن میں آ سکتا ہے۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ملنگ اکیلا نہیں ہوگا، وہ ضرور کسی ساتھی کی مدد ہی سے حملہ کرے گا۔''

''ماں بچہ تو چھت پر محفوظ ہی ہوں گے،'' میر صاحب نے کہا،''صحن میں اگر کوئی اترتا ہے اور یہ جان کر کہ چار پائی پر ماں بچہ نہیں ہے، اس کا ردِ عمل شدید بھی تو ہو سکتا ہے . . . '' میر صاحب بھائی کی طرف دیکھنے لگے۔

بھائی کچھ دیر سوچتے رہے، پھر انھوں نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔

''چلیے میں آپ کے قیاس کو مان لیتا ہوں،'' انھوں نے کہا،''اگر چہ مجھے اب بھی یقین نہیں کہ ملنگ بچے کو مارنے آئیں گے — بچگانہ سی بات لگتی ہے — لیکن اگر وہ آ گئے اور ان کا ارادہ بچے کی جان لینا ہوا تو صحن میں اترنے کے بعد ہمیں ہر حال میں ملنگ کو پکڑنا ہو گا تا کہ اسے کالرہ کے پولیس سٹیشن میں لے جا کر چوری کے الزام میں گرفتار کرا سکیں۔ ملنگ کی گرفتاری پر پیر مجبوراً خاموشی اختیار کرے گا۔''

گداؤ بے چین سا نظر آیا۔

''نہ صاب . . . '' گداؤ نے کہا،'' کالرے نہیں — کالرے کا تھانیدار پیر کا مرید ہے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے گداؤ میاں!'' میر صاحب نے کہا،'' پیر خود بھی پکڑے جانے والے ملنگ کو چور ہی قرار دیں گے اور اپنے ملنگوں کے ٹولے سے نکال کر لاتعلقی کا اظہار کریں گے، کیونکہ اسی میں ان کا اپنا مفاد بھی ہو گا۔ وہ کوشش کریں گے کہ معاملہ دب جائے۔ دوبارہ بچے کو مارنا بھی ان کے مفاد سے ٹکرائے گا۔''

گداؤ میر صاحب کی اردو سمجھ نہ سکا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بخشو چائے لے آیا۔

''بہت دیر لگا دی بخشو!'' گداؤ نے کہا،''سموسے بھی ٹھنڈے ہو گئے۔''

''کیا کروں . . . '' بخشو بیزاری سے بولا،''اس بار ٹال[40] پر ساری لکڑیاں ہی گیلی آئی ہیں۔''

بھائی نے پلیٹ میں دو سموسے رکھ کر چٹنی ڈالی اور بخشو کو دی۔ بخشو نے مسکراتے ہوئے پلیٹ پکڑی۔

''سوچتا ہوں،'' بخشو نے کہا،''میں بھی ماسی جیراں کی طرح من چھٹی کے اونٹ والوں سے بات کر ہی لوں۔'' بخشو پلیٹ پکڑے ہوئے اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔ سب کے ہاتھوں میں

40۔ ٹال: وہ جگہ جہاں عمارتی اور جلانے والی لکڑیاں فروخت ہوتی ہیں۔

سموسوں کی پلیٹیں تھیں، خاموشی منطقی تھی ۔ میری نگاہیں تنور کی سمت گئیں ۔گلنازی ماسی کو پیڑے بنا بنا کر دے رہی تھی ۔

''سب سے اہم کام . . . ''میں نے سوچا،''اس واقعے کو گاؤں والوں سے چھپانا ہے۔ اگر کسی کو بھی بھنک پڑ گئی تو سب تدبیر نہ صرف ختم ہو جائے گی، بلکہ الٹ بھی جائے گی۔ سب سے مشکل کام گلنازی کو روکنا ہے۔ وہ دن کے وقت بھی عصمت سے ملنے کے بہانے جا سکتی ہے۔ رقیہ نے بوبے کو کمرے میں چھپا رکھا ہے۔ سخت گرمی میں بھی کمرے اور چھتوں والے برآمدے تک محدود کر رکھا ہے، لیکن گلنازی . . . ''

گداؤ نے جلدی جلدی سموسے کھائے، چائے پی اور تنور کی سمت روٹیاں لینے چلا گیا۔ اسے آتے دیکھ کر گلنازی کے چہرے پر ناگواری سی تو آئی لیکن کسی چھوٹی سی بچی کی طرح، جو کسی بات پر روٹھ گئی ہو، پھر اس نے میری جانب دیکھا۔ آہستہ سے اٹھی، گھر کے بیرونی دروازے تک گئی۔ کواڑ کھول کر اندر قدم رکھا۔ مڑی، مجھے دیکھا۔ چہرے پر اداس سی مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح، اس کی آنکھوں میں بھی تھی، جسے میں شام کے دھندلکوں میں آسمان پر چمکنے والے پہلے ستارے کی طرح ٹمٹماتا محسوس کر رہا تھا۔

''مجھے ہر حالت میں . . . ''میں نے سوچا،''ماسی جیراں اور گلنازی کو اعتماد میں لینا ہوگا۔''میں یہ فیصلہ تو کر ہی چکا تھا کہ مجھے ماسی جیراں اور گلنازی سے مدد حاصل کرنا ہوگی، لیکن نہ جانے کیوں میں ہچکچاہٹ سی محسوس کر رہا تھا۔'' کچھ بھی ہو . . . مجھے یہ قدم تو اٹھانا ہی ہوگا۔''

22

میری یہ مشکل اگلے روز خود ہی حل ہو گئی۔

اگلی شام بھائی، میر صاحب اور میں شام کے وقت ہسپتال کے صحن میں بیٹھے تھے۔ میں اس بات پر سکون محسوس کر رہا تھا کہ دن بھر گلنازی، رقیہ اور بوبے سے ملنے گھر نہیں آئی تھی، شاید ماسی نے اجازت ہی نہ دی ہوگی۔ میری نظریں بار بار تنور کی سمت اٹھ رہی تھیں۔ ماسی تنور دہکا چکی تھی، گلنازی یقیناً گھر ہی میں ہوگی۔

اچانک سڑک پر گداؤ نظر آیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے ہسپتال کی سمت مڑا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ کسی کو بھی شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت سی تھی۔ آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا سا گیا — رقیہ اور بوبا خیریت سے تو ہیں؟ بھائی اور میر صاحب کے چہرے پر بھی پریشانی سی نمایاں تھی — کہیں بھید کھل تو نہیں گیا؟ گداؤ نے قریب آ کر سب سے پہلے بخشو کی سمت دیکھا جو دور چولھا جلا رہا تھا، پھر اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سٹول پر بیٹھتے ہوئے، گھبرائے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

''آ گئے...'' اس کا گھبرایا ہوا لہجہ سرگوشی میں بدل گیا۔ ''آ گئے صاب جی... ملنگ...''

''کیا؟'' میر صاحب کا بدن جھٹکے سے آگے کی سمت جھکا، بھائی نے بھی گداؤ کی سمت جسم کو آگے بڑھایا۔

''آ گئے...'' گداؤ کی سرگوشی میں خوف سا تھا۔ ''سیدھے پرانی حویلی کی طرف گئے ہیں... دو ہیں... ہٹے کٹے مسٹنڈے۔ دونوں نے جھولے[41] لٹکائے ہوئے ہیں۔''

میر صاحب اور بھائی دونوں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں نہ جانے کیا تھا کہ میں ان کی سمت دیکھ کر تنور کی سمت دیکھنے لگا۔ تنور سے میری نظریں پھر بھائی اور میر صاحب کی سمت گئیں۔ وہ اب بھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر میر صاحب نے گداؤ کی سمت دیکھا۔

''آپ نے کہاں دیکھے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''میرا گھر ادھر ہی ہے ڈاکٹر جی،'' گداؤ نے کہا۔ ''میں بازار کی طرف جا رہا تھا کہ میگھا پتن سے آنے والے تانگے پر وہ آئے... ایک بہت موٹا ہے، دوسرا کم موٹا ہے، دونوں بڑے خطرناک لگتے ہیں... سیدھے پرانی حویلی کی طرف گئے ہیں... میں سیدھا اِدھر آیا ہوں... وہ جب بھی آتے ہیں، پرانی حویلی کی طرف ہی جاتے ہیں۔''

مجھے گداؤ کی گھبراہٹ سے پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔ ''انھوں نے آنا ہی تھا گداؤ،'' میں نے کہا۔ ''گھبرانے کی کیا بات ہے؟ ہم تیار ہیں۔''

''لیکن صاحبزادے،'' میر صاحب نے کہا۔ ''کسی کو معلوم نہیں کہ اگر ان کا ارادہ بچے کو

41۔ جھولے: بڑے تھیلے جو ملنگ لوگ کندھوں پر لٹکاتے ہیں۔

مارنے کا ہے تو ان کا طریق کار کیا ہوگا۔ آپ نے جو قیاس آرائی کی ہے، وہ غلط بھی تو ہوسکتی ہے۔''
''یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ بچے کو مارنے ہی آئے ہوں،'' بھائی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے کہ ان کا آنا ہمارے لیے تشویش کا باعث ضرور ہے، لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ان کے آنے کا مقصد کچھ اور ہو۔''
میر صاحب نے بھائی کی جانب دیکھ کر اثبات میں سر کو جنبش دی۔
''نہیں بھائی جان،'' میں نے کہا۔ ''اب ان کا کوئی اور مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ سیدھے پرانی حویلی کے کھنڈرات کی سمت گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کل سارا دن جائزہ لیں گے، گھر کا پتا چلائیں گے، تیاری کریں گے... کل اماوس کی رات ہے اور مجھے بہت خطرناک محسوس ہو رہی ہے۔''
میر صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ گداؤ نے انھیں روکا۔ بخشو چائے لے کر آ رہا تھا۔ بخشو نے ہر شام کی طرح پیالیاں میز پر رکھیں اور جانے کے لیے مڑا، لیکن پھر پلٹا... اس نے غور سے گداؤ کی سمت دیکھا۔
''اوئے، تجھے کیا ہوا ہے؟'' بخشو نے گداؤ کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔ ''بگڑے گھوڑے کی طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟''
''کچھ نہیں ہوگا گداؤ،'' میں نے فوراً کہا، ''بچوں کو بخار آ ہی جاتا ہے... کل صبح ڈاکٹر صاحب کی ڈسپنسری لے جانا۔'' میں نے صورتحال کو سنبھالنے کے لیے جھوٹ بولا۔
''ابھی تو بخار کا موسم آیا ہی نہیں،'' بخشو نے کہا، ''تیرے بیٹے کو ابھی سے بخار ہوگیا ہے؟ ابھی تو بارشیں بھی شروع نہیں ہوئیں... اسے لُو لگ گئی ہوگی۔''
''کبھی اچھی بات بھی کر لیا کر!'' گداؤ نے غصے سے کہا اور ہمیشہ کی طرح بخشو نے غصہ دیکھ کر دانت نکالے۔ پھر مسکراتے ہوئے چولھے کی سمت چلا گیا، جہاں اس نے اپنے لیے چائے کا گلاس بھر کر رکھا ہوا تھا۔
''مشکل تو یہی ہے،'' بھائی نے کہا۔ ''ہمیں ہر حال میں یہ بات چھپانا ہے۔''
''ہاں بھیا،'' میر صاحب نے کہا، ''جب تک معاملہ صاف نہیں ہو جاتا، بات کو چھپانا بہت ضروری ہے۔''
''اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ بچے ہی کو مارنے آئے ہیں،'' بھائی نے کہا، ''تو آج رات تو وہ

کوشش نہیں کریں گے۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا گھر کہاں ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''وہ کل رات ہی کوشش کریں گے۔ کل اماوس کی رات ہے۔''

''تو کیا وہ کل گاؤں میں گھومیں گے؟'' بھائی نے کہا۔ ''کس بہانے سے؟''

بھائی کی اس بات پر گداؤ چونکا۔

''بہانہ تو ہے ان کے پاس،'' گداؤ نے کہا۔ ''ہرمل دھونی۔''

''وہ کیا ہوتی ہے؟'' میر صاحب نے کہا۔

''گاؤں کے ہر گھر کو، گلی کو، دکانوں کو اور راستوں کو پاک صاف کرنے کے لیے، ملنگ ہرمل دھونی دیتے ہیں، ہرمل کو جلا کر، دھواں پھیلا کر...'' گداؤ نے کہا۔

''ہاں ہاں!'' میر صاحب نے کہا، ''ملنگ بازار میں ایسا دھواں پھیلاتے ہیں۔ چند مہینے پہلے وہ ہماری ڈسپنسری میں بھی آئے تھے۔ بہت تیز بُو تھی دھویں میں۔''

''ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی کڑاہیاں ہوتی ہیں،'' گداؤ نے کہا، ''جن میں لکڑی کے دستوں والے کنڈے لگے ہوتے ہیں۔'' گداؤ نے تصور میں ایسی کسی کڑاہی کو پکڑا۔ اس کا ہاتھ اس کے سامنے ہوا میں اٹھا ہوا تھا، مٹھی بند تھی۔ ''کڑاہیوں میں انگارے ہوتے ہیں۔ انگاروں پر ہرمل کے دانے پھینک کر، جب دھواں اٹھتا ہے تو پھونکیں مارتے ہیں... ہر جگہ دھواں پھیلاتے ہیں، ہر دکان سے، ہر گھر سے بخشش بھی مانگتے ہیں۔''

میں قدرے بے چین سا تھا۔ اپنی بے چینی کو میں نے زبان دے ہی دی۔ ''اب تو شک کی بھی گنجائش نہیں ہے،'' میں نے کہا۔ ''کل اماوس بہت خطرناک ہوگی — تاریک رات۔''

''ہم تو اس کا انتظام کر چکے ہوں گے، صاحبزادے،'' میر صاحب نے کہا۔ ''رقیہ بی بی اور بچہ تو چھت پر ہوں گے۔''

''انھیں...'' میں نے کہا۔ ''ملنگوں کو... پکڑنا بھی تو ہے۔ جو صحن میں اترے گا ممکن ہے اس کے پاس ہتھیار بھی ہو۔''

''یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا،'' بھائی نے کہا۔

''ہو بھی سکتا ہے،'' میر صاحب نے کہا،'' کبھی کبھی ایسی صورتحال بہت خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔ گھبراہٹ اور پکڑے جانے کے خوف میں خوفزدہ آدمی کچھ بھی کر سکتے ہیں... برخوردار...''

انھوں نے میری طرف دیکھ کر گداؤ کی طرف دیکھا۔'' آپ کو اور گداؤ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔''

بھائی کچھ سوچ رہے تھے۔ میر صاحب نے میری طرف دیکھا۔'' صاحبزادے،'' انھوں نے کہا،'' آپ نے کہا تھا کہ آپ گلنازی اور ان کی والدہ کو اعتماد میں لیں گے۔ جو کرنا ہے جلد کیجیے — ہمیں یہی کام سب سے مشکل لگ رہا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں،'' میں نے کہا،'' یہ سچ ہے کہ یہی کام سب سے مشکل ہے — لیکن میں یہ کام کر لوں گا۔ مجھے تو ابھی کچھ باتوں کی طرف سے تشویش ہے۔ ابھی کچھ معاملات طے کرنا ہیں۔''

بھائی نے میری طرف دیکھا۔

''اب کیا ہے؟'' انھوں نے کہا،'' سب تو طے ہو چکا ہے۔''

''کل جب ملنگ گاؤں میں آئیں...'' میں نے کہنا شروع کیا،'' تو گداؤ ان کی چھپ کر نگرانی کرے گا، اس طرح کہ وہ کسی صورت بھی اسے نہ دیکھیں۔ کیا خبر ان میں سے کسی نے گداؤ کو میگھا پتن میں دیکھا ہو۔ جب شام سے کچھ پہلے، جو مجھے امید ہے کہ وہ شام سے کچھ پہلے پرانی حویلی کی طرف چلے جائیں گے تو گداؤ یہ بات آکر بھائی جان کو بتائے گا اور بھائی جان، بھابھی اور بہنوں کو آپ کے...'' میر صاحب کو دیکھتے ہوئے میں نے بات جاری رکھی،'' آپ کے گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں کل شام ہی کو ٹائیگر کے ساتھ ہسپتال آ جاؤں گا۔ میں آج ہی ماسی اور گلنازی کو اعتماد میں لے کر اس بات پر راضی کر لوں گا کہ وہ کل رات ہمارے اور رقیہ اور بوبے کے ساتھ چھت پر سوئیں... باقی میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔''

بھائی ذرا سا مسکرائے۔

''نیند کیسے آئے گی! اور...'' انھوں نے میری طرف دیکھا۔'' اگر کل رات ملنگ ہمارے گھر کی طرف نہ آئے اور نہ ہی انھوں نے بچے پر کوئی حملہ کیا تو...''

''تو اگلی رات کیا کرنا ہے!'' میں نے کہا۔'' پرسوں صبح سوچیں گے۔ لیکن مجھے مکمل یقین ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کل رات ہی کریں گے — کل اماوس ہے۔''

گداؤ اٹھا اور تنور کی سمت چلا گیا۔ ماسی نے اسے روٹیوں کی چنگیر پکڑا دی۔ گلنازی نے آنکھیں بھینچ کر ماسی کی طرف دیکھا اور پھر گداؤ کی طرف دیکھا۔ ماسی نے گلنازی کے چہرے پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔

''اچھا،'' ماسی نے کہا، آواز مجھ تک بھی پہنچی۔ ''کل صبح چلی جانا بی بی کے پاس۔''

میر صاحب بھی یہ سن کر چونکے، وہ اب مقامی زبان اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔

''صاحبزادے،'' انھوں نے میری طرف دیکھا، ''جو کرنا ہے جلد کیجیے۔ گلنازی تو کل آپ لوگوں کے گھر پہنچ جائیں گی۔ اجازت مل گئی ہے انھیں — یہی سب سے مشکل کام ہے۔''

''میں آج رات ہی ماسی سے ملوں گا،'' میں نے اعتماد سے کہا۔

''یہ بہت مشکل ہوگا،'' بھائی نے کہا، ''رات کے وقت ماسی کے گھر جانا، وہاں . . . میرا مطلب ہے ماسی . . . اگر اس نے کچھ اور سمجھا تو . . . '' بھائی جو کہنا چاہ رہے تھے، کہہ نہیں پا رہے تھے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بخشو آیا، چائے کی پیالیاں اٹھا کر لے گیا اور اپنی کوٹھڑی کے پاس بیٹھ کر ایک بالٹی میں بھرے پانی سے دھونے لگا۔

''اگر ماسی کا ردِعمل منفی ہوا،'' میر صاحب نے کہا، ''تو کیا بات بگڑ نہ جائے گی؟''

''مجھے امید ہے،'' میں نے کہا، ''کچھ نہیں ہوگا، میں سنبھال لوں گا۔''

''زیادہ پُراعتماد ہونا خطرناک ہے،'' بھائی نے کہا۔

''میں جانتا ہوں میں نے کیا کرنا ہے،'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے،'' بھائی نے کہا، ''لیکن میرے لیے اب کوئی اور مصیبت نہ کھڑی کر دینا۔''

''آپ مجھ پر اعتماد رکھیں،'' میں نے کہا۔

میری نظریں تنور کی سمت گئیں۔ ماسی کے پاس اب گلنازی اور نوراں ہی بیٹھی تھیں۔ نوراں اٹھی تو ساتھ گلنازی بھی اٹھی۔ نوراں نے میری طرف دیکھا، پھر پلکیں نہ جھپکاتے ہوئے وہ سڑک کی جانب مڑتے ہوئے مجھے دیکھتی گئی۔ گلنازی کی نگاہیں نیچی تھیں، ناراض سی لگ رہی تھی۔ وہ گھر کے بیرونی دروازے تک گئی، رکی، ایک ہاتھ سے کواڑ کو دھکیلتے ہوئے، اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ گہری شام میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پل بھر کے لیے چمکی اور وہ اندر چلی گئی۔ میر صاحب بھائی سے

کچھ کہہ رہے تھے جو میں قریب بیٹھے ہونے کے باوجود نہ سن سکا۔

''جہاں تک بچے کی زندگی کا سوال ہے،'' میر صاحب کی آواز میری سماعت میں آہستہ سے ابھری اور نمایاں ہوگئی۔ ''ہم سمجھتے ہیں کہ اب اس کی جان کو خطرہ ہے۔۔۔ اب اس کا امکان ہے کہ اس پر حملہ ہو۔۔۔ لیکن ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا ملنگ یہ غلطی کریں گے کہ وہ بچے کی جان کو ایسے وقت میں خطرے میں ڈالیں جب وہ خود گاؤں میں موجود ہیں؟ کیا گاؤں والوں کو ان پر شک نہیں ہوگا؟''

بھائی ذرا سا آگے جھکے۔ میر صاحب کی طرف دیکھا۔

''ہاں، یہ بات تو ہے'' انھوں نے کہا۔ ''اگر بچے کو کچھ ہو جاتا ہے تو شک تو ملنگوں ہی کی طرف جائے گا۔ گداؤ یہ بات بتا چکا ہے کہ وہ ہٹے کٹے مسٹنڈے ہیں، شکل ہی سے خوفناک لگتے ہیں۔ گاؤں والے ان پر شک ضرور کریں گے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ بچے پر کل رات حملہ نہیں کریں گے، لیکن اسے۔۔۔'' بھائی نے میری طرف دیکھا، ''اسے تو مکمل یقین ہے کہ وہ بچے کو مارنے آئے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ کل جائزہ لے کر چلے جائیں اور دوبارہ کسی رات کوشش کریں۔''

''وہ پیدل تو میگھا پتن سے آ نہیں سکتے؛'' میں نے کہا، ''تانگے پر ہی آئیں گے۔ جب بھی آئیں گے، گاؤں میں ان کی آمد کی خبر ہو جائے گی۔ آپ نے پیر اور گداؤ کی گفتگو میں چالیس گھنٹے کے چلّے پر کیا غور نہیں کیا؟ مسلسل — چالیس دن کے نہیں — چالیس گھنٹے کے چلّے کی بات ہوئی تھی۔۔۔ پھر گداؤ نے جو ہرمل دھونی کی بات کی ہے، اس پر غور کریں۔۔۔ پیر لوگ انتہائی مکار ہوتے ہیں۔ پیر نے ملنگوں کو سمجھا کر بھیجا ہوگا کہ گھروں میں، گلیوں میں، راستوں میں، بازاروں کی دکانوں میں دھونی دیتے وقت وہ لوگوں سے کہیں گے کہ جھاوریاں پر کوئی خطرہ منڈلا رہا ہے اور پیر نے انھیں اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ دھونی کے ذریعے بدروحوں اور بلاؤں کو بھگا دیں۔۔۔ اس کے بعد اگر گاؤں میں کوئی واردات ہو جاتی ہے تو لوگ ملنگوں پر شک نہیں کریں گے، بلکہ سادہ لوح دیہاتیوں کے دلوں میں پیر کی دہشت کے ساتھ عقیدت بھی بڑھ جائے گی۔''

میر صاحب تھوڑا سا آگے جھکے، میری طرف غور سے دیکھا۔

''ہاں، یہ بات سمجھ میں آتی ہے،'' انھوں نے کہا، ''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ بہر حال اب تو۔۔۔ ہمارا مطلب ہے کہ کل ہی پتا چلے گا کہ کیا ہوتا ہے۔۔۔ چلیں۔'' میر صاحب نے کرسی کو اٹھتے

ہوئے دھکیلا۔

بھائی اٹھے۔ میں بھی اٹھا۔ ہمارے اٹھتے ہی بخشو کرسیاں، میز اور سٹول اٹھانے کے لیے آتا نظر آیا۔ تنور پر ماسی جیراں الٹی کڑاہی رکھ رہی تھی۔

23

میری زندگی میں یہ نہایت ہی کٹھن آزمائش تھی۔

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ میں ماسی جیراں کے گھر جاؤں گا، اسے اعتماد میں لوں گا، لیکن اس رات کھانا کھا کر جب میں گھر سے نکلا تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ٹانگوں میں سکت ہی نہ تھی۔ ایک انجانی سی پریشانی نے دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔

''ماسی جیراں کوئی بچی تو نہیں ہے،'' میں نے تنور کی سمت جانے والی سڑک پر آ کر گھبراہٹ میں سوچا۔ ''اس نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ گلنازی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ ایسے میں رات کے وقت، اس اندھیرے میں، اس کے گھر جانا...''

اماوس سے ایک رات پہلے کے اندھیرے نے سارے گاؤں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ہر سمت سیاہ پردے سے تنے ہوئے تھے اور ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکے جیسے ان پردوں کو جُھلا رہے تھے۔ سڑک کی دائیں جانب میدان میں بشیر نعل بند کی چارپائی نظروں سے اوجھل تھی۔ میں چلتے ہوئے ایک دو بار ٹھٹکا۔

''ماسی جیراں اور گلنازی تو سوگئی ہوں گی۔'' خیال خاصا پریشان کن تھا۔ ''گاؤں میں لوگ رات آٹھ بجے ہی سو جاتے ہیں۔ ماسی جیراں اور گلنازی کو جگانا ہوگا۔ کیا وہ اٹھ جائیں گی؟ ان کے پڑوس میں خالی احاطہ ہے۔ دروازہ تو میں آسانی سے کھٹکھٹا سکوں گا، لیکن تنور کے ساتھ تو گھر میں لوگ رہتے ہیں۔ کہیں وہ اٹھ گئے تو...''

اس خیال کے ساتھ ہی پریشانی، سیاہ پردوں کی طرح، ایک ایک گزرتے لمحے کے ساتھ، مجھے اپنے وجود پر اترتی محسوس ہوئی۔ پھر میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

''جو بھی ہو،'' میں نے سوچا، ''ماسی جیراں چاہے جو بھی سوچے، مجھے اب اس کے گھر جا کر

اسے اور گلنازی کو ساری صورت حال بتانا ہوگی، انھیں اعتماد میں لینا ہوگا۔''

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی گھر کی کھڑکی کی درز میں روشنی کی کوئی لکیر دکھائی نہ دی۔ گاؤں سو چکا تھا۔ میں ہسپتال کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سامنے ماسی کا تنور تھا، لیکن نظروں سے میں اس کا اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ ماسی کے گھر کے بیرونی دروازے تک پہنچنے کے لیے مجھے تنور سے آگے دیوار کا سہارا لینا تھا۔ سڑک کے آگے لاری اڈے کی سمت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تنور کے پاس پہنچ کر میں نے پکی ہوئی روٹیوں کی خوشبو نتھنوں میں محسوس کی — یہ احساس اچھا لگا، لیکن میری ذہنی حالت کا اثر میرے قدموں پر ظاہر ہو رہا تھا، میرے قدم بوجھل ہو چکے تھے۔ میں اب اس دیوار تک پہنچ چکا تھا جہاں سے گلنازی نے چھلانگ لگائی تھی۔ میرا ایک بازو آگے کی سمت بڑھا ہوا تھا۔ تاریکی اس قدر تھی کہ چند گز دور گھر کا دروازہ بھی نظروں سے اوجھل تھا۔ کسی نابینا شخص کی طرح، جس کے پاس شاید ایک نظر کا بھی احساس نہ ہوتا ہوگا، انگلیاں دیوار سے چھو جانے پر میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا کہوں گا؟'' مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ ''کچھ کہہ بھی پاؤں گا کہ نہیں؟ پتا نہیں دروازہ کھٹکھٹانے پر ماسی جیراں باہر آئے گی کہ گلنازی... نہ جانے ان کا ردِعمل کیا ہوگا۔''

وہ تھکن جو میرے پیروں میں تھی، اب مجھے اپنے پورے بدن پر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری سانس تیز ہو چکی تھی اور سینے میں دل کی دھڑکن بھی...

میں دیوار سے گھسٹتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازے کو اندر کی سمت دھکیلا۔ دروازے پر اندر کی طرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ میں کپکپاہٹ تھی۔ میں نے اپنی جسمانی حالت پر قابو پانے کی شعوری کوشش کی، لیکن کپکپاہٹ پورے بدن میں پھیل رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں،'' میں نے سوچا، ''میری اس گھبراہٹ کی وجہ گلنازی ہے... میں خوفزدہ ہوں... ماسی کیا کہے گی... رات کی اس تاریکی میں... کہیں وہ شور ہی نہ مچا دے... ساری بات بگڑ جائے گی... نہیں، کم از کم مجھے دیکھ کر وہ شور تو ہرگز نہیں مچائے گی... اندھیرا بہت ہے، وہ مجھے دیکھ تو نہ سکے گی، لیکن میری آواز تو پہچانتی ہوگی... میں کیوں گھبرا رہا ہوں؟ میری جسمانی حالت ایسی کیوں ہے جیسے میں کوئی غلط کام کرنے والا ہوں؟ یہ گھبراہٹ یقیناً گلنازی کی جانب میرے کسی پوشیدہ خیال، کسی چھپے ہوئے رویے کی وجہ سے ہے۔ میں اپنے کسی داخلی جذبے، کسی اندرونی کیفیت

کی وجہ سے کپکپارہاہوں۔''

اس سوچ سے کپکپاہٹ توکم ہوگئی ،لیکن ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں موجود خنکی کے باوجود، میرا ساراسارابدن پسینے سے یوں بھیگا ہوا تھا جیسے کسی نے مجھ پر دور سے پانی پھینکا ہو۔

''اگر میں اسی طرح گھبراتا رہا،''میں نے سوچا،''تو میں کبھی بھی ماسی جیراں اور گلنازی کو اعتماد میں نہیں لے سکوں گا۔''

میرے اندر حوصلہ سا پیدا ہوااور میں نے کنڈی کھٹکھٹادی۔

اندرخاموشی تھی۔عجیب سی کیفیت میں چند لمحے گزرے جس میں حوصلہ اور بے حوصلگی، دونوں کی آمیزش تھی۔میں نے دوبارہ کنڈی کھٹکھٹائی۔اچانک صحن سے چار پائی کے چرچرانے کی آواز آئی۔کسی کے اٹھنے کا احساس ہوا، پھر دھیمی سی آہٹ سے دوبارہ چار پائی چرچرائی۔

''کون ہے؟''ماسی جیراں کی آواز آئی،''اس وقت؟''اس نے مقامی زبان اور لہجے میں قدرے اونچی آواز میں کہا۔میں گھبرا گیا۔دروازے کے پاس آتی ہوئی ماسی جیراں کی آواز میں تشویش تھی۔

''میں ہوں ماسی،''میں نے آہستہ سے کہا،''ڈاکٹر کا بھائی۔''

''کیا بات ہے؟''ماسی جیراں کی آواز آہستہ ہوگئی۔اب اس کی آواز میں تشویش کے ساتھ حیرت بھی تھی۔اس نے دروازہ نہ کھولا۔چندلمحوں کی خاموشی رہی۔

''کیا کام ہے... اس وقت کیوں آیا ہے؟''ماسی پریشان سی تھی۔

''رقیہ اور بُوبے کی بات کرنی ہے،''میں نے جواب دیا۔

''کیا؟''ماسی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔''کیا ہوا ہے رقیہ اور بُوبے کو؟''ماسی ایک دم سے بہت گھبرا گئی۔''خیر تو ہے پتر ..کیا ہوا ہے؟''

وہ اندھیرے میں میرے سامنے کھڑی تھی ،لیکن اس کے خدوخال نمایاں نہ تھے۔ماسی جیراں نے پتر (بیٹا) کہہ کر میرے خوف کو باہر تاریکی کی سمت بھگا دیا۔برآمدے میں دیا سلائی جلی، گلنازی نے لالٹین جلائی۔میری نگاہیں تنور سے ملحق چھت کی طرف گئیں۔مجھے سکون سا محسوس ہوا کہ اس گھر کی منڈیریں اونچی تھیں، تاریکی میں اور بھی سیاہ نظر آرہی تھیں۔کوئی چھت پر سویا بھی ہوگا تو

مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گلنازی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں، لمبی پلکوں والی خوبصورت آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور پریشان سی تھیں . . . میں اس تاریک رات میں اس کے گھر کے دروازے میں کھڑا تھا — وہ یقیناً ڈری گئی تھی۔ گلنازی کے دائیں رخسار پر، لالٹین کی مدھم روشنی میں، زلف بل کھا کر ہونٹوں تک پہنچ گئی۔

''ماسی،'' میں نے کہا، ''دروازے میں کھڑے ہو کر بتانے والی بات نہیں ہے . . . کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

ماسی نے خاموشی سے مجھے صحن میں قدم رکھنے دیا۔ پھر وہ برآمدے کی طرف مڑی، دو تین قدم آ گے گئی۔ میں نے بیرونی دروازہ بند کر دیا۔ صحن میں دو چار پائیاں شمالاً جنوباً بچھی تھیں۔ چار پائیوں کا چکر کاٹ کر میں بھی ماسی کے پیچھے برآمدے تک گیا۔

''کیا ہوا ہے ماں؟'' گلنازی کی آواز میں خوف سا تھا، اس نے دروازے میں میری دھیمی آواز میں بات سن لی تھی۔

''پتا نہیں،'' ماسی جیراں نے کہا۔ اس کے دھیمے لہجے میں گھبراہٹ تھی، ''رقیہ اور بوبے کی کوئی بات . . . بتانے آیا ہے۔''

''ہوا کیا ہے؟'' گلنازی نے آہستہ سے کہا۔

''ماسی،'' میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا، ''میں نہیں چاہتا کہ پڑوس میں کوئی جاگ اٹھے۔ بات ہی کچھ ایسی ہے . . . کیا ہم کمرے میں جائیں؟''

ماسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ گلنازی پھر پریشان ہو گئی۔ ماسی کچھ دیر خاموش کھڑی رہی، پھر اس نے مجھے اندر کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ماسی اور لالٹین اٹھائے ہوئے گلنازی کے پیچھے کمرے کی طرف قدم بڑھایا۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے کمرے کا دوازہ بھی بند کر دیا۔ میری اس حرکت سے ماسی اور گلنازی ڈری گئیں۔

''کیا بات ہے؟'' ماسی نے کہا، ''کیا بات ہو گئی ہے جو تو اس وقت . . .'' ماسی کے لہجے میں خوف تھا۔

''ماسی،'' میں نے کہا، ''بیٹھ کر آہستہ آواز میں بات کرنا بہتر ہو گا۔'' میں نے گلنازی کی طرف

دیکھا۔ ''بہت بڑی مصیبت آ گئی ہے۔''

میرے اس جملے پر ماسی کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔ گلنازی کے خوبصورت چہرے پر میں نے پہلی بار خوف محسوس کیا... کمرہ ہمارے گھر کے کمروں کی طرح بڑا تھا۔ چھت پر بھی شہتیر نظر آئے۔ کمرے میں ایک رنگین پایوں والا پلنگ بچھا تھا جس پر سفید اور کالے رنگ کا کھیس بچھا ہوا تھا۔ چھت سے تین فٹ نیچے پڑچھتی بنی ہوئی تھی — چھت کے نیچے چھت، جو شاید اڑھائی فٹ چوڑی ہوگی۔ پڑچھتی پر دو ٹین کے صندوق اور کچھ برتن پڑے ہوئے تھے۔ ایک سمت ٹین ہی کی پیٹی پر سلائی مشین اور چرخہ نظر آیا۔ گھر کا سامان غریبانہ تھا۔ گلنازی نے کمرے کے ایک کونے سے موڑھا اٹھایا اور پلنگ کے سامنے مجھے بیٹھنے کو دیا۔ گلنازی اور ماسی پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

''تو کل صبح تنور پر آ کر بھی بتا سکتا تھا...'' ماسی نے کہا، ''اس وقت... ہوا کیا ہے؟ کیا تجھے بی بی جی نے بھیجا ہے؟ رقیہ اور بوبا ٹھیک تو ہیں؟''

''بہت بڑی مصیبت آ گئی ہے ماسی،'' میں نے کہا اور ماسی کا منہ کھل گیا۔ اندیشہ اس کے سارے چہرے پر گہرا ہو گیا۔ گلنازی بھی پریشان تھی۔ ''میں صبح تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔''

''خیر تو ہے؟'' ماسی نے کہا، ''جو کہنا ہے کھل کر کہہ۔''

میں پریشان سا ہو گیا کہ بات کہاں سے شروع کروں؟ کیسے کروں؟ کیا کسی تمہید کی ضرورت ہے یا سیدھی بات کروں؟

''خیر ہی تو نہیں ہے ماسی،'' میں نے کہا، ''ورنہ اس وقت کیوں آتا!'' ماسی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''ماسی...'' میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا، ''کمرے میں بہت گرمی ہے، لیکن تمھیں میری پوری بات یہیں سننی ہوگی۔ آوازوں کو بھی دھیما رکھنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے،'' ماسی نے کہا، ''تو پوری بات بتا۔''

''ماسی،'' میں نے کہا، ''میری ایک اور عرض ہے...'' مجھے خود پر حیرت محسوس ہوئی، میں سرگودھا کی پنجابی مقامی لہجے میں روانی سے بول رہا تھا۔ ''اگر بات سن کر تجھے غصہ آ جائے تو اس پر قابو رکھنا، آواز اونچی نہ ہو۔ میں یہاں بیٹھا ہوں، رات کا وقت ہے — اور غصے پر قابو رکھنے ہی میں سب کی بھلائی ہے، رقیہ کی بھی اور بوبے کی بھی۔''

ماسی کے چہرے پر اندیشہ، گھبراہٹ میں بدلا۔

''غصہ؟'' اس نے گلنازی کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھا۔'' سیدھی سیدھی طرح بتا، ہوا کیا ہے؟'' ماسی نے پھر گلنازی کی طرف دیکھا۔'' تیری ماسی کو میں بچپن سے جانتی ہوں— کیا ہوا جو چھ سات سال اس سے دور رہی ہوں۔ رقیہ بہت اچھی ہے۔ بے وقوف ضرور ہے، سوچ کے بات نہیں کرتی، لیکن بہت اچھی ہے۔ وہ کوئی ایسی بات کر ہی نہیں سکتی جو بُری ہو، اس پر تو غصہ آتا ہی نہیں۔''

''ماں،'' گلنازی کی خوبصورت آواز ابھری۔'' بات صرف رقیہ ماسی کی نہیں ہے... تو نے سنا نہیں، بات بوبے کی بھی ہے۔''

ماسی نے فوراً میری طرف دیکھا۔

''کیا ہوا ہے بوبے کو؟'' ماسی کی آواز میں سختی سی نمودار ہوئی۔'' صاف صاف بتا، اس وقت... ہوا کیا ہے؟'' میں نے ماسی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ گلنازی کی سمت دیکھنے کی مجھ میں ہمت ہی نہ تھی۔

''رقیہ کو کچھ نہیں ہوا،'' میں نے کہا،'' اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ جو... بوبے کے سر پر رقیہ نے بالوں کا گچھا رکھوایا ہوا ہے...''

''رکھ،'' ماسی نے میری بات کاٹ دی،'' کیا ہوا ہے رکھ کو؟''

''مجھے گداؤ نے بتایا تھا کہ وہ رکھ پانچ سال کے لیے رکھوائی گئی تھی،'' میں نے کہا۔

''ہاں،'' ماسی نے حیران ہو کر کہا،'' ابھی دوڈھائی مہینے رہتے ہیں کٹنے میں۔''

''وہ رکھ...'' میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ گلنازی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''کیا ہوا ہے رکھ کو؟'' ماسی نے کہا،'' تو بتاتا کیوں نہیں؟'' گلنازی پلنگ پر تیزی سے آگے کی سمت جھکی، سر گھما کر ماسی کو دیکھا۔

''ماں... ماں...'' اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے کوئی بات یاد آئی ہے۔'' ماں وہ نوراں بتا رہی تھی کہ گاؤں میں دو ملنگ آئے ہیں— کہیں رکھ کا ہدیہ تو نہیں مانگ رہے ہیں؟''

''نہیں،'' اس بار میں گلنازی سے مخاطب ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت دھیمی سی مسکراہٹ ابھری۔'' معاملہ کچھ اور ہے۔''

ماسی کے ماتھے پر شکن سی ابھری۔

''تو بتاتا کیوں نہیں؟'' ماسی کی دھیمی آواز میں غصہ بھی تھا، ''بات کیا ہے؟ صاف صاف بتا۔''

وہ لمحے میرے لیے بہت پریشان کن تھے، لیکن میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے، گالیوں، بددعاؤں اور دھمکیوں کے خوف سے آزاد ہو کر، بڑے حوصلے سے بوبے کے بالوں کا گچھا کٹ جانے کا واقعہ ماسی اور گلنازی کو سنا دیا۔ ماسی نے کئی بار بولنے کی کوشش کی، مگر میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ خصوصاً رکھ کٹ جانے کی بات سن کر ماسی نے اپنا دوپٹہ ہونٹوں پر، دائیں ہاتھ سے دبالیا۔ اس نے سر گھما کر گلنازی کی طرف دیکھا جو ماسی ہی کی طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ میں واقعہ سناتے ہوئے گداؤ کے میگھا پتن جانے اور ملنگوں کے جھاوریاں آنے کا ذکر نہ کر سکا۔

''یہ کیا ظلم کیا ہے تو نے!'' ماسی کی گھٹی ہوئی آواز میں شدید غصہ تھا۔ ''کیا دشمنی تھی تیری بوبے سے؟ اور... اب مجھے یہ سب کچھ بتانے کیوں آیا ہے؟ اتنی رات گئے...''

''میری دشمنی بوبے سے نہیں ہے ماسی،'' میں نے کہا۔ ''میری دشمنی تو ان پیروں سے ہے جو سیدھی سادی عورتوں کو خوفزدہ کر کے، سونے اور چاندی سے اپنا گھر بھر رہے ہیں۔''

''کیا...؟'' ماسی نے غصے سے کہا، ''تو نے مرشد سے متعلق یہ بات کی اور میرے گھر بیٹھ کر؟... مرشد سے دشمنی؟... جا، اسی وقت چلا جا... نکل جا میرے گھر سے... مجھے بی بی جی کا لحاظ ہے... چلا جا... مرشد کو دشمن کہہ رہا ہے... عذاب آئے گا تجھ پر۔''

''مجھ پر کوئی عذاب نہیں آئے گا، ماسی،'' میں نے کہا۔ ''عذاب تو ملنگوں کی صورت میں جھاوریاں میں آچکا ہے... تو میری پوری بات سن لے... اس طرح آدھی بات سن کر گھر سے نہ نکال، ماسی۔ رقیہ اور بوبے کی جان کو خطرہ ہے۔''

ماسی پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ گلنازی بھی سہمی ہوئی تھی۔ مجھے شاید اسی لمحے کا انتظار تھا تاکہ پوری بات بتانے کے لیے گفتگو کا آغاز کر سکوں، تمام حالات و واقعات کو زبان دے سکوں... میں نے گداؤ کے میگھا پتن جانے اور پیر کے ساتھ ہوئی تمام باتیں ماسی جیراں اور گلنازی کو بتا دیں۔ میں نے ایک بار ماسی کے چہرے کا تاثر جاننے کی کوشش کی۔ کمرے میں لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماسی کے چہرے پر خوف بھی تھا، پریشانی بھی۔ گلنازی بھی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

''ملنگ بغیر مقصد کے جھاوریاں نہیں آئے ماسی،'' میں نے کہا۔''ان کا ارادہ بد ہے۔ وہ بوبے کو مارنے آئے ہیں تاکہ پیر نور شریف کو سچا ثابت کر پائیں۔''

ماسی یوں خاموش تھی جیسے کسی نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی ہو۔

''ہائے ماں...'' گلنازی نے روہانسی ہو کر کہا،''بوبا... بچ تو جائے گا؟''

''اگر تم لوگ میری، بھائی اور گداؤ کی مدد کرو تو ہم بوبے اور رقیہ کو کچھ نہیں ہونے دیں گے،'' میں نے کہا اور پھر بوبے کو بچانے کے لیے پہلے ہی سے بنائی ہوئی منصوبہ بندی گلنازی اور ماسی جیراں کو بتادی۔''میرے ساتھ بھائی ہیں، میر صاحب ہیں، گداؤ ہے اور اب تو رقیہ بھی ہمارے ساتھ ہے، لیکن وہ چھت پر صرف اس شرط پر سونے کے لیے تیار ہے اگر آپ دونوں اس کے ساتھ ہوں۔ میں نے بہت احتیاط سے یہ بات بھابھی اور بہنوں سے چھپا کر رقیہ سے کہی ہے... ہمیں آپ کی مدد چاہیے... کل رات بہت خطرے کی رات ہے۔''

ماسی نے پلنگ پر پہلو بدلا، گلنازی کی سمت دیکھا، پھر میری طرف دیکھا۔

''نہ پتر...'' ماسی جیراں نے کہا۔''میں نہیں پڑتی اس بکھیڑے میں... بالکل نہیں... ملنگ تو آتے ہی رہتے ہیں... نہ پتر، تو جا... میں اس معاملے میں نہیں پڑوں گی۔''

ماسی کے اس جملے سے مجھ پر مایوسی سی اتری، لیکن میں نے خود کو سنبھالا۔ گلنازی کی طرف مدد کی امید سے دیکھا۔ وہ نیچے فرش کی سمت دیکھ رہی تھی۔

''بوبا تمھارا ابھی تو کچھ لگتا ہے ماسی!'' میں نے کہا۔''ذرا سوچ، وہ پیر جو بچوں کے سروں پر رکھیں رکھواتا ہے، کیا وہ برداشت کرے گا کہ پانچ سال پورے ہو جائیں اور بوبا رکھ کے بغیر بھی زندہ رہے؟ ماسی، ملنگ برے ارادے ہی سے آئے ہیں... کالی بلا اول تو کوئی شے ہے ہی نہیں، صرف خوف ہے... وہ بوبے کو مارے نہ مارے، پیر ضرور مروا دے گا۔''

ماسی جیراں کے چہرے پر خوف ابھرا۔''نہ بیبا...'' ماسی نے کہا،''میں کچھ نہیں کروں گی۔''

اس جملے کے باوجود ماسی کے چہرے پر وہ تشویش موجود تھی جو اپنوں کے لیے ہوا کرتی ہے۔ بظاہر وہ انکار کر رہی تھی، لیکن مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رقیہ اور بوبے کے لیے فکرمند ہے۔

''ماسی،'' میں نے فوراً کہا،''جب رقیہ مان گئی ہے کہ وہ آپ دونوں کے ساتھ چھت پر بوبے

کو لے کر سو جائے گی تو پھر تمھیں وہاں سونے میں خوف کیوں محسوس ہو رہا ہے؟''

گلنازی تھوڑا سا آگے جھکی۔

''تو نے ڈاکٹر جی (میر صاحب) کو یہ بات کیوں بتائی ہے؟'' پہلی بار گلنازی مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوئی۔ ''یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔'' اس کی خوبصورت آنکھوں میں شکایت سی تھی۔

''یہ بات صرف میر صاحب ہی کو معلوم ہے،'' میں نے آہستہ سے گلنازی کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انھوں نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو بھی یہ بات نہیں بتائی۔ گداؤ نے بھی یہ بات اپنے بیوی بچوں سے چھپائی ہے۔ میر صاحب نے اپنی بیگم اور بیٹیوں کے ذریعے بھابھی اور بہنوں کو اپنے گھر رات رہنے کے لیے بلا لیا ہے، لیکن بہت احتیاط سے، تاکہ کسی کو اصل وجہ معلوم نہ ہو۔''

ماسی نے پھر پلنگ پر پہلو بدلا۔

''نہ پتر... '' ماسی نے کہا، ''یہ ہم سے نہیں ہوگا... نہ میں جاؤں گی نہ گلنازی... مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا ماسی؟'' میں نے کہا، ''بدروحوں اور کالی بلا کا خوف صرف خوف ہے ماسی۔ نہ بدروحیں ہوتی ہیں نہ کوئی کالی بلا ہوتی ہے۔ یہ پیر کا کاروبار ہے۔ مجھے گداؤ نے بتایا ہے کہ جب رکھ کٹتی ہے تو بالوں کے وزن کے مطابق پیر کو ہدیے کے طور پر سونا یا چاندی دینی پڑتی ہے... یہ تو کاروبار ہے ماسی، خوف کا کاروبار... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر پیر خود بوبے کو مروانے کی کوشش نہ کرے تو اگلے دو مہینے بھی گزر جائیں گے — بوبے کو کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے اور علاقے میں اپنی دہشت اور کاروبار جمائے رکھنے کے لیے پیر کسی صورت بھی یہ برداشت نہیں کرے گا کہ رکھ کٹ جائے اور بچہ زندہ رہے۔ وہ بوبے کو مروانے کی کوشش کرے گا، بلکہ اس نے اسی کوشش میں ملنگ بھیجے ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ یہ خاموشی کمرے میں موجود گرمی کی طرح بوجھل تھی۔

''تو بھی حوالدار جی جیسا ہے!'' ماسی کا لہجہ بدل گیا۔ گلنازی کے چہرے کی گھبراہٹ کم محسوس ہوئی۔ ''وہ بھی پیروں فقیروں کو نہیں مانتے تھے۔ انھوں نے کبھی لام پر جاتے ہوئے بھی کوئی تعویذ گلے میں نہیں ڈالا تھا... کہا کرتے تھے...'' ماسی کے چہرے پر سوچ سی نظر آئی۔ ''کہا کرتے تھے کہ

موت برحق ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اس نے مرنا ہے۔ موت کا وقت بھی برحق ہے — ہر زندہ انسان کے لیے ضرور آتا ہے۔ جو رات قبر میں ہے، وہ باہر نہیں ہوگی۔ تو پھر موت سے ڈر کر گلے میں پیروں فقیروں کے پھندے کیوں ڈالوں... حوالدار جی بہت دلیر تھے پتر... پر ان کے بعد میں بہت ڈرتی ہوں — ہم غریب لوگ ہیں پتر، کمزور ہیں۔ مرشد ڈاہڈا (طاقتور) ہے۔ آج تک کسی میں ہمت نہیں ہوئی کہ مرشد کے خلاف ایک لفظ بھی بولے... تجھ میں ہمت ہے، مجھ میں نہیں ہے... مجھے ڈر لگتا ہے۔''

ماسی کی باتوں سے مجھے مایوسی نے جکڑ لیا۔ کمرے کے سب کونے تاریک سے نظر آئے، لالٹین کی لہراتی ہوئی روشنی بجھتی محسوس ہوئی۔ مجھے ذہن پر بوجھ سا محسوس ہوا، جس میں ناکامی کا اندیشہ بھی تھا، جو میرے خیال کو دبا رہا تھا۔ پھر ایک خیال کے آنے پر میں نے گلنازی کی سمت دیکھا۔

''کیا تجھے بھی ڈر لگتا ہے؟'' میں پہلی بار گلنازی سے براہِ راست مخاطب ہوا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، ماسی جیراں نے میری طرف دیکھا۔

''گلنازی نہیں جائے گی...'' ماسی کے لہجے میں پھر سختی سی آ گئی۔ ''نہ ہی میں جاؤں گی... ہمیں معاف کر، ہم اس مصیبت میں نہیں پڑیں گی۔ تو مصیبت لے کر آیا ہے، اب تو ہی نبڑ (نمٹ)... رقیہ میری چھوٹی بہن ہے... بوبا مجھے بھی پیارا ہے... رکھ کاٹ کر ظلم تو نے کیا ہے... کیا ضرورت تھی رکھ کاٹنے کی؟ اب اگر تیری باتوں کو میں مان بھی لوں، تو بھی اب بوبے کو بچانا تیری ذمے داری ہے... اگر بوبے کو کچھ ہو گیا تو تیرا بچنا بھی مشکل ہوگا، ہمارے رشتے دار تجھے بھی مار دیں گے۔''

ماسی کے اس جملے پر گلنازی کے چہرے پر خوف سا نمودار ہوا۔

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے ماسی،'' میں نے کہا۔ ''مرنا تو ایک دن ہے ہی... مجھے تو بوبے کی فکر ہے۔ میں اس کی جان بچانا چاہتا ہوں اور اسی لیے مدد مانگنے آیا ہوں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ماسی، کہ اگر پیر کے ملنگ بوبے کو نہ مار سکے تو بوبا اگلے دو مہینے بھی گزار لے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں لمحے بھر کے لیے رکا۔ میں ماسی کے خوف کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ماسی...'' میں نے دھیمے سے کہا، ''پیر یہی کہتا ہے کہ ہر لڑکے کی پیدائش پر بدروحیں اور کالی بلا اس پر چکر لگاتی

ہے۔۔۔ ماسی، میں لڑکی نہیں ہوں — ''میرے اس جملے پر گلنازی کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے اپنے خوبصورت انداز میں میری سمت کنکھیوں سے دیکھا۔ ''میں لڑکا ہوں ماسی۔ اگر پیر کی بات سچی ہے تو پیدائش کے وقت مجھ پر بھی بدروحوں اور کالی بلا نے چکر لگایا ہوگا۔ پیر کہتا ہے کہ پانچواں سال کالی بلا کا ہوتا ہے، تو مجھے پانچ سال کی عمر سے پہلے مر جانا چاہیے تھا، کیونکہ میری تو کوئی رکھ نہیں تھی۔ نہ ہی میرے گلے میں کوئی تعویذ تھا، نہ کلائی پر کالا دھاگا بندھا ہوا تھا، نہ بازو پر کوئی نقش بندھا ہوا تھا — میں تو ماسی، انگلی میں انگوٹھی بھی نہیں پہنتا۔۔۔ ''ماسی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ میری نگاہ گلنازی کی سمت گئی۔ مسکراہٹ اب اس کی آنکھوں میں بھی چمک رہی تھی۔ ''میرے جسم پر۔۔۔ ''میں نے بات جاری رکھی، ''پیروں فقیروں کی، حفاظت والی کوئی چیز نہیں ہے — کوئی بدروح، کوئی کالی بلا، مجھے کیوں نہیں مار سکی؟'' ماسی کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ سے میرا حوصلہ بڑھا۔ ''میں تو اچھا بھلا ہوں، زندہ ہوں۔ اگر بیمار نہ ہوا اور مجھے کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو زندہ ہی رہوں گا۔ بیماری یا حادثہ نہ تو بدروحوں کا کام ہوتا ہے، نہ کالی بلا کا۔ ان چیزوں کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ تو بس خوف کی صورتیں ہیں — مچھر کاٹیں گے تو ملیریا کا بخار ضرور ہوگا، سڑک پر بس الٹ جائے گی تو زخمی ہو کر میں مر بھی سکتا ہوں۔۔۔ ان سب باتوں میں بدروحیں کہاں سے آجاتی ہیں؟ کالی بلا کا ان سے کیا تعلق ہے؟ بدروحوں اور کالی بلا کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ صرف پیر کا دلایا ہوا خوف ہے، ماسی۔ ایسا خوف جس سے بچانے کی وہ قیمت وصول کرتا ہے۔ پہلے خود خوف دلاتا ہے، سیدھے سادے مردوں اور بھولی بھالی عورتوں کو خود خوف میں مبتلا کرتا ہے اور پھر اسی خوف سے بچانے کی قیمت سونے یا چاندی کی صورت میں وصول کرتا ہے۔۔۔ یہ دکانداری ہے ماسی۔۔۔ دکانداری۔۔۔ اب اس نے گداؤ سے کہا ہے کہ بدروحیں میرے سر میں بچے دیں گی اور کالی بلا کا بچہ میری ریڑھ کی ہڈی سے سانپ کی طرح لپٹ کر میرا حرام مغز چوسے گا — یہ کیا بکواس ہے!''

گلنازی نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔ ماسی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔

''اور پیر کالی بلا کے بچے کو مارنے کے لیے مجھے پانی میں گھول کر پینے کے لیے تعویذ دینا چاہتا ہے — وہ تعویذ مفت میں تو نہیں دے گا۔ جو لوگ اس کے جھانسے میں آجاتے ہوں گے، ان سے وہ سینکڑوں ہزاروں روپے ہدیے کے طور پر لیتا ہوگا۔ اسے صرف لوٹنے سے غرض ہے اور اپنی دھاک

بٹھائے رکھنے کے لیے، اپنی بدروحوں اور کالی بلا کا خوف قائم رکھنے کے لیے، اپنے کاروبار جمائے رکھنے کے لیے، وہ بچے کی جان لینے سے بھی نہیں ٹلے گا۔ اسی لیے تو اس نے گاؤں میں ملنگ بھیجے ہیں۔'' گلنازی نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں روشنی سی لہرائی ہے۔

''ماں،'' گلنازی نے کہا،'' خطرہ تو ہے — ورنہ گداؤ کے میگھا پتن جانے کے فوراً بعد ملنگ کیوں آتے... کوئی بات ہے ضرور، ماں... کوئی خطرہ ہے، ماں۔''

خاموشی سی چھاگئی۔ ماسی کے چہرے پر پھر سے خوف نمودار ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں جس عورت کی مدد لینے آیا ہوں، وہی عورت ہے جو صدیوں سے ہوس کارقوتوں کے بنائے ہوئے خوف اور خودغرضی کے جال میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کا ذہن، ہوس کے گھناؤنے پنجوں میں کسی چڑیا کی طرح پھنسا ہوا، پھڑ پھڑانے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔ اس کا شعور تاریکی میں اُس کے اپنے وجود سے بھی آشنائی کے لیے بصارت سے محروم ہے... بصیرت کہاں سے آئے گی! خوف، خودغرضی... عقیدت، وہ بھی اندھی، ہوس کے جال میں مضبوط تانے بانے، لمحہ لمحہ کستے ہوئے سیاہ دھاگے... پیچیدگی، الجھاؤ... جس کا سلجھنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ہے۔

''یہ عورت...'' میں نے سوچا،'' یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے، جس کے تاریک ذہن میں مجھے روشنی کی تلاش ہے، یہ تو شاید روشنی کی اس ایک کرن سے بھی محروم ہے جس سے کسی بھی انسان کے لیے اس کی اپنی پہچان کا روشن ہوجانا ممکن ہے۔''

خاموشی ایک منٹ سے بھی کم تھی۔ ماسی نے پھر چارپائی پر پہلو بدلا، اس نے گلنازی کی طرف دیکھا۔

''نہیں گلنازی...'' اس نے کہا،'' میں کچھ نہیں کروں گی۔ خطرہ ہو یا نہ ہو، مجھے اس جھگڑے میں نہیں پڑنا۔ چین سے جی رہی ہوں، کسی مصیبت کا سامنا کرنا میرے لیے مشکل ہے — میں نہیں جاؤں گی...'' ماسی نے پہلو بدل کر اب میری طرف دیکھا۔'' تو جا... تجھے اس طرح رات کے اندھیرے میں نہیں آنا چاہیے تھا... جو ہو سو ہو، میں تجھ سے اتنا وعدہ ضرور کرتی ہوں کہ یہ بات میں کسی سے نہیں کہوں گی اور نہ ہی گلنازی کبھی کسی کو یہ بات بتائے گی... تو اب جا۔''

میں موڑھے سے اٹھتے ہوئے پھر بیٹھ گیا۔

''ماسی،'' میں نے کہا،'' میں آج تک جیٹھ اساڑھ کی تپتی دوپہر میں کسی گاؤں کی کسی گلی میں ننگے پیر نہیں دوڑا... ''میں نے انگلی کو ٹیڑھا کرتے ہوئے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ چند قطرے نیچے مٹی سے لپے ہوئے فرش پر گرے۔ ''لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر جلتی زمین پر کوئی بچہ ننگے پیر پھر رہا ہو، بار بار اپنے پنجوں پہ کھڑا ہو کر پاؤں کو جلنے سے بچا رہا ہو تو کوئی نہ کوئی مرد، عورت، لڑکا، لڑکی، یہاں تک کہ ہیجڑا بھی اسے اٹھا ضرور لے گا۔''

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' ماسی نے کہا۔

''یہاں بوبے کے پاؤں جلنے کا نہیں، اس کی چلتی سانسوں کا سوال ہے،'' میں نے کہا۔ ''تمھارے لیے پیر نور شریف بہت طاقتور ہوگا، میرے لیے نہیں... میں پیر کے ظلم اور مکاری سے دہکتے انگاروں پر بوبے کو پاؤں نہیں رکھنے دوں گا۔ میں بوبے کی سانسیں نہیں رکنے دوں گا، چاہے اس کے لیے میری اپنی سانسیں کیوں نہ رک جائیں۔ میں اس کا سگا نہیں ہوں، نہ سہی، یہ تو جانتا ہوں کہ اس کی زندگی کو سخت خطرہ لاحق ہے۔ ٹھیک ہے، تم مدد کے لیے نہ جانا— لیکن یہ سچ ہے کہ پیر نے ملنگ بوبے ہی کو مارنے کے لیے بھیجے ہیں۔ میں بوبے کو بچاؤں گا۔ چاہے میری جان کیوں نہ چلی جائے، میں بوبے کو نہیں مرنے دوں گا... میں ڈرپوک نہیں ہوں ماسی... تمھاری مدد لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں آ گیا... اس کے لیے معافی مانگتا ہوں۔''

میں آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں نے اتنی رات گئے تمھیں جگایا، پریشان کیا— معاف کر دے ماسی۔''

میں دروازے کی سمت مڑا۔

''تو کیا کرنا چاہتا ہے؟'' گلنازی نے پوچھا۔ ماسی نے سر گھما کر اس کی سمت دیکھا۔ ماسی کے ساتھ میرا سر بھی گلنازی کی سمت گھوما۔

''بتا تو چکا ہوں،'' میں نے بہت آہستہ سے لہجے میں کہا۔ ''ایک تو یہ کہ رقیہ اکیلی کسی صورت میں چھت پر نہیں سوئے گی۔ نیچے اس کی اور بوبے کی جان کو خطرہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ملنگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کا اطمینان ہونے پر کہ چھت پر پانچ افراد سوئے ہوئے ہیں اور ماں بچہ صحن میں ہیں، اپنا کوئی گھناؤنا طریقہ اختیار کریں گے۔ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے کھیتوں میں چھپ

کر تسلی کریں گے کہ چھت پر پانچ چار پائیوں پر پانچ افراد ہی سوئیں گے۔ میں ملنگوں کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے گھر کی بیرونی دیوار سے چھت صاف نظر آتی ہے۔کل اگرچہ بہت گھرے اندھیرے والی رات ہوگی، پھر بھی ملنگ تسلی کیے بغیر حملہ نہیں کریں گے۔ اگر آپ دونوں وہاں چھت پر رقیہ اور بوبے کے ساتھ ہوں گی تو میں اور گداؤ ملنگوں سے نمٹ لیں گے۔''

ماسی سر اٹھا کر میری طرف دیکھ رہی تھی، بے چین سی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پھر بیٹھنے کے لیے کہا۔

''بیٹھ، میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں ...'' ماسی نے کہا۔'' تو مجھے اور گلنازی کو کیوں لے جانا چاہتا ہے؟ ملنگوں کو دھوکا تو تُو ویسے بھی دے سکتا ہے۔ پانچ لوگ تو تم ہو ہی۔ ایک بہن کو ڈاکٹر جی کے گھر بھیج دے، اس کی چار پائی پر رقیہ اور بوبا سو جائیں گے۔ ہماری کیا ضرورت ہے؟ ہمیں کیوں لے جانا چاہتا ہے؟''

میں دوبارہ موڑھے پر بیٹھ گیا۔ گلنازی سیدھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی، جیسے اسے بھی اس سوال کا جواب چاہیے تھا۔

''میں اپنی بہنوں اور بھابھی کو اچھی طرح جانتا ہوں ماسی،'' میں نے کہا۔'' اب تو گلنازی بھی جانتی ہوگی۔'' میرے ہونٹوں پر اپنا نام پا کر گلنازی کی آنکھیں چمکیں۔'' بھابھی پوٹھوہار کی رہنے والی ہیں، لیکن اس قدر کمزور دل کی ہیں کہ اندھیرے میں چوہے سے بھی ڈر جاتی ہیں۔''

گلنازی کا دھیما سا قہقہہ سنائی دیا۔ ماسی کے چہرے پر پھر مسکراہٹ پھیلی، میرا حوصلہ پھر بڑھا۔

''میں کیا بتاؤں ماسی!'' میں نے کہا۔'' بڑی بہن اس قدر ڈرپوک ہے کہ کوئی خوفناک آواز بھی سن لے تو فوراً سپارہ کھول کر تلاوت کرنے لگتی ہے۔ میری اور گداؤ کی تیاری دیکھ کر وہ ساری رات جاگتی رہے گی اور خطرے کے وقت شور مچا دے گی ... چاہے کتنا ہی منع کیوں نہ کیا ہو، وہ شور مچا دے گی۔''

''نکی بی بی جی ...'' گلنازی نے عصمت بہن کی سمت اشارہ کیا،'' وہ تو ڈرپوک نہیں لگتیں۔''

''ہاں،'' میں نے کہا،'' لیکن وہ بہت جلد گھبرا سی جاتی ہے۔ مجھے بہت دلیر اور مضبوط ساتھی چاہییں۔''

''تو نے یہ کیسے جان لیا کہ ہم ...'' ماسی نے کہا،'' ہم مضبوط دل والیاں ہیں؟''

''تو نے خود ہی تو بتایا تھا کہ جب گلنازی چار سال کی تھی تو اکیلی گلنازی کو لے کر سری نگر سے جھاوریاں آ گئی تھی۔ یہ کسی ڈرپوک عورت کا کام نہیں ہے۔ اور گلنازی بھی تو تیری ہی بیٹی ہے۔'' میرے اس جملے پر ماسی کے چہرے پر خوشی سی نمودار ہوئی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم ماں بیٹی بہت مضبوط دل والیاں ہو۔ تم نہ ڈرو گی، نہ گھبراؤ گی، نہ شور مچاؤ گی۔ ملنگ اگر سیڑھیوں کی سمت آیا تو بھابھی اور بہنیں تو اس قدر شور مچائیں گی کہ سارا گاؤں جاگ اٹھے گا۔''

ماسی کے چہرے کا تاثر پھر بدل سا گیا۔

''میں تو کہتی ہوں،'' ماسی نے کہا، ''اگر ایسی بات ہے تو پورے جھاوریاں کو پتا چلنی چاہیے۔''

''نہیں ماسی،'' میں نے کہا، ''یہ بات تو تُو بھی جانتی ہے کہ یہاں ہر دوسرے گھر میں پیر نور شریف کے مرید موجود ہیں۔ ایک ہنگامہ ہو جائے گا۔ وہ ہماری کوئی بات نہیں سنیں گے۔ ملنگوں کا کیا ہے، وہ تو زور زور سے کہیں گے کہ وہ بوبے کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ اس ہنگامے میں نہ بوبا محفوظ رہے گا، نہ رقیہ، نہ میں، نہ بھائی، نہ بھابھی، نہ بہنیں، نہ گداؤ بچے گا — سب ختم ہو جائیں گے۔''

مجھے تو اب بھی اس بات پر یقین نہیں ہو رہا،'' ماسی نے کہا، ''ملنگ ... کیا واقعی بوبے کو مارنے آئے ہیں؟''

''کل رات تجھے یقین ہو جائے گا ماسی،'' میں نے اعتماد سے کہا۔

''اگر وہ نہ آئے تو؟'' ماسی نے کہا۔

''تو جیسے میں بتا ہی چکا ہوں، میر صاحب اور بھائی مجھے پاگل مشہور کر دیں گے۔ گداؤ بھی پیر کے ڈیرے پر یہی کہہ کر آیا ہے،'' میں نے کہا۔ ''ملنگ نہ آئے تو ماسی ... تو ماسی ... تُو بچی مچی مجھے پاگل ہی سمجھ لینا۔''

گلنازی کا دھیما سا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مسکراتی چمکتی آنکھوں میں کچھ اور بھی تھا، جسے شاید میں کبھی بیان نہ کر پاؤں گا۔ گلنازی کے پورے بدن پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ مجھے اس کے جسم پر دھیمی دھیمی روشنی نظر آئی۔ لالٹین کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر لہرا رہی تھی، لیکن ہر شعاع مجھے اس قدر روشن محسوس ہوئی کہ مجھے گلنازی کا چہرہ روشنی کے ہالے میں نظر آیا، پھر یہ روشنی مجھے اپنے بدن پر بھی پھیلتی محسوس ہوئی۔ گلنازی کے بائیں رخسار پر روشنی مدھم تھی۔ اس

کے بالوں میں مدھم سی کرنیں بالوں ہی کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ گلنازی کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا، مجھے اپنے چہرے پر تپش کا احساس ہوا، جس کے بعد اکثر میرا چہرہ سرخ سا ہو جایا کرتا ہے۔۔۔ مجھے کچھ دیر کے لیے بھول سا گیا کہ میں کہاں ہوں۔۔۔

''میں چلوں گی۔'' گلنازی کی خوبصورت آواز پر، میرا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ وہ روشنی جو گلنازی کے وجود پر تھی، مدھم سی ہوگئی۔ فیصلے کی تپش، جو فیصلے سے پہلے میرے چہرے کے آئینے میں منعکس ہوئی تھی، کم سی ہوگئی۔ گلنازی کے بالوں سے بائیں جانب ایک زلف گری اور رخسار پر پھیل کر ہونٹوں تک پہنچ گئی۔ ''بوبے کی جان بچانے کی خاطر میری جان بھی چلی جائے تو مجھے پروا نہیں۔۔۔ میں جاؤں گی رقیہ ماسی اور بوبے کے پاس۔''

گلنازی نے مسکراتی، چمکتی آنکھوں سے میری طرف پھر اس انداز سے دیکھا کہ دوسرے ہی لمحے میری نگاہیں نیچی ہوگئیں۔

''یہ تو کیا کہہ رہی ہے گلنازی؟'' ماسی جیراں کی آواز پر میں چونکا۔

''جاؤں گی ماں، تو بھی جائے گی۔'' گلنازی نے ماسی کی طرف دیکھا۔ ''میں ڈرپوک نہیں ہوں، اور یہاں تو بوبے کی زندگی کا سوال ہے۔ بوبا مجھے بہت پیارا لگتا ہے، ماں — میں جاؤں گی۔''

''پر گلنازی۔۔۔'' ماسی نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے گلنازی کی سمت پہلو بدلا۔ ''دِھیے، ہم کیسے جا سکتی ہیں؟ رات کے وقت، ڈاکٹر کے گھر۔۔۔ کسی نے دیکھ لیا تو جھاوریاں میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔۔۔ ایک عزت ہی تو ہے میرے پاس۔ نہ دِھیے، اتنی بدنامی ہوگی کہ جینا مشکل ہو جائے گا۔۔۔ نہ۔۔۔ ایک عزت ہی تو ہے — یہ بھی گئی تو کیا رہ جائے گا جینے کے لیے۔۔۔''

گلنازی نے ماسی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ماں،'' گلنازی نے آہستہ سے کہا، ''وہاں رقیہ ماسی بھی تو ہے۔۔۔ ڈر کس بات کا؟ سب جانتے ہیں کہ رقیہ ماسی اور بوبا ڈاکٹر صاب کے گھر میں رہتے ہیں، بی بی جی کے پاس۔۔۔ ہم رقیہ ماسی اور بوبے کے پاس ہی تو جائیں گی۔''

''ماسی،'' میں نے کہا۔ ''کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں خود بھی یہ کبھی نہ چاہتا کہ تو اور گلنازی رات کے اندھیرے میں ہمارے گھر آؤ۔۔۔ لیکن یہاں بوبے کی زندگی کا سوال ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں، ماں،'' گلنازی نے کہا، پھر اپنی خوبصورت آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ''ہمیں یہ بات چھپانی بھی ہے ماسی،'' میں نے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ ہم اگلے دو مہینے بوبے کو کہیں چھپا بھی سکتے ہیں... کمرے میں رکھ سکتے ہیں، رات کو چھت پر سلا سکتے ہیں... لیکن خطرہ تو موجود رہے گا۔ پیر کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا، جو زیادہ خطرناک ہوگا۔ رقیہ کو کون سنبھالے گا؟ ہاں اگر کل رات، ہم اس کے ملنگوں کو ناکام بنا دیں تو پھر پیر بھی بے بس ہو جائے گا... پھر وہ خود ہی اس معاملے کو دبانے کی کوشش کرے گا اور خاموش رہنے ہی میں اپنی بھلائی جانے گا۔''

ماسی نے میری جانب، میری آنکھوں میں دیکھا۔

''پتر،'' اس نے کہا، ''لوگوں کی زبانیں روکنا آسان نہیں ہوتا۔ میں تو گلنازی کو بازار کی طرف بھی نہیں جانے دیتی۔ تُو ابھی بہت چھوٹا ہے، ان باتوں کو نہیں سمجھ سکے گا۔''

''ماں،'' گلنازی نے کہا، ''کل رات بہت اندھیرا ہوگا۔ جب سب لوگ سو جائیں گے، میں اندر سے کنڈی لگا کر...'' گلنازی کا ہاتھ باہر کی سمت اٹھا ہوا تھا— بہت خوبصورت، نازک سا ہاتھ، لمبی لمبی انگلیوں والا... ماسی شاید گھر کا کوئی کام اس سے نہیں کراتی ہوگی، ورنہ برتن دھونے سے ہاتھ نازک نہیں رہتے۔ ''میں دیوار سے تنور کی طرف اتر جاؤں گی، ہم تو کسی کو نظر بھی نہیں آئیں گی۔''

ماسی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ''تو چھوٹی سی بچی ہی رہے گی گلنازی،'' ماسی نے کہا۔ ''کل صبح جب ہم واپس آ رہی ہوں گی، ککڑ (مرغ) کے بولنے پر، اگر کسی مرد، کسی عورت نے ہمیں دیکھ لیا تو...''

''ماں،'' گلنازی نے کہا، ''ہم سڑک سے کیوں آئیں گی؟ بی بی جی کے گھر کے ساتھ ہی تو کھیت ہیں۔ ہم کھیتوں میں چلی جائیں گی... وہاں سے کھیتوں ہی سے ہو کر، اپنے گھر کے سامنے، وہاں...'' گلنازی نے باہر کی طرف اشارہ کیا، ''وہاں آ جائیں گی اور پھر گھر... میں دیوار پر چڑھ کر اندر سے کنڈی کھول دوں گی۔''

میں نے بھی حیرت سے، ماسی ہی کی طرح گلنازی کی سمت دیکھا۔

''نی گلنازی...'' ماسی نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثر والی آواز میں کہا، ''نی تُو تو بہت سیانی ہو گئی ہے۔''

گلنازی کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکی۔

''میں کل... ''میں نے کہا،''کل رات صحن کا دروازہ کھلا رکھوں گا۔ آپ آ جائیں گی تو اندر سے دروازے پر تالا لگا دوں گا... ٹائیگر ہسپتال میں ہوگا... باقی جو ہوگا، میں اور گداؤ دیکھ لیں گے۔ یہ بات تو پکی ہے کہ کل کی رات خطرناک ہے۔''

''ٹھیک ہے،''ماسی نے کہا۔''رقیہ سے کہہ دینا، نہ گھبرائے۔ ہم کل آ جائیں گی۔''

''اچھا ماسی،''میں نے کہا۔ میرے ساتھ ماسی اور گلنازی بھی صحن میں آ گئیں۔ صحن میں آتے ہی کمرے کی شدید گرمی کا احساس ہوا، جس میں ہم نے کم از کم تیس منٹ گزارے تھے۔ میں نے لالٹین کی بہت دھیمی روشنی میں گلنازی کی طرف دیکھا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا اور شاید اس نے بھی میری آنکھوں میں شکرگذاری کے تاثر کو محسوس کر لیا تھا، اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو دوپٹے کے پلو سے پونچھا۔ میرا سارا بدن پسینے سے اس طرح بھیگا ہوا تھا جیسے میں نے نہا کر تولیے سے جسم پونچھے بغیر کپڑے پہن لیے ہوں۔ ماسی جیراں نے باہر کا دروازہ کھولا۔ باہر کے سارے مناظر پہلے تو تاریک نظر آئے، پھر ہسپتال کے صحن میں شیشم کا پیڑ، آسمان کے پس منظر میں، تاروں کے سامنے ایک ہیولا سا لگا۔ کھیتوں کی جانب سے حشرات الارض کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ میں دروازے سے باہر نکلا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک بار پھر تاریکی کے پھڑ پھڑاتے پردوں میں گھر سا گیا ہوں، ملفوف سا ہو رہا ہوں۔ بہت اندھیرا تھا...

میں تاریک سڑک پر بھائی کے گھر کی طرف آہستہ آہستہ قدموں سے جا رہا تھا۔ کامیابی کا احساس بہت خوشگوار تھا — اتنا دشوار کام، اور اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ میں خوشی کا احساس، ذہن میں ایک بہت روشن کیفیت میں بدلتا محسوس کر رہا تھا۔ فطرت کی وہ کیفیت جو لطیف ہے، حسن ہے، انصاف ہے، رحم ہے، ہمدردی ہے، سکون ہے، میرے ساتھ ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک جو کچھ بھی میں نے کیا ہے، مجھے جتنی بھی کامیابی ملی ہے، اس میں فطرتِ لطیف کی قوتِ خیر کا عمل دخل ہے۔ یہی قوت ہر مشکل میں میری مدد کرتی ہے — یہ قوت جس کے پاس خوف نہیں ہے، جس کے پاس خود غرضی نہیں ہے، جو اس دنیا میں رہنے والے ہر انسان کو، وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، ادھیڑ

عمر کی شخصیت ہو یا لڑکپن کی، یا وہ بچہ ہو، سب کو آزادی سے آشنا کرنا چاہتی ہے اور اس سلسلے میں کی گئی ہر کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے کوشاں انسان کی مدد بھی کرتی ہے، جس نے آج بے حد خوبصورت اور نازک سی دیہاتی لڑکی کے دل میں بے مثال حوصلہ پیدا کیا ہے، جس نے آج گلنازی کی زبان بن کر میری مشکل کو ختم کر دیا ہے... مجھے کامیابی دی ہے... سڑک پر بے حد تاریکی تھی۔ میں بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔

''کل اماوس ہے،'' میں نے سوچا۔ ''کل اس سے بھی زیادہ تاریکی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا... میں بو بے کو ہر حال میں ظلم کے خونیں پنجے سے بچا لوں گا۔''

غصے سے بھری ''خر ررکھا آ آخر ررر'' کے ساتھ، بائیں جانب کوئی جانور تیزی سے بھاگا اور میدان کی سمت چلا گیا — یقیناً کوئی بلا یا بلی ہوگی۔ میں میدان کے قریب تھا، اندازے سے گھر کی جانب گلی میں مڑا۔ میدان میں بشیر نعل بند کی چارپائی نگاہوں سے اوجھل تھی۔

24

رات بہت بے چین تھی۔

میں بستر پر لیٹا تو بے سکونی کا احساس پورے بدن پر چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ چھت پر قریب قریب پڑی چارپائیاں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ بھائی، بھابھی اور بہنیں کچھ دیر، ہر رات کی طرح، باتیں کرتے رہے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میرے ذہن میں دن بھر کے واقعات گردش کر رہے تھے۔ پھر یہ گردش تنور پر تھم گئی۔ گلنازی کی دو چمکتی ہوئی آنکھیں تصور میں مسکرا رہی تھیں۔ آسمان پر تاروں کے جھرمٹ میں ہر ستارہ پلکیں جھپکتا محسوس ہوا۔ پھر مجھے تصور میں بھی جھٹکا سا محسوس ہوا۔ مجھے گلنازی کی سہیلی نوراں کی آنکھیں نظر آئیں جو پلکیں جھپکائے بغیر مسلسل مجھے دیکھ رہی تھیں — پھر دوسرے سے بھری ہوئی آنکھیں دور سے مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی نظر آئیں۔

''یہ لڑکیاں...'' میں نے بے چینی سے سوچا، ''کیا ہے... یہ لڑکیاں مجھے گھورتی کیوں رہتی ہیں؟ کھوڑ میں، بلکسر میں اور چکوال میں بھی لڑکیاں مجھے گھورتی رہتی ہیں... کیوں؟''

مجھے کھوڑ گاؤں کے پاس کنواں یاد آیا، جس کے قریب سے میں جب بھی گزرتا تھا، پانی بھرتی

لڑکیاں اپنے اپنے گھڑے کنویں کے گرد اینٹوں کے چبوترے پر رکھ دیا کرتی تھیں۔ ہر لڑکی میری طرف دیکھ رہی ہوتی تھی۔ میرا چہرہ تپنے لگتا تھا۔ بلکہ میں تو گاؤں کے اکلوتے کنویں پر مجھے دیکھ کر ایک لڑکی کے ہاتھ سے ڈول والی رسی چھوٹ گئی تھی۔ تمام لڑکیوں نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ چکوال میں کوٹ سرفراز خان کے سکول سے چھٹی کے وقت اگر اتفاق سے میں ڈھلوان نما سڑک پر لڑکیوں کے سامنے آ جاتا تھا تو چکوال شہر کی، گورے رنگ اور لمبوترے چہروں والی لڑکیاں مسلسل میری سمت دیکھتی جاتی تھیں۔ کئی ایک تو اپنے دوپٹوں کے پلو کھینچنا شروع کر دیتی تھیں۔

''کیا میں گلنازی کی طرح بہت خوبصورت ہوں؟'' میری سوچ سے پھر مجھے اپنے چہرے پر تپش کا احساس ہوا۔ ''لیکن مجھ میں کسی لڑکی کی سمت متوجہ ہونے کی خواہش کیوں نہیں ہے؟ ... گلنازی شاید پہلی لڑکی ہے جسے میں بار بار دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن میرے دل میں ابھی تک وہ جذبہ کیوں نمودار نہیں ہوا جس کا اظہار سکول میں اکثر میرے دوست کیا کرتے ہیں، جب وہ اپنی اپنی چاہتوں کے قصے، ایک دوسرے کو سناتے ہیں کہ انھیں کس طرح لڑکیوں سے پیار ہوا اور وہ ان کی چاہت میں کیسے دن رات تڑپتے ہیں... ایک لڑکے نے تو یہ بھی کہا تھا کہ یا تو وہ اپنی محبوبہ کو حاصل کرے گا یا جان دے دے گا... ہو گی کوئی گوری لمبوترے چہرے والی!

''یہ جذبہ مجھ میں کیوں نہیں ہے؟'' کھیتوں کی جانب سے آنے والے ہوا کے جھونکوں میں نباتات کی مہک تھی۔ ''میرے وجود میں محبت کا یہ جذبہ موجود تو ضرور ہو گا، لیکن اس کی نوعیت عجیب سی کیوں ہے؟ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میں ایک لڑکا ہوں، میں اس حقیقت کو جسمانی طور پر محسوس بھی کرتا ہوں، لیکن میرے دل میں کسی لڑکی کو چاہنے کے بجائے چاہے جانے کا جذبہ کیوں موجود ہے؟ یہ جذبہ خواہش کا روپ کیوں دھار لیتا ہے۔ میں کسی لڑکی کو اس کے سامنے کسی لڑکے کی طرح کیوں نہیں دیکھ پاتا؟ میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے کہ وہ مجھے دیکھے، میرے پاس آئے، مجھ سے باتیں کرے؟ مجھے ایسا ہونا ہی کیوں اچھا لگتا ہے؟ یہ جذبہ تو سنا ہے، لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ یہی میرے دوست مجھے بتایا کرتے ہیں — چاہے جانے کی خواہش لڑکیوں کی ہوتی ہے، لڑکوں کی نہیں... یہ خواہش مجھ میں کیوں ہے؟ کیا میرے وجود میں... ایک لڑکی کی جگہ بھی موجود ہے؟ کیا فطرت نے اس زمین پر آباد اس دنیا میں، میرے وجود کے ساتھ، عاشقی کے بجائے محبوبیت وابستہ کر دی ہے؟''

اپنے ان خیالوں سے میں چونک سا گیا۔ دھیان بُو بے کی سمت گیا... رقیہ شدید گرمی میں بھی اس کے ساتھ برآمدے میں چقیں لٹکائے سو رہی تھی۔ میں نے بھائی، بھابی اور بہنوں کے چھت پر آ جانے کے بعد، پانی پینے کے بہانے نیچے جا کر رقیہ کو آہستہ سے بتا دیا کہ کل رات ماسی اور گلنازی چھت پر اس کے ساتھ سونے کے لیے آ جائیں گی۔ رقیہ نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ خوفزدہ تھی۔

''جو بھی ہو،'' میں نے سوچا،'' کل فیصلہ تو ہو ہی جائے گا — یا تو میں پیر نور شریف کو بے نقاب کر دوں گا یا مجھے پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے کے بعد، خود کو پاگل ثابت کرتے ہوئے جھاوریاں سے جانا ہوگا۔''

بے چینی بڑھ گئی۔ میں بار بار بستر پر کروٹیں لے رہا تھا۔ پھر میں سیدھا لیٹ کر ستاروں کے جھرمٹ کی سمت دیکھنے لگا۔ لحہ لحہ تصورات ٹمٹماتے ستاروں کی طرح جھلکیاں دکھاتے رہے۔ جھاوریاں سے چلے جانے کا خیال مجھے اداس سا کر رہا تھا... گلنازی کو چھوڑ کر جانا... ''لیکن میں یہ کیا سوچ رہا ہوں؟... وہ ماسی جیراں کے بھتیجے محمد اکبر خان کی منگیتر ہے!'' میرے دل پر مایوسی سی اتری... پھر یوں محسوس ہوا میرے چہرے کے اوپر دھند سی چھا رہی ہے اور اسی دھند میں مجھے گلنازی کا بے حد خوبصورت چہرہ نظر آیا۔ مسکراتی چمکتی آنکھیں... مسکراہٹ اس کے چہرے پر چمک رہی تھی۔ میری پلکیں لمحے بھر کو بند ہوئیں، دوبارہ کھلیں تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ دور فضا کے جھرمٹ میں ستاروں کی روشنی جھلملا رہی تھی۔

''میں بار بار یہ کیوں بھول جاتا ہوں کہ گلنازی کی منگنی ہو چکی ہے، وہ کسی سے منسوب ہے؟''
اس خیال کے ساتھ ہی مایوسی کی سیاہ چادر تہیں بنا کر میرے دل میں اترنے لگی، پھر بوجھ سا بن گئی اور میرے وجود پر بے حسی کی طرح پھیل گئی۔ نیند اگرچہ اداسی میں ہوا کرتی ہے، لیکن یہ بے حسی عجیب سی کیفیت میں تبدیل ہو کر غنودگی کی طرح میرے جسم پر پھیل گئی۔

''شاید فطرت نے اسی لیے،'' میں نے خواب آلود ذہن سے سوچا،'' شاید اسی لیے فطرت نے میرے وجود میں لڑکی کے لیے جگہ چھوڑ رکھی ہے... کیا گلنازی اس خلا کو پورا کرے گی؟''
میں اگرچہ بہت دیر سے سویا تھا، لیکن صبح جب چھت پر سورج کی کرنوں نے اپنی تمازت کا

احساس دلایا تو میں نہ چاہنے پر بھی اٹھ بیٹھا۔ سب نیچے صحن میں جا چکے تھے۔ صحن میں گداؤ موجود تھا۔ گاؤں کے لوگ صبح بہت جلدی اٹھ جاتے ہیں، بازار بھی بہت جلد کھل جاتا ہے۔ بھابھی گداؤ کو بازار سے کچھ لانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ میں صحن میں اترا۔ گداؤ بیرونی دروازہ کھول کے چلا گیا۔ رقیہ اور بُوبے کو دیکھ کر مجھ پر صورت حال کی سنجیدگی اور اندیشے نے بوجھ سا ڈالا۔ میں ہینڈ پمپ کی سمت گیا۔ ٹائیگر نے ہمیشہ کی طرح اگلے پیر میرے پیٹ پر رکھ دیے، اس کی گچھے دار دُم دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ یہ چارچشما جرمن شیفرڈ اپنی محبت کا اظہار اتنی نمایاں کیفیت میں کرتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں۔ تقریباً نو بجے گداؤ واپس آیا۔ اس بار بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ سی تھی۔ گداؤ نے مجھے آہستہ سے بتایا کہ ملنگ شمالی جانب تانگے کے اڈے سے بازار میں داخل ہو چکے ہیں۔ وہ ایک ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو کر ہرمل دھونی دیتے ہیں اور دکانداروں سے باتیں بھی کر رہے ہیں۔

''صاب، وہ ہمارے گھر کا پتا لگائیں گے۔۔۔'' گداؤ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دیکھو گداؤ،'' میں نے کہا، ''تم گھبرائے ہوئے ہو۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاؤ، اس سے کسی کو بھی شک ہو سکتا ہے۔ دلیر بنو، ابھی تو تمھیں ملنگوں کا مقابلہ بھی کرنا ہے۔''

''صاب، ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔۔۔'' گداؤ نے قدرے بہتر لہجے میں کہا، ''ہمارے گھر کا پتا پوچھیں گے۔''

''کس بہانے سے گداؤ؟'' میں نے پوچھا۔ میں گداؤ کی گھبراہٹ کم کرنا چاہتا تھا۔

''بہانے تو بہت ہیں صاب،'' گداؤ نے کہا، ''وہاں میگھا پتن میں پیر نور شریف کا طویلہ ہے، گھوڑے گھوڑیاں ہیں، مویشی ہیں، بھیڑ بکریاں ہیں، مرغیاں ہیں، شکاری کتے ہیں — ہمارے گھر کا پتا پوچھنا ان کے لیے بہت آسان ہے صاب۔ ہسپتال کا پوچھ کر وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر کا پتا بھی تو پوچھ سکتے ہیں۔۔۔ پھر میں پیر کو یہ بھی تو بتا آیا ہوں کہ گھر کی باہر والی دیوار کے سامنے کھیت ہیں۔ وہ سارے گاؤں کا چکر تو لگائیں گے۔ پتا چلنا کون سا مشکل ہوگا۔'' گداؤ کے چہرے پر اب بھی گھبراہٹ موجود تھی، جو مجھے پریشان کرنے لگی تھی۔

''گداؤ۔۔۔ دیکھو۔۔۔'' میں نے کہا، ''اپنی گھبراہٹ کو خود محسوس کرو — یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم

جب پیر کے حجرے میں پیر کے سامنے نہیں گھبرائے تھے تو اب ان ملنگوں کو دیکھ کر کیوں گھبرا رہے ہو؟ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ان کی نیت خراب ہے اور ہمیں آج رات ان کا مقابلہ بھی کرنا ہے۔ وہ آج رات ضرور بُوبے کو مارنے کی کوشش کریں گے ... دیکھو تم ملنگوں کی خبر رکھو، لیکن ان کے سامنے بالکل نہ جانا۔''

''پتا ہے صاب،'' گداؤ نے کہا۔ ''میں یہ سوچ کے گھبرا رہا ہوں صاب کہ اگر ہم نے بچانے کا انتظام نہ کیا ہوتا تو ہمارا بُوبا ملنگوں کے ہاتھوں سے مارا جاتا ... اب تو مجھے بھی پورا یقین ہے کہ وہ بوبے ہی کو مارنے آئے ہیں ... آج رات چالیس گھنٹے پورے ہو جائیں گے۔''

''مجھے یقین ہے کہ آج رات ان میں سے ایک ہمارے صحن میں ضرور اترے گا،'' میں نے کہا۔

''میں اترنے کے بعد اسے اینٹیں اور پتھر ماروں گا کہ دیوار پر چڑھتے ہی نشانہ بازی شروع کر دوں گا؟'' گداؤ کے لہجے میں اعتماد سا ابھر آیا۔

''بہتر تو یہی ہو گا گداؤ کہ اسے صحن میں اترنے کے بعد زخمی کیا جائے — ہمیں اس کو پکڑنا ہے،'' میں نے کہا۔

''دوسرا تو باہر ہی ہو گا؛'' گداؤ نے کہا۔

''وہ بھی تمھارے نشانے پر ہو گا؛'' میں نے کہا۔ ''اندر آنے والا تو چھت سے میرے نشانے پر بھی ہو گا۔ اور ہاں — ہمیں یہ بھی خیال رکھنا ہو گا کہ وہ ہماری اینٹوں اور پتھروں سے مر ہی نہ جائے، ورنہ ایک اور مصیبت ہمارے سامنے کھڑی ہو جائے گی۔''

''آپ فکر نہ کریں صاب؛'' گداؤ نے کہا۔ ''میں ہتھ ہولا رکھوں گا ...'' (زیادہ زور سے نہیں ماروں گا) ''پر صاب جی؛'' گداؤ نے کہا، ''اگر وہ آج ہمارے گھر کا پتا لگا کر واپس میگھا پتن چلے گئے تو ...''

''ابھی تم نے خود ہی چالیس گھنٹوں کی بات کی تھی، گداؤ؛'' میں نے کہا۔ ''پیر نے چالیس گھنٹوں کے چلّے کی بات کی تھی۔ ملنگ اگر کامیاب ہو جائیں تو بات پورے علاقے میں پھیلے گی اور پیر یہی کہے گا کہ اس نے کالی بلا کو روکنے کے لیے چالیس گھنٹے کا چلہ کاٹا تھا، اور وہ تمھیں اس کا گواہ بھی بنائے گا، اور یہ بھی کہے گا کہ اس کے ملنگوں نے بدروحوں کو جھاوریاں سے بھگانے کے لیے دھونی

بھی دی ہے، لیکن کالی بلا رکھ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ٹلی اور اپنا کام کر گئی ہے۔ چالیس گھنٹے آج رات ختم ہو جائیں گے... بہت سیاہ رات ہوگی... گداؤ، وہ آج ہی بچے کو مارنے آئیں گے۔''

''آنے دیں صاب!'' گداؤ نے کہا، ''آج بتاؤں گا پیر کے کتوں کو۔ انھوں نے...''

گداؤ خاموش ہو گیا اور مجھے ایک بار پھر خیال آیا کہ ماضی میں گداؤ کی پیر اور ملنگوں سے متعلق کوئی تلخ یاد ضرور موجود ہے، ورنہ وہ اس قدر حوصلے سے پیر کے خلاف ہمارا ساتھ نہ دیتا... بہر حال، یہ وقت کریدنے کا نہ تھا۔

''تم غسل خانے اور لیٹرین کی چھت پر پڑا جھاڑ جھنکاڑ، اینٹیں، پتھر ہٹا کر نیچے اچھی طرح دیکھ لو، کوئی بچھو یا کن کھجورا نہ ہو،'' میں نے کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاب جی،'' گداؤ نے کہا۔ ''اوپر جو ٹہنیاں پڑی ہیں، وہ بھی سوکھ گئی ہیں۔ اس قدر گرمی، اتنی تیز دھوپ، شکر دوپہرے... کون زندہ رہ سکتا ہے؟ ٹھویں (بچھو) اور کن کریلیں (کنکھجورے) تو برسات میں ہوتے ہیں۔ ان دنوں تو سب کیڑے کھیتوں کے کنارے ٹھنڈی مٹی ہی میں مرے پڑے رہتے ہیں۔''

بھابھی نے گداؤ کو آواز دی۔ وہ برآمدے کی سمت گیا۔ میرے دل میں تجسس تھا۔ میں گھر سے نکلا اور بازار کی سمت چل دیا۔ میر صاحب کی ڈسپنسری سے کچھ پہلے مجھے دونوں ملنگ دکھائی دیے۔ انھوں نے سیاہ چغوں جیسے کرتے پہنے ہوئے تھے جو ان کے ٹخنوں تک لمبے تھے۔ ان کے سروں پر پٹکے بھی سیاہ تھے۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کو موٹے دھاگے سے باندھے ہوئے کئی رنگوں کی مالائیں تھیں۔ ہاتھوں میں فرائنگ پان جیسی لکڑی کے دستوں والی کڑاہیاں تھیں، جن سے دودھیا دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ بار بار دھویں کو پھونکیں مار کر ایک دکان کے اندر پھینک رہے تھے۔ وہ کچھ بول بھی رہے تھے جو دور سے مجھے سنائی تو دیا، لیکن ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر نعرے کی آواز آئی اور ملنگوں نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کڑاہیوں کے ساتھ کلائیوں میں پہنے ہوئے لوہے کے کڑے بجائے۔ دکاندار نے انھیں کچھ پیسے دیے اور وہ ساتھ والی دکان کے سامنے آنے کے لیے مڑے۔ میرے قدم آہستہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھاری بھرکم، چوڑے کندھوں والا تھا، اور دوسرا نہ زیادہ موٹا تھا نہ دبلا۔ موٹے بھاری بھرکم ملنگ کا چہرہ بہت چوڑا اور تارکول کی طرح سیاہ تھا۔

ماتھا نصف سے زیادہ پٹکے میں چھپا ہوا تھا، ابرو بہت گھنے اور آنکھیں بھی بڑی بڑی، گول گول سی تھیں۔ ناک بھی موٹی اور چہرے پر دبی دبی سی تھی، دہانہ چوڑا تھا، پٹکے کے پیچھے اس کے لمبے لمبے کالے بال لٹک رہے تھے۔ کانوں میں عورتوں کی طرح جھمکے لٹکے ہوئے تھے۔ دوسرا سانولا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا تھا، آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی تھیں، ناک پتلی اور آگے کی سمت جھکی ہوئی تھی، دہانہ تنگ تھا اور ٹھوڑی آگے کی سمت نکلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بھی بُندے تھے اور بال پٹکے سے نکل کر آگے، کندھوں پر اس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ اس کی چھاتی تک پہنچ رہے تھے۔ دونوں خاصے خطرناک قسم کے تھے۔

انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔

میں نے فوراً اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیں، جیسے ہوا سے باتیں کر رہا ہوں، لیکن زیرِلب، ورنہ بازار میں موجود لوگ بھی میری اس حرکت کو محسوس کر لیتے۔ موٹے، سیاہ، چوڑے منھ والے ملنگ کے ہونٹوں پر مکارانہ سی مسکراہٹ آئی۔ ان کے قریب جانے پر میں نے گنگنانا شروع کر دیا، جیسے کوئی دنیا سے بے خبر، اپنی ہی مستی میں گم ہو۔ ہر سمت اسپند کے دانوں کے جلنے سے پیدا ہونے والے دھویں میں شدید قسم کی ناگوار بو کا احساس ہوا۔ میں ملنگوں کے قریب سے یوں گزرا جیسے میں نے انھیں دیکھا ہی نہ ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ مجھے دیکھ کر موٹا سیاہ ملنگ کیوں مسکرایا تھا۔ کیا وہ سمجھ گیا تھا کہ میں ہی وہ پاگل ہوں جس نے بچے کے بالوں کا گچھا کاٹا ہے؟ میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور میر صاحب کی ڈسپنسری میں چلا گیا۔ وہاں چار پانچ مریض موجود تھے۔ میر صاحب کی ڈسپنسری میں بھی ہرمل دھونی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میر صاحب نے مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

''میں آج پڑھنے نہیں آپاؤں گا سر،'' میں نے کہا۔

''اچھی بات ہے،'' میر صاحب نے جواب دیا۔

میں واپس مڑا۔ ملنگ اب سبزی فروشوں کی دکانوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے پھر کسی ہوش وحواس سے عاری لڑکے کے طرح گنگنانا شروع کر دیا۔ ملنگوں کے قریب پہنچ کر میں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور یوں بڑبڑایا جیسے میں نے کسی کو گالی دی ہو۔ دونوں ملنگوں کے چہروں پر عیارانہ مسکراہٹ ابھری۔ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں

لال ڈورے تھے، جیسے نشہ کرنے والوں کی آنکھوں میں ہوتے ہیں۔ان کے بڑے بڑے جھولے ان کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزر کر میدان میں پہنچ گیا۔

سہ پہر کے قریب گداؤ نے بتایا کہ ملنگوں نے ہمارا گھر تلاش کرلیا ہے۔

''صاب، وہ ہمارے گھر کے پاس آئے، انھوں نے سائیکل والے اور بشیرے نعل بند کی دکانوں میں ہرل دھونی دی، بخشش لی۔ پھر کھلی گلی میں آئے، گھر کی چھت کی طرف دیکھا، دیواروں کی طرف دیکھا۔ باہر والے دروازے کے پاس وہ کچھ دیر کھڑے رہے... میں پرائمری سکول کے پاس تھا، صاب جی... پھر وہ قدم قدم دروازے سے کھیتوں کے پاس والی دیوار کے پاس گئے، اِدھر اُدھر دیکھا اور کھیتوں میں چلے گئے۔ بس میں اتنا ہی دیکھ سکا ہوں۔ کھیتوں میں جا کر انھوں نے کیا کیا، مجھے نہیں معلوم۔ پر یہ بات پکی ہے صاب کہ وہ کھیتوں کی طرف سے پرانی حویلی ہی کی طرف گئے ہوں گے... ''گداؤ کی آنکھوں میں گہری تشویش تھی۔''صاب، آپ کا... لگتا ہے اندازہ درست ہے... وہ کھیتوں ہی کی طرف سے آئیں گے۔''

گداؤ پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔

''اندازہ کیا، گداؤ،'' میں نے کہا۔''مجھے یقین ہے کہ وہ آج رات بُوبے کو مارنے کی کوشش کریں گے اور کھیتوں ہی کی طرف سے آئیں گے۔ہمیں اپنی تیاری مکمل کر لینی چاہیے۔''

''میں تیار ہوں صاب،'' گداؤ نے کہا۔

بھابھی اور بہنوں کو میر صاحب کے گھر سے یہ دعوت مل چکی تھی کہ انھیں رات میر صاحب کی بیگم اور بیٹیوں کے پاس رہنا ہے۔وہ اسے معمول ہی کی دعوت سمجھ رہی تھیں۔ عصمت بہت خوش تھی، میر صاحب کی چھوٹی بیٹی سے اس کی دوستی ہو چکی تھی، اور عصمت نے یہ بھی بتایا تھا کہ میر صاحب کی بیٹیاں موسیقی میں دلچسپی رکھتی ہیں۔

''آج تو گانوں کی محفل جمے گی،'' عصمت بہن نے کہا۔

''کیا فائدہ... ''بہن زیبا نے کہا،''فضول میں وقت ضائع کرنے کا! اس سے تو ہزار گنا بہتر ہے کہ نعتیں پڑھی جائیں۔''

عصمت کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بھابھی نے موضوع بدل کر دونوں بہنوں میں معمول کی چخ چخ

کو روک دیا۔ شام سے پہلے ہی وہ میر صاحب کے گھر چلی گئیں۔ میں نے گداؤ کو خصوصی طور پر کہہ رکھا تھا کہ وہ اس بات کا مکمل خیال رکھے کہ جب بھابھی اور بہنیں میر صاحب کے گھر جائیں، ملنگ گاؤں سے دور ہوں... گداؤ نے بتایا کہ وہ شام سے پہلے پرانی حویلی میں پہنچ چکے تھے۔

شام ہوتے ہی بھائی، میر صاحب، گداؤ اور میں ہسپتال کے صحن میں بیٹھ گئے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ رقیہ اور بُوبا گھر پر اکیلے ہیں، لیکن میں نے، ہسپتال آنے سے پہلے، رقیہ کی سمت دیکھے بغیر کہہ دیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ دروازہ نہ کھولے اور بوبے کے ساتھ برآمدے ہی میں رہے۔ اس بار ہسپتال کے صحن میں ہمارا باتیں کرنے کا انداز قدرے مختلف سا تھا۔ بخشو چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ماسی جیراں کے گھر کا بیرونی دروازہ کھلا۔ گلنازی باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رک سی گئی، لیکن تنور کی سمت جاتے ہوئے اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ اس بار میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ سی بکھر گئی۔

''آپ کو یقین ہے کہ ماسی آج رات آپ کی مدد کریں گی؟'' میر صاحب نے کہا۔

''شک کی کوئی وجہ نہیں،'' میں نے کہا۔ ''وہ ضرور آئیں گی۔''

''میں نہیں جانتا،'' بھائی نے کہا، ''لیکن مجھے اب بھی یہ سب کچھ فضول محسوس ہو رہا ہے...''

''نہیں صاب!'' اس بار گداؤ نے کہا۔ ''ملنگوں کا ارادہ بد ہے۔''

''آج کی رات خاصی پریشان کن ہوگی،'' میر صاحب نے کہا۔ گداؤ شاید پریشان کن کا مطلب سمجھ نہ سکا تھا، تھوڑا سا آگے جھکا، اس نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔

''معاف کریں ڈاکٹر جی،'' گداؤ نے کہا۔ ''میں گُن مُن تو نہیں جانتا پر وہ جس طرح گھر کو تاڑ رہے تھے، وہ آج رات کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔''

''مجھے یوں لگتا ہے،'' میں نے کہا، ''موٹا ملنگ باہر ٹھہرے گا، دوسرا دیوار پھاند کر اندر آئے گا۔ جب اسے پتا چلے گا کہ چارپائی پر رقیہ اور بوبا نہیں، گدا اور گاؤ تکیہ ہے تو وہ بدحواس ہو کر یا واپس بھاگے گا تا کہ دیوار پھاند کر باہر چلا جائے یا بیرونی دروازے کی سمت جائے گا۔ دروازے پر اندر سے تالا لگا دیکھ کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے گا۔ اوپر سے پتھر برس رہے ہوں گے۔ وہ آسانی سے پکڑا جائے گا۔''

گداؤ نے سر جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔

''میں اسے چار پائی تک پہنچنے ہی نہیں دوں گا صاب،'' اس نے آہستہ لیکن جوشیلے انداز میں کہا۔ 'دیوار پر ہی ایسی مار ماروں گا کہ ساری حیاتی یاد رکھے گا۔''

''تم لوگ تو یوں کہہ رہے ہو،'' بھائی نے کہا،'' جیسے تم نے ملنگوں کا سارا منصوبہ ان کی زبانی سنا ہو۔''

کبھی کبھی قیاس آرائی... ''میر صاحب نے کہا،'' حقیقت کا روپ دھار لیا کرتی ہے۔''

''ہمارا گھر ایسی جگہ واقع ہے کہ ہمارا کوئی پڑوسی نہیں ہے،'' میں نے کہا۔'' فکر صرف بشیر نعل بند کی ہے... وہ بیدار نہ ہو جائے۔''

''نہ صاب نہ،'' گداؤ نے کہا،'' وہ نہیں اٹھے گا، سارا دن کھوتے کی طرح کام کرنے کے بعد سُرت کہاں رہتی ہے! وہ تو کل صبح تک بے ہوش رہے گا۔''

گداؤ نے تنور کی سمت دیکھا، چائے پیے بغیر ہی اٹھا، سیدھا تنور کی سمت گیا۔

''آج پہلی بار گلنازی بہت سنجیدہ ہے۔'' اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ میری سمت دیکھے، مسکرائے، مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے کہیں زیادہ اس کی آنکھوں میں چمکے... لیکن گلنازی نے میری طرف نہ دیکھا، خود ہی اٹھ کر روٹیوں کی چنگیر گداؤ کو تھما دی۔

''میں سچا ہوں!'' میں نے سوچا۔'' آج رات بھائی کو بھی احساس ہو جائے گا کہ میں جھوٹا نہیں ہوں؛ اگر میں نے پیروں کی مخالفت کی ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی ہے... یہ پیر لوگ، چہروں پر بزرگی کی نقاب اوڑھے دہشت گرد، کب تک اپنے بھیانک چہروں کو چھپا پائیں گے؟ سیدھے سادے دیہاتی معاشرے میں دہشت پھیلا کر، خود ہی دیہاتیوں کے نجات دہندہ بننے والے یہ عیار لوگ کب تک خود کو محفوظ رکھ سکیں گے؟ عقیدت کو ہتھیار بنا کر سادہ لوح انسانوں کو لوٹنے والے یہ ڈاکو کب تک اپنی مذموم سرگرمیوں کو جاری رکھ سکیں گے؟ ایک نہ ایک دن تو ان کا خاتمہ ہو کر ہی رہے گا۔''

بخشو چائے لے کر آ گیا۔ تین پیالیاں میز پر رکھ کر اس نے سٹول کی سمت دیکھا۔

''او... کہاں گیا طبلچی؟'' بخشو نے بے اختیار کہا۔ میر صاحب اور بھائی مسکرائے۔

''گداؤ میاں تو گئے،'' میر صاحب نے کہا،'' اب چوتھی پیالی آپ ہی پی لیں۔''

''میں تو اپنے لیے گلاس بھر کے آیا ہوں۔'' بخشو نے اپنی کوٹھڑی کے باہر بنے چولھے کو

دیکھا۔ ''پر اب ضائع بھی تو نہیں کرنی — یہ بھی پی لیتا ہوں۔'' وہ پھر اپنے چولھے کی سمت چلا گیا۔

''سچ پوچھیں تو . . . '' بھائی نے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا، ''مجھے تو اب بھی یہ سب کچھ افسانوی جنون لگ رہا ہے جس میں یہ . . . '' بھائی نے میری طرف اشارہ کیا، ''نہ صرف یہ مبتلا ہے، بلکہ اس نے ہمیں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ ملنگوں میں اتنی ہمت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ میرے گھر میں داخل ہو کر بچے پر حملہ کریں . . . یہ ناقابلِ یقین سی بات ہے۔''

بھائی کو ابھی تک کسی بات پر یقین نہیں ہے . . . اس خیال سے مجھے دکھ سا ہوا۔

''آپ بھول رہے ہیں بھائی جان،'' میں نے کہا۔ ''ہم نے گداؤ کو میگھا پتن بھیجا تھا اور اس کے جانے کے بعد ملنگ جھاوریاں میں آئے ہیں، اور آج رات چالیس گھنٹے ختم ہو جائیں گے، جن کا ذکر پیر نے گداؤ سے کیا تھا کہ وہ چلہ کاٹ کر کالی بلا کو بچے سے دور رکھے گا۔ چالیس گھنٹے بہت تھے پیر کے لیے کسی کالی بلا کا انتظام کرنے کے لیے . . . آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ملنگ کسی برے ارادے سے ہی آئے ہیں؟ وہ ہمارے گھر کا جائزہ تک لے چکے ہیں اور آپ کو یہ سب کچھ افسانوی جنون لگ رہا ہے۔''

''بھیا، کچھ بھی ہو،'' میر صاحب نے کہا۔ ''کچھ ہو نہ ہو، اگر یہ افسانوی جنون ہے تو ہمیں زندگی بھر یاد رہے گا۔''

بخشو چائے کی پیالیاں اٹھانے آ رہا تھا۔

''بخشو،'' میں نے اس کے قریب آتے ہی کہا۔

''جی صاب؟'' بخشو نے میرے غیر متوقع مخاطب ہونے پر قدرے گھبرا کر کہا، ''کیا ہوا؟''

''ٹائیگر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے،'' میں نے کہا۔ ''میں ابھی ہسپتال چھوڑ جاؤں گا۔ اسے رات ہسپتال ہی میں رکھنا ہے۔ اسے کھانے کو کچھ نہ دینا۔''

''ہاں، وہ گداؤ کہہ رہا تھا کہ ٹائیگر کا پیٹ خراب ہے۔'' بھائی نے غیر متوقع طور پر میری مدد کی۔ ''میں نے چیک تو نہیں کیا . . . ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ اسے کل صبح دودھ میں اٹھائیس نمبر [42] کی دوائی

42۔ دیہاتی ہسپتالوں میں دوائیاں بوتلوں میں بھر کے بوتلوں پر نمبر لگا دیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نمبر بتا دیتے ہیں اور ہسپتال کے کارکن کمپاؤنڈر سمیت، نمبروں ہی سے جانوروں کو ادویات پلاتے رہتے ہیں۔

پلا دینا، ایک بڑا چمچ...''

''جی صاب جی،'' بخشو نے کہا۔''ہزار بار منع کیا ہے طیلچی کو کہ گوشت ابال کر کھلایا کرے...
کچا ہی ڈال دیتا ہے۔'' بخشو نے گداؤ پر بھڑاس نکالی۔ بھائی اور میر صاحب مسکرائے۔

غیر ارادی طور پر میری نگاہیں اوپر اٹھیں۔ گلنازی اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی۔
نگاہیں ملتے ہی وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ پھر اس کی نظریں نیچے زمین کی سمت گئیں، اٹھیں۔
گلنازی کی آنکھوں میں وہی مسکراتی ہوئی چمک تھی جسے دیکھتے رہنے کی خواہش سے میں بچ
نہیں سکتا تھا۔

25

گہری ہوتی ہوئی شام، افق پر سیاہی مائل نارنجی رنگ بکھیرتی شام، اندیشے، تشویش اور
بے چینی کے لمحات کو لائی۔ گھر پہنچ کر میں نے ٹائیگر کی زنجیر کھولی۔ ٹائیگر میرے پیچھے پیچھے بیرونی
دروازے سے باہر نکل تو آیا، لیکن باہر نکلتے ہی ٹھہر گیا۔ جرمن شیفرڈ شاید دنیا میں سب سے زیادہ عقلمند
ہوتے ہیں۔ میں نے ٹائیگر کی زنجیر کھینچی تو وہ بھونکا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون سا وقت ہے سیر کرنے کا!
میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پشت کو تھپتھپایا۔ اس نے دُم ہلائی، وہ میرے ساتھ چل تو پڑا، لیکن
وہ حیرت زدہ محسوس ہو رہا تھا۔ پھر گلی سے کچی سڑک پر آ کر اس نے اِدھر اُدھر مٹی کو سونگھنا شروع کر دیا۔
کبھی رک جاتا تھا، کبھی مجھ سے بھی آگے نکل کر، مجھے زنجیر سمیت کھینچنے لگتا تھا۔ ہسپتال پہنچ کر وہ تین بار
بھونکا۔ میں نے اسے چھپر کے مریض جانوروں کے ساتھ باندھ دیا۔

''یہ تو بھلا چنگا ہے،'' بخشو نے غور سے ٹائیگر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مدتوں سے جانوروں کے
ساتھ رہتے ہوئے وہ خاصا تجربہ کار ہو چکا تھا۔

''ہاں،'' میں نے کہا۔''گداؤ نے شام کو دوائی دی تھی۔ اب بہت بہتر ہے۔ بس اسے آج
رات کھانے کو کچھ نہ دینا۔ چاہے جتنا بھونکے، کچھ بھی کھانے کو نہ دینا، ورنہ پھر بیمار ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے صاب،'' بخشو نے کہا،''اچھا کیا جو آپ اسے یہاں لے آئے، ورنہ بھونکنے پر
بی بی جی ایک آدھ روٹی کا ٹکڑا ضرور ڈال دیتیں۔''

''صبح دودھ پلا دینا،'' میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ گداؤ نے ٹائیگر کو اتنا ابلا ہوا گوشت کھلا دیا ہے کہ اسے صبح تک بھوک نہیں لگے گی۔ ''صبح گھمانے بھی لے جانا۔''

''اچھا صاب،'' بخشو نے کہا۔

میں واپسی کے لیے مڑا تو ٹائیگر نے احتجاج کیا، بھونکا، چھپر کے نیچے کھونٹی سے بندھی زنجیر کو دو تین بار کھینچا، ایسا کرتے ہوئے اس نے اگلے پیر اوپر اٹھائے۔ وہ میرے ہسپتال سے نکلنے تک بھونکتا رہا جیسے پوچھ رہا ہو کہ مجھے کیوں چھوڑے جا رہے ہو۔ سڑک پر آ کر میں نے تنور کی سمت دیکھا۔ تنور پر الٹی ترامی (کڑاہی) پڑی تھی۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں نہ جانے کیوں مجھے سارا ماحول پُراسرار سا محسوس ہوا۔ اس پُراسراریت میں بے چینی بھی تھی اور شدید قسم کا تجسس بھی تھا۔

''کیا سب کچھ ویسا ہی ہوگا... '' میں نے سوچا ''جیسا میرے ذہن میں ہے؟'' بھائی کے گھر کی سمت میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ اماوس کی رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ ''اگر ایسا نہ ہوا... '' منفی خیال سے مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہوگئی۔ ''اگر ملنگ بُوبے کو مارنے کے لیے نہ آئے، اگر انھوں نے کوئی کوشش ہی نہ کی، اگر وہ کل صبح جھاوریاں سے کسی اور قصبے کی سمت چلے گئے تو پاگل پن کی اداکاری کیا کروں گا، سب مجھے حقیقت میں جنونی ہی سمجھیں گے... تصورات کو حقیقت سمجھنے والا، خیالوں کی دنیا میں جینے والا... گلنازی بھی مجھے پاگل ہی سمجھے گی۔'' گھبراہٹ میں میرے ذہن پر مایوسی سی اتری۔ یوں محسوس ہوا جیسے تاریکی نے فضا سے کہیں زیادہ مجھے گھیرے میں لے لیا ہے۔ میرے قدموں کو بوجھل کر دیا ہے، میرے ہاتھوں کو جکڑ لیا ہے۔ تاریکی مجھ سے لپٹ گئی ہے... کسی کالی بلا کی طرح... اس خیال کے ساتھ ہی میرے سر کو جھٹکا سا لگا۔

''یہ میں کیا فضول باتیں سوچ رہا ہوں!'' میں گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ''یہ تو ہم، جن سے میں لڑتا رہا ہوں، میرے ذہن پر کیوں حاوی ہو رہے ہیں... بدروحیں، کالی بلا، سب بکواس ہے۔ یہ محض ایک خوف ہے، انسان کا اندرونی خوف، جو صدیوں سے انسانی ذہن پر مسلط ہے۔ اسی خوف نے ناکامی کا احساس بن کر میرے قدم بوجھل کر دیے ہیں، میرے ہاتھوں کو جکڑ لیا ہے۔ مجھ سے لپٹ گیا ہے۔ یہی وہ خوف ہے جس کی لاتعداد شکلیں ہیں۔ یہی وہ خوف ہے جس کی وجہ سے انسان صدیوں سے قوتِ شر کا غلام بنا ہوا ہے۔ اس کا سلسلہ خود غرضی سے جا ملتا ہے۔ اسی اتصال سے یہ خوف

پلٹ کر تاریک گہراؤ میں بدل جاتا ہے، جہاں ایک بار گر کر، انسانی زندگی کا ہر روشن راستہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔''

میں گلی کی سمت مڑنے سے پہلے سڑک پر ہی ٹھہر گیا۔ میں نے میدان کی سمت دیکھنے کی کوشش کی، بشیر نعل بند کی چارپائی تلاش کی۔ وہ ہمیشہ چوڑی گلی کے سامنے چارپائی بچھایا کرتا تھا تاکہ کھیتوں کی سمت آنے جانے والی ہوا میں سکون سے سو سکے۔ اس رات ہوا نہیں تھی۔ بشیر کی چارپائی گلی کے سامنے کہیں نظر نہ آئی۔ اندھیرے میں آنکھیں بھینچ کر میں نے پھر میدان کی سمت دیکھا۔ کچھ دور مجھے ہیولا سا نظر آیا۔ اس نے میدان کی کھلی جگہ پر چارپائی بچھا رکھی تھی تاکہ ہوا کی بندش میں وہ دن بھر کی جھلستی دیواروں کی گرمی سے دور سو سکے۔ مجھے یہ تائیدِ غیبی محسوس ہوئی۔ مجھے یہی تشویش تھی کہ رات کو اگر شور ہوا تو بشیر بیدار بھی ہو سکتا ہے۔

''ملنگوں کو تو یہ اپنے پیر کی کرامت محسوس ہو گی،'' میں نے سوچا'' تاکہ وہ آسانی سے اپنا کام کر جائیں۔'' میں گھر کی سمت مڑا، بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں گداؤ صحن میں بچھی چارپائی کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے چارپائی برآمدے سے دور اور بیرونی دیوار کے قریب بچھائی تھی۔

''میں نے سب انتظام کر دیا ہے،'' گداؤ نے کہا۔''اچھی طرح چھت صاف کر کے، مورچہ بنا کر ابھی اترا ہوں۔'' چارپائی پر گداؤ نے ایک گدا گول کر کے، ساتھ گاؤ تکیہ رکھ کر، اس پر چادر ڈال دی تھی اور گاؤ تکیے پر چادر میں ایک اُبھار سا بھی بنا دیا تھا جو مدھم روشنی میں بچے کے جسم پر لپٹا ہوا ماں کا بازو محسوس ہو رہا تھا۔

''تم واقعی فنکار ہو گداؤ!'' میں نے گداؤ کی طرف دیکھا، وہ خوشی سے مسکرایا۔

''تھیٹر میں بہت سیٹ لگائے ہیں،'' اس نے خوشی سے کہا۔''سیٹ وہی ہوتا ہے کہ نقل اصل لگے۔''

گداؤ نے غسل خانے کی چھت پر چڑھنے کے لیے ایک سٹول بھی دیوار کے پاس رکھا ہوا تھا جس کے قریب ایک ہاکی بھی تھی۔

''اگر کسی نے غسل خانے کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کی تو،'' گداؤ نے کہا،'' ہاکی ہو گی

میرے پاس، سر کھول دوں گا۔''

''نہیں گداؤ!'' میں نے کہا، ''ایسا کچھ نہ کرنا کہ ملنگ جان ہی سے چلا جائے۔ ہمیں اسے زخمی کر کے پکڑنا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں... '' گداؤ سٹول پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے ہاکی غسل خانے کی چھت پر رکھ دی، پھر اچھل کر چھت کی ایک اینٹی منڈیر پر اپنا پیٹ رکھا اور اچک کر چھت پر چڑھ گیا، پھر وہ غائب ہو گیا۔ اس نے ناقابلِ یقین حد تک خود کو چھپانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ پھر وہ منڈیر کے پاس نظر آیا۔ منڈیر سے لٹک کر اس نے سٹول پر پاؤں جمائے اور نیچے اتر آیا۔

''کیوں صاب؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا، ''کیسا ہے میرا مورچہ؟''

میں نے اسے داد دی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر چلا گیا۔ چھت پر صرف بھائی اپنی مخصوص چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ رقیہ اور بوبا ابھی برآمدے ہی میں تھے۔ مستطیل چھت پر، ہسپتال کی سمت جانے والی کچی سڑک پر تاریکی بہت گہری ہو چکی تھی۔ سڑک اور میدان کی جانب، ہر رات کی طرح، چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر سفید چادریں بھی اندھیرے میں سیاہی مائل نظر آ رہی تھیں۔ کھلی گلی کی سمت بھائی کی چارپائی تھی، ان کے قریب بھابھی کی چارپائی پر آج رات ماسی جیراں نے سونا تھا، ماسی جیراں کے ساتھ رقیہ اور بوبے کے لیے باجی زیبا کی چارپائی تھی، اور کھلے احاطے کی جانب بہن عصمت کی چارپائی گلنازی کے لیے تھی۔ میری چارپائی سیڑھیوں کے پاس تھی، جسے میں نے منڈیر کے قریب کھسکا لیا تا کہ مجھے صحن نظر آتا رہے اور خطرے کے وقت میں گداؤ کی مدد کر سکوں۔

''صاب!'' صحن سے آواز آئی۔ گداؤ لالٹین کی روشنی میں چھت کی سمت سر اٹھائے نظر آیا۔

''آج بھوکا ہی سونا ہے کیا؟''

میں کھانا کھانا بھی بھول چکا تھا۔

''میں کھا چکا ہوں،'' بھائی نے کہا۔ ''تم کھا لو۔ گداؤ سے کہنا گرم کر دے۔''

میں صحن میں اترا۔ گداؤ نے کھانا گرم کرنے کے بعد ہی مجھے آواز دی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے ٹائیگر کا خیال آیا۔

''ٹائیگر کو صبح تک... ''میں نے کہا ہی تھا کہ گداؤ نے میری بات کاٹ دی۔
''ہسپتال میں پہلے بھی رہ چکا ہے،''اس نے کہا۔''بھوک تو اسے کل دوپہر تک بھی نہ لگے گی۔''
''پھر بھی،''میں نے کہا،''گھر سے دور وہ بھونک بھونک کر ہی رات گزارے گا۔''
''ملنگوں کو گالیاں دے گا!''گداؤ غیر متوقع طور پر بہت خوشگوار لہجے میں بولا۔ معابلہ کرنے کے خیال نے اس کے خوف کو ختم کر دیا تھا۔ وہ بہت پُراعتماد نظر آ رہا تھا۔ کھانا کھا کر میں نے ہینڈ پمپ پر ہاتھ دھوئے۔
''پتا نہیں!''میں نے کہا،''بشیر نعل بند سو گیا ہے کہ جاگ رہا ہے۔''
''سو گیا ہوگا کھوتا! آپ اس کی فکر نہ کریں... خراٹے لے رہا ہوگا۔''
''گاؤں میں لوگ جلدی سو جاتے ہیں،''میں نے کہا،''یہ تو میں جانتا ہوں، لیکن وہ ٹھہرا من موجی، دیر تک حقہ پیتا رہتا ہے، اکثر گانے بھی گاتا ہے۔''
''ملنگ کون سا جلدی آ جائیں گے!''گداؤ کو ملنگوں کے آنے کا اب مجھ سے بھی زیادہ یقین تھا۔''حرامی آدھی رات ہی کو آئیں گے۔''
میں نے بیرونی دیوار کی سمت دیکھا۔ دیوار کی بنیادیں اندھیرے میں نگاہوں سے اوجھل تھیں۔
''وہ روشنی کرنے کے لیے ٹارچ وغیرہ تو نہیں جلائیں گے؟''میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔
''جلائیں گے صاب!''گداؤ نے کہا۔''وہ صحن میں چارپائی کو دیکھنے کے لیے چھوٹی بیٹری (ٹارچ) ضرور لائیں گے۔ ایسی بیٹریاں سرگودھے میں ملتی ہیں صاب، انگلی جتنی لمبی، بہت مدھم روشنی نکلتی ہے۔ میں نے دیکھی ہوئی ہے ایسی بیٹری۔ دو چھوٹے سیل پڑتے ہیں اور ہاں... ''گداؤ خود ہی چونک اٹھا۔''آپ کے پاس چھ بڑے سیلوں والی بڑی بیٹری ہے نا؟''
''ہاں، ہے گداؤ،''میں نے کہا،''اس سے تو سارا صحن روشن ہو جائے گا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، صحن میں اتر کر ملنگ رقیہ کو بے ہوش کرنے کے لیے کوئی نشہ آور تیز دوائی ساتھ لایا ہوگا تاکہ رقیہ کے بے ہوش ہو جانے پر بوبے کو مار سکے۔''
''صاب،''گداؤ نے کہا۔''رقیہ اور بوبا تو محفوظ ہوں گے — اگر بستر پر صحن میں دونوں ہوتے تو آپ نے جو سوچا ہے وہی ہوتا، لیکن ملنگ بوبے کو گلا گھونٹ کر تو ہرگز نہ مارتا۔ اس طرح تو گردن پر

انگلیوں کے نشان رہ جاتے ہیں۔ وہ کوئی اور ہی طریقہ اختیار کرتا۔''

میں گداؤ کی اس عقلمندی پر حیران رہ گیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو گداؤ؛'' میں نے کہا،'' اب جو انتظام ہم نے کیا ہے، اس سے تو ملنگ کے ہوش ہی ٹھکانے نہیں رہیں گے، بہت جلد پکڑا جائے گا۔''

''میں نے تو آپ کو پہلے بھی... '' بیرونی دروازہ کھلنے پر گداؤ خاموش ہو گیا۔ ماسی جیراں اور گلنازی آ گئی تھیں۔ گداؤ فوراً برآمدے کی سمت گیا۔

''رقیہ بہن،'' گداؤ نے کہا،'' ماسی اور گلنازی۔''

رقیہ باہر آئی، بوبا شاید سو رہا ہوگا۔ ماسی جیراں کو دیکھ کر رقیہ نے رونا شروع کر دیا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے آپا!'' رقیہ ماسی جیراں کے قریب آئی۔'' یہ کہتا ہے، ملنگ بوبے کو مارنے آئے ہیں۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ماسی جیراں نے میری طرف دیکھا۔

''بہت زیادتی کی ہے اس نے،'' ماسی جیراں نے غصے سے کہا۔'' کیا ضرورت تھی بوبے کی رکھ کاٹنے کی؟'' ماسی کی اس بات پر میں گھبرا سا گیا۔'' دشمنی پیروں سے تھی تو ہمیں کیوں پھنسا دیا ہے اس نے؟... بی بی جی سے تو میں بات کروں گی... مذاق بنایا ہوا ہے... میں تیری خاطر آ گئی ہوں... خطرہ تو مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔''

''ماسی،'' گلنازی نے کہا،'' بوبا کہاں ہے؟''

''اندر ہے۔'' رقیہ نے برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔

''چھت پر لے چل، وہاں محفوظ رہے گا،'' گلنازی نے پھر کہا۔

''اب جو ہوگا دیکھ لیں گی،'' ماسی جیراں نے کہا،'' اٹھا لا بوبے کو۔''

''مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے،'' رقیہ نے کہا۔'' گداؤ نے بتایا ہے کہ وہ گھر کو اچھی طرح دیکھ کے گئے ہیں اور بہت خطرناک نظر آتے ہیں۔'' بات کرتے ہوئے وہ بار بار سسکیاں لے رہی تھی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں،'' ماسی نے کہا۔'' اس نے... '' ماسی نے میری طرف دیکھا،'' اتنا یقین دلایا ہے کہ میں اس کی بات مان کر آ گئی ہوں۔ اسے اور شاید ڈاکٹر صاحب کو بھی یقین ہے کہ وہ... ''

''ماسی،'' گداؤ نے کہا،'' شاید کی کیا بات ہے؟ ان کا ارادہ بد ہے، وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ لیکن ہم نے بھی سارا انتظام کر لیا ہے۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔'' رقیہ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ خوف کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ کسی اندرونی خوف سے نیم جان سی لگ رہی تھی۔

''کہا ہے نا،'' گداؤ نے کہا،''ہم نے سب انتظام کر لیا ہے۔ آئیں ملنگ، دیکھ لیں گے۔''

''بیبیاں ہوتیں تو،'' رقیہ نے کہا،''میں تمھیں بلانے کے لیے کبھی نہ کہتی۔''

گلنازی نے فوراً میری طرف دیکھا — میری بات کی سچائی کے احساس نے اسے مسکرانے کا موقع دے ہی دیا۔

''ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں رقیہ بہن،'' گداؤ نے کہا۔''تیری بیبیاں ہوتیں تو وہ تجھ سے زیادہ ڈری ہوتیں۔ اچھا ہے کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔''

گلنازی نے پھر میری سمت دیکھا — میرے دوسرے سچ کی تصدیق پر اس کی مسکراہٹ آنکھوں میں بھی چمکی۔

''لے آ بُوبے کو،'' ماسی نے کہا۔

رقیہ برآمدے میں گئی۔ چار برس دس مہینے کے بُوبے کو اس نے یوں اٹھایا جیسے ایک برس کا ہو، لیکن پہلی سیڑھی پر ہی لڑکھڑائی۔

''صاب!'' گداؤ نے کہا،''لالٹین کمرے میں لے جائیں، بُوبے کو میں اوپر لے جاتا ہوں۔ اگر ملنگ کہیں کھیتوں سے تاڑ بھی رہے ہوں گے تو انھیں اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آئے گا۔''

گداؤ واقعی بہت ہوشیار اور عقلمند تھا۔ میں برآمدے میں لٹکی لالٹین کو اندر کمرے میں لے گیا اور دروازہ بھی بند کر دیا۔ کمرے میں اتنی زیادہ گرمی تھی کہ تین چار منٹوں ہی میں میری قمیض بھیگ کر جسم سے چپک گئی، پسینہ چہرے پر لکیریں بنانے لگا۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا تو سب چھت پر جا چکے تھے۔ گداؤ صحن میں کھڑا تھا۔

''آپ بھی چھت پر چلے جائیں صاب،'' گداؤ نے کہا۔''دروازے کو اندر سے لگانے کے لیے تالا میری جیب میں ہے۔''

''گداؤ، تمھیں شاید رات دیر تک غسل خانے اور لیٹرین کی چھت پر بیٹھنا ہوگا، کوئی گدی یا تکیہ لے جاؤ،'' میں نے لالٹین بجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں صاب،'' گداؤ نے کہا،''چادر ہے میرے پاس، دوہری کر کے بیٹھ جاؤں گا۔آپ چھت پر جا کر سو جائیں۔اب باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

میں نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھایا۔

''نیند کیسے آئے گی، گداؤ،'' میں نے کہا اور سیڑھی پر پاؤں رکھا۔''ساری رات تکیے کے نیچے پڑی ٹارچ پر ہی ہاتھ رہے گا۔''

''ہو سکتا ہے،'' گداؤ نے کہا،''حرامی جلدی ہی آ جائیں۔''

گداؤ کی ملنگوں سے نفرت مجھے بار بار اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ ماضی میں گداؤ کے ساتھ کوئی واقعہ ضرور ہوا ہے۔بہر حال، ابھی تو یہ سوچنا بھی بیکار تھا۔میں چھت پر پہنچا۔اس قدر گہرا اندھیرا تھا کہ جسموں کا احساس بھی نہیں تھا۔گلنازی رقیہ سے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ماسی بھی کبھی کبھی آہستہ سے بولتی تھی۔بھائی خاموش تھے۔میں اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔لیٹتے ہوئے میں نے تکیے کے نیچے چھ سیلوں والی بڑی ٹارچ کو اسی طرح ٹٹولا جس طرح بوبے کے بالوں کا گچھا کاٹنے سے پہلے قینچی کو ٹٹولا تھا۔اچانک رقیہ کی سسکی سنائی دی۔وہ ماسی جیراں کی کسی بات پر رونے لگی تھی۔

''بس ماسی،'' گلنازی کی خوبصورت آواز آئی۔''صبح تک پتا چل ہی جائے گا کہ کیوں آئے ہیں۔'' گلنازی کا اشارہ ملنگوں کی سمت تھا۔رقیہ خاموش ہو گئی۔مجھ پر پھر ایک بار ندامت سی چھا گئی۔

''کچھ بھی ہو،'' میں نے سوچا،''رقیہ کے اس دکھ کا باعث تو میں ہی ہوں۔''

''کچھ نہیں ہوگا ماسی،'' گلنازی کی آواز ابھری۔''بوبے کو کچھ نہیں ہوگا۔''

پھر سناٹا سا چھا گیا۔ہوا بھی بند تھی۔میں ہمیشہ کی طرح اپنی چارپائی پر لیٹا ستاروں کو دیکھ رہا تھا،لیکن گلنازی کی چھت پر موجودگی سے مجھ پر فطری گھبراہٹ بھی طاری تھی۔

''سری نگر سے آتے ہوئے...'' ماسی جیراں نے آہستہ سے کہا،''میں اتنی نہیں ڈری تھی جتنی آج گھر سے یہاں آتے ہوئے ڈری ہوں۔''

''بس کر ماں،'' گلنازی نے کہا،''سوجا۔بوبا تو محفوظ ہے۔''

''چپ!'' رقیہ نے کہا،''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

پھر سناٹا چھا گیا۔میں ہر رات ستاروں کو دیکھا کرتا تھا،لیکن اس رات مجھے یوں محسوس ہوا

جیسے ستاروں کے جھرمٹ نیچے آ گئے ہیں اور صحن میں دھیمی دھیمی سی روشنی پھیلا رہے ہیں۔

''دیکھیں۔۔۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔''میری بات غور سے سنیں۔ جب خطرے کا احساس ہو گا تو صرف میں اٹھوں گا۔ آپ میں سے کوئی نہ اٹھے، نہ ہی کروٹ لے۔ مکمل خاموش رہیں۔۔۔ بھائی جان، آپ بھی۔''

''فضول۔۔۔'' بھائی نے پہلی بار آہستہ سے کہا،''فضول میں سب کو پریشان کر رہے ہو۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ لیکن تمھاری ان باتوں کے بعد کوئی سو نہ سکے گا۔ کسی کو نیند آئے گی؟''

پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے کروٹ لے کر لیٹرین کی چھت پر گداؤ کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن تاریکی اس قدر تھی کہ میرے قریب چھت کی منڈیر بھی ایک سیاہ لکیر سی دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی ہی ایک مدھم سی لکیر صحن کے پار بیرونی دیوار کے اوپر بھی محسوس ہوئی۔ ستاروں کی روشنی، اماوس کی رات میں، سر سے اوپر ہی اپنا احساس دلا رہی تھی۔ صحن کی طرف دیکھنے کے لیے آنکھوں کو بھینچنا پڑ رہا تھا۔ لیٹرین کی چھت پر کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن کچھ دیر مسلسل دیکھتے رہنے کے بعد وہاں ایک بڑا سا سیاہ دھبا نظر آیا، جیسے مٹی کا کوئی ڈھیر ہو۔ پھر بیرونی دیوار کے بھی مدھم سے نقوش نگاہوں میں ابھرے اور صحن میں، دیوار سے کچھ ہی دور، چارپائی کا بھی احساس ہوا۔

''کہیں ایسا تو نہیں،'' میں نے سوچا،''کہ میں لیٹرین کی چھت، بیرونی دیوار اور چارپائی کا تصور کر رہا ہوں اور وہ مجھے اندھیرے میں دکھائی دے رہے ہیں۔''

لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تصور کا نظارہ نہیں؛ ستاروں نے اتنی روشنی تو بکھیر ہی دی ہے کہ بیرونی دیوار پر چڑھنے والا نظروں سے بچ نہیں سکے گا۔

اچانک ایک گہری کیفیت نے مجھ پر سایہ سا ڈالا۔ وہ خوف جو رقیہ کو تھا، ماسی جیراں کو تھا، جس نے شاید گلنازی کے ذہن پر بھی اپنا تاثر چھوڑا ہو گا، جس سے بھائی اور گداؤ بھی نہ بچ پائے ہوں گے، وہ خوف جس نے شام کے وقت ہسپتال سے واپس آتے ہوئے مجھے بھی اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، وہ خوف مجھے اپنے اردگرد پھیلتا محسوس ہوا۔ اس خوف میں ایک انجانی سی پُراسراریت بھی تھی۔۔۔ انہونی کا خوف تو سب کو ہوتا ہی ہے، لیکن کسی بات کے ہونے کا ڈر، جب اس کے ہونے کا یقین بھی ہو، اعصاب کو اکثر جکڑ لیا کرتا ہے۔

''میرے خوف کی . . .'' میں نے سوچا،''نوعیت شاید سب سے الگ ہے۔کسی کو بھی اس خوف کا احساس نہ ہوگا، کیونکہ کسی کے ذہن میں ناکامی کا خوف نہیں ہوگا۔ناکامی پر سب مجھے پاگل سمجھیں گے — گلنازی بھی۔ اس کے دل میں جو جگہ میں بنا چکا ہوں،اس کے ذہن میں جو میری اہمیت ہے،وہ ختم ہو جائے گی،ہنسی میں اڑ جائے گی،جس طرح خزاں کی ہوا کے دھیمے سے جھونکے سے بھی خشک پتا ٹوٹ جایا کرتا ہے۔میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔''

مجھے یوں لگا جیسے میرے خوف کی ڈور میری خودغرضی سے بندھی ہوئی ہے۔اس خیال کے ساتھ ہی مجھے اپنے اردگرد پھیلتا ہوا خوف سمٹتا محسوس ہوا۔اب سارا خوف صورت حال کی سنجیدگی میں روپوش ہوتا جا رہا تھا۔

''شاید میری خودغرضی میرے خوف کا باعث تھی،'' میں نے سوچا۔''ڈور کا احساس ہوا ہے تو ڈور ٹوٹ گئی ہے۔مجھے کیا— گلنازی کے دل میں میری جگہ رہے نہ رہے . . . اس کی نظروں میں میں اہم رہوں نہ رہوں . . . مجھے اس سے کیا . . . مجھے تو بیس دنوں بعد یہاں سے چلا جانا ہے۔''

خوف سمٹ گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ اندیشے کی صورت میں پلٹا۔

''شاید میں اس ارادے سے خوفزدہ ہوا ہوں،''میں نے سوچا،''جس ارادے کے ساتھ ملنگ قصبے میں آئے ہیں — ایک معصوم بچے کا قتل . . . پیر کی دھاک بٹھانے کے لیے،پیر کی دہشت پھیلانے کی خاطر، پیر کو سچا ثابت کرنے کے لیے . . . یا پھر شاید میں اس ملامت سے خوفزدہ ہوا ہوں جس کا سامنا مجھے بوبے کے بالوں کا گچھا کاٹنے پر کرنا پڑا تھا، گالیاں، بددعائیں، دھمکیاں . . . اگر ملنگ نہ آئے تو کل صبح مجھے پھر سب کچھ سننا ہوگا، سہنا ہوگا۔''

میں نے پھر صحن کی سمت دیکھا۔

''میں تیار ہوں،'' میرے ذہن میں پختہ ارادہ ابھرا۔''ہر ملامت کے لیے تیار ہوں۔میں جانتا ہوں کہ ناکامی کی صورت میں مجھے پاگل کہا جائے گا اور شاید کل صبح ہی میرا بیگ میرے کاندھے پر لٹکا کے مجھے شاہ پور جانے والے تانگے پر بٹھا دیا جائے گا لیکن اس کے باوجود میں اپنے اس یقین کو ہمیشہ زندہ رکھوں گا کہ ہوس کے ہتھیاروں کے ساتھ سیدھی سادی انسانیت پر حملہ کرنے والے اس زمین پر قوتِ شر کے خاص نمائندے ہیں۔''

اس سوچ نے خوف کو اس طرح بھگا دیا جس طرح کسی باڑے میں، بھیڑ بکریوں کے ممیانے پر، رکھوالے کے جاگ اٹھنے پر، باڑے کی دیوار پر چڑھتا ہوا چیتا الٹی چھلانگ لگا دے۔

''جب تک میرا شعور میری قلبی و ذہنی کیفیات کا رکھوالا ہے،'' میں نے سوچا، ''نہ خوف مجھے دبوچ سکتا ہے نہ خود غرضی...''

میں نے صحن سے نظریں ہٹا کر ستاروں کے جھرمٹ کی طرف دیکھا جو مجھے اوپر کی سمت، قریب ہی لٹکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے منتشر خیالات یکجا ہو رہے تھے۔

''رقیہ نے جتنی گالیاں، بد دعائیں اور دھمکیاں مجھے دینا تھیں، دے چکی ہے،'' میری سوچ ایک نقطے پر مرکوز ہو رہی تھی۔ ''رقیہ اب میرا ساتھ دے رہی ہے۔ بُوبا چھت پر محفوظ ہے۔ آج اماوس ہے، ملنگوں نے جو کچھ بھی کرنا ہے، آج ہی کریں گے۔ ہم سب پوری طرح چوکس ہیں۔ بوبا اڑھائی ماہ بعد پانچ برس کا ہو جائے گا۔ اب تو ساون شروع ہونے والا ہے، چھت سے چارپائیاں اتر جائیں گی۔ گھر میں دو کمرے ہیں۔ ایک میں بھائی بھابھی اور دوسرے میں رقیہ اور بوبا سویا کریں گے۔ آج اگر ہم نے ملنگ کو پکڑ لیا تو پیر نور شریف بھی خاموش ہو جائے گا۔ خود ہی کوشش کرے گا کہ اس واقعے کی تشہیر نہ ہو۔ اگر میں آج ناکام ہو گیا تو کل مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ سب مجھے پاگل سمجھیں گے، گلنازی کے دل میں میری اہمیت ختم ہو جائے گی — اس سے کیا فرق نمایاں ہوگا؟ کامیابی کی صورت میں بھی تو مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ پھر نہ جانے کبھی جھاوریاں آؤں نہ آؤں... گلنازی مجھے بھول جائے گی۔ میں بھی اسے ایک خوبصورت خواب کی طرح کچھ دن یاد رکھوں گا، پھر بھول جاؤں گا۔ تو پھر مجھے اس کے دل میں اپنی اہمیت کے رہنے یا نہ رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ملنگ آئیں نہ آئیں... میں نے اپنی طرف سے بچے کو بچانے کی کوشش تو کی ہے...''

مجھے اپنے اعصاب میں مضبوطی کا احساس ہوا۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔ نظریں بار بار دو فٹ اونچی منڈیر سے نیچے صحن میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں، لیکن ہر سمت اندھیرا سدِ بینائی تھا۔ مجھے وہ خوف، جو پھیل کر سمٹ رہا تھا، سیڑھیوں کے ذریعے چھت سے نیچے صحن میں اترتا محسوس ہوا۔ وہ صحن میں چارپائی کی سمت گیا، پھر خوف کا احساس بیرونی دیوار پر چڑھ کر، دوسری جانب کھیتوں میں کود

گیا... مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اب بیرونی دیوار سے چاہے کوئی بھی اندر آئے، کوئی بھی دیوار سے نیچے صحن میں اترے، خوف کا احساس اس کے ساتھ نہیں اترے گا۔ میں ستاروں کی سمت دیکھنے لگا۔

''کیا کسی خوبصورت خواب کو فراموش کیا جاسکتا ہے؟'' میرے قریب ہی لیٹی ہوئی گلنازی کا احساس پھر پوری شدت سے ذہن میں نمودار ہوا۔ ''کیا میں اپنی زندگی میں اس بے انتہا خوبصورت لڑکی کو بھلا پاؤں گا؟'' ہوا اس قدر ساکن تھی کہ ہر سمت سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ ہاں، کبھی کبھی کھیتوں کی طرف سے حشرات الارض کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور دور لاری اڈے کی سمت کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ گزرتے لمحے خوف سے نجات پا چکے تھے، لیکن بوجھل تھے۔ اب مجھ پر بے چینی سی طاری تھی۔

انتظار کی کوئی کیفیت بھی خوشگوار نہیں ہوا کرتی... شاید کسی عزیز از جان کے آنے کا انتظار شیریں ہوتا ہوگا، لیکن مجھے تو ابھی تک ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا... ''یہ رات تو ایسی رات ہے کہ مجھے ہوس کے عفریتوں کا انتظار ہے، اور اس انتظار میں کس قدر کڑواہٹ ہے۔''

میں نے تکیے کے نیچے بائیں ہاتھ سے ٹارچ کو ٹٹولا، چارپائیوں کی سمت دیکھا۔ سب بظاہر سو رہے تھے، لیکن میں جانتا تھا کہ نہ بھائی سو رہے تھے، نہ ماسی جیراں، نہ رقیہ، نہ گلنازی!— بس ایک بوبا ہی تھا جو ہر شے سے بے نیاز گہری نیند میں تھا۔ باقی سب اسی انتظار کو محسوس کر رہے تھے جس میں کڑواہٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا— انتظار ہر لمحے کو کھینچ رہا تھا۔ وقت اپنا احساس دلائے بغیر گزرنے لگا۔

''گداؤ یقیناً بہت چوکنا ہوگا...'' میں نے لیٹرین کی چھت کی سمت دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ گداؤ کو کسی صورت بھی نیند نہیں آئے گی اور اسے دھیمی دھیمی روشنی میں کھیت بھی نظر آ رہے ہوں گے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ رات بہت گہری ہو چکی ہے۔

وقت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ وقت کے قدم بوجھل تھے۔ میں نے سیدھا لیٹ کر ایک بار پھر ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ نگاہیں آسمان کی سمت تھیں، لیکن کان بیرونی دیوار کے پار کسی آہٹ کے منتظر تھے۔

اس کے ساتھ ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے... کھیت میں کچھ دور سرسراہٹ سی سنائی دی...

کھیت میں سرسراہٹ آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی...

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی پگڈنڈی چھوڑ کر بیرونی دیوار کی جانب آ رہا ہے... گلنازی نے فوراً تکیے سے سر اٹھایا، اس نے بھی سرسراہٹ سن لی تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سر نیچے کی سمت رکھنے کو کہا۔ اندھیرے میں اس نے میرا اشارہ دیکھا تھا یا نہیں، اس نے سر دوبارہ تکیے پر رکھ دیا... قریب آتی ہوئی سرسراہٹ بیرونی دیوار سے کچھ دور ختم ہو گئی... تاریکی میں... شاید آنے والوں کو پگڈنڈی کا مکمل اندازہ نہ تھا، اس لیے وہ بار بار خریف کی فصل میں بلند ہوتے ہوئے پودوں سے گھسٹ جاتے تھے... پھر خاموشی سی چھا گئی۔ مجھے گزرتے ہوئے لمحے دل کی دھڑکن محسوس ہو رہے تھے۔

''ممکن ہے کوئی جانور ہو'' میں نے لیٹے لیٹے بیرونی دیوار کی سمت دیکھتے ہوئے سوچا۔ خیالات کی رفتار تیز تھی... سرسراہٹ اس انداز کی تھی جیسے کوئی بڑا جانور کھیت سے گزر رہا ہو۔ ''جو بھی ہوگا، گداؤ کو تو نظر آ ہی گیا ہوگا۔ گداؤ نے تو اسے دیکھ ہی لیا ہوگا۔''

''سرر سرر سرر...'' میرا ہاتھ تیزی سے تکیے کے نیچے گیا، میں نے ٹارچ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میری نگاہیں بیرونی دیوار پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ ''سرر سرر...''

یوں محسوس ہوا جیسے بیرونی دیوار کی سمت آنے کے لیے کوئی پگڈنڈی سے کھیت میں اترا ہو۔ چھت پر تمام چارپائیوں میں چرچراہٹ سی ہوئی۔ میرے منع کرنے کے باوجود سب نے سرسراہٹ پر ردِ عمل ظاہر کر دیا تھا... لیکن سب خاموش تھے — سب چارپائیوں پر ساکت تھے۔

میری بھنچی ہوئی آنکھیں پوری قوتِ بینائی کے ساتھ بیرونی دیوار کی سمت تھیں، جہاں تاروں کی مدھم مدھم روشنی میں ایک دھندلی سی لکیر نمایاں تھی۔ یہ لکیر بالائی دیوار کا حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ دیوار کے زیریں حصے پر گہری تاریکی تھی۔ سرسراہٹ دیوار کے پاس آ کر تھم گئی۔

ایک ایک لمحہ ٹھہرا ٹھہرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میری نظریں لیٹرین کی چھت پر گئیں۔ وہاں پہلے جو مٹی کا ڈھیر نظر آ رہا تھا، اب بڑی سیاہ گٹھڑی بن چکا تھا۔ گداؤ نظروں سے اوجھل تھا... میرے رونگٹے

ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ بیرونی دیوار کے پیچھے دھیمی سی آواز سنائی دی جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو۔

میں خود حیران تھا کہ اچانک ہی میری قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ دیوار کے پیچھے کسی کے ہونے کا احساس سرگوشی نما آواز سے ہوا اور کسی شک و شبہے کے بغیر مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ حملہ آور آ گئے ہیں۔ میری گرفت ٹارچ پر سخت ہو چکی تھی — چند لمحے بہت ہی بوجھل تھے۔

اچانک مجھے دیوار پر دو سیاہ دھبے سے نظر آئے جو دھندلی لکیر پر نمایاں تھے۔ پھر اوپر کی سمت کوئی تاریک سی شے دیوار سے اٹھتی نظر آئی — تکون نما شے . . .

اس تکون نما شے سے روشنی کی ایک بہت ہی مدھم شعاع سی نکلی، صحن میں اِدھر اُدھر لہرائی اور پھر چارپائی پر ٹھہر گئی — یہ یقیناً انگلی جتنی چھوٹی ٹارچ کی روشنی تھی۔ اس مدھم سی روشنی نے مجھے دیوار سے اوپر اٹھے ہوئے جسم کا احساس دلایا۔ دیوار سے اوپر اٹھنے والے نے اپنا سر اور کندھے چادر سے ڈھانپ رکھے تھے اور اس کا اوپر والا دھڑ تکون نما نظر آ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے ٹارچ کی دھیمی سی شعاع تاریکی میں ڈوب گئی۔ تکون نما جسم بھی پیچھے کی سمت اتر گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹارچ کی مدھم شعاع میں کسی مالا میں پرویا ہوا منکا چمکا ہو — جھلک دکھا گیا ہو۔

وہ ملنگ ہی تھا۔ دیوار کے پیچھے پھر دھیمی سی آواز ابھری۔

میں دور چھت پر تھا، لیکن یہ دھیمی سی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ گداؤ مکمل طور پر خاموش تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ملنگ کے دیوار پر چڑھنے اور پھر صحن میں اترنے کا منتظر تھا۔

بیرونی دیوار کے بالائی حصے پر پھر حرکت سی ہوئی . . . لمحے سنسناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ملنگ شاید دیوار پر چڑھ رہا تھا . . . میں مضبوطی سے ٹارچ پکڑے، اچھلنے کے لیے تیار تھا، لیکن تکون نما شے دوبارہ دیوار کے پیچھے اتر گئی۔

پھر یوں محسوس ہوا کہ دیوار کی دوسری جانب سے کسی نے دیوار پر کوئی شے رکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تکون نما جسم پھر دیوار کی بالائی لکیر پر ابھرا۔ اس بار گھسٹنے کی آواز آئی۔ گلنازی نے پھر تکیے سے سر اٹھایا، پھر رکھ دیا . . . تکون نما جسم مزید اونچا ہو گیا۔ یوں لگا جیسے باہر کسی نے اسے اوپر اٹھایا ہوا

ہو۔اوپر اٹھنے والے ملنگ کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔اسے دیوار کے پیچھے موجود دوسرے ملنگ نے یقیناً کمر سے پکڑ کر اوپر اٹھایا ہوا تھا۔اوپر اٹھے ہوئے ملنگ کے بائیں ہاتھ میں انگشت نما ٹارچ تھی۔ ٹارچ سے مدھم سی شعاع نکلی، صحن میں دائیں بائیں گئی، برآمدے کی سمت آئی اور پھر پیچھے ہٹتے ہوئے چارپائی پر ٹھہر گئی۔ مجھے اسی ٹارچ کی مدھم روشنی میں اوپر اٹھے ہوئے ملنگ کے دائیں ہاتھ میں موٹی سی رسی نظر آئی۔ٹارچ کی شعاع چارپائی کے وسط میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ملنگ نے رسی کو ایک سمت سے پکڑ رکھا تھا۔تیسری بار میرے رونگٹے کھڑے ہوئے... ملنگ کے ہاتھ میں رسی نے بل کھایا تھا...

انتہائی سرعت سے، ملنگ کے ہاتھ میں اوپر کی سمت جنبش ہوئی۔ پھر اس نے بل کھاتی رسی کو گھما کر چارپائی پر پھینکا۔نشانہ اس قدر درست تھا کہ بل کھاتی رسی چارپائی پر گاؤ تکیے اور گدے کے درمیان گری... اس کے ساتھ ہی ''ہال اوئے!'' کی قدرے بلند آواز ابھری اور ملنگ دیوار سے پیچھے کی سمت گرا۔

گداؤ کی اینٹ کام کر چکی تھی! میں چھلانگ لگا کر اٹھا، ٹارچ جلائی، سیڑھیوں کی سمت گیا۔ ٹارچ سے صحن روشن ہو گیا... اس کے ساتھ ہی پھنکار سنائی دی۔

ایک کوبرا پھن پھیلائے چارپائی پر نظر آیا۔

گداؤ نے ایک دو اینٹیں باہر کی سمت پھینکیں، لیکن صحن میں پھنکار سن کر وہ تیزی سے غسل خانے کی چھت پر آیا۔ میری ٹارچ کا رخ صحن میں چارپائی کی طرف تھا، لیکن سارا صحن روشن ہو چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیزی سے میرے پیچھے سیڑھیوں پر آیا ہے — بھائی، ماسی جیراں یا گلنازی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھ بھی نہ سکا۔

''بیٹری نہ بجھے...'' گداؤ نے صحن میں اترتے ہی گھٹی گھٹی چیختی آواز میں کہا، ''بیٹری نہ بجھے صاب... ماریا جاساں...'' (ٹارچ جلتی رہے صاحب، ورنہ مارا جاؤں گا...)

گداؤ کی آواز میں تھرتھراہٹ سی تھی۔ وہ کوبرے کو دیکھ چکا تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیوں پر اترنے لگا۔ میرے قدم چھت سے نیچے کی سمت تیسری سیڑھی پر ہی تھے کہ مجھے اپنی بغلوں کے نیچے، آگے کی سمت آتے ہوئے دو ہاتھ محسوس ہوئے جنھوں نے بے حد تیزی اور پھرتی سے میرے سینے پر

دائیں بائیں جاتے ہوئے مجھے جکڑ لیا۔

وہ گلنازی تھی۔

''چھوڑ مجھے... چھوڑ...''میں نے بھی گھٹی گھٹی آواز میں چیختے ہوئے کہا۔

''نہ چھڈ دی...''(نہیں چھوڑتی) گلنازی نے اپنی خوبصورت لیکن گھبرائی ہوئی آواز میں سرگوشی سی کی۔

''چھوڑ مجھے...''میں نے جھنجھلا کر کہا،''صحن میں ناگ ہے۔''

''نہ چھڈ دی...''

گلنازی نے مجھے اس قدر زور سے جکڑ لیا تھا کہ میں پوری قوت کے ساتھ بھی اس کی گرفت سے نہ نکل سکا۔ صحن میں گداؤ ہاکی پکڑے آہستہ آہستہ چار پائی کی سمت بڑھ رہا تھا۔ سانپ کا رخ گداؤ ہی کی طرف تھا، پھن کھلا ہوا تھا، پھنکار کی آواز چھت پر پہنچ رہی تھی، کوبرا نہایت غصے میں تھا۔ پھر گداؤ کا ہاتھ کندھے پر پڑی تولیہ نما چادر کی سمت گیا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے کندھے سے چادر اتاری... میں نے گلنازی کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے خود کو چھڑانے میں ذرا سی بھی غلطی کی تو میں گلنازی سمیت سیڑھیوں پر لڑھک جاؤں گا اور ٹارچ بجھ جائے گی۔ گلنازی نے اس انداز سے مجھے پکڑا ہوا تھا کہ میرے لیے دائیں بائیں ہلنا بھی دشوار تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بھائی اور ماسی جیراں چھت کی منڈیر سے لگے نیچے صحن میں دیکھ رہے ہیں۔ گداؤ نے کندھے سے چادر اتار کر تیزی سے اس کا گولہ سا بنایا اور کوبرے کے سامنے چار پائی پر پھینکا۔ کوبرے کا پھن ڈسنے کے انداز میں گولے سے ٹکرایا اور کوبرا چادر کے بنے گولے سمیت چار پائی پر گاؤ تکیے اور گدے کے درمیان گرا۔ کوبرا انتہائی چالاک اور پھرتیلا تھا — اس سے پہلے کہ گداؤ کی ہاکی اس کے پھن پر پڑتی، وہ گھوم گیا۔ گداؤ کا وار خالی گیا۔ کوبرے سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ صورت حال انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ اگر وہ زمین پر ہوتا تو یا تو وہ گداؤ پر حملہ کرتا یا تیزی سے جان بچانے کے لیے بھاگتا۔ وہ چار پائی پر تھا۔ تیزی سے وہ چار پائی کی پائینتی کی سمت گیا۔

''چھوڑ مجھے!''میری آواز میں غصہ تھا۔''گداؤ نیچے اکیلا ہے... چھوڑ مجھے۔''

''نہ چھڈ دی...''گلنازی کی گرفت میرے بدن پر اس قدر مضبوط ہوگئی کہ مجھے سانس لینی

بھی دشوار محسوس ہو رہی تھی۔ گداؤ نے بڑی دلیری سے، پائینتی کی طرف نیچے اترتے ہوئے سانپ پر ہاکی کا وار کیا جو چارپائی کی سخت لکڑی اور کوبرے کے جسم پر ایک ساتھ لگا۔ کوبرا زخمی ہو کر چارپائی سے نیچے گرا اور درد کی شدت میں پائینتی کے نیچے کنڈلی سی بنا کر گول گول گھومنے لگا۔ وہ اب بھی بار بار پھن کھول اور بند کر رہا تھا۔ اس کی پھنکار میں الٹا چلنے والے جلیبی سانپ کا سا شور تھا جو مسلسل جسم کو رگڑتا رہتا ہے۔ گداؤ نے گول گول چکر کھاتے کوبرے پر پھر ہاکی ماری۔ مزید زخمی ہو کر سانپ جیسے سکڑا۔

''چھوڑ نا، گلنازی!'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا،'' اب تو چھوڑ...''

''نہ چھڈ دی...'' گلنازی نے مجھے پیچھے کی سمت کھینچا۔

نیچے صحن میں ٹارچ کی روشنی سیدھی سانپ پر تھی۔ کوبرے نے تھوڑا سا پھن کھولا... پھن پھیل کر سکڑا اور پھر سرنمایاں ہو گیا۔ گداؤ کی ہاکی اس بار سیدھی سر پر پڑی اور سر کچلا گیا۔ گداؤ نے اوپر ہماری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کھنچاؤ تھا۔ پھر اس نے بیرونی دیوار کی سمت دیکھا۔ ملنگ کھیتوں میں بھاگ چکے ہوں گے۔

مجھے پہلی بار اپنے بدن پر، سینے کے دونوں جانب، گداز بانہوں کا احساس ہوا۔ پھر پشت پر نسوانی بدن کا عجیب سا گدگدا احساس ہوا۔ میرے بدن میں ایک انجانی سی کیفیت کی لہر اٹھی، جس سے میں نا آشنا تھا۔ گلنازی کا چہرہ میری گردن کے بالکل قریب تھا۔ اس کی گرم گرم سانس مجھے اپنے کانوں کے نیچے محسوس ہو رہی تھی... پھر اس کا چہرہ کچھ آگے بڑھا، میرے بائیں رخسار سے مس کرتا ہوا اس کا دایاں رخسار آگے بڑھا اور پھر گلنازی کے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قریب مجھے مس کرتے محسوس ہوئے... ہونٹوں کے اس لمس سے میرا چہرہ یقیناً سرخ ہو گیا ہو گا۔

''چھوڑ...'' ماسی جیراں کی غصے سے بھری لیکن گھٹی گھٹی آواز آئی۔ وہ گلنازی کے پیچھے سیڑھی پر کھڑی تھی۔'' چھوڑ... چھوڑ اُساں...'' (چھوڑ اسے)

میرے بدن پر گلنازی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے ہونٹ پیچھے ہٹے، رخسار میرے رخسار سے مس کرتا ہوا پیچھے گیا اور دونوں بازو میرے بازوؤں کو اپنا احساس دلاتے ہوئے پیچھے کی سمت بغلوں سے نکل گئے۔ گلنازی تیزی سے ماسی کی سمت مڑی۔

''ڈنگ جاندا تے؟'' (ڈس لیتا تو؟) گلنازی نے دھیمے لیکن پر جوش انداز میں کہا اور ماسی جیراں خاموش ہوگئی۔ چند لمحوں بعد بھائی بھی ہمارے ساتھ سیڑھیوں سے اترے۔ہم صحن میں چارپائی کے پاس آئے۔رقیہ یقیناً بوبے کو چھاتی سے لپٹائے چارپائی پر ہی ہوگی، وہ چھت سے نیچے نہ اتری۔ہم دائرہ سا بنا کر کوبرے کو دیکھ رہے تھے جس کی دُم ابھی تک ہل رہی تھی۔سانپ کا سر جیلی بن چکا تھا۔

''تساں دے ہتھاں اچ کیڑے پون ملنکو!'' (تمھارے ہاتھوں میں کیڑے پڑیں ملنکو!) ماسی جیراں نے کہا۔

''تو یہ ہے کالی بلا!'' بھائی نے کوبرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔پھر وہ میری سمت ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔بھائی کی نظروں سے میں جھینپ سا گیا۔سیڑھیوں پر رقیہ نظر آئی۔گلنازی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف گئی اور چار پانچ سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

''بچ گیا ماسی!'' گلنازی کی خوبصورت آواز میں خوشی کا تاثر اور بھی خوبصورت محسوس ہوا۔ ''بُوبا بچ گیا ماسی!''

گداؤ کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی۔رقیہ پل بھر کے لیے نیچے آئی، کوبرے کو دیکھا اور تیزی سے واپس مڑی۔چھت پر بُوبا اکیلا تھا۔

''اب نہ ڈر رقیہ بہن...'' گداؤ نے کہا،''تیرا بُوبا سلامت ہے... تو سلامت ہے... ذرا بھی نہ ڈر... اب بُوبے کو کچھ نہیں ہوگا۔''

رقیہ گداؤ کی بات سن کر بھی نہ رکی۔سیڑھیاں چڑھ گئی۔گداؤ نے ہماری طرف دیکھا۔ گلنازی ماسی جیراں کے پاس کھڑی ہوگئی۔

''دو تھے،'' گداؤ نے کہا۔''موٹا تو نیچے کھڑا تھا، لمبی ٹھوڑی والا دیوار پر چڑھنے لگا تھا۔اسے نیچے سے موٹے نے کمر سے پکڑ رکھا تھا۔پہلے تو وہ اپنی چھوٹی بیٹری سے صحن میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر واپس نیچے اترا۔اس نے موٹے کو سرگوشی میں بتایا کہ ماں بچہ چارپائی پر سو رہے ہیں۔پھر صاب، اس نے دیوار پر بڑی سی پٹاری رکھی... میں چونک گیا — ایسی پٹاری میں تو ناگ ہوتا ہے۔موٹے نے اسے رانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔اس نے پھر بیٹری سے چارپائی کی دوری کا اندازہ کیا، پٹاری کا

ڈھکن اٹھا کر باہر پھینکا۔ اس نے ناگ پھینکا، میں نے اینٹ چلائی ۔ ۔ ۔ کس کر ۔ ۔ ۔ '' گداؤ نے گہری سانس لی۔'' دھونے تے وتی اے، اپنے پیریں نہ جاسی!'' (گردن پر لگی ہے، اپنے پیروں پر چل کر نہ جا سکے گا!) گداؤ نے مقامی زبان اور لوچ دار لہجے میں کہا۔

بھائی نے مجھ سے ٹارچ لی اور روشنی کو برے پر سیدھی ڈالی۔

'' یہ اس علاقے کا کوبرا نہیں ہے،'' بھائی نے کہا۔ ان کی آواز میں حیرت تھی۔'' یہ کلیجی رنگا کوبرا اس علاقے میں نہیں ملتا۔ یہ دھنی کے علاقے کا ہے۔''[43]

گداؤ سانپ کے پاس بیٹھ گیا۔

'' ٹھیک کہہ رہے ہیں صاب جی،'' گداؤ نے کہا۔'' یہ جہلم پار[44] کا ناگ ہے۔''

'' یہ بہت زہریلا ہوتا ہے،'' بھائی نے کہا۔'' اس کا زہر انتہائی نیوروٹاکسک (neuro toxic) ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ '' بھائی کی میڈیکل ٹرم سب کے سروں پر سے گزر گئی۔ ماسی نے جھک کر ناگ کو دیکھا۔

'' تیڈا ککھ نہ رَوے ملنگا، تیڈے ہتھ ٹٹن ۔ ۔ ۔ '' (تیرا تنکا بھی نہ رہے یعنی تیرا کچھ نہ رہے ملنگ، تیرے ہاتھ ٹوٹیں!)

'' یہ کیوں نہیں کہتی ماسی ۔ ۔ ۔ '' میں نے کہا،'' تیرا ککھ نہ رووے پیرا!'' (تیرا کچھ نہ رہے او پیر!)

ماسی نے میری طرف دیکھا۔ ماسی کی آنکھیں بھنچی بھنچی سی تھیں۔

'' حرامی!'' گداؤ نے کہا۔'' مجھ سے میگھا پتن میں حجرے میں جانے سے پہلے وضو کرایا، گھسے چموائے ۔ ۔ ۔ اور کرتوت یہ — حرامی!''

'' تو یہ قصہ ہے کالی بلا کا،'' بھائی نے کہا۔

'' میں جانتا تھا،'' میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔'' جانتا تھا کہ پیر ایسا ہی کرے گا، کیونکہ اس کے آباؤ اجداد صدیوں سے یہی کچھ کرتے آرہے ہیں۔ نہ جانے کتنی ماؤں کی گودیں اجڑی ہوں

43۔ ضلع اٹک میں تحصیل فتح جنگ، تحصیل پنڈی گھیب اور تحصیل تلہ گنگ کو دھنی کا علاقہ کہا جاتا ہے۔

44۔ دریائے جہلم کے شمالی علاقے کو جہلم پار کہا جاتا ہے۔

گی ۔ پیروں نے نہ جانے کتنے بچوں کو قتل کیا ہوگا، کتنی ماؤں کی آنکھوں کو ویران کیا ہوگا۔ اگر میں ان پیروں کو انسانیت کے سب سے بڑے دشمن کہتا ہوں تو غلط نہیں کہتا۔''

بھائی نے گداؤ کی طرف دیکھا۔

''اس معاملے کی خبر پولیس کو کر دینی چاہیے،'' انھوں نے کہا،'' تم صبح میرے ساتھ کالرے چلنا، میں ایف آئی آر لکھواؤں گا۔''

''نہ صاب... اب نہیں...'' گداؤ نے کہا۔'' ایسی غلطی نہ کریں۔ ہم ملنگ کو پکڑ نہیں سکے۔ کالرے کا تھانیدار پیر نور شریف کا مرید ہے۔ وہ اور کا اور کیس بنا دے گا... ایسی غلطی نہ کریں۔''

بھائی انگلیوں سے اپنی ٹھوڑی کھجانے لگے۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''اگر چار پائی پر...'' بھائی نے کہا،'' اگر رقیہ اور بُوبا چار پائی پر ہوتے تو کسی ایک کی موت یقینی تھی۔ اس کوبرے کا...'' انھوں نے چار پائی کی پائینتی کی سمت دیکھا۔'' اس کا زہر تو تین منٹوں میں تگڑے سانڈ کو بھی ختم کر سکتا ہے۔''

''پولیس کچھ نہیں کرے گی صاب، الٹا ہم کو ہی تھانے کے چکر لگانے پڑیں گے،'' گداؤ نے کہا۔

''یہاں کوئی کیا کرے...'' بھائی نے بے بسی سے کہا،'' ہر سمت جال سا بچھا ہوا ہے۔''

ماسی جیراں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیوں کی سمت مڑی۔ گلنازی بھی مڑی۔ بھائی نے بھی سیڑھیوں کی سمت قدم اٹھایا۔

''اسے صبح باہر پھینک دینا،'' انھوں نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے گداؤ کی طرف دیکھا۔

''بیبیوں کو دیکھ لینے دیں صاب!'' گداؤ کے لہجے میں فخر سا تھا۔'' پھینک دوں گا۔''

گداؤ کے دل میں بھابھی اور بہنوں کو اپنا کارنامہ دکھانے کی خواہش موجود تھی، اور یہ خواہش جائز بھی تھی۔ گداؤ نے جس قدر دلیری سے کوبرے کا مقابلہ کیا تھا اس سے یہ مفروضہ غلط ثابت ہو گیا تھا کہ میراثی لوگ بہت ڈرپوک ہوتے ہیں۔

''مجھے افسوس ہے گداؤ،'' میں نے کہا،'' میں تمھاری کوئی مدد نہ کر سکا۔''

گداؤ نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔

''جس حالت میں آپ تھے نکے صاب،'' اس نے ہنستے ہوئے کہا،'' بیٹری کا رخ چار پائی کی سمت رکھنا اور بجھنے نہ دینا ہی میری بہت بڑی مدد تھی۔''

میں گھبرا گیا۔ گداؤ نے گلنازی کو مجھ سے لپٹے ہوئے دیکھ لیا تھا... دیکھا تو ماسی جیراں نے بھی تھا، بھائی نے بھی تھا۔

''وہ مجھے نیچے آنے ہی نہیں دیتی تھی۔'' میری آواز میں ندامت تھی۔

''اس نے بہت اچھا کیا صاب!'' گداؤ نے کہا۔'' آپ نہیں جانتے کہ اس نے آپ کے لیے کیا کیا ہے۔'' گداؤ چار پائی کی سمت مڑا۔ چار پائی سے گدا اور گاؤ تکیہ اٹھایا۔ وہ برآمدے میں گیا۔ میں نے ٹارچ کا رخ برآمدے کی سمت کر دیا۔ گداؤ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چادر اور تکیہ تھا۔ وہ چار پائی کی طرف بڑھا۔

''یہیں سوؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں صاب،'' گداؤ نے کہا،'' اب وہ مت آئے... اب کیا... وہ کبھی اِدھر منہ بھی نہ کریں گے۔''

''ٹھیک کہتے ہو گداؤ،'' میں نے کہا،'' مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔ ان کا پیر بہت مکار آدمی ہے۔ وہ اس واقعے کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی جائے گا۔''

گداؤ چار پائی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاصا پراعتماد تھا۔

''آپ بھی چھت پر جا کر سو جائیں،'' اس نے کہا۔'' ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔''

میں سیڑھیوں کی سمت مڑا ہی تھا کہ ماسی جیراں اور گلنازی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھیں۔

''ہمیں تو اب اجازت دے پتر...'' ماسی جیراں میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا۔'' تو نے رقیہ اور بوبے کی جان بچائی ہے، میرا لُوں لُوں (رواں رواں) تجھے دعائیں دے رہا ہے... تو بہت سیانا ہے، بہت ہی سیانا... اور سچا بھی ہے... میری دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی۔ اب اجازت دے... بہت رات باقی ہے، ہم چلی جائیں گی پتر...''

گلنازی کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک مجسم مسکراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

''گداؤ کو ساتھ لے جا، ماسی،'' میں نے کہا،'' راستے میں کتے ہوں گے۔''

''نہیں،'' ماسی جیراں نے کہا،'' کوئی ضرورت نہیں۔ تندروالی ہوں، گاؤں کے سب کتے مجھے پہچانتے ہیں پتر۔''

گلنازی کا دھیما سا قہقہہ ابھرا۔

''ٹھہر ماسی،'' گداؤ نے کہا،'' دروازے پر اندر سے تالا لگا ہوا ہے۔'' گداؤ دروازے کی سمت گیا۔ اس کے پیچھے ماسی اور ماسی کے پیچھے گلنازی تھی۔ اچانک ہی گلنازی تیزی سے مڑی، ٹارچ کی روشنی میں اس کا تمتمایا ہوا چہرہ چمک سا گیا۔ جس طرح چھوٹے بچے اور بچیاں، دوسرے بچوں اور بچیوں کو چڑانے کے لیے ناک سکوڑتی ہیں، گلنازی نے شرارت بھری، چمکتی مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ناک سکوڑی۔ پھر تیزی سے مڑی، اس کے ماتھے کے قریب لٹکی ہوئی زلف لہرا سی گئی۔

ماسی اور گلنازی کے چلے جانے کے بعد گداؤ صحن میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہی ٹارچ بجھا دی۔ ہر سمت گہرا اندھیرا چھا گیا۔ چھت پر پہنچتے ہی مجھے دھیمی دھیمی روشنی میں یوں محسوس ہوا جیسے رقیہ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا ہو۔ ستاروں کی دھیمی روشنی گہرے اندھیرے میں بھی اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ چھت پر گرمی کا احساس اگرچہ کم تھا، لیکن جسم پر پسینے کے قطروں سے ناگواری سی تھی۔ اس گرمی میں بھی رقیہ نے بوبے کو چھاتی سے لپٹایا ہوا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹتے ہی نیچے صحن کی سمت دیکھا۔ گداؤ کی چارپائی اندھیرے ہی کا حصہ تھی۔ گداؤ واقعی بہت دلیر تھا۔

''کسی غیر معمولی حالت میں حواس کی صلاحیت کئی گنا کیوں بڑھ جاتی ہے؟'' ستاروں کو دیکھتے ہوئے یہ سوال میرے ذہن میں نمودار ہوا۔'' جسم تو وہی ہوتا ہے، جسم میں موجود ہر قسم کی صلاحیت بھی وہی ہوتی ہے، جسمانی قوت بھی وہی ہوتی ہے۔ پھر کسی غیر معمولی حالت میں قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت کئی گنا بڑھ کیوں جاتی ہے؟ اس کی طبی توجیہہ کیا ہوگی؟''

پھر مجھے اپنی بغلوں کے نیچے سے دو لمبی نازک انگلیوں والے ہاتھ سینے کی جانب بڑھتے محسوس ہوئے... لمبی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا، جو بڑھتے ہوئے دونوں جانب سے ایک دوسرے میں پیوست ہوگئیں اور پھر ان نازک انگلیوں میں اتنی زیادہ قوت کا احساس ہوا کہ میرا سینہ جکڑا گیا...

پھر مجھے پشت پر گدگدے نسوانی جسم کا احساس ہوا اور میرے پورے بدن میں سنسناتی ہوئی اجنبی کیفیت لہر پر لہر بن کر دوڑی — اس مردانہ کیفیت سے میں زندگی میں پہلی بار آشنا ہوا تھا۔

''گلنازی مجھے چاہتی ہے...''میں نے سوچا۔''نادان دیہاتی لڑکی... یہ بھی بھول چکی ہے کہ وہ ماسی کے بھتیجے محمد اکبر خان کی منگیتر ہے... دیہاتوں میں رہنے والے منگیتر کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ ماسی اپنے بھائی کو زبان دے چکی ہے۔ یہ دیہاتی زبان کی خاطر مرمٹ جاتے ہیں... گلنازی کو روکنا ہوگا۔ وہ بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ خواہش نے اس کے دل پر اتنی مضبوط گرفت ڈال دی ہے جتنی کہ اس کے بازوؤں نے میرے بدن پر ڈالی ہے۔''

ان خیالات کے ساتھ ہی مجھے اپنے سینے کے اطراف سے بھی انگلیوں والے نازک سے ہاتھ پیچھے ہٹتے محسوس ہوئے۔ پشت پر نسوانی جسم کا گدگدا احساس بھی مٹ سا گیا۔ گدگداہٹ کے احساس سے پیدا ہونے والی اجنبی کیفیت بدن کے زیریں حصے ہی میں ٹھہر گئی، جیسے اسے میری چھاتی اور پشت کی سمت آنے سے اجتناب ہو۔ مردانہ کیفیت کا احساس جلد ہی ساون کے بادلوں سے گرتی ہوئی اس بوند کی مانند ہو گیا جو جیٹھ اساڑھ کی تپتی جھلستی مٹی میں گر کر پل بھر ہی میں خشک ہو جاتا ہے۔

''ناآسودہ خواہش سے بڑھ کے اذیت ناک کیفیت شاید ہی کوئی اور ہوگی؛''میں نے سوچا۔ ''میں خواہش کی مکمل ناآسودگی سے آشنا تو نہیں ہوں، لیکن مجھے اس کا احساس ضرور ہے۔ رومانوی کہانیاں پڑھتے ہوئے میں نے اس اذیت کو کسی حد تک محسوس تو کیا ہی ہے۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سونا چاہتا تھا، لیکن خیالات کی لہریں بہت تند تھیں۔

''میں نے گوشِ تصور سے رانجھے کی بانسری میں اس کے دل کی چیخیں تو سنی ہیں، میں نے عزت بیگ (مہینوال) کو دریائے چناب کے کنارے کسی فقیر کی چھوڑی ہوئی کٹیا کے فرش پر، خس و خاشاک کے سوکھے ہوئے بستر پر، ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے تو دیکھا ہے۔ میں نے فرہاد کے تیشے کی ہر ضرب اس کے سینے پر لگتی تو محسوس کی ہے۔ میں نے وکرم کو مرغزار میں پھولوں، تتلیوں اور بھونروں سے دیوانہ وار باتیں کرتے تو سنا ہے۔ میں نے ہیر کو کھیڑوں کی حویلی میں دیواروں سے سر پٹختے تو دیکھا ہے۔ میں نے سوہنی کے چہرے پر عشق اور موت کے سربستہ راز کو افشا ہوتے تو دیکھا ہی ہے جو عشق کی دہکتی آتش پر، خواہش کے شعلوں پر پختہ ہونے کے بعد، موت کی کچی مٹی کی مانند اپنے خام

ہونے کا احساس بھی دلا دیتا ہے اور دل کی ہر تمنا حقائق کی تند لہروں میں بھر بھری ہو کر بہہ جاتی ہے۔ دریا کی لہروں پر چند دل دوز چیخوں کے سوا کوئی آواز بھی نہیں تیرتی۔ میں نے شیریں کو کیخسرو کے دربار میں دوزانو ہو کر اپنے آنسوؤں سے کیخسرو کے پاؤں بھگوتے بھی دیکھا ہے، جب وہ اپنے بدن کی قیمت پر، اپنی آبرو کے عوض، فرہاد کی زندگی مانگ رہی تھی۔ میں نے اُروَسی کو وِکرم کے بجوگ میں شدتِ غم میں پلکوں سے وہ خون کے آنسو گراتے دیکھا ہے جسے راج ہنس موتی سمجھ کر چگنے کے لیے آ گئے ہوں اور اس منظر کو دیکھ کر جھیل کا پانی ساکن ہو گیا ہو... میں ناآسودگی کی مکمل کیفیت سے ناآشنا ہی سہی، میری حالت اس بچے کی سی تو ہے جو کسی دریا کے کنارے ریت پر بیٹھا، پاؤں سے گھروندا بنا رہا ہو، لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو کہ پاؤں پیچھے ہٹانے پر، گھروندا ٹوٹ جانے پر اسے کتنا دکھ ہوگا۔''

میں نے ستاروں کے جھرمٹ کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھا۔

''گلنازی نے گھروندا بنانا شروع کر دیا ہے... '' ستارے ٹمٹما رہے تھے۔''اس سے پہلے کہ وہ اپنا پاؤں پیچھے کھینچے اور گھروندا ٹوٹ جائے، اسے روکنا ہوگا۔''

ستاروں کے جھرمٹ اب بھی نیچے لٹکے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، لیکن وہ کشمکش زدہ خوف جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، اب کہیں بھی نہ تھا۔ وہ خوف ہمیشہ کے لیے چھت سے نیچے اتر چکا تھا، صحن کو پار کر چکا تھا، بیرونی دیوار کے پیچھے کھیت کی پگڈنڈی پر ڈھیر ہو چکا تھا، کھیتوں کی نباتات میں سے گھسٹتا ہوا پرانی حویلی کے کھنڈرات کی سمت جا چکا تھا— زخمی، سہما اور سمٹا ہوا... میں نے سر گھما کر صحن کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بیرونی دیوار کا احساس بھی مٹ چکا تھا۔ ہیجانی کیفیت میں بڑھ جانے والے حواس، آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے، اپنی عمومی صلاحیت تک آ گئے تھے۔ حواس میں جو تیزی پیدا ہو گئی تھی، وہ مٹتے مٹتے مٹ چکی تھی۔

''وہ کتنی خوبصورت ہے... '' میرے خیالوں کا سلسلہ پھر جذبات کی رو میں، نہر کے بہتے دھاروں کی طرح بہنے لگا۔'' وہ دل کی بھی کتنی اچھی ہے، بچوں جیسی، بھولی بھالی، کسی چھوٹے سے ببول کی نازک سی شاخ پر بیٹھی فاختہ جیسی، کسی جھاڑی کی پتلی سی ٹہنی پر خوشی سے جھومتی چڑیا کی طرح... وہ کتنی خوبصورت ہے... ''

مجھے پھر اپنے بدن پر گلنازی کے بازوؤں کی مضبوط گرفت محسوس ہوئی۔

''اس کے بازو کتنے گداز ہیں... لیکن ان میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی؟ اس نے تو مجھے یوں جکڑ لیا تھا کہ میں ہل بھی نہ سکا تھا۔ گاؤں کے جفاکش ماحول میں پلی بڑھی ہے، طاقتور تو ہو گی ہی... لیکن اس کے بازو کس قدر گداز تھے۔ اس کے ہاتھوں میں نرمی بھی تھی۔ اس کی انگلیاں، لمبی انگلیاں کس قدر خوبصورت ہیں... شاید وہ بھی میری طرح ہیجانی کیفیت میں ہو گی۔''

مجھے ایک بار پھر نسوانی بدن کے احساس سے پیدا ہونے والی کیفیت پشت پر محسوس ہوئی اور پھر وہ میرے پورے بدن میں انجانی سی لہر بن کر دوڑنے لگی۔

''اس کے رخسار ریشمی ہیں... اس کے ہونٹ...''

مجھے یوں لگا جیسے میرا چہرہ پھر سرخ سا ہو گیا ہے۔

''نہیں نہیں...'' میں اپنے احساسات سے چونکا۔ ''یہ غلط ہے، ایسا ہونا غلطی ہو گی۔ جو بات ممکن ہی نہیں، اس سے وابستہ احساسات و جذبات بے معنی ہوتے ہیں... مجھے تو یہاں سے بیس پچیس دنوں تک جانا ہی ہے... یہ میں کیا سوچ رہا ہوں... نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

تلخ حقیقت بے حسی بن کر میرے بدن پر اتری۔ اس بے حسی میں مجھے اپنے ذہن میں ایک گنبد کا احساس ہوا جس میں خیالات، بے صدا ہونے کے باوجود، بازگشت کے ہونے کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

''نہیں، میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ گلنازی کو خواہش کی اس دلدل میں نہیں گرنے دوں گا۔ وہ محمد اکبر خان کی منگیتر ہے اور یہ دیہاتی لوگ منگیتر کی خاطر انتہا پسند ہو جاتے ہیں... گلنازی کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا... وہ گلنازی کو مار دیں گے... خواہش کی کالی بلا اسے مارے نہ مارے، غیرت کے اندھے عفریت اسے نہیں چھوڑیں گے... شاید میں بھی اندھی غیرت کے عفریتوں کا شکار ہو جاؤں گا... میں ڈرپوک نہیں ہوں، نہ ہی موت کا خوف کبھی مجھے کسی راستے پر جانے سے روکتا ہے، لیکن یہ راستہ ایسا ہے جس پر روشنی نہیں ہے اور قدم قدم پر گہراؤ ہیں، اور اس راستے پر اگر میں نے قدم رکھا تو میرے ہاتھ میں گلنازی کا ہاتھ بھی ہو گا... نہیں، میں گلنازی کو ہر حال میں روکوں گا...''

میں نے صحن میں مردہ کو برے کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ صحن میں ہر سمت تاریکی تھی۔ ہوا کے ایک دھیمے سے جھونکے نے احساس دلایا کہ رات ڈھل رہی ہے — ویسے بھی جون جولائی کی راتیں لمبی کہاں ہوتی ہیں۔ سب سو چکے تھے۔ بھائی، رقیہ . . . بوبا تو پہلے ہی سے سویا ہوا تھا، اور صحن میں گداؤ بھی سو چکا تھا۔

''گداؤ واقعی بہت دلیر ہے،'' میں نے سوچا۔ ''اس علاقے میں رہتے ہوئے بھی وہ پیر نور شریف کے سحر سے آزاد ہے۔ اس نے میری مدد کی، اور آج رات جس دلیری کا مظاہرہ کیا ہے وہ میں کبھی بھول نہ پاؤں گا . . . یہ بات سچ ہے کہ پیروں نے پسماندہ علاقوں میں اٹھانوے فیصد لوگوں کو اپنے سحر کا اسیر بنا رکھا ہے، لیکن ان ہی علاقوں میں ماسی جیراں کا شوہر حوالدار نذر حسین بھی تو تھا جو پیروں کے فریب سے آگاہ تھا . . . ان ہی علاقوں کا رہنے والا گداؤ بھی ہے جو پیر کی غلامی کی زنجیریں توڑ چکا ہے . . . وجہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ آزاد تو ہے . . . اور آج کے بعد ماسی جیراں، رقیہ اور گلنازی کے لاشعور پر سے پیر کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ وہ اپنے شعور کے ساتھ زندگی کے سفر میں آگے بڑھیں گی . . . سست رفتاری ہی سے سہی، یہ شعور ضرور پھیلے گا . . . ''

ڈھلتی رات میں بھی وقت کے قدم بوجھل تھے۔ میری آنکھوں کی نیند شاید پلکیں جھپکتے ستاروں کے پاس تھی۔

''کیا میں کسی داخلی بے تابی کا شکار ہو چکا ہوں؟'' میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ''وقت نہ جانے کیا ہوا ہوگا۔'' ہوا کے جھونکوں میں تیزی سی نمودار ہو رہی تھی۔ چار پائیوں پر بچھی چادروں کے لٹکے ہوئے حصوں میں پھڑ پھڑاہٹ سی پیدا ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی سی بھی تھی۔ ہوا کا رخ ہمیشہ سون سکیسر کے پہاڑوں سے جنوب مغرب کے میدانوں کی سمت ہوا کرتا ہے، اس لیے تیز ہوا میں فصلِ خریف کی خوشبو بہت کم ہوتی ہے، لیکن خنکی اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ رخ تبدیل بھی ہو جاتا تھا اور ہوا کے ہر جھونکے میں مکئی کے نرم، گہرے سبز رنگ کے بھٹوں کی خوشبو، جواری کے پھول نما خوشوں کی مہک، گھوڑوں اور دیگر چوپایوں کے لیے لگائے گئے برسیم اور شتالے[45] کی خوشبو رچی ہوا کرتی تھی۔

45۔ شتالا: گھوڑوں کا سبز چارہ، الفالفا (Alfalfa)۔

''مجھے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟'' میں نے پھر پہلو بدلا۔''اب نہ اضطراب ہے، نہ اندیشہ... مجھے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟'' چند لمحوں بعد دور سے اس چھوٹی سی جنگلی چڑیا کی آواز آئی جو سات سُروں کا گیان رکھتی ہے۔ یہ موسیقار چڑیا مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔''صبح تمام پرندوں سے پہلے بولنے والی اس چڑیا کی سرگم سن کر ہی شاید دوسرے پرندوں کو رات گزر جانے کا احساس ہوتا ہوگا۔''

اچانک رقیہ اٹھی — نہ جانے وہ رات بھر سوئی بھی تھی کہ نہیں۔ اس نے پھر بوبے کو یوں اٹھایا جیسے وہ ایک برس کا ہو۔ اس بار اسے سیڑھیوں سے اترنا تھا۔ بوبے نے اُوں وُوں کرتے ہوئے سر رقیہ کے کندھے پر رکھ دیا اور وہ اچھے خاصے بوجھ کو اٹھا کر نیچے صحن میں اتر گئی۔

''وہ کہاں جا رہی ہے؟'' میں گھبرا گیا۔''اس وقت اس کا کہیں بھی جانا ٹھیک نہیں۔'' میں اٹھنے ہی والا تھا کہ نیچے برآمدے کے اندر کمرے کی کنڈی کھلنے کی دھیمی سی آواز آئی۔ رقیہ اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ ابھی تک خوفزدہ تھی۔ میری سانس پھیپھڑوں سے یوں نکلی جیسے اسے کسی بندش نے روک لیا تھا...

''رقیہ بہت ڈر گئی ہے،'' میں نے سوچا۔''چھت پر میرے اور بھائی کے موجود ہونے کے باوجود وہ بہت خوفزدہ ہے۔ کمرے میں تو بہت گرمی ہوگی — بھابھی اور بہنیں بھی گھر پر نہیں ہیں۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

چھت پر گزرتی ہوئی ہوا میں موسیقار چڑیا کی آواز وقفے وقفے سے گزر رہی تھی۔ پہلی بار رات کے زوال پذیر لمحوں میں مجھے غنودگی کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں موند لیں — تصور میں پل بھر کے لیے گلنازی کا خوبصورت چہرہ نمایاں ہوا، چڑیا کی خوبصورت آواز آئی اور پھر ہر شے دھندلا گئی...

26

''اٹھو، دھوپ نکل آئی ہے!'' بھائی کی آواز پر میں بہت مختصر لیکن بہت گہری نیند سے بیدار ہوا۔ آہستہ سے اٹھا۔ آنکھوں میں خوابیدگی سی تھی، جس میں چھت پر اور آس پاس پھیلی ہوئی چمکتی

ہوئی دھوپ کا احساس پلکیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں منہ پر الٹا ہاتھ رکھے سیڑھیوں تک گیا۔ جسم میں سونے کے باوجود تھکن سی تھی۔ تیسرے زینے پر پاؤں رکھتے ہی مجھے اپنے پورے وجود میں ایک خوشگوار کیفیت کا احساس ہوا، جو ایک اٹھی ہوئی موج کی طرح میرے بدن سے بہت ہی لطیف انداز میں ٹکرا رہی تھی۔ گلنازی کا مجھے روکنے کے لیے مجھ سے لپٹنا یاد آیا۔ میرے ہونٹوں پر یقیناً مسکراہٹ بکھر گئی ہوگی۔ میں ٹھہر ٹھہر کر صحن میں اترا۔

صحن میں چارپائی کی پائینتی پر مرا ہوا کلیجی رنگا کوبرا مردہ حالت میں بھی کنڈلی مارے نظر آیا۔ میں نے ہینڈ پمپ پر منہ ہاتھ دھوئے، دانت صاف کیے۔ بیرونی دروازے سے بھابھی اور بہنیں تیزی سے اندر آئیں۔ ان کے ساتھ گداؤ بھی تھا۔ گداؤ نے انھیں راستے میں یقیناً سب کچھ بتا دیا تھا، تبھی وہ صحن میں آتے ہی سیدھی چارپائی کی پائینتی کی سمت گئیں۔ بھابھی پر تو جیسے سکتہ طاری تھا۔ گھبرائی ہوئی باجی زیبا زیرلب تلاوت کرنے لگیں۔ بہن عصمت مجھ سے ناراض تھیں کہ میں نے انھیں اس مہم میں کیوں شامل نہیں کیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟'' بہن عصمت نے کہا، ''میں ڈر جاتی، شور مچا دیتی؟'' گداؤ نے بہنوں کو ہر بات بتا دی تھی۔ بہن عصمت کی آواز میں غصہ بھی تھا۔ ''تم سے زیادہ دلیر ہوں میں — ایسے سانپ تو میں اپنی جوتی کے نیچے کچل سکتی ہوں۔'' عصمت کے اس جملے پر بھائی مسکرائے۔ گداؤ نے بھی مسکراتے ہوئے کوبرے کی طرف دیکھا۔ بہن عصمت کو یہ بات کہاں معلوم تھی کہ یہ کلیجی رنگا کوبرا اس قدر چالاک اور پھرتیلا ہوتا ہے کہ اکثر سپیرے نظر آنے پر اسے پکڑنے کے بجائے راستہ ہی بدل لیتے ہیں۔ برآمدے کی چق اٹھی۔ رقیہ باہر آئی۔ سیدھی بھابھی کی سمت گئی اور اس نے اپنا سر بھابھی کے کندھے پر رکھ دیا۔

''بی بی جی...'' رقیہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ بھابھی کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ بہن عصمت نے رقیہ کا ہاتھ پکڑا۔

''حوصلہ کر رقیہ،'' عصمت نے کہا، ''خطرہ ٹوٹل گیا — ہمارا بُوبا بچ گیا۔''

''میرے بوبے کو مارنے آئے تھے...'' رقیہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ برآمدے سے بُوبا بھاگتا ہوا باہر آیا اور ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ ''مارنے آئے تھے...'' رقیہ نے کوبرے

کی طرف دیکھا۔ ''جان لینے آئے تھے میرے بُوبے کی... لعنت پڑے ان پر... زندگی میں کبھی چین نہ ملے ان کو... اور وہ پیر... میرے بُوبے کی جان لینا چاہتا تھا... میرے بُوبے کو مروانا چاہتا تھا... تیرے بچے مریں پیرا!''

میرا سر جھٹکے سے رقیہ کی سمت مڑا۔ شاید میری آنکھیں چمک اٹھی ہوں گی ─ یہ چمک فتح کی تھی، اس کامیابی کی جو اپنے احساس سے روح کو بالیدگی دیتے ہوئے انسان کے جسم کو شاداب کر دیتی ہے۔ اس جنگ میں میری جیت ہو چکی تھی۔ رقیہ کی آزاد روح بول اٹھی تھی... گداؤ چولھے کے لیے لکڑیاں اٹھائے برآمدے کی سمت آیا۔ اس نے رقیہ کی طرف دیکھا۔

''آج ناشتہ نہیں بنانا کیا، رقیہ بہن؟'' گداؤ نے مسکراتے ہوئے کہا، ''بے فکر ہو جا ─ اب ڈر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ہسپتال سے ٹائیگر کو لے آتا ہوں۔ ایک پراٹھا میرے لیے بھی پھینک دینا توے پر۔''

گداؤ کا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔ گداؤ کی بے تکلفانہ اپنائیت نے خوشگوار سا احساس دیا۔ وہ گھر کا نوکر ہی نہیں، اہم فرد بن چکا تھا۔

''پہلے اسے تو باہر پھینک!'' بھابھی نے کہا۔ وہ مرے ہوئے کوبرے کو دیکھ رہی تھیں جس کے بدن سے چیونٹیاں چمٹی نظر آ رہی تھیں۔ چار پانچ گھنٹے پہلے مرنے والے کوبرے کے جسم پر جہاں ہاکی کی پہلی ضرب لگی تھی، وہاں خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا، جو کلیجی رنگے کوبرے کی کینچلی پر پھیلا محسوس ہو رہا تھا اور چیونٹیاں اس پر دائیں بائیں رینگ رہی تھیں۔ ایسی ہی چیونٹیاں کوبرے کے سر کے آس پاس بھی نظر آ رہی تھیں۔ گداؤ صحن کے ایک کونے سے چھڑی اٹھا لایا۔ اس نے کوبرے کو یوں اٹھایا کہ سانپ کا آدھا جسم چھڑی کی ایک سمت اور آدھا دوسری سمت لٹک گیا۔ چھڑی کو گھما کر، توازن قائم کرتے ہوئے، گداؤ کوبرے کو لے کر باہر نکلا۔ میں بھی گداؤ کے ساتھ تھا۔ گداؤ کھیتوں کی سمت بڑھا اور بیرونی دیوار کے پاس دائیں جانب کچھ خاردار جھاڑیوں میں کوبرے کو پھینک دیا۔ میں تیز قدموں سے دیوار کے اس بیرونی حصے کی طرف گیا جہاں رات کو گداؤ کی اینٹ کھا کر ملنگ گرا تھا۔

''گداؤ!'' میں نے تیز لیکن دھیمی آواز میں گداؤ کو بلایا۔ ''یہ دیکھو... یہ...''

دیوار اور کھیت کے درمیان جو گہری نالی سی بنی ہوئی تھی، وہاں ایک پٹاری الٹی پڑی تھی۔

قریب ہی پٹاری کا ڈھکن بھی موجود تھا۔ کوبرا اسی پٹاری میں تھا۔ گداؤ نے پٹاری اور ڈھکن اٹھایا۔ میری نظریں دیوار کے پاس مٹی پر ٹھہر گئیں۔ مٹی پر دو تین سیاہ دھبے نظر آ رہے تھے — جمے ہوئے خون کے دھبے...

گداؤ اور میں صحن میں پہنچے تو گداؤ نے سب کو پٹاری دکھائی۔

''یہ ہے کالی بلا کی پٹاری!'' بہن عصمت نے کہا۔

''تیرے بچوں کو ناگ ڈسے پیرا!'' رقیہ کی آواز میں اب غصہ بھی تھا۔

''جلا دے اسے،'' بھابھی نے گداؤ سے کہا۔

''اچھا بی بی جی۔'' گداؤ نے صحن کے ایک کونے میں چند لکڑیوں کے ٹکڑوں کو آگ لگائی اور پٹاری کو ڈھکن سمیت ان پر رکھ دیا۔

27

گداؤ ٹائیگر کو لینے ہسپتال چلا گیا۔ میرے دل میں شدید خواہش تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے، میر صاحب کی ڈسپنسری جا کر انھیں کامیابی کی خبر دوں۔ میں نے کمرے میں جا کر جلدی جلدی کپڑے بدلنے شروع کر دیے۔ باہر برآمدے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

''اگر رقیہ اور بُوبا چارپائی پر ہوتے تو...'' عصمت نے کہا۔

''یا میں مر جاتی یا...'' رقیہ بوبے کا نام لیتے لیتے رک گئی۔ ''میرے بوبے کو مارنے والے مریں دشمن... آگ لگے پیر کے ڈیرے کو... بدمعاش... بچوں کا رکھوالا بنتا ہے... میرے بوبے کو مارے گا؟'' رقیہ نے اس انداز میں کہا جیسے پیر نور شریف اس کے سامنے ہو۔ ''میرے بوبے کو؟... تیرے بچے مریں پیرا۔''

''ہاں نا!'' بھابھی نے پوٹھوہار کے مخصوص لہجے میں کہا، ''شرم نہ آئی اسے؟... ظالم... صرف لوگوں کو ڈرانے کے لیے، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ رکھ ہی کالی بلا سے بچاتی ہے... توبہ توبہ... اتنا بڑا ظلم کرنے لگا تھا، بچے ہی کو قتل کرانا چاہتا تھا۔''

''ایسے لوگوں کو گولی مار دینی چاہیے،'' عصمت بہن نے کہا۔

''اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں،'' باجی زیبا نے کہا،'' خسارہ ان ہی لوگوں کے لیے ہے۔''
باجی زیبا نے ایک آیت پڑھی، جس میں الخاسرین کا لفظ بھی تھا۔ میں برآمدے سے ہو کر صحن میں جانے والا تھا کہ بھابھی نے روک دیا۔

''ناشتہ نہیں کرو گے؟ تیار ہے۔''

رقیہ ناشتے کی ٹرے لے آئی۔ رقیہ مجھ سے نظریں ملانے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کھنچاؤ سا تھا۔ ناشتے کے بعد میں بازار کی سمت جانے والے میدان میں پہنچا۔

''باجی زیبا کو کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے سوچا۔'' وہ اس قدر مذہبی ہو چکی ہیں کہ ان کے ذہن میں ہر لمحے مذہبی باتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' میدان میں دھوپ کی حدت محسوس ہو رہی تھی۔
''اس طرح تو ان کے ذہنی افق سمٹ جائیں گے... صدیاں گزر گئی ہیں... مذہب کے نام پر کاروبار کرنے والے فریبی لوگوں کے لیے تو کوئی خسارہ نظر نہیں آیا۔ وہ سب تو نفع ہی نفع دیکھ رہے ہیں۔ ان کے کالے دھاگے، تعویذ اور نقش کثرت سے بک رہے ہیں۔ شرکی دکانیں چمکی ہوئی ہیں۔ ان کی تجوریوں میں ہر روز سیدھے سادے دیہاتیوں کا خون قطرہ قطرہ گرتا رہتا ہے۔ ان کی تجوریوں میں ہوس کی صراحیاں لبریز ہو رہی ہیں... ہر روز بچوں کے سروں پر سے بالوں کے گچھے اتر رہے ہیں، انھیں تولا جا رہا ہے، وزن کے برابر سونے اور چاندی سے تجوریوں کو بھرا جا رہا ہے... خسارہ کہاں ہے؟ خسارہ تو سادہ لوح غریب لوگوں کے لیے ہے...''

میرے ذہن میں تلخی سی ابھری۔ بازار کی سمت جانے والی گلی کے کنارے پر کچھ دیہاتی عورتیں سروں پر ٹوکرے اٹھائے نظر آئیں۔ میں گلی میں پہنچا۔ دکانیں کھل چکی تھیں لیکن ابھی بازار میں وہ گہما گہمی نہ تھی جو چاشت کو اور پھر شام کو بازار بند ہونے سے پہلے ہوتی ہے۔ میں ابھی میر صاحب کی ڈسپنسری سے دور ہی تھا کہ میرے قدم رک گئے... میر صاحب کی ڈسپنسری میں، دور سے نظر آنے والی بیرونی بنچ پر ایک ملنگ بیٹھا تھا — وہی، کالا، موٹا، چوڑے چہرے اور سرخ ڈوروں والی خوفناک آنکھوں والا۔ دوسرا شاید اندر تھا۔ موٹے کالے ملنگ کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے چہرے پر کھنچاؤ سا نمودار ہوا، اس کی بڑی بڑی آنکھیں خوفزدہ سی ہو گئیں۔ اس نے فوراً اندر دیکھنا شروع کر دیا۔ میں ڈسپنسری کے قریب پہنچا۔

اندر میر صاحب کے پہلو والے سٹول پر سانولے رنگ، لمبوترے چہرے اور آگے کی سمت بڑھی ہوئی ٹھوڑی والا ملنگ بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پٹی سر سے بائیں کان کی طرف آ کر، نیچے جبڑے سے ہوتی ہوئی، دائیں جبڑے سے اٹھتی ہوئی سر کے بالوں پر بندھی ہوئی تھی۔ بائیں کان سے کچھ نیچے، گردن کی طرف، پٹی کے نیچے ابھار سا تھا جس پر سرخ رنگ نمایاں تھا۔ یہ رنگ خون کا تھا یا آیوڈین کا، مجھے معلوم نہیں...

موٹے ملنگ نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ بہت بے چین سا نظر آ رہا تھا۔

میر صاحب نے میری سمت دیکھا۔ مسکرائے۔ ''ارے برخوردار،'' انھوں نے کہا، ''آج صبح صبح ہی چلے آئے؟''

''صبح کہاں ہے سر؟'' میں نے کہا۔ ''آٹھ بج چکے ہیں۔''

''بیٹھیں۔'' میر صاحب نے مجھے ڈسپنسری کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم ذرا انھیں پنسلین کا انجکشن لگا دیں۔''

''کیا ہوا ہے انھیں؟'' میں نے ملنگ کی سمت دیکھتے ہوئے یوں پوچھا جیسے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ موٹے کالے ملنگ نے میر صاحب کی سمت بے چینی سے دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ فوراً ڈسپنسری سے ساتھی سمیت جانا چاہتا ہے۔ میں اس کے قریب سے ہو کر گزرا اور اندر، میر صاحب کی میز کے سامنے والی بنچ پر بیٹھ گیا۔ زخمی ملنگ کے چہرے پر بھی خوف سا تھا۔

''ہی بچ تاں ویسی ڈاکدر صیب؟'' (یہ بچ تو جائے گا ڈاکٹر صاحب؟) موٹے ملنگ نے گھبرائی ہوئی آواز میں، دھنی کے علاقے میں بولی جانے والی زبان اور مخصوص لہجے میں کہا، لمحے بھر میں میرے تصور میں بھائی کا چہرہ ابھرا۔ میں چونکا۔ ''بہوں رت وگی اے، تاپ بھی چڑھیا کھلا اے، ماں بہوں پھکر اے، ڈیرے ونجنا اے،'' (بہت خون بہہ گیا ہے، بخار بھی ہو گیا ہے، مجھے بہت فکر ہے، ڈیرے میں جانا ہے) موٹے ملنگ نے ایک ہی سانس میں کہا۔

مجھے بھائی کی صلاحیت پر حیرت سی ہوئی، انھوں نے سانپ کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ تو دھنی کے علاقے کا کوبرا ہے۔ میر صاحب زخمی ملنگ کو انجکشن لگا رہے تھے۔ وہ شاید موٹے ملنگ کی بولی سمجھ نہ پائے تھے۔

''بس بس،'' میر صاحب نے انجکشن لگاتے ہوے کہا،'' کچھ نہیں ہوگا، معمولی زخم ہے، ریڑھ کی ہڈی بچ گئی ہے، ورنہ مشکل تھی۔ . . بس ذرا خون زیادہ بہہ گیا ہے۔'' میر صاحب ایک روئی کے پھاہے کو ٹیکہ لگانے والی جگہ پر مل رہے تھے۔'' کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔''

موٹے ملنگ نے بےچینی سے بنچ پر پہلو بدلا۔

''ٹانگے تے ونجنا ایں، لگے ویساں؟'' (تانگے پر جانا ہے، کیا جا سکیں گے؟)

''ہاں ہاں۔'' میر صاحب اس بار اس کی بات سمجھ گئے۔'' کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ معمولی زخم ہے۔ برسات میں زخم خراب ہونے کا ڈر ہوتا ہے، ابھی تو بارشیں دور ہیں۔ بس ڈیرے میں جا کر ایک دو دن انھیں کوئی کام نہ کرنے دینا، آرام سے لیٹے رہیں گے تو جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور ہاں . . . '' میر صاحب نے میز کے نیچے شیلف سے ایک شیشے کا مرتبان نکالا، کچھ کیپسول ملنگ کو دیے۔'' یہ دوا، صبح و شام چار دن پانی کے ساتھ کھلاتے رہیے گا، زخم بھر جائے گا۔''

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوے کہا۔

''یہ دونوں . . . '' میر صاحب نے کہا،'' پرانی حویلی کے کھنڈر میں ٹھہرے تھے۔ وہاں کھنڈر کی ٹوٹی دیواروں کے نیچے پتھروں اور اینٹوں پر پھسل گئے۔ گرنے پر کان کے پیچھے چوٹ آئی ہے۔ ایک انچ لمبا اور ایک سینٹی میٹر گہرا زخم آیا ہے۔ ہم نے چار ٹانکے لگا دیے ہیں۔ ہڈی بچ گئی ہے، بس خون زیادہ بہہ گیا ہے۔''

میری نظر زخمی ملنگ کے بائیں کندھے کی سمت گئی، جہاں اس کا کالا چولا اکڑا اکڑا سا نظر آیا۔

''اوہو!'' میں نے کہا،'' کل رات بھی تو بہت اندھیری تھی۔''

موٹے ملنگ نے اپنی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس بار اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ غصہ بھی تھا۔'' کتنے پیسے ڈاکدر صیب؟'' (کتنے پیسے ڈاکٹر صاحب؟) اس نے اپنے لمبے سیاہ چولے میں ہاتھ ڈالا . . . شاید لمبی سی جیب تھی۔

''دو روپے آٹھ آنے،'' میر صاحب نے کہا۔'' ایک روپیہ ٹیکے کا، ایک روپیہ ٹانکے لگانے اور پٹی کا اور آٹھ آنے دوائی کے۔'' انھوں نے غور سے ملنگ کی طرف دیکھا۔'' نہیں ہیں تو صرف ٹیکے اور دوائی کے پیسے دے دیں۔''

''نئیں ڈاکدر صیب، پیسے بہوں...'' (نہیں ڈاکٹر صاحب، پیسے بہت،) موٹے ملنگ نے کہا۔ اس نے میر صاحب کو دو روپے آٹھ آنے دیتے ہوے ان کی طرف دیکھ کر پھر میری سمت دیکھا۔ ''بہوں مہربانی...'' اس نے پھر میر صاحب کی طرف دیکھا۔ ''بہوں مہربانی ڈاکدر صیب۔'' وہ اٹھا اور زخمی ملنگ کی سمت اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ ''اٹھو سائیں جی، ونجیے...'' (اٹھیے سائیں جی، چلیں...)

زخمی ملنگ موٹے ملنگ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا۔ میں دونوں کے درمیان بنچ پر بیٹھا تھا۔ موٹے ملنگ نے غصے سے میری سمت دیکھا۔ جیسے ہی زخمی ملنگ میرے اور میر صاحب کی میز کے درمیان آیا اور میر صاحب پل بھر کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے، موٹے ملنگ نے میری سمت جھک کر مجھے غصے سے دیکھا۔

''نبڑ گھیساں...'' (نمٹ لیں گے...) اس نے دانتوں میں پسی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا؟'' میر صاحب چونکے۔ انھوں نے سرگوشی کو سن تو لیا تھا، لیکن دھنی کی زبان ان کے لیے اجنبی تھی۔ ''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''کجھ نئیں جی...'' (کچھ نہیں جی...) موٹے ملنگ نے کہا۔ ''میں آہداواں، اَپڑ ویساں؟ ٹیم ہو گیا ٹانگے ناں، بہوں گرمی اے، نکل گیا تاں رہ ویساں...'' (میں کہہ رہا ہوں، کیا پہنچ جائیں گے، وقت ہو گیا ہے تانگے کا، بہت گرمی ہے، نکل گیا تو رہ جائیں گے۔) موٹے ملنگ نے ایک ہی سانس میں پھر لمبی بات کی۔ زخمی ساتھی کا ہاتھ پکڑا۔ وہ کراہا۔ اس کے چہرے پر درد کی کیفیت نمایاں تھی۔ بائیں کان کے نیچے گردن پر سوجن سی نظر آ رہی تھی۔ اچھا ہوا کہ گداؤ کا نشانہ چوک گیا— اگر اینٹ ملنگ کے سر پر لگتی اور کھوپڑی ٹوٹ جاتی تو اس کی موت اس دور افتادہ گاؤں میں یقینی ہوتی۔ ڈسپنسری کی سیڑھیوں سے اترتے ہوے ملنگوں کی مالاؤں کے بڑے بڑے منکے آپس میں ٹکرائے۔ کلائیوں میں کڑے پہنے، عورتوں والے کنگنوں جیسے، انگلیوں میں سرخ، عنابی، نیلے، پیلے، سبز اور سیاہ پتھروں والی انگوٹھیاں پہنے، موٹے موٹے منکوں اور کوڑیوں والے لمبے لمبے ہار پہنے، پنڈلیوں تک سیاہ چغہ نما چولوں میں ملبوس، لمبے لمبے بالوں والے، خوفناک خدوخال والے دونوں ملنگ کسی انتہائی تاریک قوت کے کارندوں کی طرح، بھیانک عفریتوں کی طرح، تانگوں والے اڈے

کی سمت چلے گئے جہاں سے نو بجے تانگے نے جانا تھا۔ دونوں ملنگوں کے سروں پر کالے پٹکے نہیں تھے۔ موٹے ملنگ کی پشت پر لٹکے ہوے بڑے تھیلے میں ہرمل دھونی دینے والی کڑاہیاں بھی لٹکی محسوس ہوئیں۔ اس نے زخمی ملنگ کا تھیلا بھی کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔

''آپ ہمیں یہاں کچھ نہ بتائیں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''اتنا تو ہم جان ہی چکے ہیں کہ آپ کامیاب ہوے ہیں۔'' میر صاحب کی آواز سرگوشی جیسی ہوگئی۔ ''یہ گاؤں ہے، یہاں کسی گھر میں اگر کوئی وفات پا جائے تو دس پندرہ منٹوں میں سارے گاؤں کو پتا چل جاتا ہے اور حادثے کی صورت میں تو سب سے پہلے ہمیں ہی پتا چلتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ ماں بچہ خیریت سے ہیں۔ ان بدمعاشوں کو بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ناکام ہو چکے ہیں ۔ ۔ ۔ اب آپ جائیں، شام کو بات کریں گے۔'' میر صاحب نے ڈسپنسری کے باہر ایک نوجوان کی سمت دیکھا جو ایک بوڑھی عورت کا بازو پکڑے کھڑا تھا۔ بوڑھی عورت مسلسل کھانس رہی تھی۔

''آیئے اماں جی!'' میر صاحب نے خوشگوار لہجے میں کہا، ''لوگ سردیوں میں کھانستے ہیں، آپ نے گرمیوں ہی میں کھانسنا شروع کر دیا؟''

میں خاموشی سے گھر کی سمت چل دیا۔ بیرونی دروازہ کھولا ہی تھا کہ ٹائیگر گداؤ سے زنجیر چھڑا کر میری سمت بھاگا، دونوں پیر میرے پیٹ پر رکھ دیے۔ اس کی گچھے دار دُم زور زور سے دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ دُم کے ساتھ اس کا سر بھی دائیں بائیں جھٹکے کھا رہا تھا، پھر اس نے اپنا سر بھی میرے پیٹ سے لگا دیا۔

''یہ چار چشما تو مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گا۔'' میں نے ٹائیگر کے سر اور چہرے کو سہلایا۔ ''اتنا خوبصورت جرمن شیفرڈ پھر شاید ہی دیکھنے کو ملے۔''

ٹائیگر نے میرے پیٹ سے سر ہٹایا، میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی، جیسے پوچھ رہا ہو کہ مجھے رات کو کہاں چھوڑ آئے تھے؟ وہ کل شام سے بھوکا تھا۔ گداؤ نے اس کی زنجیر صحن کے کچے فرش سے اٹھائی اور اسے ہینڈ پمپ کے پاس، چھپر کے نیچے باندھنے کے لیے لے جا رہا تھا کہ ٹائیگر نے بھونک کر ایک سمت گداؤ کو کھینچا۔ وہ چارپائی کی سمت بڑھا اور پائینتی کے پاس مٹی کو سونگھنے لگا۔ گداؤ نے میری طرف دیکھا۔ پھر زنجیر کھینچ کر ٹائیگر کو چھپر کے نیچے باندھا اور قریب ہی

اینٹوں کے بنے ہوئے چولھے پر ایک دیگچے میں گوشت ابالنا شروع کر دیا۔ ٹائیگر چھپر کے نیچے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے زبان باہر نکال کر زور زور سے سانس لینا شروع کر دی۔ گرمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ باہر بشیر نعل بند کی دکان سے ٹھک ٹھک ٹھم، ٹھما ٹھم کی آوازیں آ رہی تھیں — دھیمی، دور سے آتی ہوئی آوازوں کی طرح...

28

''اٹھو، کچھ کھا پی لو۔''

بھابھی کی آواز پر میں اٹھا۔ نیند سے بوجھل لمحوں کا احساس ذہن پر طاری تھا۔

''اچھا بھابھی،'' میں نے کہا اور پوری آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اس شعوری کوشش کے باوجود پلکیں بوجھل تھیں۔

''ساری دوپہر گرمی میں پڑے رہے ہو،'' بھابھی نے کہا۔ ''اس سے بہتر تھا کہ نہر کے کنارے کسی درخت کے نیچے جا کر سو جاتے۔''

''نہ بھابھی،'' عصمت نے کہا۔ ''ملنگ اب اس کے دشمن ہو چکے ہیں۔ وہ اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''وہ تو گئے عصمت بہن!'' میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا، ''اب وہ کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔''

''آئیں!'' برآمدے سے رقیہ کی آواز آئی۔ ''آئیں!... بُوبے کے مامے چاچے زندہ ہیں۔ آئیں ادھر... ٹانگیں تڑوا کے پرانی حویلی میں پھنکوا دوں گی۔''

''نہیں۔'' میں پلنگ سے اٹھ کر برآمدے میں کھلنے والے دروازے پر آیا۔ ''نہیں، جب تک بُوبا پانچ سال کا نہیں ہو جاتا، کسی سے اس بات کا، اس واقعے کا ذکر بھی نہ کرنا۔''

''کتنے مہینے رہ گئے ہیں؟'' باجی زیبا نے پوچھا۔

''ایک مہینہ بیس دن،'' رقیہ نے کہا۔

باجی زیبا ہمیشہ کی طرح قدرے نروس نظر آئیں۔ وہ برآمدے میں رقیہ کے پاس گئیں۔

''تو فکر نہ کر،'' باجی زیبا نے کہا، ''ذرا فکر نہ کر۔ جس پاک پروردگار نے تیرے بچے کی

حفاظت کی ہے، وہی آئندہ بھی کریں گے۔قرآن میں لکھا ہے...''

باجی زیبا نے آیت پڑھنا شروع کر دی اور میں صحن میں ہینڈ پمپ کی سمت چلا گیا۔

''باجی زیبا کو کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے بالٹی سے پانی نکالا۔''انھیں اپنی ساری توجہ پڑھائی پر دینا چاہیے۔ بھائی ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے ہیں کہ میں پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا— باجی کو کیوں نہیں ڈانٹتے؟ وہ ہمہ وقت مذہبی خیالوں میں گھری رہتی ہیں... ان کی ہر سوچ مذہبی گنبد میں گونجتی آیات کے پیچھے گردش کرتی رہتی ہے... یہ رجحان درست نہیں ہے— کیا ہو گا باجی کا؟ سکول میں وہ ہمیشہ عصمت سے پیچھے رہتی ہیں... عمر میں دو سال بڑی ہونے کے باوجود وہ عصمت کے ساتھ میٹرک کر رہی ہیں۔انھیں مذہبی خیالات سے فرصت ہی نہیں ملتی۔''

ہاتھ منھ دھوتے ہوئے میرے ذہن پر کتنے ہی خیالات پانی کے گرتے قطروں کی طرح گرتے رہے۔

''کیا مذہب ایک جنون ہے؟''

یہ سوال میرے ذہن میں منجمد ہوتے ہوئے قطروں کی طرح، برف کی سل میں بدلتے قطروں کی طرح... جزئیات سے کُل میں بدلتے ہوئے... بوجھ سا بن گیا۔

29

شام کو بخشو سے محتاط ہو کر بھائی، میر صاحب، گداؤ اور میں رات والے واقعے پر باتیں کر رہے تھے۔ ہر ایک پہلو پر بحث ہوئی۔ ساری بحث اس نقطے پر مرکوز ہوئی کہ پیر نور شریف اب بچے کو مارنے کی دوسری کوشش ہرگز نہیں کرے گا۔

اس بار میں اس کرسی پر بیٹھا تھا، جس پر بیٹھنے والی کی پشت تنور کی سمت ہو جاتی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ گلنازی تنور پر ہی بیٹھی ہے، مجھے دیکھ رہی ہے اور اسے میرا اس طرح اس کی جانب پشت کرنا بہت ہی برا لگ رہا ہو گا۔

''اگر خدانخواستہ بچے کو سانپ ڈس لیتا تو...'' میر صاحب نے آہستہ سے کہا۔

''کیسے ڈس لیتا؟'' گداؤ نے آہستہ سے کہا۔''بُوبا تو چھت پر تھا۔''

''گداؤ میاں،'' میر صاحب نے کہا،''ہمیں معلوم ہے . . . ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ماں اور بچہ دونوں چارپائی پر ہوتے تو دونوں میں سے ایک کی موت تو یقینی تھی . . . بچہ مرجاتا تو لوگ کہتے کہ کالی بلا نے ناگن بن کر بچے کا خون پی لیا ہے، لیکن اگر ماں مرجاتی تو؟''

''تو کیا!'' گداؤ نے کہا،''لوگ یہی کہتے کہ ماں نے بچے کی حفاظت نہیں کی تھی، لاپرواہی کی تھی . . . بچہ تو پیر کے چلّوں اور دعاؤں سے بچ گیا ہے، سزا ماں کو ملی ہے۔''

بھائی نے بے چینی سے پہلو بدلا،''رڈی کولس (ridiculous)'' انھوں نے کہا۔''میں تو اسے ماس میڈنس (mass madness) کہوں گا۔''

گداؤ نے دور چائے بناتے ہوئے بخشو کی طرف دیکھا۔

''ہمیں ابھی یہ بات چھپانی ہوگی،'' گداؤ نے کہا۔''بچے کی عمر پانچ سال ہونے میں ابھی ایک مہینہ بیس بائیس دن پڑے ہیں . . . خطرہ صرف فیکے سے ہے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے بُوبے کی رکھ چھوڑ کر باقی بال مونڈنے آجاتا ہے۔''

''اسے روکنا تو مشکل نہیں،'' بھائی نے کہا۔''کہہ دینا کہ میں نے سیفٹی ریزر سے بال مونڈ دیے ہیں۔ اسے تو اجرت چاہیے، دے دیں گے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ مجھے بار بار گلنازی کا خیال آرہا تھا۔

''مجھے اس کرسی پر نہیں بیٹھنا چاہیے تھا،'' میں نے سوچا۔''گلنازی کیا سوچتی ہوگی . . . اور ماسی . . . اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ کیا سوچے گی . . . رات والی بات کے بعد مجھے تنور کی سمت پشت نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

مجھے یاد آیا کہ گداؤ نے اور بخشو نے مجھے بتایا تھا کہ گاؤں کے کسی لڑکے میں جرأت نہیں کہ وہ تنور کی سمت آئے۔ ماسی نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔

''برخوردار،'' میر صاحب کی آواز پر میں چونکا۔''ایک معاملے میں تو پیر آپ کو مات دے گئے۔''

''وہ کیا سر؟'' میں نے کہا۔

''جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا،'' میر صاحب نے کہا،''آپ کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا۔''

''واقعی سر،'' میں نے کہا۔'' کوبرا پھینکیں گے، یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا... لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ طریقہ پیر نور شریف کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ طریقہ اس کے آباواجداد میں سے کسی بے حد مکار شخص کی ایجاد ہوگا جو نسل در نسل چلا آ رہا ہے۔ نہ جانے ہوسِ سیم وزر کی خاطر پیروں نے کتنے بچوں کو قتل کیا ہوگا، اور ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ کل بھی قاتل ہونے کے باوجود معاشرے میں بہت باعزت تھے اور آج بھی ہیں۔''

''پیروں کے مزار تو جگہ جگہ پر ہیں صاب،'' گداؤ نے کہا،'' جہاں کالے سبز سرخ پیلے جھنڈے نظر آئیں، سمجھ لیں کسی پیر کا مزار ہے۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سنا ہے، میگھا پتن کے بڑے پیر کا مزار حویلی کے اندر ہے۔'' گداؤ بخشو کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ بخشو چائے لایا، پیالیاں میز پر رکھیں، کچھ دیر گداؤ کو دیکھتا رہا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے... نہ کہہ پایا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اہم بات کرنا چاہتا تھا، لیکن کہے بغیر واپس اپنی کوٹھڑی کی سمت چلا گیا۔

''تم نے ٹھیک کہا گداؤ،'' میں نے کہا،'' جگہ جگہ پیروں کے ڈیرے ہیں، جو دربار کہلاتے ہیں۔ جو مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتے اور پیر بن کر آسان روزگار حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے دربار اور ڈیرے جلد اجڑ جاتے ہیں، صرف مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے پیروں ہی کے دربار آباد رہتے ہیں۔ جگہ جگہ کسی شاطر پیر کے مزار پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں... اپنی ساکھ اور کالی بلا کی دہشت کو قائم رکھنے کے لیے جس مکار پیر نے ماضی میں سانپوں کے ذریعے بچے مروائے ہوں گے، آج اس کے مزار پر طلائی نقش و نگار والی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ وہ بدمعاش قاتل آج بزرگ کہلاتا ہوگا۔ لوگ اس کے مزار پر دوزانو ہو کر دعائیں مانگتے ہوں گے۔ خوف انھیں جب بھی سہارے کی تلاش میں سرگرداں کرتا ہوگا، وہ اس کے مزار پر ماتھا ٹیک دیتے ہوں گے۔ خودغرضی جب بھی انھیں ان کی ذات کے حصار میں بے بس کر دیتی ہوگی تو وہ پھر سہارے کی تلاش میں پیروں کے درباروں میں سر جھکا دیتے ہوں گے۔ وہ کبھی اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لیے پیر سے تعویذ لیتے ہوں گے تو کبھی اپنے مفاد کے لیے نقش بنواتے ہوں گے، منتیں مانگتے ہوں گے اور پیروں کا گھناؤنا کاروبار جو صدیوں سے چلتا آ رہا ہے، چلتا رہتا ہوگا... چل رہا ہے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ مذہب فروشی کی اس سے بدترین مثال کیا ہوگی کہ ایک خونی، قاتل اور بدمعاش کو عزت ملتی ہے، اسے اہلِ عقیدت کہا جاتا

ہے اور اس کے مزار کو بھی سیم وزر سے مضبوط بنایا جاتا ہے۔''

میں شاید کچھ زیادہ ہی اپنے اندر چھپی کڑواہٹ کا اظہار کر گیا۔ بھائی میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

''ہم تو یہ بات پہلے ہی کہہ چکے ہیں،'' میر صاحب نے کہا،'' جب تک ہر پسماندہ علاقے میں تعلیم عام نہیں ہو جاتی، اور تعلیم بھی وہ جو ذہن کو غلام بنانے کے بجائے آزاد کرے، تب تک یہ ظلم کے سلسلے چلتے رہیں گے۔''

مجھے اپنے دل میں پھر کسی خاموش آتش فشاں کی تہہ میں لاوا حرکت کرتا محسوس ہوا۔

''یہی تو وہ مسئلہ ہے،'' میں نے کہا،'' جسے سوچ کر میں، بقول آپ کے، اپنی عمر سے آگے نکل گیا ہوں۔''

میر صاحب مسکرائے، بھائی نے میری طرف دیکھا۔

''اپنی عمر سے آگے نکل جانا ابنارملٹی (abnormality) ہے،'' انھوں نے کہا۔'' اس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا کرتا ہے۔ تم بار بار ہمیں، سب گھر والوں کو احساس دلاتے رہتے ہو کہ تم عام ذہنیت نہیں رکھتے۔ والد صاحب کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں اس کا کیا کروں، یہ جتنا ذہین ہے اتنا ہی بے وقوف بھی ہے۔ ایک طرف تو ایسی باتیں کر جاتا ہے کہ سننے والے حیرت زدہ ہو جاتے ہیں، دوسری طرف جب سکول کا رزلٹ آتا ہے تو یہ ایک نالائق طالب علم نظر آتا ہے۔ سوائے اردو زبان، تاریخ، جغرافیے کے تم کبھی اچھے نمبر لے کر پاس نہیں ہوتے۔ ریاضی میں اگر تینتیس فیصد پاس ہونے کے لیے ضروری ہوتے ہیں تو یہ نمبر صرف تمھیں جیومیٹری دلاتی ہے۔ انگلش تمھیں نہیں آتی — مشکل سے پاسنگ مارکس لیتے ہو۔ ایسی ابنارملٹی کس کام کی... کل رات پھر تم نے مجھے احساس دلایا ہے کہ تم غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت رکھتے ہو، لیکن جب تمھارا رزلٹ آئے گا تو نہ میں، نہ والد صاحب، ہم میں سے کوئی بھی تمھارے ہیڈ ماسٹر کا سامنا نہیں کر سکے گا... سکول میں جا کر تمھاری غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کہاں مر جاتی ہے؟ اسے سکول کے گیٹ کے باہر کیوں چھوڑ جاتے ہو؟''

بھائی نے کبھی اتنی لمبی بات نہیں کہی تھی۔ لمبی باتیں کرنے میں اور مسلسل بولتے رہنے کے لیے تو گھر میں میں مشہور تھا۔

''آپ نے ابنارملٹی میں نفع اور نقصان کی بات کی ہے،'' میں نے کہا۔''میں نہیں جانتا کہ میں ابنارمل ہوں یا نہیں ہوں . . . مجھے نفع اور نقصان کا احساس ہی نہیں ہوا کرتا۔ جہاں تک میرا چھوٹا سا تجربہ ہے، میں یہی سمجھتا ہوں کہ خوف اور خودغرضی سے انسانی ذہن گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔غلامی کی بھیانک تاریکی اسے جکڑ لیتی ہے۔خوف ایک عارضی شے ہے، جب تک رہتا ہے اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ذہن پر دباؤ ڈالتا ہے، اور جب خوف کی کیفیت میں خودغرضی کی آمیزش ہو جاتی ہے تو انسانی ذہن میں انتہاپسندی پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت کا اسیر شخص بغیر سوچے سمجھے کچھ بھی کر گزرتا ہے . . . اس کیفیت سے نجات صرف اور صرف اس شعور سے ملتی ہے جو عزتِ نفس سے فروغ پاتا ہے۔عزتِ نفس نہ ہو تو خوف اور خودغرضی کی آمیزش سے تشکیل پانے والی کیفیت دائمی شکل اختیار کر لیتی ہے۔''

میر صاحب نے پہلو بدلا۔

''برخوردار،'' انھوں نے کہا،''ہم اپنے پہلے تقاضے سے دستبردار ہوے۔ آپ کا رجحان میڈیکل کی سمت قطعی نہیں ہے۔آپ میٹرک کے بعد یا تو فلاسفی کو اپنا مستقبل بنائیے یا نفسیات کو۔ ہمارا اندازہ ہے کہ آپ بہت کامیاب رہیں گے۔''

بھائی نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔

''پہلے میٹرک تو کر لے،'' انھوں نے کہا۔''مجھے تو فکر لگی رہتی ہے کہ یہ میٹرک بھی نہیں کر سکے گا۔''

''ارے نہیں!'' میر صاحب نے کہا،''ہمیں یقین ہے کہ یہ کر لیں گے . . . اور ہاں . . . وہ جو آپ نے . . . '' انھوں نے میری طرف دیکھا،''عزتِ نفس کی بات کی ہے . . . جب ہم کالج میں تھے تو ایک پروفیسر صاحب نے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ گھناؤنے معاشرتی بندھنوں، تاریک مذہبی رویوں میں آزادی کا حصول ہمیشہ بغاوت کہلاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ آزادی عزتِ نفس سے حاصل ہوتی ہے تو . . . عزتِ نفس کے حصول کی کوشش بھی تو بغاوت ہی کہلائے گی . . . اور آپ کیا نہیں جانتے کہ معاشرے میں اس قسم کی بغاوت کا انجام کیا ہوتا ہے؟ ارے دو چار بھی ایسے نہیں ملیں گے جو یہ بغاوت کر سکیں . . . ہمیں ہی دیکھ لیں . . . ہم نے اپنی عزتِ نفس کو ایک طرف رکھ دیا، کیونکہ ہم معاشرتی بندھنوں کے تاریک حصے میں تھے . . . ہم نے اجتماعی معاشرتی بندھن کو اپنے انفرادی

بندھنوں پر ترجیح دی۔ ہم تاریک رویوں کے اسیر تھے... آپ سچ کہتے ہیں... اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ جب ہم نے اپنی زمین چھوڑی، ماں باپ بہن بھائیوں کو چھوڑا، نانی اماں کے آنسوؤں کو مٹی میں گر جانے دیا، اس وقت ہم خوف اور خود غرضی کے اسیر تھے۔ ہم نے وقتی جوش میں کچھ نہ سوچا، عارضی ہیجان میں کچھ نہ سمجھا... غلط فیصلہ کیا اور اب پچھتا رہے ہیں۔ اب تو ہم عزتِ نفس کے احساس سے بھی نا آشنا ہیں، بغاوت کیا خاک کریں گے...''

گفتگو بہت بوجھل سی ہوتی جا رہی تھی، میر صاحب نے اس کا رخ ہی موڑ دیا تھا، لیکن بھائی موضوع کو پھر واپس لے آئے۔ انھوں نے تنور کی سمت دیکھا۔

''میں یہ مانتا ہوں،'' بھائی نے میری طرف دیکھا۔ ''یہ جو واقعہ پیش آیا ہے... میں کل رات تک تمھیں غلط سمجھتا رہا، تمھارے قیاس کو افسانوی جنون کہتا رہا... لیکن جو کچھ کل رات ہمارے گھر میں ہوا ہے، کیا اس سے معاشرہ بدل جائے گا؟ ہم تو اس کی تشہیر بھی نہیں کر سکتے۔ کل جو کچھ ہوا ہے، غیر معمولی واقعہ ہونے کے باوجود، وسیع تناظر میں ایک معمولی نوعیت ہی کا واقعہ ہے۔ ایک ماں، ایک ادھیڑ عمر کی عورت، ایک نوجوان لڑکی، تمھاری بھابھی، بہنیں، یہ میر صاحب، میں اور گداؤ یقیناً بدل چکے ہیں... ہماری آنکھیں کھل چکی ہیں، ہم اپنی آنکھوں سے ظلم کے ہتھکنڈے کو دیکھ چکے ہیں... لیکن تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر ہم یہ واقعہ پورے گاؤں میں، ہر دیہاتی کو بتائیں تو کیا ان میں فوری طور پر شعور آ جائے گا؟ ہرگز نہیں... میر صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہے، یہ واقعہ بھی بغاوت ہی کہلائے گا جس کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوا کرتا ہے۔''

میں بھائی کی باتوں سے بے چین سا ہو گیا۔

''کیا لوگ اندھے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، یہاں پیر نور شریف کے لاکھوں مرید ہیں، لیکن اگر پانچ برس گزر جانے کے بعد بچے کے زندہ ہونے پر، اس واقعے کی تشہیر کی جائے تو کیا لوگوں میں شعور پیدا نہیں ہوگا؟ کیا ان کو حقیقت کی روشنی نظر نہیں آئے گی؟''

''آنکھیں ہوں گی تو شعور بھی ہوگا،'' میر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہاں پر تو سب اندھے رہتے ہیں... اندھی عقیدتوں نے ان سے بصارت چھین رکھی ہے۔ پیر اگر ایک جملہ بھی کہہ دیں گے کہ اس رات ان کے ملنگ کالی بلا کو ناگن کے روپ میں پہچان کر مارنے کے لیے قصبے میں

آئے تھے، تو آپ ڈھول پیٹ پیٹ کر بھی کہتے رہیں کہ نہیں، پیر بچے کو مروانا چاہتے تھے، تو آپ کی بات کوئی نہیں سنے گا... سب پیر ہی کی بات مانیں گے۔ ان کے ہاتھ چومیں گے، ان کی جوتیاں چومیں گے، قدموں پر سر رکھیں گے۔ نوزائیدہ بچوں کی مائیں ہاتھ جوڑ جوڑ کر پیر سے کہیں گی کہ ان کے بچوں کو بھی بدروحوں اور کالی بلا سے بچانے کے لیے حفاظت فراہم کی جائے... جو رکھ نہیں رکھواتی ہیں، وہ مائیں بھی بالوں کے گچھے رکھوانے لگیں گی۔''

گداؤ ہماری باتوں کو سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ میر صاحب کی باتوں پر اس کے ذہن میں احتجاج نمودار ہوا۔

''مارا تو میں نے ہے!'' گداؤ نے غصے سے کہا۔ ''پیر کے باپ نے تو نہیں مارا ناگ! اگر وہ کالی بلا تھا تو میں نے مارا ہے... کون جانے ناگ تھا یا ناگن... پر اگر کالی بلا تھی تو ماری تو میں نے ہے۔''

بھائی نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ گداؤ کے انداز نے ماحول پہ چھائی ہوئی بوجھل کیفیت کو زائل کر دیا۔

''بس گداؤ!'' بھائی نے کہا، ''اب تو بھی اپنا ڈیرہ جمالے۔ چند کالے سرخ سبز نیلے پیلے جھنڈے لگا کر اپنی پیری کا اعلان کر دے۔ ہم گواہی دیں گے کہ کالی بلا کو تو نے مارا ہے۔ بس چند ہی دنوں میں پورے علاقے میں پیر گدا حسین عرف گداؤ پیر کی دھوم مچ جائے گی۔ تیرے بہت سے ملنگ خود بخود ہی پیدا ہو جائیں گے۔ مائیں خود ہی اپنے بچے لے کر تیرے پاس رکھ رکھوانے کے لیے آنا شروع ہو جائیں گی۔''

میر صاحب مسکرا رہے تھے۔

''بس چند مہینوں میں آپ کا بھی کاروبار جم جائے گا،'' انھوں نے کہا، ''آپ کا بھی دربار قائم ہو جائے گا۔''

''لعنت بھیجیں جی ایسے کاروبار اور دربار پر!'' گداؤ نے کہا، ''جس میں بچے مارنے پڑیں اور...'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بخشو چائے کی پیالیاں اٹھائے آ رہا تھا۔ بخشو قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ باری باری سب کی جانب اس انداز سے دیکھ رہا تھا، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

''کیا بات ہے بخشو؟'' بھائی نے کہا۔

''صاب جی . . . '' بخشو نے کہا،''میرا بھی بہت تجربہ ہے۔ ٹائیگر تو بھلا چنگا تھا . . . یہ گداؤ . . . '' اس نے غصے سے گداؤ کی طرف دیکھا۔''بڑا سلوتری بنتا ہے . . . بیمار کہہ کر چھوٹے صاب کو بھی بہکا دیا . . . ٹائیگر کو کچھ نہیں ہوا تھا . . . بے چارہ رات بھر بھوکا رہا۔''

گداؤ نے سٹول پرا چک کر بخشو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''اوئے بے وقوف!'' گداؤ نے کہا، کچھ بیماریاں چھپی ہوتی ہیں، انھیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے، اور تو . . . '' گداؤ نے تھارو بریڈ کے اصطبل کی طرف دیکھا۔''تو نے ساری زندگی طویلوں میں گزاری ہے، تجھے کیا پتا کتوں کی بیماریاں کیا ہوتی ہیں!''

''اچھا . . . آ '' گداؤ نے لفظ کو کھینچا،''تو نے ڈاکٹر صاحب سے کیا کہا تھا کہ ٹائیگر کا پیٹ خراب ہے، اور صاب نے بغیر چیک کیے مجھے کہہ دیا کہ اٹھائیس نمبر دوائی دودھ میں ڈال دو۔ صاب نے تیری زبان کا اعتبار کیا . . . وڈے سیانے! جب جانور کا پیٹ خراب ہوتا ہے تو وہ الٹیاں کرتا ہے، اسے جلاب لگ جاتے ہیں۔''

''ٹائیگر کو قبض تھی۔'' گداؤ کے اس جملے پر بھائی، میر صاحب اور میں ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے۔ گداؤ بھی مسکرایا۔

''جھوٹ نہ بول گداؤ'' بخشو نے ہماری ہنسی کی پروا کیے بغیر کہا۔''میں صبح ٹائیگر کو کھیتوں میں لے گیا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے . . . تُو . . . تُو کل ٹائیگر کے حصے کا گوشت گھر لے گیا ہوگا۔''

'' بکواس نہ کر!'' گداؤ نے بھی غصے سے کہا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گداؤ غصے کی اداکاری کر رہا ہے۔''میں نے کل شام بھی دودھ میں ٹائیگر کو قبض کی دوائی دے دی تھی۔ صبح تک ٹھیک ہو گیا ہوگا . . . تو نے ہاضمے کی دوائی دودھ میں نہیں دی ہوگی . . . دودھ بچا لیا ہوگا اور وہ . . . ''

گداؤ کے کہنے سے پہلے ہی بخشو چیخا۔

''دیکھا صاب . . . دیکھا!'' وہ دونوں قدموں پر دائیں بائیں ہل رہا تھا۔''چوری آپ کرتا ہے اور الزام مجھ پر لگاتا ہے۔''

''کیا . . . آ؟'' اب گداؤ نے لفظ کو کھینچا۔'' کیا تو چوری نہیں کرتا؟ تھارو بریڈ کے راشن میں

سے چھولے کون پکا کر کھا جاتا ہے؟...اپنی چوری بھول گیا ہے خچرا!''

''ٹھیک ہے،'' بخشو اب اچھل کر بولا،''ٹھیک ہے، مٹھی بھر چھولے ہی لے لیتا ہوں، گھوڑے کے راشن سے، تیری طرح کتے کے حصے کا گوشت تو نہیں کھاتا۔''

میر صاحب تیزی سے آگے جھکے۔

''ارے... ارے میاں،'' میر صاحب تیزی سے بولے،''ارے، آپ تو سچ مچ لڑنے لگے۔''

بھائی گداؤ اور بخشو کی اس لڑائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا— گداؤ اداکاری کر رہا تھا۔ پل بھر کے لیے بخشو نے میر صاحب کی طرف دیکھا تو گداؤ نے مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ ماری۔

جب ہم واپس گھروں کو جانے لگے تو کرسی سے اٹھ کر مڑتے ہی میری نظر تنور کی سمت گئی۔ گلنازی میری سمت ہی دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں ملتے ہی اس نے چھوٹی سی بچی کی طرح بسورنے والی صورت بنا کر ماسی جیراں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ میں پہلی بار مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مسکراتے ہوئے میری نظریں نیچی ہو گئیں۔ دوبارہ تنور کی سمت دیکھا تو گلنازی کی آنکھیں پل بھر میں خوشی سے چمکتی نظر آئیں۔ اس نے اپنے بہت ہی خوبصورت مخصوص انداز میں اپنا بایاں رخسار گھٹنے پر رکھا، سر کو ترچھا کیا اور میری سمت مسکراتی، چمکتی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ تنور میں موجود کوئلوں سے اٹھنے والی روشنی کی سرخ لپک میں گلنازی کا چہرہ صبح افق سے طلوع ہونے والے سورج کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے ماتھے سے، اس کی خوبصورت زلف گری اور اس کے دائیں رخسار پر سرمئی بدلی کی طرح پھیل گئی۔

30

رات چھت پر لیٹے ہوئے، تکیے پر سر دبائے، میں گلنازی کے چہرے کو اپنے بہت قریب دیکھ رہا تھا۔ گلنازی کا تصور اس قدر روشن تھا کہ مجھے تاروں کی ٹمٹماہٹ اس روشنی میں ڈوبتی محسوس ہوئی۔

''میں نے زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی...'' میں نے سوچا،'' وہ جتنی

جسم اور چہرے سے دلکش ہے، اس سے کہیں زیادہ اس کا دل خوبصورت ہے۔ بھولی بھالی، چاہت میں سچی... میں اس کی کشش سے کیسے بچ پاؤں گا؟''

اس خیال کے ساتھ ہی گلنازی کا تصور مٹ سا گیا۔ آسمان پر تاروں کے درمیان گہری تاریکی سی نظر آئی۔

''میر صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں...'' میرے خیالات نے رخ بدلا۔ ''میں اپنے جذبات و احساسات کے ربط سے اپنی عمر کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ بھائی کہتے ہیں کہ یہ ابنارملٹی ہے اور خطرناک ہے۔ لیکن کل رات جو کچھ ہوا... اس سے میں پہلے کہاں آشنا تھا؟ کل رات میں جس کیفیت سے دوچار ہوا تھا، اس کا تجربہ تو میرے پاس نہیں تھا... تو میں اپنی عمر سے آگے کیونکر نکل چکا ہوں؟ ... نہ جانے اب آگے اور کیا ہوگا... میں گلنازی کی سمت کیوں کھنچتا چلا جا رہا ہوں؟... آج میں اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا... کیا کرتا، اس کی صورت ایک بہت ہی پیاری بسورتی بچی جیسی جو تھی... پھر بھی، میری مسکراہٹ نے اسے نہ جانے کیا پیغام دیا ہوگا۔''

اچانک میرے سامنے ماسی جیراں کا چہرہ ابھرا۔

''تو سچا بھی ہے اور سیانا بھی...'' مجھے کل رات، ماسی کا کہا ہوا جملہ پھر سنائی دیا۔ ماسی نے مجھے سچا اور عقلمند کہا تھا۔

''سچائی کیا ہے؟'' میں نے آنکھیں موند لیں۔ خیالات کل رات کے ہیجان خیز واقعات کی سمت گئے، پھر پلٹے، ان میں دھیما پن نمودار ہوا۔ ''سچائی کیا ہے؟ یہی نا کہ گلنازی ماسی جیراں کے بھتیجے کی منگیتر ہے۔ اس کی شادی محمد اکبر خان ہی سے ہوگی۔ میں انیس بیس دنوں کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ پھر نہ جانے کبھی ادھر آنا ہوگا کہ نہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ مجھے ابھی میٹرک کرنا ہے، کالج جانا ہے، یونیورسٹی جانا ہے۔ اس میں تو کئی برس لگ جائیں گے... اور پھر منگیتر کی موجودگی میں میرا گلنازی سے کوئی تعلق کیسے بن سکتا ہے؟ سچائی تو یہی ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے... عقلمندی کیا ہے؟ یہی نا کہ گلنازی کے ساتھ اپنے مستقبل کو جوڑنا غلط ہے۔ ایسا سوچنا بھی حماقت ہے۔ کیا میں بے وقوف ہوں کہ اپنے مستقبل کو ایسی لڑکی کے ساتھ دیکھنا شروع کر دوں جو گزرتے لمحے کی طرح میرے پیچھے رہ جائے گی؟''

اس خیال کے ساتھ ہی مجھ پر اداسی سی اتری۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ سر کے اوپر دھند کا احساس ہوا۔

''وہ کتنی خوبصورت ہے اور مجھے چاہتی بھی ہے۔'' سر پر دھند کا احساس پھر ماند پڑ گیا۔ ''ناخواندہ ہے تو کیا ہوا! بھابھی بھی تو ناخواندہ ہیں، لیکن بھائی کے ساتھ کتنی اچھی زندگی گزار رہی ہیں... چند برسوں ہی کی تو بات ہے... گلنازی کیا میرا انتظار نہیں کر سکے گی؟ ماسی جیراں کو منایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلی شمشادہ کی بیٹی کی خواہش کو رد تو نہیں کر سکے گی۔ اگر وہ مان گئی تو تین چار برسوں بعد میں اور گلنازی بیس برس کے ہو جانے پر ایک خوبصورت زندگی کا آغاز کر سکیں گے... اگر گلنازی اپنے منگیتر کو پسند نہیں کرتی تو اس کے ساتھ زیادتی تو نہیں ہونی چاہیے۔''

سر پر دھند کا نام و نشان نہ رہا۔ تاروں کے درمیانی حصے میں تاریکی بہت گہری ہو گئی۔ میری نگاہیں اِدھر اُدھر تاروں کے درمیان گہرے اندھیرے پر جم گئیں۔

''کیا یہ میری خودغرضی نہ ہو گی؟'' میری نگاہ ایک بہت چمکتے ہوئے ٹمٹماتے ستارے پر جم گئی۔ ''محمد اکبر خان گلنازی کا سگا ماموں زاد نہ سہی، بچپن ہی سے گلنازی کا منگیتر ہے۔ گلنازی اور محمد اکبر خان نے بچپن کے خوبصورت دن اکٹھے گزارے ہوں گے... محمد اکبر خان ان ہی خوبصورت یادوں کے سہارے جی رہا ہو گا۔'' میری آنکھوں کے سامنے پھر دھند سی نمودار ہوئی۔ ''وہ ایک فوجی ہے... اپنی عسکری ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے وہ گلنازی کو یاد کرتا ہو گا، اسے نباہ کا احساس خوبصورت محسوس ہوتا ہو گا... اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی گلنازی ہی ہو گی... کیا میں اس سے یہ خوشی چھین لوں؟... کیا میں اتنا خودغرض ہوں؟'' دھند میں مجھے گلنازی کی خوبصورت چمکتی مسکراہٹ والی آنکھیں دکھائی دیں۔ ''کیا میں اتنا برا ہوں کہ اپنے جیسے کسی دوسرے انسان سے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لوں، کیونکہ مجھے اس کا موقع مل گیا ہے؟... نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' دھند میں گلنازی کے مدھم مدھم خدوخال نمایاں ہوئے... اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی تھی۔ ''میں ایسا ہرگز نہ کر سکوں گا۔ ایسا کرنا تو تاریک جبلت کے تقاضے کو پورا کرنا ہو گا — اس تاریک جبلت کے تقاضے کو، جو انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی... خودغرضی انسانی معاشرے میں زہر کی طرح پھیل جاتی ہے... اسی زہر نے

صدیوں سے انسانی معاشرے میں انسانیت کا چہرہ مسخ کر رکھا ہے۔ اسی زہر نے انسانی وجود کو انسانی نہیں رہنے دیا، حیوانی وجود بنا دیا ہے جو صرف اور صرف اپنے جبلی تقاضوں ہی کو پورا کرتا ہے۔'' دھند میں گلنازی کا چہرہ روشن ہوگیا۔ وہ میری سمت دیکھ رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ ہر سمت روشنی میں بھی موجود تھی۔ ''کیا میں خود غرضی کے زہر سے اپنے وجود کو جلا لوں؟ کیا میں یہ تیزاب جیسا زہر گلنازی کے خوبصورت چہرے پر پھینک دوں؟ خود غرضی ہوس کا ایک مضبوط، خون آلود ناخنوں والا آہنی ہاتھ ہے۔ کیا میں اپنا ہاتھ اس آہنی ہاتھ میں دے کر اسے تسلیم کرلوں؟... نہیں، ہرگز نہیں۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں اپنا جو مقام دیکھا ہے میں اسے اپنی زندگی ہی سمجھتا ہوں۔ میں زندگی میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتا جو مجھے میرے مقام سے گرادے۔ میں قوتِ شر کا کوئی تقاضا پورا نہیں کروں گا، ہرگز نہیں... میں ایسا کر ہی نہیں سکتا... شاید یہی میری عزت نفس ہے۔''

میں چونک سا گیا۔ گلنازی کے بہت روشن تصور میں، سر کے اوپر پھیلی دھند میں، مجھے گلنازی اثبات میں سر ہلاتی محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی سارا منظر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ سر پر کھلے آسمان پر تاروں کے جھرمٹ دکھائی دیے... ٹمٹماتے جھرمٹ...

''مجھے گلنازی کو روکنا ہوگا...'' میں نے سوچا۔ ''میں اسے مزید قدم بڑھانے سے خود ہی روک دوں گا۔''

اس سوچ کے ساتھ ہی مجھ پر اداسی سی اتری... میں نے پھر آنکھیں موند لیں اور نہ جانے کب مجھ پر، غنودگی، اداسی ہی کی مانند گہری ہوگئی۔

31

اگلی صبح ناشتے کے بعد بھائی نے میری طرف دیکھا۔

''تمھیں گھڑسواری کا بہت شوق ہے... تمھارے یہاں سے جانے میں بھی زیادہ دن باقی نہیں ہیں...'' انھوں نے اس انداز میں کہا جیسے کوئی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ ''شام کو تھارو بریڈ کو ایکسرسائز کے لیے لے جانا۔''

''پر بھائی جان . . . '' عصمت نے کہا، ''میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ یہ گھر سے باہر جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب وہ ملنگ اس کے دشمن بن چکے ہیں۔''

''نہیں عصمت،'' میں نے کہا، ''اب وہ اِدھر نہیں آئیں گے، اور اگر میں ایک بار خوفزدہ ہو گیا تو بار بار ہوتا رہوں گا۔'' میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔ ''میں آ جاؤں گا۔''

میں نے کہہ تو دیا، لیکن رات کے فیصلے نے میرے سامنے سوال کی دیوار کھڑی کر دی۔ مجھے گلنازی سے دور رہنا ہے، یہ فیصلہ میرے سامنے تھا۔

''ہسپتال جاؤں گا تو گلنازی سے نظریں ملیں گی . . . اس کی خوبصورت چمکتی آنکھوں کو میں دیکھے بنا نہیں رہ پاؤں گا۔ وہ پھر مجھے کمزور کر دیں گی۔''

میں تو یہ فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ باقی دنوں میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ گلنازی سے دور رہوں . . . شام کو ہسپتال کے صحن میں بھی نہیں جاؤں گا۔ گداؤ نے مجھے بتایا تھا کہ گاؤں کا کوئی لڑکا بھی ماسی جیراں کے تنور کی سمت نہیں جاتا . . . تو میں کیوں جاؤں؟ . . . اگر گلنازی ہمارے گھر آئی تو میں فوراً گھر سے نکل جایا کروں گا۔ میں اپنے ہر عمل سے گلنازی کو بتا دوں گا کہ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے وہ غلط ہے۔ میں اپنے کسی تاثر سے اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دوں گا کہ میں اس کے بے مثال حسن سے بہت مرعوب ہو چکا ہوں۔

''وہ یا تو چاشت سے پہلے بہن عصمت سے ملنے کے بہانے آ سکتی ہے یا سہ پہر کو، جب ماسی جیراں شام تک کے لیے تنور بند کر دیتی ہے۔ میں ان اوقات میں گھر سے باہر رہوں گا۔''

ناشتے کے بعد میں گھر سے نکلا۔

''کہاں جاؤں؟'' بیرونی دروازے سے نکلتے ہوئے یہ سوال مجھے جیسے سامنے کھڑا نظر آیا۔

''ٹھک ٹھک ٹھم ٹھک . . . '' بشیر نعل بند کے ہتھوڑے کی آواز نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی۔ میں سیدھا اس کی طرف گیا۔ مجھے دکان کے سامنے دیکھ کر وہ چونکا۔

''اوئے تیں اپنے کتے نوں کھریاں[46] لوانیاں وا؟'' (او تو نے اپنے کتے کو نعل لگوانے ہیں؟) بشیر نے مشرقی پنجاب کے مخصوص لہجے میں کہا۔ میں بے اختیار ہنس دیا۔ وہ کسی گھوڑے کی نعل

46۔ پنجابی میں نعلین کو کھریاں کہا جاتا ہے اور ایک نعل کو کھری۔

بنا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے اس کا ہتھوڑا ہوا ہی میں ٹھہر گیا۔ ایک مہینہ پندرہ دن گزر چکے تھے، میں نے کبھی اس سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ ہنستے ہوے میں اس کی دکان میں اس کے پہلو میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ میری اس بے تکلفی پر وہ فطری طور پر حیرت زدہ تھا۔

''کچھ چاہیے؟'' اس نے مشرقی پنجاب کی بولی اور لہجے میں کہا، ''کیا بات ہے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے؟''

''نہیں... '' میں نے بھی پنجابی زبان ہی میں جواب دیا۔ ''بس ویسے ہی چلا آیا۔''

''او پائی... '' (بھائی) اس نے حیرت سے کہا، ''آج ادھر کدھر؟''

''سارا جھاوریاں گھوم چکا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''کوٹ بھائی خان، کوٹ احمد خان، کالرہ، یہاں تک کہ چاچڑاں بھی دیکھ چکا ہوں... '' میں بھائی کے ساتھ ان قصبوں میں جا چکا تھا، وہاں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی تھی۔

''سب جگہیں دیکھ چکا ہوں۔ چھٹیاں ختم ہونے میں اب کچھ دن باقی ہیں... گھر بیٹھے بیٹھے تنگ آ جاتا ہوں۔ سو چا کہ... ''

بشیر نے ہتھوڑا ایک سمت رکھ کر ہاتھ دھونکنی پر رکھ دیا۔

''آ گیا خیال بشیرے اونتری دے کا... '' بشیر نے میری بات کاٹتے ہوے کہا، ''چار قدم پر میری دکان ہے... کبھی توفیق نہ ہوئی بات کرنے کی... اب گھر میں بیٹھا اوازار (بیزار) ہو رہا تھا تو آ گیا بشیرے غریب کے پاس!''

''نہیں بشیر،'' میں نے کہا، ''ایسی بات نہیں۔ جب تم گاتے ہو تو میں بہت غور سے سنتا ہوں۔ تم بہت اچھا گاتے ہو۔''

بشیر نے دھونکنی چلانی شروع کر دی اور لوہے کی ایک موٹی پتری چنگاریاں اڑاتے کوئلوں پر رکھ دی۔

''او پائی، اب کیا گانا وانا... '' بشیر نے گہری سانس لی۔ ''گانے وانے سب پیچھے رہ گئے... اب تو دو وقت کی روٹی کے لیے میرا ہتھوڑا ہی طبلہ بجاتا رہتا ہے۔''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''گورداسپور،'' بشیرے نے آہستہ سے کہا۔

''بیوی بچے کہاں ہیں؟'' میرے اس سوال پر بشیر نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔

''یہ بکھیڑا میں نے نہیں پالا۔'' چالیس پینتالیس برس کے بشیرے نے پھر گہری سانس لی۔ ''جب ادھر آیا تھا، کنوارا تھا۔ نہ اُودھر ویاہ (بیاہ) ہوا نہ اِدھر۔'' بشیر نے آگ میں سرخ ہو جانے والی پتری کو چمٹے سے پکڑ کر اٹھایا اور نہائی پر رکھ دیا۔

''رشتے دار تو ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہیں... پر نہ ہون جوگے...'' بشیر نے نعل بنانا شروع کر دیا۔ ''کچھ لاہور میں ہیں، کچھ لائلپور میں ہیں۔ ماموں کی لڑکی سرگودھے میں ہے۔ باقی سب پیچھے رہ گئے، گورداسپور فرید کوٹ اور ملیر کوٹلے میں...''

''تم یہاں جھاوریاں کیسے پہنچ گئے؟'' میں نے پوچھا۔

بشیر خاموش سا ہو گیا... پھر میری طرف دیکھا۔

''شام کو آنا...'' اس نے کہا، ''بڑا وقت ہوتا ہے میرے پاس... بڑے لمبے قصے ہیں... میرا یہ کام، کھریاں بنانا، بڑا مشکل کام ہے... مجھے آج ہی شاہ پور کے ایک گھوڑے کو کھریاں لگانی ہیں، باتوں کا وقت نہیں ہے میرے پاس... گھوڑوں کے پیروں کی پیمائش کرنا درزی کی پیمائش سے اوکھا (مشکل) کام ہے... کپڑا نہیں ہے اونتری دا... لوہا ہے... اَدھا سُوتر بھی اِدھر اُدھر ہو گیا تو کھری برباد...''

میں موڑھے سے اٹھا۔

''اچھا، شام کو آ جاؤں گا۔'' میں دکان سے نکل کر کھیتوں میں چلا گیا۔

32

شام سے کچھ پہلے میں بھائی کے بلاوے پر تھارو بریڈ کو ایکسر سائز کے لیے لے جانے کی خاطر ہسپتال جانا چاہتا تو تھا، لیکن رات کو کیا ہوا فیصلہ میرے سامنے سدِ راہ بن رہا تھا۔

''گلنازی تنور پر ہوگی...'' میں نے سوچا، ''اسے دیکھ کر میں اپنی خواہش پر قابو نہیں پا سکتا

کہ بس اسے دیکھتا ہی رہوں۔ میں کمزور پڑ جاتا ہوں، لیکن اگر میں اب گھوڑے کو ورزش کے لیے نہ لے کر گیا تو میر صاحب، بھائی، گداؤ، ماسی جیراں اور شاید گلنازی بھی یہی سوچے گی کہ میں پیر نور شریف اور اس کے ملنگوں سے ڈر گیا ہوں، اس لیے تنہا گھوڑے کو ایکسر سائز کے لیے نہیں لے جانا چاہتا۔''

اس خیال کے ساتھ ہی میں گھر سے نکلا، چوڑی گلی سے نکل کر کچی سڑک پر آیا تو تنور کی جانب سے دور مجھے دو لڑکیاں آتی نظر آئیں۔ ایک کو تو میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ شریفاں کٹی تھی۔ چوڑے منہ اور کھلے دہانے سے اس کے قدرے باہر نکلے ہوئے دو دانت نظر آ رہے تھے۔ دور سے وہ واقعی کٹڑی ہی لگتی تھی — گاؤں کی لڑکیوں نے خوب چن کر اس کا نام کٹی رکھا ہوا تھا — بھینس کی مادہ بچی...

شریفاں کے ساتھ دوسری لڑکی نے بھی سر پر روٹیوں کی چنگیر اٹھا رکھی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں کچھ تیزی سی تھی۔ میرے کپڑے پھڑ پھڑا رہے تھے اور سر کے بال اڑ اڑ جاتے تھے... دوسری لڑکی کو بھی میں نے پہچان لیا۔ گندمی رنگ، اٹھے ہوئے سیدھے ماتھے اور اور اٹھی ہوئی سیدھی ناک والی یہ وہی لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں سرمہ پھیلا رہتا تھا اور وہ تیز تیز، چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی تھی۔ وہ دونوں قریب آ رہی تھیں، دونوں کی نظریں مجھ پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں سڑک کی دائیں جانب سے اور وہ بائیں جانب سے گزر جاتیں، شریفاں کٹی کی اڑینگتی آواز بلند ہوئی۔

''چھوڑس نی بیداں، گلنازی چرو کی پھاہدی کھلوتی اے...'' (چھوڑ اسے زبیدہ، گلنازی نے کب کا پھانس رکھا ہے...)

میرے پورے بدن کو جھٹکا سا لگا۔ لمحے بھر کے لیے میرے قدم رک گئے۔

گلنازی سے متعلق اس قدر بے ہودہ جملہ سن کر مجھے شدید ناگواری کا احساس ہوا... شریفاں کٹی اپنے بدصورت چہرے اور بدہیئت وجود کی طرح اندرونی طور پر نہایت بدصورت اور بدہیئت محسوس ہوئی...

میں نے قدم آگے بڑھائے۔ مڑ کر ان کی طرف نہ دیکھا جو میرے قریب سے گزر کر میدان

کی سمت چلی گئی تھیں۔ گاؤں کی سب سے خوبصورت، بھولی بھالی، بچوں جیسی گلنازی سے متعلق گاؤں کی سب سے بدصورت، چالاک اور بدہیئت لڑکی کی زبانی یہ بے ہودہ جملہ میرے ذہن کو کالی ناگن کی طرح ڈس گیا۔

''یہ شریفاں کٹی، یہ زہریلی زبان والی، گلنازی کو سارے گاؤں میں رسوا کردے گی۔''

میں چلتے چلتے رک گیا۔ کیا گھوڑے کو سیر کرانے لے جاؤں یا نہ... میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں میدان کی سمت مڑ چکی تھیں۔ شریفاں کٹی کے جملے سے پیدا ہونے والی ناگواری خوف میں بدل رہی تھی — گلنازی کے رسوا ہونے کا خوف، جو مجھ پر طاری ہو چکا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا۔

''خوف ان دیکھے کا ہو یا کوئی اور، خوف ہمیشہ پریشانی، گھٹن اور منفی عمل کی طرف کھینچتا ہے۔ میں نے ہمیشہ خوف کو ہوس کا ایک ہتھیار سمجھا ہے۔ مجھے اس سے لڑنا ہوگا... یہ شریفاں کٹی، اس گاؤں کی سب سے بدصورت اور بدہیئت لڑکی ہے... کاش اس کا ذہن خوبصورت نہ سہی، قبول صورت ہی ہوتا۔ وہ گلنازی کا بے مثال حسن دیکھ کر یقیناً دل ہی دل میں جلتی ہوگی... اور اس کا ذہن بھی اسی کی طرح بدصورت ہے۔ وہ اور تو کچھ کر نہیں سکتی، گلنازی کو رسوا کرنے، نیچا دکھانے اور دکھ پہنچانے ہی میں اپنا سکون محسوس کرتی ہوگی۔ اس سے کیا ڈرنا؟... گاؤں کا ہر شخص، ہر عورت یہ تو اچھی طرح جانتی ہی ہوگی کہ شریفاں کی زبان سے اس کی جلن بولتی ہے۔ مجھے ڈرنا نہیں چاہیے، لیکن احتیاط لازمی ہے۔ میں آج ہی حفظِ ماتقدم اختیار کرلوں گا۔''

میں ہسپتال کی سمت چل دیا۔ تنور کے پاس پہنچ کر میں نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ نہ جانے گلنازی وہاں موجود تھی یا نہیں... یقیناً ہوگی... لیکن میرے ذہن میں 'نہ جانے' کے الفاظ مجھے نگاہیں اٹھانے سے مسلسل روک رہے تھے۔ ہسپتال میں بھائی کے ساتھ میر صاحب موجود تھے۔ بخشو نے تھارو بریڈ پر سپاٹ ڈال رکھی تھی۔ میں جیسے ہی گھوڑے پر سوار ہوا، میر صاحب کھڑے ہوگئے۔

''برخوردار،'' انھوں نے بلند آواز میں کہا۔ ''اس ہاتھی کی نسل کو ہماری نظروں سے دور لے جائیں، کم بخت کے نتھنوں سے پھنکار نکلتی ہے۔''

بھائی ہنسے۔ میں نے گھوڑے کو باہر نکالنے کے لیے قدم قدم چلایا۔ تنور کے سامنے آتے ہی بے اختیار میری نظریں گلنازی کو تلاش کرنے لگیں... وہ ماسی کی دائیں جانب بیٹھی سیدھی میری طرف

ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی مسکراہٹ میں پندار بھی تھا۔

''کیا کروں؟'' میں نے گھوڑے کو نہر کی جانب لے جانے کے بجائے، لاری اڈے سے شاہ پور جانے والی سڑک کے کنارے کچی جگہ پر پویہ چال میں ڈالا۔ ''کیا کروں؟... نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں اسی کو تلاش کرتی ہیں۔ آج اس کی خوبصورت آنکھوں کے چمکتے تبسم میں پندار کی آمیزش نے تو میرے فیصلے کو خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح اڑا دیا ہے جو تیز ہوا کے جھونکوں سے زمین پر گر کر بھی ارضی پیوستگی سے ناآشنا رہتے ہیں... میں کیا کروں؟ وہ اتنی خوبصورت کیوں ہے؟ کاش میں یہاں نہ آتا۔ چھٹیاں گزارنے کھوڑ چلا جاتا، یا بلکسر ہی میں رہتا، کاش میں کبھی اس بے مثال حسن کو نہ دیکھتا... میں کیا کروں؟... کیا کروں؟...''

ایک کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر میں نے گھوڑے کو روکا اور واپس موڑ لیا۔ تنور کے قریب پہنچ کر میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ تنور میں کسی جلتی لکڑی کے شفق رنگ شعلے کا عکس گلنازی کے چہرے پر لہرا رہا تھا۔ ٹاپوں کی آواز پر اس نے تیزی سے منہ موڑ کر میری سمت دیکھا... میرا فیصلہ تند جھونکوں میں اڑ گیا۔ ہم دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی بکھر گئی۔ دونوں کا رنگ لال ہو گیا۔ بخشو کو گھوڑا دے کر میں بھائی اور میر صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

''خاصی خطرناک سواری ہے،'' میر صاحب نے کہا۔ ''آپ کو اس میں کیا لطف ملتا ہے؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا...'' میری نظریں تنور کی سمت گئیں۔ گلنازی کا رخسار آتشیں تھا، وہ ماسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''بس اسے بھی ہابی سمجھ لیں... ایک بار گھوڑے کو اگر سوار کی صلاحیت پر اعتماد ہو جائے تو پھر گھڑ سواری بہت پُر لطف ہابی ہے۔''

میر صاحب نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''آپ بھی سواری کر لیتے ہیں؟'' انھوں نے کہا۔

''ہاں،'' بھائی نے جواب دیا۔ ''لیکن قدم قدم یا کبھی کبھار سرپٹ... اس جیسا سوار نہیں ہوں۔''

مجھے گلنازی کی آنکھوں میں مسکراتا، چمکتا پندار یاد آیا۔ پھر میری نگاہیں تنور کی سمت گئیں تو ماسی جیراں میری سمت دیکھ رہی تھی۔ پل بھر ہی میں مجھ پر طاری خمار سا اتر گیا...

''یہ میں کیا کر رہا ہوں؟'' خیال تند جھونکے کی مانند میرے ذہن سے گزرا۔ ''مجھے کیا ہو جاتا

ہے؟ میں کسی ایک فیصلے پر ثابت قدم کیوں نہیں رہ پاتا؟'' خیالات کی تندی کم ہونے لگی۔ ''نہیں نہیں... میں یہ غلط کر رہا ہوں... بہت ہی غلط... گلنازی کا خود ہی حوصلہ بڑھا رہا ہوں کہ وہ ایسے رستے پر قدم رکھ دے جس کی منزل ہی نہیں ہے...''

میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''ایک بات میرے دل میں کھٹک رہی ہے،'' میں نے کہا۔ ''کئی بار آپ سے کہنا چاہی لیکن...''

''کیا؟'' بھائی اور میر صاحب ایک ساتھ بولے۔

''مجھے گداؤ نے بتایا تھا کہ ماسی جیراں...'' میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا، ''ماسی جیراں نے گاؤں کے تمام لڑکوں پر سخت پابندی لگا رکھی ہے کہ وہ تنور کی سمت نہ آئیں۔ اسی لیے یہاں بیٹھ کر یوں لگتا ہے جیسے گاؤں میں لڑکے ہیں ہی نہیں... پھر میں جب سے یہاں آیا ہوں، ہر روز تنور کے سامنے بیٹھ جاتا ہوں۔ کیا ماسی جیراں اور تنور پر آنے والی لڑکیوں کو یہ بات بری نہ لگتی ہوگی؟''

بھائی مسکرائے۔ انھوں نے تنور کی سمت دیکھ کر میری طرف دیکھا۔

''بہت دیر سے خیال آیا تمھیں!'' انھوں نے کہا۔ ''لیکن میرے خیال میں تمھارے یہاں بیٹھنے پر ماسی جیراں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، اس لیے کہ تم اس گاؤں کے نہیں ہو اور دو مہینے کے لیے یہاں آئے ہو۔''

میر صاحب بھی مسکرائے۔

''آپ کے بھائی کی آپ کے بارے میں رائے درست ہے،'' انھوں نے کہا۔ ''بیک وقت بہت ذہین بھی ہیں آپ، اور معاف کیجیے گا... بے وقوف بھی۔ برخوردار، آپ تو رات کے اندھیرے میں ماسی کے گھر بھی ہو آئے ہیں اور اب یہاں بیٹھنے سے گھبرا رہے ہیں!''

بھائی نے میر صاحب کی سمت دیکھا۔

''ماسی کو اس کے یہاں بیٹھنے پر اب کیا اعتراض ہوگا،'' انھوں نے کہا۔ ''اس کے یہاں سے جانے میں پندرہ دن ہی تو رہ گئے ہیں۔''

''جو بات ابھی تک نہیں ہوئی، میں چاہتا ہوں کہ اگلے پندرہ دن میں بھی نہ ہو،'' میں نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں،'' بھائی نے کہا۔

''ماسی کو میرے یہاں آنے اور بیٹھنے پر نہ تو اعتراض تھا نہ ہوگا،'' میں نے کہا۔ ''لیکن گاؤں کی لڑکیاں... اگر کسی کے ذہن میں یہ بات آ گئی تو گاؤں میں پھیل سکتی ہے۔''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے،'' میر صاحب نے کہا۔ ''ابھی تک جو خیریت رہی ہے، غنیمت ہے۔ تنور پر ماسی کی بیٹی گلنازی جیسی لڑکی بھی موجود ہے... '' میر صاحب نے میری طرف دیکھا۔ ''لڑکیاں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔''

میر صاحب نے بھائی کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا، لیکن بھائی کی سوچ زیادہ تر مثبت ہی ہوا کرتی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا،'' انھوں نے کہا۔ ''گلنازی سے متعلق سارا گاؤں جانتا ہے کہ وہ محمد اکبر خان کی منگیتر ہے۔ کسی کی ہمت نہ ہوگی۔ رہی یہ بات... '' انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ''اگر تم خود یہ بات سمجھتے ہو اور یہاں ہر شام نہیں آنا چاہتے ہو تو اچھی بات ہے... ہم بھی اب گرمی کم ہو جانے پر کرسیاں شیشم کے درخت کے نیچے سے ہٹا کر آفس کے سامنے بچھالیا کریں گے۔ وہاں سے تنور نظر نہیں آتا۔''

میں نے قدرے گھبرا کر بھائی اور میر صاحب کی طرف دیکھا... صاف ظاہر ہے، وہ دونوں بچے تو نہیں ہیں، انھوں نے بھی گلنازی کے چہرے پر میرے لیے مسکراہٹیں دیکھی ہوں گی، اور ماسی جیراں بھی تو یہ بات جان چکی ہوگی کہ میرے دیکھنے پر گلنازی کی خوبصورت آنکھیں چمکنے کیوں لگتی ہیں۔

''ٹھیک ہے بھائی جان،'' میں نے کہا۔ ''بخشو سے کہیں کہ کل سے گھوڑا گھر ہی پر لے آیا کرے۔ میں اسے پگڈنڈیوں سے ہو کر نہر کے کنارے لے جایا کروں گا۔''

''اس کی بھی ضرورت نہیں،'' بھائی نے کہا۔ ''بخشو پہلے بھی ایکسر سائز کرایا کرتا تھا، اب بھی کرالے گا۔''

میں بخشو کے چائے لانے سے پہلے اٹھا اور اجازت چاہی۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' میر صاحب نے کہا، ''کہاں چل دیے؟''

''سر... '' میں نے کہا، ''آج سر کچھ بوجھل بوجھل سا ہے، میں گھر جا رہا ہوں۔''

''زیادہ سوچا نہ کریں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''درد تو نہیں ہے؟''

''نہیں سر،'' میں نے کہا۔ ''بس تھکن سی ہے۔''

میں ہسپتال سے نکلا۔ میری نظریں پھر جھکی ہوئی تھیں۔ گلنازی نے کیا سوچا ہوگا؟ مختلف قیاس آرائیاں کرتا میں سیدھا بشیر نعل بند کے پاس جا بیٹھا۔ وہ اپنی دکان کے سامنے، سڑک کے پار، میدان میں چارپائی پر نیم دراز تھا۔ چارپائی کے پاس سٹول پہلے ہی سے موجود تھا۔ دھوتی اور بنیان پہنے، بشیر تکیے سے ٹیک لگائے حقہ پی رہا تھا۔ چوڑے سانولے چہرے پر سوچ کا تاثر تھا۔ آنکھیں نیم وا تھیں۔ حقے کی نڑ اس کے منہ میں تھی اور غور سے دیکھنے پر مجھے تکیے کے پیچھے روئی کا گدا بھی نظر آیا۔

''او پائی... '' مجھے دیکھتے ہی بشیر نے بلند آواز میں کہا، ''تیرا ہی انتظار کر رہا ہوں۔''

''کیا حال ہے؟'' میں نے کہا۔

''حال کیا ہونا ہے!'' بشیر نے ہاتھ سے حقے کی نڑ ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تو نے سوال ہی ایسا پوچھ لیا تھا... سارا دن، سارے واقعات آنکھوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔ اونتری دا مقدر بھی بندے کو کہاں سے کہاں لا پھینکتا ہے!'' بشیر نے پھر ہاتھ حقے کی نڑ کی سمت بڑھایا، منہ کے قریب لا کر غڑ غڑ کرتے ہوئے حقے کا دھواں پھیپھڑوں میں کھینچا، پھر نتھنوں اور منہ سے دھواں چھوڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''گورداس پور میں رہتے تھے ہم... '' بشیر نے کہنا شروع کیا۔ ''اپنا گھر تھا، ہم پیشے سے خرادیے ہیں۔ یہ نعل بندی تو مقدر کا کھیل ہے۔ میرا باپ خرادیا تھا۔ ہمارے گھر کے باہر ہماری دکان تھی جس میں خراد کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔''

بشیر نے پھر حقے کا کش لیا۔ ''تو یہ سوچ رہا ہوگا کہ خرادیا ہو کر میں نعل بندی کا کام کیسے سیکھ گیا۔ اونتری دی کھریاں بنانی بھی کون سی آسان ہوتی ہیں! او پائی... گورداسپور میں میرا جگری یار تھا ہَرناما (ہرنام سنگھ)۔ ہرنامے کا باپ کھریاں بناتا تھا۔ بس اسی سے سیکھ لی نعل بندی۔ دن بھر میں باپ کے ساتھ خراد کی مشینوں پر کام کرتا تھا، شام سے پہلے میں ہرنامے کے پاس چلا جاتا تھا۔ وہ کھریاں بنانے کا ماہر تھا۔ میں بھی بیٹھ جاتا تھا نہائی کے سامنے۔ بناتے بناتے سیکھ گیا۔'' بشیر نے رک کر لمبا کش لیا۔ دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔

''جماندروں (پیدائش ہی سے) اکیلا ہوں۔ نہ بہن نہ بھائی۔ آٹھ برس کا تھا، ماں مرگئی۔ بس باپ اور میں۔ یہی زندگی تھی گورداس پور میں۔ اٹھارہ برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ باپ بھی گزر گیا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ میں نے گھر میں ڈربے بنا کر مرغیاں پالی ہوئی تھیں۔ میرے پاس اصیل مرغے بھی تھے، نانگے [47] بھی۔ ۔ ۔ اور کرنگ ناس [48] کے تو میرے پاس چھ جوڑے تھے۔ ایک ماما تھا جو ہمارے گھر سے تھوڑی دور ہی رہتا تھا۔ وہ بھی خرادیا تھا۔ مامے کی بیٹی رجو (رضیہ) اکثر میرے گھر آ کر مرغیوں کو دانہ ڈالنے کے بہانے انڈے اٹھا کے لے جاتی تھی۔ مجھ سے دس سال چھوٹی ہے۔'' بشیر نے ایک اور کش لیا۔ ''ایک دن میں خراد پر کام کر رہا تھا کہ ماما آیا۔ ۔ ۔ کچھ دیر بیٹھا رہا، پھر میری طرف دیکھ کر آہستہ سے میرے بازو کو پکڑا۔

''دیکھ بشیرے، مامے نے کہا، حالات بہت خراب ہو رہے ہیں، ملک میں تقسیم کا رولا پے گیا ہے (شور مچ گیا ہے)۔ ۔ ۔ تو اکیلا ہے۔ مجھے تیری بہت فکر رہتی ہے۔ میری ماں جائی کا بیٹا ہے تو، میں ان حالات میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ ۔ ۔ چل میرے ساتھ چل، میرے گھر میں رہ۔ فساد کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ تو میرے پاس آ جا۔ میرا اور کون ہے، رجو کی ماں، تو اور رجو۔'' بشیر نے حقے کی نڑ کو ہاتھ سے پرے کیا۔ ''میں سمجھا کہ شاید میرے اور رجو کے رشتے کی بات سوچ رہا ہے۔ وہ سولہ سال کی ہو چکی تھی، میں چھبی (چھبیس) کا۔ میں بہت خوش ہوا۔ رجو مجھے بہت اچھی لگتی تھی، بس لگا سفنے (سپنے) سجانے۔ خوشی اتنی تھی کہ اس دن میں نے اپنی مرغیوں کو، اپنے مرغوں کو بادام توڑ توڑ کر کھلائے۔ ۔ ۔ میں اگلے روز مامے کے گھر گیا۔ مامے نے کہا کہ اپنا سامان بھی لے آ، صبح جا کر مرغیوں کو دانہ پانی دے دیا کر، خراد پہ کام کر لیا کر اور سورج ڈوبنے سے پہلے گھر آ جایا کر۔ مامے نے رولے کی بات ٹھیک ہی کہی تھی۔ جلسے جلوس ہو رہے تھے۔ ۔ ۔ پھر سکھوں کے اکالی دَل والا رَولا بھی پے گیا۔ افراتفری سی تھی۔ مامے نے کہا کہ اب تو لاہور جانا ہی پڑے گا۔ ۔ ۔ حالات خراب ہیں، فساد تو اب ہو کر ہی رہے گا۔ پھر مامے نے مامی کے سامنے مجھ سے وعدہ کیا کہ لاہور پہنچ کر وہ میری شادی رجو سے کر دے گا۔ میں اپنا گھر، خراد کی دکان اور مرغیاں بیچ دوں۔ اب دیر کرنا ٹھیک نہیں، لاہور چلے

47۔ مرغوں کی ایک قسم جس کی گردن ننگی ہوتی ہے۔

48۔ مکمل سیاہ، ایسے مرغوں کی جلد بھی سیاہ ہوتی ہے۔

جاتے ہیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔''بشیر خاموش ہو گیا۔ دو چار لمبے کش لینے کے بعد اس نے آسمان کی طرف منھ کر کے دھواں چھوڑا۔''مت ماری گئی تھی میری... غلطی ہو گئی مجھ سے... میرے یار ہرنامے نے مجھے روکا بھی تھا۔ ہرنامے نے کہا تھا کہ دیکھ بشیرے، مجھے تیرے مامے کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ وہ لاہور جانا چاہتا ہے، لیکن خالی ہاتھ نہیں۔ دو گھر، دو خراد کی دکانیں، تیرے قیمتی مرغے، دو گھروں کا سامان — اچھی خاصی رقم لے کر جانا چاہتا ہے۔ تیرا سب کچھ چھین لے گا — آخو[49]... تو نہ جا یار! کیا بھروسا، رجو کی شادی تجھ سے کرے یا زبان سے پھر جائے... تو رجو سے دس گیارہ سال بڑا ہے بشیرے... تو نہ جا... ادھر ہی رہ... بہت سے مسلمانوں کے خاندان نہیں جا رہے ہیں... انھوں نے چرخے والے[50] جھنڈے گھروں پر لگانا شروع کر دیے ہیں... ٹھیک ہے، وڈ ٹکی (مار دھاڑ) کا خطرہ ہے... پر ہم ہیں نا تیرے یار، تیرے گھر پر چرخے والا جھنڈا لگا دیں گے۔ پھر اگر کسی نے تیری طرف بری نظر سے دیکھا تو آنکھ نکال کے تلی (ہتھیلی) پہ رکھ دیں گے... تو نہ جا... میری بات مان لے...''بشیرے نے پھر کش لیا۔''یہ پیار و یار سب دھوکا ہی ہوتا ہے — او ننتری دا مقدر جب گلے میں رسی ڈال دیتا ہے تو کوئی دھوکا دھوکا نہیں لگتا... نہ مانی میں نے ہرنامے کی بات، اور مامے مامی اور رجو کے ساتھ لاہور پہنچ گیا۔ ماما بہت تیز نکلا۔ اس نے گورداسپور میں میرے بیچے ہوے مکان اور خراد کی دکان کے جعلی کاغذات بنوا رکھے تھے۔ اسے کلیم میں سرگودھے کے ایک اچھے کاروباری علاقے میں... وہ بڑے اڈے کے پیچھے... گھر بھی مل گیا اور دکان بھی... خراد کی مشینیں لگ گئیں۔ میں بھی مامے کے ساتھ دکان پر کام کرنے لگا۔ پھر ایک دن مامے نے کہا، بشیرے، نیا شہر ہے، کاروبار جمتے جمتے کئی سال لگ جائیں گے... تو نعل بندی کا کام جانتا ہے۔ یہ علاقہ گھوڑی پال[51] ہے۔ بہت گھوڑے ہیں یہاں، ہر طرف تانگے نظر آتے ہیں۔ یہاں نعل بندی کا کام بہت جمے گا۔ تو نعل بندی شروع کر دے۔ مامے کی بات مجھے ٹھیک لگی۔ ویسے بھی میں سوچا کرتا تھا کہ رجو سے شادی کے بعد گھر جوائی بن کر رہنا اچھی بات نہیں ہو گی۔ میں نے فوراً

49۔ پنجابی زبان میں کسی بات پر زور دینے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

50۔ چرخے والے: انڈین نیشنل کانگریس کے چرخے والے ترنگے کو اسی الفاظ میں پکارا جاتا تھا۔

51۔ برطانوی حکومت گھوڑے پالنے کے لیے زمینیں دیا کرتی تھی، وہ علاقے گھوڑی پال کہلاتے تھے۔

ہامی بھر لی۔ مجھے تیار دیکھ کر مامے نے پُٹھی [52] لگائی۔ بولا کہ دیکھ بشیرے، یہاں سرگودھا شہر میں تو جگہ جگہ نعل بند بیٹھے ہیں... تو یوں کر، کالرے چلا جا۔ وہاں خضر حیات ٹوانے کا پورا رسالہ ہے، تجھے نوکری مل جائے گی، تنخواہ بھی اچھی خاصی ہوگی... مامے نے مجھے دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا، جیسے ہی ملازمت مل جائے، مجھے خبر کر دینا...''بشیر نے پھر دو تین اکٹھے کش لیے، دھواں چھوڑا۔''میں بہت خوش خوش کالرے پہنچا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ملازمت میرے لیے پہلے ہی سے تیار ہے۔ جب خضر حیات ٹوانے کے طویلے تک پہنچا، کسی نے مجھے اندر گھسنے بھی نہ دیا۔ سارا دن باہر ہی بھوکا پیاسا بیٹھا رہا۔ پھر ایک سائیس نے رحم کھا کر میری ملاقات وہاں کے منیجر سے کرادی۔ وہ میری بات سنتا رہا، سنتا رہا... مجھے یوں لگا کہ نوکری مل جائے گی۔ لیکن کافی دیر میری بک بک سننے کے بعد اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کوٹ بھائی خان یا کوٹ احمد خان چلا جاؤں۔ ٹوانہ صاحب کے گھوڑوں کی حفاظت اور دیکھ بھال ڈاکٹر کرتا ہے۔ میں نے کہا، سرکار، میں سلوتری نہیں، نعل بند ہوں۔ وہ ہنسنے لگا، بولا کہ ملک صاحب کے گھوڑوں کی نعل بندی بھی ڈاکٹر ہی کرتا ہے۔ پھر اس نے ایک گلاس لسی کا منگوایا، مجھے پینے کو دی اور باہر نکال دیا... لے پائی... شام کا وقت، میں اکیلا بندہ، نہ جان نہ پہچان... سوچا کہ واپس سرگودھے چلا جاؤں۔ ایک بس جانے والی تھی... پھر سوچا، کیوں نہ کوٹ بھائی خان اور کوٹ احمد خان میں مقدر آزمالوں۔ تانگے پر بیٹھ کر جھاوریاں پہنچا۔ رات یہاں ہی گزاری، اگلے روز کوٹ بھائی خان پہنچ گیا۔ وہاں میکنوں کے گھوڑوں کی دیکھ بھال ایک ریٹائرڈ فوجی کرتا تھا... پتا نہیں زندہ ہے کہ مر گیا ہے، بہت بوڑھا تھا۔''بشیر نے پھر حقے کی نڑ پکڑ کر لمبا کش لیا اور نتھنوں سے دھواں چھوڑا۔ پھر اس نے چارپائی کے قریب آتے ہوئے ایک کتے کو دیکھ کر چارپائی کے نیچے سے سلیپر اٹھایا۔

''دُردُر اونتری دا...''بشیر کے سلیپر اٹھانے پر کتا بھاگ گیا۔ بشیر بار بار عورتوں والی گالی دے رہا تھا — نہ جانے یہ گالی اس کی زبان پر کیسے چڑھ گئی تھی۔''بڑے کتے ہیں یہاں!''بشیر نے دور جاتے کتے کو دیکھا۔''کھرک مارے (خارش زدہ)... میں کسی دن تیرے بھائی سے کہوں گا کہ سب کو زہر دے کر مار دے... اونتری دے بھونک بھونک کر ساری رات سونے نہیں دیتے۔''

52۔ کشتی کا ایک داؤ جو چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔

''پھر کیا ہوا تھا؟''، میں نے پوچھا۔

''اوئے ہاں... ''بشیر نے پھر حقے کی نڑ پرے کرتے ہوئے کہا۔''میں نے فوجی کو بتایا کہ میں بہت اچھی کھریاں بناتا ہوں۔ اس نے کہا کہ نعل تو تانگے والے گھوڑے کو لگتے ہیں۔ ہمارے گھوڑے تو سواری کے ہیں۔ ہمارے گھوڑوں کو لوہے کے نعل نہیں لگتے، ولایتی لگتے ہیں۔ پیمائش کے ساتھ ولایت سے آتے ہیں۔ ہمارے گھوڑے ہر سال گھوڑوں اور مویشیوں کی نمائش میں لاہور جاتے ہیں، نیزہ بازی میں حصہ لیتے ہیں، ریس میں بھی دوڑتے ہیں... ایسے گھوڑوں کے لیے کھریاں؟ مت ماری گئی ہے تیری!''بشیر نے پھر حقے کی نڑ پکڑی، دو تین کش لیے۔''او پائی، میں کیا جانوں ولایتی کھریاں کیا بلا ہوتی ہیں۔ نہ میں نے پوچھا، نہ اس نے بتایا... میں مار کھائے ہوئے کھوتے کی طرح سڑک پر آ گیا۔ یہی فیصلہ کیا کہ سرگودھے واپس چلا جاؤں۔ سڑک سے گزرتے ایک بندے نے بتایا کہ شاہ پور سے کوئی نہ کوئی تانگہ شام کو بھی آ جاتا ہے۔ جھاوریاں چلے جاؤ، کل صبح سرگودھے والی بس میں بیٹھ جانا۔ بہت پریشان تھا میں۔ شام گہری ہو رہی تھی، میں اکیلا سڑک کے کنارے کھڑا شاہ پور سے آنے والے کسی تانگے کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈر بھی بہت لگ رہا تھا۔ لیکن ایک تانگہ آ ہی گیا... اس میں جگہ ہی نہیں تھی۔ منتیں کر کے کوچوان کے پاس، سواری کے پیروں میں جگہ ملی۔''بشیر نے بدن چارپائی پر پیچھے کی سمت کھسکایا۔ آرام دہ حالت میں آتے ہی اس نے پھر کش لگایا۔''میں تو واپس سرگودھے جانے کی سوچ رہا تھا، پر اونتری دے مقدر نے بھی موٹا رسا پکڑ رکھا تھا— باندھ دیا میرے گلے میں۔ رات جھاوریاں میں ٹھہرنا تھا۔ وہ جو... ''بشیر نے ہسپتال کی سمت جانے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔''وہ جو لاری اڈے پر چھوٹا سا ہوٹل ہے — اوئے وہی نذیر لانگری کا ہوٹل۔''

''ہاں ہاں،''میں نے کہا۔

''اسی ہوٹل میں منجی بستر املا۔ نذیرو لانگری ان دنوں زندہ تھا— ہوٹل اب بھی اسی کے نام سے چلتا ہے۔ نذیر فوج میں لانگری تھا، سروس پوری ہونے پر اس نے ہوٹل کھولا تھا۔ اونتری دا اس قدر لذیذ کھانے بناتا تھا کہ ان کے ذائقے... ''بشیر نے سر پر انگلی ماری،''یہاں ابھی تک محفوظ ہیں۔ چنگیر میں گرم گرم روٹیاں رکھ کر... ان دنوں ہوٹل ہی میں توے پر روٹیاں لگتی تھیں، اب تو ماسی جیراں

کے تنور نے رونق لگا دی ہے۔ . . نذیر لانگری کھانے کی تھالی پر دھنیے کا ایسا چھٹا مارتا تھا (چھڑکتا تھا) کہ بھوک سات گنا بڑھ جاتی تھی—اوئے بیڑا غرق!'' بشیر تقریباً چھلانگ لگا کر چارپائی سے اترا۔

''اوئے، ماسی کا تنور تو بند ہونے والا ہوگا۔ . . او پائی، روٹیاں نہ ملیں تو رات کو بھوکا ہی سونا پڑے گا۔''

وہ تیزی سے دکان کی سمت بھاگا، کرتا پہنا، پٹ بند کیے اور تنور کی سمت بھاگا۔ میں گھر جانے کے لیے چوڑی گلی کی سمت جارہا تھا کہ دور سے بھائی اور میر صاحب آتے دکھائی دیے۔ میں گھر میں داخل ہوا تو گداؤ سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''بڑی گپیں لگ رہی تھیں صاب بشیرے سے!'' اس نے تقریباً ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''وہ مجھے گورداسپور سے جھاوریاں تک کے سفر کی داستان سنارہا تھا کہ اسے روٹیاں یاد آ گئیں۔''

گداؤ نے قہقہہ لگایا۔ برآمدے میں لالٹین کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میں صحن میں موجود سٹول پر اور گداؤ رقیہ کی چارپائی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''وہ یہ قصہ اس گاؤں کے ہر آدمی کو سنا چکا ہے، اس امید پر کہ شاید کسی کو اس کے اکیلے پن کا احساس ہوجائے اور اس کی شادی ہوجائے۔ . . پر صاب، اس سے کوئی بیوہ بھی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ بیوہ کو بھی گھر چاہیے، روپے پیسے چاہییں۔ . . بشیرے کا تو مشکل سے اپنا ہی گزارہ ہوتا ہے نعل بندی سے۔ دکان ہی اس کا گھر بھی ہے۔ . . سات آٹھ سال میں سو دوسو روپے بھی جمع نہیں کر پایا۔ شادی کیسے ہو؟ ولیمے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں اس کے پاس۔ مجھے تو یوں لگتا ہے، اس کی شادی کبھی نہ ہوگی۔ . . نذیرو کی مہربانی سے بھوکا مرنے سے بچ گیا ہے۔''

''ہاں، وہ کچھ بتا ہی رہا تھا کہ تنور کی سمت بھاگ گیا ہے،'' میں نے کہا۔

''نذیر ماسی جیراں کے تائے کا بیٹا تھا،'' گداؤ نے انکشاف کیا۔ ''بچپن ہی سے کھانے پینے کا بہت شوقین تھا۔ ذات کا راٹھ تھا۔ فوج میں بھرتی ہوا تو وہاں بھی لنگر ہی کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ یہ بات وہاں کے کرنل صاب کو پتا چلی تو انھوں نے اس کی ڈیوٹی لنگر خانے ہی میں لگا دی۔ بس نذیر نذیرو لانگری مشہور ہو گیا۔ اس کو کھانے کی عادت ہی مار گئی تھی۔ پٹھانوں کی طرح چربی والے بڑے چھ چھ

چپل کباب کھا جاتا تھا۔ دو سال پہلے دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ ۔ ۔ پر صاب اس کے کھانے تو بھولے سے بھی نہیں بھولتے۔ ۔ ۔ ایک بار کالرے کے ایک فنکشن کے لیے میں اور شانی خوشاب سے آئے تو۔ ۔ ۔''

گداؤ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ بھائی بیرونی دروازے سے صحن میں آئے اور برآمدے میں چلے گئے۔

''گداؤ،'' میں نے کہا،''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''سمجھ گیا ہوں صاب،'' گداؤ نے کہا۔''یہ زبان۔ ۔ ۔ قابو میں جو نہیں رہتی۔''

''تم شانی بائی کے ساتھی تھے،'' میں نے کہا۔''اس سے یقیناً محبت بھی کرتے ہو گے۔ تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ شانی بائی تمھیں بمبئی لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی تم سے بہت پیار کرتی ہو گی۔ تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے تھے؟''

گداؤ کچھ دیر خاموش سا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی سی چھا گئی۔

''یہ پہلا پیار بڑا ظالم ہوتا ہے صاب۔ ۔ ۔'' گداؤ کی آواز بھی اداس تھی۔''اب بات کھل ہی گئی ہے تو جھوٹ کیوں بولوں۔ ۔ ۔ ہاں، بہت پیار کرتی تھی وہ مجھ سے۔ میں بھی اس کے بغیر ایک دن نہیں گزار سکتا تھا۔ تھیٹر میں سب کچھ الٹ تھا۔ وہ ہیروئن کا رول کرتی تھی، میں ولن کا۔ ہیر رانجھا میں وہ ہیر بنی تھی اور میں سیدو کھیڑا۔ مرزا صاحباں کا کھیل ہونے والا تھا کہ کرمو باہمن کا رول کرنے والے ایکٹر کو ملیریا ہو گیا۔ ڈائریکٹر نے میرے پاس آ کر کہا، گدا حسین، اب میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں اس ڈرامے میں صاحباں کے بھائی شاہ میر کا پارٹ کرنے والا تھا۔ ڈائریکٹر نے کہا، گدا حسین، تو ڈبل رول کر لے۔ کرمو باہمن کا رول آسان نہیں ہے، ہندو بن کے دکھانا ہے۔ تو شاہ میر کا رول بھی ادا کر دے اور کرمو باہمن کا بھی۔ شانی بائی نے کہا، شاہ میر کا رول تو کوئی بھی کر لے گا، اصل پارٹ تو کرمو باہمن کا ہے — چھوٹا ہی سہی، پر ہے تو کھیل کی جان۔ آپ کسی اور کو شاہ میر کا رول دے دیں، گدا حسین تو کرمو باہمن ہی کا پارٹ کرے گا۔ ڈائریکٹر چلا گیا تو میں نے شانی سے شکایت کی کہ اتنا بڑا رول چھڑوا کے مجھے چار پانچ منٹ کا پارٹ کیوں دلوا دیا ہے؟ تو صاب، شانی نے وہ بات کی جو آج بھی یاد آتی ہے تو تڑپ جاتا ہوں۔''

''کیا کہا تھا اس نے؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا، گدا حسین، شاہ میر صاحباں کا بھائی تھا، میں صاحباں کا پارٹ کر رہی ہوں... میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ کھیل میں ہی سہی، تو میرے بھائی کا رول کرے۔ میں تو تجھے اپنی زندگی کا ساتھی مان چکی ہوں۔''

گداؤ کے چہرے پر اداسی، المناک سا تاثر پیدا کرنے لگی۔

''لیکن تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''رواج... کالے رواج...'' گدا حسین نے آہستہ سے کہا۔ ''میرے ماں باپ نے مجھے بچپن ہی میں چاچے کی لڑکی سے منگ دیا تھا۔ میری بڑی بہن چچی کے بھائی کے گھر بیاہی جا چکی تھی۔ جب میں نے بمبئی جانے کی بات کی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ پھر نہ جانے کس بد بخت نے میرے والد کو یہ خبر بھی پہنچا دی کہ میں شانی بائی کے ساتھ بمبئی بھاگ رہا ہوں۔ باپ تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا، لیکن میری ماں اور بڑی بہن ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ماں نے کہا کہ پتر، اپنی منگیتر کو چھوڑنا سخت بے عزتی کی بات ہوتی ہے۔ منگیتر کا چھوڑا جانا اس سے بھی بڑی بے عزتی کی بات ہوتی ہے۔ تیرا چاچا یہ برداشت نہیں کرے گا... دونوں گھروں میں سخت دشمنی شروع ہو جائے گی اور اس دشمنی کے اصل کانٹے تیری بہن کو چبھیں گے۔ چچی کا بھائی تیری بہن کو دھکے مار کر گھر سے نکال دے گا، اس کی زندگی برباد ہو جائے گی... بہن نے ہاتھ جوڑ کر، رو رو کے کہا کہ بھائی، میں تو برباد ہو ہی جاؤں گی، وہ لوگ مجھ سے میرے بچے بھی چھین لیں گے۔ مر جاؤں گی میں... میری ساری زندگی کا سکھ اب تیرے ہاتھ میں ہے... مارنا ہے تو مجھے گلا گھونٹ کر ابھی مار دے اور چلا جا بمبئی... زندگی دینی ہے تو تھیٹر والی کو بھول جا — اور صاب، میں بے بس ہو گیا۔ ماں باپ اور خصوصاً بڑی بہن کی زندگی کی خاطر میں مر گیا۔ شانی بائی کے ساتھ میں نے طے کیا تھا کہ جس دن بمبئی کے لیے روانہ ہونا ہے، میں سرگودھے سے لاہور جانے والی بس کے اڈے پر پہنچ جاؤں گا... میں نہ جا سکا... سرگودھے کے دو آرٹسٹوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ بس پر سوار ہونے سے پہلے شانی بائی بہت روئی تھی اور بس پر چڑھتے وقت اس نے روتے ہوئے کہا تھا کہ گدا حسین، میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' گداؤ کی آواز میں رقت سی نمودار ہوئی۔

''تو کیا تمھاری شادی...'' میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ گداؤ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ خاموشی سی چھا گئی۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ یہ سوال مجھے ہرگز نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ پھر گداؤ نے میری طرف دیکھا۔

''شادی کیا تھی صاب...'' اس نے کہا،''لاش کو دولھے والے کپڑے پہنا دیے گئے تھے، سر پر سہرا سجادیا گیا تھا۔ نکاح ہو گیا۔ مجھے بس ایک ہی بات یاد رہی کہ میں نے بہن کا گھر اجڑنے سے بچالیا ہے۔''

''گداؤ،'' میں نے کہا۔''ایک اور سوال... اگر تو برا نہ مانے تو۔''

''میں نے کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا صاب،'' گداؤ نے کہا،''آپ نے اگلوا ہی لیا ہے تو جو باقی پوچھنا ہے پوچھ لیں... ویسے میرے دل کا بوجھ بھی کچھ کم ہوا ہے... میں نے شانی کو دھوکا نہیں دیا، صاب۔ وہ مجھے معاف کرے یا نہ کرے، یہ اس کا حق ہے... میں نے اسے دھوکا نہیں دیا۔ میں نے بہن کی زندگی بچائی ہے، صاب۔''

''گداؤ،'' میں نے کہا،''تمھیں پیروں فقیروں اور ملنگوں سے جو نفرت سی ہے، اس کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟''

گداؤ نے جھٹکے سے سر گھما کر میری طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بھنچ سی گئیں۔

''مان گیا میں صاب!'' گداؤ نے کہا،''آپ کے ذہن کا پردہ صحیح سین اور درست وقت پر ہی اٹھتا ہے۔ سین میں شانی اور میں ہی ہیں... بہت نفرت ہے مجھے پیروں اور ملنگوں سے۔''

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم خوشاب میں سسی پنوں کا کھیل پیش کر رہے تھے، میں اس میں ہوت[53] (اونٹ بان) بنا ہوا تھا، اور سسی کا رول شانی ادا کر رہی تھی۔ خوشاب میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے کسی پیر کے مرید رہتے ہیں۔ وہ پیر اپنے ملنگوں کے ساتھ خوشاب کے قریب کسی گاؤں میں اپنے مرید زمیندار کے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ بھی تھیٹر دیکھنے کو آ گیا۔ اس تھیٹر میں... میرا مطلب ہے، کھیل سسی پنوں میں، شانی کا ایک زبردست ڈانس بھی تھا، جو وہ سہیلیوں کے ساتھ، پنوں کے بھنبھور شہر میں آنے پر کرتی ہے۔ میرا رول

53۔ سسی پنوں کے قصے میں ہوت ہی پنوں کو بے ہوش کر کے سسی کے محل سے اٹھا لے گیا تھا۔

تو ہوت کا تھا جو پنوں کو بے ہوش کر کے اٹھا کر لے جاتا ہے اور سسی اکیلی رہ جاتی ہے ۔۔۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میرے کھیل کی سسی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کھیل کے بعد ڈائریکٹر کے ساتھ خوشاب کا زمیندار اور ڈیرے کا پیر اسٹیج کے پیچھے آئے۔ زمیندار نے کہا کہ شانی بائی، مبارک ہو، مرشد کو تمھارا ڈانس بہت ہی پسند آیا ہے۔ مرشد کی خواہش ہے کہ تم یہ ڈانس پھر کرو! اور اس نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر شانی کی طرف بڑھایا۔ مرشد آج رات میرے ڈیرے پر تمھارا ڈانس دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے ساتھ لڑکیوں کو بھی لے آنا۔ زمیندار نے ایک سو روپیہ اور نکالا۔ یہ لڑکیوں کو دے دینا ۔۔۔ وہ بڑے سے پٹکے والے، سانولے رنگ کے موٹے پیر کے ساتھ چلا گیا۔ ہمارا ڈائریکٹر بھی ان کے ساتھ تھا۔ شانی بائی حیرت سے پانچ سو کے نوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ ہمیں تو تھیٹر میں روزانہ پندرہ سے بیس روپے تک معاوضہ ملتا تھا ۔۔۔ میں پریشان تھا۔ شانی نے کہا کہ گدا حسین، تو میرے ساتھ جانا ۔۔۔ ویسے تو ڈانس پارٹی والی لڑکیاں ہوں گی میرے ساتھ، لیکن تو ضرور میرے ساتھ چلنا۔

''ابھی ہم نے رات کا کھانا کھایا ہی تھا۔ تھیٹر کا ایک ہی شو ہوتا تھا، جو رات نو بجے ختم ہو جاتا تھا ۔۔۔ ہم نے کھانا کھایا ہی تھا کہ زمیندار کی بڑی سی جیپ آ گئی۔ جیپ میں ڈانس والی لڑکیاں موجود تھیں۔ میں اور شانی بائی بھی بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ہم زمیندار کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ڈیرے میں جگہ جگہ گیس جل رہی تھی۔ زمیندار کا ایک کارندہ آیا اور اس نے شانی سے کہا کہ زمیندار جی اسے بلا رہے ہیں۔ میں ساتھ جانے لگا تو مجھے روک دیا گیا ۔۔۔ آپ سب ٹھہریں، ابھی آپ کو بھی بلاتے ہیں، ڈیرے کے بڑے کمرے کا انتظام دکھانا ہے بائی جی کو۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہاں ہمارے تھیٹر کا پیٹی والا[54] اور طبلے والا پہلے ہی موجود تھے اور کچھ دیر بعد گانا گانے والی نسیم بھی آ گئی۔ اتنے لوگوں کو دیکھ کر مجھے تسلی سی ہوگئی۔ پھر ایک ملنگ نے ہم سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ مرشد بہت پاک صاف ہیں۔ انھیں ڈانس پسند آ گیا ہے، کل تھیٹر میں بھی دیکھ سکتے تھے، لیکن کل انھوں نے دریا خان میں مریدوں کے پاس پہنچنا ہے، اس لیے دوبارہ دیکھنے کے لیے تمھیں یہاں بلایا ہے ۔۔۔ پھر اس نے پیر کی پرہیزگاری کی بہت سی باتیں کیں۔ اس نے کہا، ہمارے مرشد کے ڈیرے میں جہاں عورتیں رہتی ہیں وہاں تو صحن میں پھرنے والی مرغیوں کے ساتھ کوئی مرغا نہیں رکھا

54۔ پیٹی والا: ہارمونیم بجانے والا۔

جاتا... مجھے اس بات پر ہنسی تو آئی لیکن میں نے خود پر قابو رکھا۔ بہر حال دل کو یقین ہو گیا کہ کوئی گڑ بڑ نہیں ہے۔ پیر کو ڈانس اچھا لگا ہے، دوبارہ دیکھنا چاہتا ہے۔'' گداؤ کچھ دیر کے لیے رکا، کھانسا، پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''صاب، میرے ہوش اڑ گئے تھے جب ڈانس والی لڑکیوں، پیٹی والے اور طبلے والے کو اندر بلایا اور مجھے روک دیا گیا۔ میں نے کہا کہ میں شانی بائی کے ساتھ ہوں، لیکن نہ صرف زمیندار کے کارندے بلکہ پیر کے ملنگ بھی میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر انھوں نے احاطے کا دروازہ بند کرا دیا۔ صاب، وہ مصیبت کی رات مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں ساری رات ڈیرے کے باہر کسی زخمی جانور کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ صبح چار بجے طبلے والا، پیٹی والا اور لڑکیاں باہر آئیں۔ میں جس سے شانی سے متعلق پوچھتا تھا، وہ خاموش رہتا تھا۔ پیٹی والے نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے بس اتنا بتایا کہ ڈانس پروگرام تو رات دو بجے ہی ختم ہو گیا تھا۔ ہم بڑے کمرے میں بیٹھے تھے... وہ شانی بائی کو اندر لے گئے تھے۔ ہم کو کچھ معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔ میری حالت ایسی ہو گئی تھی صاب کہ میں زور زور سے چیخنے ہی والا تھا کہ شانی باہر آئی... وہ بے حال تھی... میرے پاس آئی تو صبح کی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ ہم ایک چھوٹی جیپ میں بیٹھ گئے۔ میں نے شانی بائی کے آنسو اپنی انگلیوں سے پونچھے تھے، لیکن اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا، نہ ہی یہ پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ پھر شانی نے کہا، گدا حسین، مجھے معاف کر دے... میں نے کہا، معافی تو تجھے تب مانگنی چاہیے تھی جب تیرا کوئی قصور ہوتا... بس بھول جا... جو کچھ بھی ہوا ہے، بھول جا... میں بھی اس رات کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔ تھیٹر میں پہنچ کر جب ہم شانی کے تمبو میں گئے تو شانی نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کہا، اب تو میری رب سے صرف اور صرف یہی دعا ہے کہ وہ مجھے کبھی تجھ سے جدا نہ کرے... میرا سب کچھ چھین لے لیکن تجھے ہمیشہ کے لیے مجھے دے دے... یادیں پیچھا نہیں چھوڑتیں صاب... پہلا پیار بڑا ظالم ہوتا ہے صاب، زندگی بھر آگ میں تپی ہوئی سلاخیں، روح پر لگاتار رہتا ہے... دل پر داغ پڑ جاتے ہیں، زندگی بھر سلگتے رہتے ہیں اور...''

گداؤ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ بھابھی اور رقیہ صحن میں آئیں۔

''آج کھانا نہیں کھانا تم نے؟'' بھابھی نے میری سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

''گداؤ!'' رقیہ نے اونچی آواز میں کہا، ''گھر سے لڑ کر آیا ہے؟ گھر نہیں جانا؟ آ ٹرے لے جا۔ میں نے تیرا کھانا بھی لگا دیا ہے... تیری لیلیٰ مجنوں تو کبھی ختم نہیں ہوگی۔''

پہلی بار رقیہ کے لہجے میں وہی خود اعتمادی محسوس ہوئی جو بُوبے والے واقعے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔

''ہر وقت طعنے نہ دیا کر رقیہ بہن! کون سی لیلیٰ، کون سا مجنوں... سب کچھ پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔'' گداؤ کی آواز میں اداسی تھی، اذیت کا چھپا ہوا احساس تھا۔

میں سٹول سے اٹھا، گداؤ فرش سے... کھیتوں کی طرف سے آنے والی ہوا میں خنکی کا اداس سا احساس بھی تھا۔

33

اگلی صبح میں ناشتے کے بعد کھیتوں میں اور کھیتوں سے ہو کر نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ نم آلود کنارے پر اُگی گھاس کے تنکے توڑ توڑ کر لہروں کے سپرد کرتا رہا۔ آنکھوں میں نیند کی دھیمی سی کیفیت بھی تھی... رات دیر تک مجھے گداؤ اور شانی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات نے سونے نہیں دیا تھا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' میں نے گھاس کا تنکا نہر کے پانی میں پھینکا۔ ''اس معاشرے میں زندگی اس قدر گھٹن کا شکار کیوں ہے؟ بہن کی زندگی بچانے کے لیے گداؤ نے جیتے جی موت قبول کر لی۔ بچپن ہی میں منگنی کیوں کر دی جاتی ہے؟ یہ معاشرے نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں سے ان کی پسند کا حق کیوں چھین لیتے ہیں؟ کیا یہ معاشرہ شادی کے بندھن کو صرف جنسی بندھن سمجھتا ہے، جس کا صرف ایک ہی مقصد ہے — افزائشِ نسل؟

''گلنازی کے ساتھ بھی تو یہی ظلم ہو چکا ہے اور اسے شدید روحانی اذیت سے بچانے کے لیے میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ اسے مکمل طور پر یہ احساس دلا دوں کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے... لیکن یہ تو جھوٹ ہوگا۔ اسے دیکھتے ہی، اس کی خوبصورت مسکراتی آنکھوں کو دیکھتے ہی، میں بے خود سا ہو جاتا ہوں، اب تو اسے دیکھ کر میں اپنی مسکراہٹ پر بھی قابو نہیں رکھ پاتا... کیا

ہوگا؟ یہ الجھن کیونکر ختم ہوگی؟... کیا ہوگا؟'' ایک بار پھر میرے تصور میں بالوں کا گچھا لہرایا جس کا ایک ایک بال ایک ایک خواہش جیسا محسوس ہوا...

میں بے چین سا ہو کر اٹھا۔ اس جگہ پہنچ کر میں رک گیا جہاں ایک مہینہ سولہ دن پہلے نوراں نے اپنا کرتا اتار کر مجھے کہا تھا کہ 'اوڈاکٹرنیاں بھراوا، منہ دھیان پراں کر...'' (اوڈاکٹر کے بھائی، منہ دھیان پرے کر لے!) اور جب میری نظر بے اختیار اس کی سمت گئی تھی، وہ لاچا بھی اتار رہی تھی۔ اگر میں فوراً ڈبکی نہ لگا لیتا تو وہ سر سے پاؤں تک ننگی ہو چکی ہوتی۔

''نوراں بہت بری لڑکی ہے...'' میں نے سوچا۔ ''اچھی خاصی خوبصورت ہونے کے باوجود وہ اندرونی طور پر اس قدر گندی اور بدصورت کیوں ہے؟... میں گلنازی سے کیسے کہوں کہ نوراں کی دوستی چھوڑ دے؟... شاید یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہو... جس طرح دیوار سے کودتے ہوئے گلنازی کا لاچا ہوا نے اڑا دیا تھا... لیکن وہ بغیر پلکیں جھپکائے مجھے کیوں دیکھتی رہتی ہے؟ وہ تو گلنازی کی سہیلی ہے...''

مجھے ایک بار پھر دیوار سے کودنے پر، لاچا اڑ جانے پر، گلنازی کی گھبراہٹ یاد آئی۔ میں بے اختیار مسکرایا۔

''دوسرے دن گلنازی کی حالت دیکھنے والی تھی...'' میں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ ''شرم سے بیر بہوٹی[55] بن گئی تھی۔ وہ کتنی اچھی ہے... جتنی خوبصورت ہے، اتنا ہی خوبصورت اس کا دل بھی ہے — بھولی بھالی، بچوں جیسی... شرم کی کسی بات پر اس کے چہرے کا رنگ بھی، میرے چہرے کی طرح، سرخ ہو جاتا ہے... لیکن وہ اپنے جذبات کے اظہار میں دلیر ہے اور سچی بھی ہے...'' مجھے اپنے بائیں رخسار پر گلنازی کے رخسار کا لمس محسوس ہوا... ''نہ چھڈ دی!'' اُس کی خوبصورت آواز مجھے سرگوشی کی طرح محسوس ہوئی اور میں بے چین سا ہو گیا۔ پھر میں نے جوتے اتار دیے، نہر کے کنارے پر بیٹھ کر پاؤں نہر کے پانی میں ڈال دیے۔ پانی میرے گھٹنوں سے کچھ نیچے، میری ٹانگوں سے ٹکراتے ہوئے گزرنے لگا۔ پانی میں خنکی تھی۔

''جون جولائی کی دوپہروں میں نہر کا پانی ٹھنڈا رہتا ہے،'' میں نے سوچا۔ ''درختوں کی

55۔ بیر بہوٹی یا چندرو دھو: ریتیلے علاقے میں برسات کے موسم میں پیدا ہونے والی خوبصورت صحرائی مکڑی، جس کا رنگ مخملیں سرخ ہوتا ہے۔ بہت شرمیلی ہوتی ہے، انگلی یا تنکا لگانے سے ٹھہر کر بیٹھ جاتی ہے، سر کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔

چھاؤں میں... شاید اس کا باعث روانی ہوگی۔'' کوئی اور وجہ ذہن میں نہیں تھی۔

پھر میرے خیالات میں تلازم سا نمودار ہوا۔تنور پر نہ جانے کے خیال سے بشیر نعل بند کا خیال جڑ گیا۔

''بشیر نے شاید بہت کچھ بتانا تھا لیکن...'' میں خیالات کے دھارے میں بہنے لگا۔'' بھوک ہر بات بھلا دیتی ہے۔''

پھر مجھے بُوبے کا خیال آیا، رقیہ کی جانب خیال مڑ گیا۔ رقیہ کی دی ہوئی گالیاں، بددعائیں اور دھمکیاں یاد آئیں... پھر مجھ پر غنودگی سی چھا گئی۔ یہ عجیب سی نیند ہے جو بچپن ہی سے میرے ساتھ ہے۔ یہ اکثر مجھ پر طاری ہو جاتی ہے، جس میں نہ میں جاگتا ہوں نہ سوتا ہوں۔ اس کیفیت میں کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں اور مکمل بیداری پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک منٹ گزرا ہو... وقت کا میرے لیے اس طرح تھم جانا خود میرے لیے باعثِ حیرت ہوتا ہے۔

میں مکمل طور پر بیدار ہوا تو دوپہر زوال پذیر ہو رہی تھی۔ میرے کندھوں پر، گردن میں درد سا تھا۔ گھٹنوں سے نیچے ٹانگیں سن سی ہو چکی تھیں۔ میرے لیے گزرنے والا ایک ایک منٹ گھنٹوں پر محیط تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔

شام ہوتے ہی میں بشیر نعل بند کے پاس جا بیٹھا۔

''او پائی...'' بشیر نے کہا۔'' قصہ بہت لمبا ہے۔ سارا دن ساری رات سناتا رہوں تو بھی ختم نہ ہو... کہاں تھا میں؟''

''نذیرو لانگری کے ہوٹل میں،'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' بشیر گدے اور تکیے سے ٹیک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ حقے کی نڑ اس کے ہاتھ میں تھی۔

''کیا روح تھی نذیر لانگری بھی!'' بشیر نے کہا،'' پھر نہیں دیکھا ایسا بندہ... کھانا پکانا تو اس پر ختم تھا۔ میری کوئی گھر والی ہوتی تو اونتری دی کو نذیرو لانگری کی شاگرد بنا دیتا۔''

''پھر کیا تم واپس سرگودھے چلے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''او پائی... پہلے سن تو لے!'' بشیر نے جھنجلا کر کہا۔'' بڑا اُتاوَلا ہے تو... لے ثریا ہے مجھے

سرگودھے!'' (لے چلا ہے مجھے سرگودھے!) اس نے زور کا کش لیا۔ ''میں کھانا کھا رہا تھا کہ نذیرو لانگری میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ پردیسی لگتے ہو۔ اس نے کہا، کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے؟ میں نے اسے ساری بات بتادی۔ وہ سنتا رہا۔ پھر جب میں نے کہا کہ کل صبح میں سرگودھے چلا جاؤں گا تو وہ کچھ سوچ کر بولا، پورے جھاوریاں میں ایک بھی نعل بند نہیں ہے۔ گھوڑے گھوڑیاں، خچر خچریاں، کھوتے کھوتیاں تو بہت ہیں، پر نعل بند سب شاہ پور میں ہیں۔ تو یہاں کام شروع کر دے۔ میں نے کہا، او پائی، چھابڑی لگا کے سبزی نہیں بیچنی مجھے... کھریاں بنانی ہیں۔ سڑک کے کنارے بیٹھ کر تو میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ نذیرو نے یہ بات سن کر میری طرف دیکھا۔ بولا، دیکھ بھائی بشیر — نام تو اس نے میرا پہلے ہی پوچھ لیا تھا — کہنے لگا کہ دیکھ، جھاوریاں میں میری ایک دکان ہے — ایک کمرے کی، ایک ڈیڑھ مرلے کی۔ زمین بھی میری ہے،'' بشیر نے دکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دکان نذیرو لانگری کی تھی۔ وہ یہاں اپنے بیٹے کے لیے ہوٹل بنانا چاہتا تھا۔ لیکن بیٹا کاروبار سے بھاگتا تھا، ایئرفورس میں بھرتی ہو کر سرگودھے چلا گیا۔ دکان خالی پڑی تھی۔ نذیرو نے مجھے کہا، دکان بازار سے زیادہ دور نہیں، بس چھوٹا سا میدان ہے درمیان میں، پھر بھی کوئی کرائے پر لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تو یہ دکان لے لے۔ اگر تیرے پاس پینتالیس روپے ہیں تو میں زمین اور دکان تیرے نام کرا دیتا ہوں... نذیرو لانگری کی بات سن کر مجھ میں بہت حوصلہ پیدا ہوا۔ صبح میں پہلی بس پر سرگودھے پہنچ گیا۔ گھر پہنچا تو مامے کے پاس چند مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ رجو نے بتایا کہ یہ کپور تھلے کے خرادیے ہیں۔ انھیں بھی سرگودھے میں مکان الاٹ ہوا ہے۔ پیسے والے ہیں، انھوں نے یہاں لوہے کے پائپوں کی دکان کھول لی ہے۔ اچھا خاصا کاروبار جم گیا ہے۔ وہ لوگ مامے کے دوست بن گئے ہیں۔ دو بھائی ہیں، دونوں کپور تھلے سے آئے ہیں۔ چھوٹے بھائی کا ایک ہی بیٹا ہے، پنجی چھبی کا (پچیس چھبیس سال کا)... اس وقت میرے دماغ میں بس ایک ہی خیال تھا کہ مامے سے پینتالیس روپے لے کر جلدی جلدی یہاں آؤں اور دکان خرید لوں۔ ماما مہمانوں سے فارغ ہوا تو میں نے بات کی۔ وہ دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا، بہت بڑی رقم مانگی ہے تو نے بشیرے... اچھا، کچھ انتظام کرتا ہوں۔ یہ کہہ ماما باہر چلا گیا۔ رجو کا میرے ساتھ برتاؤ کچھ بدلا بدلا سا تھا، لیکن میرے پاس کچھ اور سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ رات کو ماما آیا اور مجھے چالیس روپے دیے اور کہا، بس

اتنے پیسوں ہی کا انتظام ہو سکا ہے۔ چار روپے میرے پاس موجود تھے، میں چالیس روپے لے کر یہاں آ گیا۔ نذیرو لانگری کو بتایا کہ چالیس لے آیا ہوں، باقی پانچ روپے مہینے دو مہینے میں چکا دوں گا۔ نذیرو لانگری نے مجھے دکان کی چابی دی اور کہا کہ پٹواری سے کاغذات مکمل کرا دے گا۔ بڑا اپکا اور ایمان دار تھا نذیرو، چھ دن ہی میں اسے کاغذات مل گئے، میرے نام مالکانہ حقوق کے، دکان میرے نام ہوگئی۔'' بشیر نے دو تین لمبے لمبے کش لے کر دھواں ایک سمت چھوڑا۔'' او پائی، دکان کو چاٹنا تھا میں نے؟ نہ پھونکنی (دھونکنی)، نہ لوہا گُرسی (نہائی) نہ ہتھ تیشہ،[56] نہ چھینی، نہ ہتھوڑا، نہ کھریاں بنانے کے لیے لوہا۔ بھٹی (انگیٹھی) تو چلو، میں نے خود ہی بنائی تھی، سامان کہاں سے لاتا؟ پھر نذیرو لانگری سے بات کی۔'' بشیر نے حقے کے اوپر دھری مٹی کی ٹوپی اٹھائی جس میں تمباکو کے اوپر کوئلے رکھے جاتے ہیں۔ اس نے تکیے کے نیچے سے لوہے کی لمبی سلائی سی نکالی اور ٹوپی کے اندر راکھ کو دیکھا۔ پھر اس نے سلائی راکھ میں گھسا کر راکھ کو ٹٹولا۔ ایک مدھم سی چنگاری اڑتی نظر آئی۔ بشیر نے ٹوپی حقے پر رکھ کے زور زور سے تین چار کش لیے اور دھواں نکلنے پر میری طرف دیکھا۔'' او پائی، کمال بندہ تھا نذیرو لانگری بھی! ایسے لوگ، ایسی روحیں اب کہاں! جھٹ سے اس نے جیب سے دس روپے نکالے اور مجھے دیے۔ بولا کہ کل ہی شاہ پور مجیدے کے پاس چلا جا۔ لاری اڈے کے قریب ہی اس کی دکان ہے۔ مشہور آدمی ہے، کسی سے بھی پوچھ لینا۔ بس وہاں جا کر میرا نام لینا اور کام بتانا۔ وہ تجھے اسلم کباڑیے کے پاس لے جائے گا، سب چیزیں مل جائیں گی — تیرا کام چھ سات روپے میں ہو جائے گا۔ کل صبح ہی نکل جا شاہ پور کے لیے۔ سامان لے آ۔ گاہکوں کی فکر نہ کر۔ سب تانگے والے میرے ہوٹل پر کھانا کھاتے ہیں، جس کے گھوڑے کی نعل بھی ٹوٹے گی، تیرے پاس بھیج دوں گا۔ یہاں سے شاہ پور تک سڑک پکی ہے، نعل ٹوٹتی ہی رہتی ہیں — تیرا کام چل نکلے گا۔ . . کمال کا آدمی تھا نذیرو لانگری! نہ جان نہ پہچان، نہ رشتے داری — وہ جھاوریاں کا، میں گورداسپور کا۔ . . اس نے تو میری اس طرح مدد کی کہ کوئی سگا بھی نہ کرے۔ نہ غرض نہ لالچ۔ زمین دے دی، دکان دے دی، اوزار کا انتظام کر دیا۔ . . میں کہتا ہوں کہ اس دنیا میں اگر سب لوگ نذیرو لانگری جیسے ہو جائیں تو اونتری دی یہ دنیا

56۔ ہتھ تیشہ: نعل بندوں کے پاس نعل ہی کی شکل کا ایک چھوٹا سا تیشہ ہوتا ہے، جسے انگوٹھے اور انگلیوں کی مدد سے پکڑتے ہیں اور گھوڑے کے سُم چھیل کر ہموار کرتے ہیں۔ گنڈیریاں بنانے والے بھی اسی سے گنوں کے چھیلتے ہیں۔

جنت بن جائے۔'' بشیر نے زور سے کش لیا۔

''لے آئے پھر اوزار؟'' میں نے کہا۔

''او پائی، صبر نہیں ہے تجھ میں؟ دو کش تو لینے دے، حقہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پھر روٹیاں لینے بھی جانا ہے۔''

بشیر نے زور زور سے کش لینے شروع کر دیے۔ مجھے گلنازی یاد آئی... وہ تنور پر بیٹھی بار بار سڑک کی سمت دیکھ رہی ہوگی... وہ کیا سوچ رہی ہوگی؟

''گیا تھا میں شاہ پور۔'' بشیر کی آواز پر میں چونکا۔ ''مجیدے نے اسلم کباڑیے سے سارے اوزار سات روپے میں لے دیے۔ دو روپے میں کھریاں بنانے کے لیے پتریاں بھی لے دیں۔ واپس آ کر میں نے ایک دن ہی میں بھٹی بھی بنالی، پھونکنی (دھونکنی) بھی جمالی، لوہا کرسی (نہائی) بھی گاڑ لی۔ اگلے روز ایک گاہک آ گیا۔ اسے نذیرو ہی نے بھیجا تھا۔ میں نے ایک گھنٹے میں کھریاں بنا کر گھوڑے کو لگا دیں تو وہ حیران ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر اس نے مجھے شاباش دی۔ واہ بھئی واہ! شاہ پور میں تو چار چار گھنٹے بیٹھنا پڑتا ہے۔ اور نعل... واہ... اتنا اچھا، کاریگر ہے تو— شاباشے! بس مشہور ہو گیا میں۔ جھاوریاں کے علاوہ شاہ پور سے بھی تانگے والے آنے شروع ہو گئے۔ خچروں والے بھی مجھ ہی سے کھریاں لگوانے لگے۔ لہراں بہراں ہو گیاں (لہر بہر ہو گئی)... لے پائی، آج اتنی ہی... باقی کہانی کل سنادوں گا۔ میں چلوں روٹیاں لینے۔''

میں بھی سٹول نما موڑھے سے اٹھا۔ گھر کی سمت بڑھا۔

''انسانی ذہن بھی عجیب شے ہے،'' میں نے سوچا ''اپنی محرومی کو ختم کرنے کے لیے اس کا احساس ہی ختم کر دینا چاہتا ہے۔ گداؤ نے بتایا تھا کہ بشیر کا مشکل سے گزارہ ہوتا ہے — وہ اپنی تصوراتی خوش وقتی کو حقیقی بنا کر میرے سامنے پیش کرتے ہوئے سکون محسوس کر رہا تھا۔''

34

اگلی صبح میں پھر نہر کے کنارے بیٹھا تھا۔

صبح کے سورج کی کرنیں، درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر، نہر کے کنارے پر پھیلی ہوئی تھیں۔

''بشیر کی کہانی بھی عجیب ہے . . . '' میرے ذہن میں بشیر کے ماموں کی لڑکی رجو کا خیال سوالیہ نشان بن کر کھڑا تھا۔

''رجو کا کیا بنا ہوگا، کیا ہوا ہوگا؟ بشیرا کیلے زندگی گزار رہا ہے، یقیناً کوئی المیہ ہی ہوا ہوگا۔ برادریوں کی اقدار اور رویے مصلحتوں کے بوجھ تلے دب ہی جایا کرتے ہیں۔''

اگلا خیال نہ جانے تلازم کی کس جہت پر تھا کہ رقیہ پر آ کر تھم گیا۔ مجھے رقیہ کی گالیاں، بددعائیں اور دھمکیاں یاد آئیں۔ اس دن بھی میں اسی نہر کے کنارے سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس روز مجھے پانی کے دھاروں میں روانی کا کوئی احساس نہ تھا۔

''زندگی بہتے پانی کی مانند ہے . . . '' میں نہر میں بہتے دھاروں کو دیکھنے لگا۔ ''رواں دواں . . . کبھی کناروں میں سمٹتی ہے تو کبھی کناروں سے اچھل بھی جاتی ہے، پھیل بھی جاتی ہے . . . کبھی ساکن سی نظر آنے لگتی ہے تو کبھی اس میں بھنور پڑتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہ کہیں بھی مستقل طور پر ساکن نہیں ہوتی۔ زندگی میں بظاہر سکون کے لمحے بھی وقت کے ساتھ رواں ہی رہتے ہیں . . . بُوبے کی زندگی بھی رواں دواں رہے گی . . . رقیہ بھی روز وشب میں اپنے ہونے کے احساس کے ساتھ، اپنا سب کچھ اپنے بیٹے پر قربان کرتے ہوے، اپنی جوانی کی ساری امنگیں اپنے بچے کی خاطر تیاگ کر، نہر میں بہتے دھارے کی مانند رواں ہی رہے گی . . . اس کی زندگی بظاہر ساکن بھی نظر آئے گی اور اس میں بھنور بھی پڑتے رہیں گے . . . لیکن دھاروں کے نیچے جس طرح پانی میں ناقابلِ یقین تیزی موجود رہتی ہے، رقیہ کی زندگی بھی، اپنے بیٹے کے ساتھ، وقت کا احساس کیے بغیر بہت تیزی سے گزر جائے گی . . . روشنی اور سچائی کی راہ پر زندگی کبھی نہیں تھمتی . . . اسے تاریکی میں گھراؤ روکنے کی کوشش ضرور کرتے رہتے ہیں۔ تو پھر زندگی کا مقصد کیا ہوا؟ یہی نا کہ تاریکی کی راہ روکی جائے، اس تاریکی کی جو سیاہ پوش ملنگوں کی طرح گاؤں گاؤں جا کر اسپند کے دانوں کا دھواں پھیلاتی ہوئی داخل ہوتی ہے . . . جو اماوس میں، کالی بلا کو پٹاری میں بند کرتے ہوئے، مکئی کے کھیتوں میں رینگتی ہے، جو سیاہ دیوار پر اپنے ہاتھ دھرتی ہے، اچکتی ہے اور کالی بلا کی پٹاری کھول کر ایک بچے کی جان لینے کی کوشش کرتی ہے۔ روکنا ہے تو اس تاریکی کو کیوں نہ روکا جائے، ورنہ وہ ایک تاریک زندگی لاکھوں روشن زندگیوں کو نگل جائے گی . . . تاریکی کے اصول بھی تاریک ہوتے ہیں . . .

اندھیرا صرف روشنی ہی کو نہیں، چھوٹے اندھیروں کو بھی نگل جاتا ہے تاکہ اس کا وجود عظیم ہو جائے — اس مہاراجہ کوبرے کی طرح جو اپنے سامنے آنے والے ہر سانپ کو کھا جاتا ہے . . . اس بادشاہ شارک کی طرح جو اپنے سامنے آنے والی ہر مچھلی کو ہڑپ کر جاتا ہے . . . روکنا ہے تو اس اندھیرے کی راہ کیوں نہ روکی جائے . . . کیا میں اسے روک پاؤں گا؟ کیا کوئی اور اسے روک پائے گا؟ کیا سب مل کر اسے روک پائیں گے؟ کیا میں اپنی اس جسمانی اور دنیاوی زندگی میں اس صبح روشن کو دیکھ سکوں گا؟ کیا ان تاریکیوں میں میری زندگی اپنی روانی میں مجھے وہ چمکتی ہوئی روشن صبح دکھا پائے گی جس کی خواہش میرے لیے میری زندگی ہی کی مانند ہے؟ کیا میں اندھیرے کے تہہ بہ تہہ پردوں کو کھول کر روشنی کی شعاعوں کے لیے راستہ بنا پاؤں گا؟''

میرے سامنے نہر کے پانی پر کچھ بلبلے سے نمایاں ہو کر دھارے کے ساتھ بہتے چلے گئے۔ شاید گدلے پانی کے نیچے کوئی مچھلی ہوگی۔

35

بشیر نعل بند کی ادھوری کہانی مجھے کھینچ کر پھر اسے کچھ اور بتانے کے لیے اسی کے پاس لے گئی۔ وہ بھی شاید یہ جانتا تھا کہ میں اس کی مکمل کہانی سنے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ اس نے سٹول نما موڑھا چارپائی کے قریب پہلے ہی سے رکھا ہوا تھا . . . میری یہ کوشش بھی میرے اس عمل کے لیے تحریک تھی کہ نہ تو میں گلنازی کو دیکھوں اور نہ ہی وہ مجھے دیکھے۔

''کیا ہونا تھا!'' میرے اس سوال پر کہ رجو کا کیا ہوا، بشیر نے حقے کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا تھا، ''او پائی، میں تو جماندروں (پیدائش ہی سے) اکیلا ہوں . . . اکیلا ہی تھا، اکیلا ہی ہوں۔''

شام کی سنہری کرنیں گاؤں کے مغربی افق پر نمودار ہو چکی تھیں۔

''کچھ دیر بعد افق پر ہر سمت آگ سی پھیل جائے گی،'' میں نے سوچا، ''ماسی کے تنور کی دہکتی ہوئی آگ کی مانند . . . گلنازی کیا سوچتی ہوگی . . . میں کہاں غائب ہو گیا ہوں؟''

''او پائی، تیں کیہڑی سوچیں پے گیا؟'' (او بھائی تو کس سوچ میں گم ہے؟) بشیر نے بھانپ لیا تھا کہ میری توجہ اس کی جانب نہیں ہے۔

''وہ تم . . . ''میں نے کہا،'' بتا رہے تھے کہ تمھارا کاروبار تو یہاں جم گیا تھا— پر تمھاری رجو سے شادی کیوں نہیں ہو پائی تھی؟''

بشیر نے میری سمت گہری نظروں سے دیکھا۔

''جم تو گیا تھا کاروبار . . . ''اس نے کہا۔'' گاہکوں کی لین لگ گئی تھی، پر مقدر نے میری ہی لین لگانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رجو کو بیاہ لاؤں۔ نذیرو لانگری نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے دس پندرہ روپے کرائے پر بازار کی سمت پکا گھر لے دے گا۔ میں خوش خوش سرگودھے پہنچا۔ میں خوش تھا کہ اب اپنا گھر ہوگا، رجو ہوگی . . . بال بچے ہوں گے، اور میرے پاس ایک ریڈیو بھی ہوگا . . . تجھے پتا نہیں، مجھے ریڈیو کا بڑا شوق ہے . . . پر کیا کروں، یہاں بجلی ہی نہیں ہے، ورنہ اونتری دا، خرید ہی لیتا۔'' بشیر نے ریڈیو کو گالی دی۔'' بیٹری والا ریڈیو لینے لاہور جانا ہی پڑے گا . . . ''بشیر نے دو کش لگائے۔

''پھر کیا ہوا؟''میں نے پوچھا۔

''کیا ہونا تھا!''بشیر نے کہا۔''بڑی امید لے کر گیا تھا میں سرگودھے . . . او پائی، میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا جب پتا چلا کہ مامے نے کپور تھلے والے چھوٹے خرادیے کے بیٹے سے رجو کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ میں اتنی زور سے منجی پر بیٹھا کہ چولیں ہل گئیں اونتری دی کی۔''

''بہت غصہ آیا ہوگا تجھے!''میں نے پوچھا۔

''صاف ظاہر ہے . . . میں نے مامے کو سنائیں کہ یہی کرنا تھا تو مجھے یہاں کیوں لایا تھا؟ پر مامے جیسا بے شرم اور ڈھیٹ بندہ بھی شاید ہی کوئی ہوگا۔ کہنے لگا کہ میں رجو کا باپ ہوں، اس کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا۔ وہ تجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی، میں زبردستی نہیں کر سکتا . . . اب تو اس کا رشتہ پکا ہو گیا ہے، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو اب جا . . . میں نے کہا کہ کیسے جاؤں؟ میری ساری زندگی تو نے برباد کر دی ہے۔ میرا گوردا سپور والا گھر بیچ دیا، خراد کی دکان بیچ دی، مشینیں بیچ دیں، گھر کا سارا سامان بیچ دیا۔ اب کم از کم وہ پیسے تو مجھے دے دے . . . تو مامے نے کہا، اتنے سال میرے گھر میں کھانا کھاتا رہا ہے . . . میں تجھے صحیح سلامت ادھر لے آیا، گھر میں رکھا، کیا سب کچھ مفت میں مل جاتا ہے؟ پیسے کس چیز کے مانگ رہا ہے؟ چالیس روپے دے تو دیے ہیں۔ میں نے کہا کہ بیس روپے کی تو میری مرغیاں ہی تھیں، خراد کی مشینیں دو تین سو روپے کی تھیں، گھر تھا، زمین تھی، گھر کا سامان تھا . . . کیا سب

کی قیمت چالیس روپے تھی؟ کتنا کھانا کھا گیا ہوں تیرا؟ یہاں آ کر تیرے ساتھ خراد پر کام کرتا رہا ہوں، کون سی تنخواہ دی ہے تو نے؟ مفت میں کام کرا کے روٹی دال کا طعنہ دے رہا ہے! تو سیدھی طرح میرے پیسے نکال... اس پر مامے نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔ بولا، کیا کرلے گا تو؟ عدالت میں جائے گا؟ جا۔ میں نے نہ تیرا مکان بیچا تھا نہ دکان، نہ مشینیں نہ مرغیاں نہ گھر کا سامان... جا ثابت کر — پتر جی، یہ دنیا قانون پر چلتی ہے، قانون کاغذ مانگتا ہے... کیا ہے تیرے پاس رسید کہ میں نے تیرے پیسے لیے ہیں؟ نہیں ہے! بہتر یہی ہے کہ اب یہاں سے دفع ہو جا اور پھر کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا... پیسے مانگتا ہے! مامے کی آنکھوں میں مکاری دیکھ کر اور اپنی بے چارگی دیکھ کر میں وہاں سے چلا آیا۔'' بشیر چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''مامے کو حرامی کہنا ٹھیک نہیں، پر تھا وہ حرام کی اولاد... دغا کر گیا میرے ساتھ۔''

''کیا مر چکا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں،'' بشیر نے کہا، ''لالچ کی گٹھری اٹھا کے لگ گیا ہے بنے (کنارے)...''

''تو نے رجو سے کیوں نہیں پوچھا تھا کہ اس نے شادی سے انکار کیوں کیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''کیا پوچھتا!'' بشیر نے کہا۔ ''اس کا برتاؤ تو پہلے ہی بدلا ہوا تھا۔ میرے یار ہرنامے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ رجو مجھ سے دس سال سے چھوٹی ہے، وہ کیسے مجھ سے بیاہ پر راضی ہو گی؟ پر میری ہی مت ماری گئی تھی... میں سوچتا تھا کہ دس سال سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر خوراک ملتی رہے تو گھوڑا اور مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ پر ایک بات میں بھول گیا تھا کہ میرے پاس دھن دولت نہیں ہے۔ اور وہ رجو... اسے حویلی نظر آئی، چلتا لوہے کا کاروبار نظر آیا، دھن دولت نظر آئی... بڑی خوشی سے راضی ہو گئی شادی پر... اب بھی سرگودھے ہی میں ہے۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں، میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی... میں تو مامے کی وفات پر بھی نہیں گیا تھا۔ خبر مجھے مل گئی تھی... رجو ہی نے بھجوائی تھی... کمینی، خودغرض، بے وفا... پیسہ دیکھ کے گر گئی کنجری!''

بشیر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ مجھے خودغرضی کا ایک اور پہلو نظر آیا جو اس دنیا کے رہنے والوں کی جبلی ضرورتوں سے جڑا ہوا ہے۔

''بھوک مٹانے کے لیے دو روٹیوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے،'' میں نے سوچا، ''لیکن اگر

دسترخوان پر طرح طرح کے پکوان پڑے ہوں تو ان کی سمت کیوں نہ رخ کیا جائے... کیا ضرورت ہے دو سوکھی روٹیاں کھا کر خود کو ترسانے کی..."

بشیر کے ذہن میں تلخی تھی۔ وہ حقے کے کڑوے کش پہ کش لے رہا تھا — شاید ذہنی تلخی کو جسمانی کڑواہٹ سے ختم کرنا چاہتا تھا۔

"کل ماسی جیراں ناراض تو نہیں ہوئی تھی؟" میں نے گفتگو کا رخ موڑا۔ "تم دیر سے گئے تھے۔"

"کل نئیں او پائی..." بشیر نے کہا، "پرسوں دیر ہوگئی تھی... ماسی ناراض نہیں ہوتی، بڑی ہی اچھی اور نیک عورت ہے۔ کیا کروں، اونتری داتوا ہے میرے پاس، روٹی بھی پکانی آتی ہے، پر کون آٹا گوندھے، کون چولھے پر پھونکیں مارے... پھونکنی بہت زیادہ کوئلے کھا جاتی ہے — چل پائی، میں تو چلا تنور پہ..."

36

واپس چکوال جانے میں دس دن رہ گئے تھے۔

اگلے روز بھی میرا معمول وہی رہا۔ گلنازی سے دور رہنے ہی میں اپنی اور اس کی بھلائی دیکھ رہا تھا۔ رات کو جب سب چھت پر سونے کے لیے لیٹے اور میں تاروں میں جیومیٹری کی اشکال تلاش کرنے لگا تو بھائی نے تکیے سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ پریشان سے تھے۔

"گداؤ نے بتایا ہے کہ تم صبح سے دوپہر تک کھیتوں میں اور نہر کے کنارے گھومتے پھرتے رہتے ہو،" بھائی نے کہا۔ "یہ ٹھیک نہیں... تم اس بات کو کیسے بھول سکتے ہو کہ پیر کے جرائم پیشہ ملنگ اب میگھا پتن سے تمھاری جان لینے بھی آ سکتے ہیں۔"

بھائی کے اس جملے سے مجھے پہلی بار تمام واقعے سے وابستہ اس پہلو کا احساس ہوا... یہ اندیشہ تو عصمت نے بھی ظاہر کیا تھا، لیکن مجھے اس کی سنجیدگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں نے اب بھی اس اندیشے کو جھٹلایا۔

"نہیں بھائی جان،" میں نے کہا، "میرے خیال میں وہ اب اس گاؤں میں جلدی نہیں آئیں گے۔ پیر لوگ بہت عیار ہوتے ہیں۔ پیر نور شریف خود بھی اس اندیشے کا شکار ہوگا کہ کہیں اس کے

فریب کی دیوار میں دراڑ نہ پڑ جائے۔ وہ اب کوئی رسک نہیں لے گا، خود ہی اس بات کو دبانے کی کوشش کرے گا... اور اب تو برسات بھی شروع ہونے والی ہے۔ بُوبا اور رقیہ کمرے ہی میں سویا کریں گے... بچے پر دوبارہ حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... مجھ پر حملہ پیر کے حق میں کسی صورت بھی اچھی بات نہیں ہوگی۔ وہ بہت مکار آدمی ہے۔ وہ بوبے کے پانچ سال پورے ہو جانے تک اب جھاوریاں کے متعلق نہیں سوچے گا۔ اسے صرف گداؤ کی طرف سے یہ خوف ہوگا کہ وہ اس واقعے کو جانتا ہے۔ اگر گداؤ خاموش رہے گا، تشہیر نہیں کرے گا، تو پیر اسی میں اپنی بھلائی جانے گا کہ وہ اس واقعے کو کڑوا گھونٹ سمجھ کے پی جائے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بھائی نے میری باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

''رقیہ تو اب بھی کمرے ہی میں سوتی ہے،'' بھابھی نے خاموشی کو توڑا۔ ''میں نے تو کہا ہے کہ چھت پر آ جا، ایک چارپائی اور بچھ سکتی ہے، لیکن وہ نہیں مانتی۔''

''کمرے میں تو بہت گرمی ہوتی ہوگی،'' عصمت نے کہا۔

''پنکھا تو ہوتا ہے اس کے پاس،'' بھابھی نے کہا، ''جب تک جاگی رہتی ہوگی، بوبے پر جھلاتی رہتی ہوگی۔''

بہن زیبا زیرِلب کچھ پڑھ رہی تھیں، یقیناً کوئی آیت ہوگی، وہ ہر رات سونے سے پہلے زیرِلب آیات پڑھتی رہتی تھیں۔ نہ جانے غنودگی کب سب پر چھا گئی۔

37

اگلی دوپہر میں کاپی پنسل لے کر میر صاحب کے پاس ان کی ڈسپنسری میں گیا۔

''آئیے برخوردار!'' انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، ''ہسپتال میں تو آپ نے آنا چھوڑ دیا ہے۔ دن بھر کہاں غائب رہتے ہیں؟''

میں انھیں کیا بتاتا کہ میرا تنور کے سامنے نہ بیٹھنا گاؤں کی لڑکیوں کی وجہ سے نہیں ہے، اصل باعث گلنازی ہے۔

میں ان کے پہلو میں دھرے سٹول پر بیٹھ گیا۔ ڈسپنسری میں کوئی مریض نہ تھا۔

''نو دن رہ گئے ہیں واپس جانے میں،'' میں نے کہا۔ ''بس گاؤں کے بیرونی حصوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔''

''ارے... اتنی جلدی دن گزر گئے، پتا بھی نہیں چلا!'' میر صاحب نے کہا۔ ''یوں لگتا ہے کہ آپ لوگ چند دن پہلے ہی جھاوریاں آئے تھے۔''

''وقت کی رفتار وقت کے تصور سے زیادہ تیز ہوتی ہے سر،'' میں نے کہا۔

''یہ ابھی آپ نے کیا کہا تھا؟'' میر صاحب نے کہا، ''آپ گاؤں کے باہر رہتے ہیں؟''

''جی،'' میں نے جواب دیا۔ ''سر، میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔''

''لیکن اس طرح اکیلا رہنا، اکیلے گھومنا پھرنا... '' میر صاحب نے سنجیدگی سے کہا، ''وہ بھی اس حادثے کے بعد... صاحبزادے، ہمیں تو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔''

''یہی بات کل بھائی جان نے بھی کہی تھی،'' میں نے میر صاحب کے چہرے کی سنجیدگی کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ان کا خیال ہے کہ بچے کے بعد اب مجھ پر جان لیوا حملہ ہو سکتا ہے۔''

میر صاحب کچھ دیر بازار کی سمت دیکھتے رہے، پھر انھوں نے میری طرف دیکھا۔

''درست کہتے ہیں آپ کے بھائی،'' انھوں نے کہا۔ ''ہم بھی یہی کہیں گے... زخمی درندے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں کیا پیر ایسی حماقت کرے گا؟'' میں نے کہا۔

''بظاہر تو نہیں،'' میر صاحب نے کہا، ''لیکن دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔ ہم تو آپ سے یہی کہیں گے کہ محتاط رہیے... احتیاط ہر حال میں ضروری ہے۔''

میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس صورت حال کے متعلق جس کا تعلق اب میری ذات سے ہے، کیا کہوں...

''آپ کے جانے میں ابھی نو دن باقی ہیں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''اچھی بات ہے... بہتر یہی ہے کہ اب آپ گاؤں کے اندرونی حصوں میں رہیں۔ بارونق جگہوں پر ہی رہا کیجیے، گاؤں کے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملنگ کے زخمی ہونے پر ان کا شک آپ پر ہی ہوگا۔ وہ یہی سمجھتے ہوں گے کہ غسل خانے پر آپ ہی تھے۔ گداؤ میاں پر تو ان کا شک جا ہی نہیں سکتا، نہ ہی ان کا دھیان

آپ کے بھائی کی سمت جائے گا... ان کا ہدف آپ ہی ہوں گے برخوردار... انھیں یہ بھی تکلیف ہوگی کہ وہ آپ کی وجہ سے ناکام ہوئے ہیں... وہ یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ سانپ پھینکنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے اور سانپ صحن کے فرش پر گرا ہے جس سے اس کے کسی مہرے کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ اپنا بچاؤ نہیں کر پایا، مارا گیا ہے... نہیں، میرے خیال میں انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ سانپ بچ کر بھاگ گیا ہے یا مارا گیا ہے... بہر حال، انھیں یہ تو یقین ہوگا کہ ملنگ کو اینٹ آپ ہی نے ماری تھی۔''

''تو کیا اب وہ مجھ پر حملہ کر سکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''وثوق سے تو ہم یہ بات کہہ نہیں سکتے،'' میر صاحب نے کہا، ''لیکن یہ خارج از امکان بھی نہیں ہے۔''

مجھے زخمی ملنگ کے ساتھ موٹے ملنگ کی آخری بات یاد آئی... آخری جملہ...

''سر،'' میں نے کہا۔ ''وہ... موٹے ملنگ نے... اس دن... آپ کو معلوم ہے کیا کہا تھا؟''

''ارے ہاں،'' میر صاحب چونکے۔ ''کیا کہا تھا انھوں نے؟''

''جانے سے پہلے اس نے سرگوشی کی تھی،'' میں نے کہا۔

''ہاں... ہم نے سنی تھی، لیکن وہ بولی ہم سمجھ نہیں پائے تھے،'' میر صاحب نے کہا۔

''اس نے کہا تھا 'نبڑ گھیساں... دھنی کی زبان میں اس کا مطلب ہے، نمٹ لیں گے۔''

میر صاحب ایک دم بہت سنجیدہ ہو گئے۔ خاموشی سے باہر گلی کی طرف دیکھتے رہے، پھر انھوں نے میز پر پڑے سٹیتھوسکوپ کی طرف دیکھا۔ وہ بے چین سے تھے، سنجیدگی اضطراب میں بدل چکی تھی۔ پھر ان کی نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔

''یہ تو وارننگ ہے صاحبزادے!'' میر صاحب نے بے چینی سے کہا۔ ''وہ آپ کو خبردار کر کے گئے ہیں کہ وہ انتقام لیں گے۔ بس آج سے آپ کا گھر سے باہر زیادہ دیر باہر رہنا بند... ہسپتال تو اب آپ آئیں گے نہیں... دوپہر کو ہمارے پاس آ جایا کیجیے۔ گاؤں کا یہی حصہ سب سے بارونق ہے۔ کھیتوں اور نہر کی سمت کسی صورت میں بھی نہیں جانا... وہ کھلی وارننگ دے کر گئے ہیں آپ کو... آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں!''

''میں تو سوچ رہا تھا،'' میں نے کہا،'' سارا گاؤں دیکھ چکا ہوں، پرانی حویلی کے کھنڈر نہیں دیکھے، وہ بھی دیکھ لوں۔''

میر صاحب ٹھٹک سے گئے۔

''ہرگز نہیں!'' انھوں نے کہا،'' وہاں تو ملنگ آ کر ٹھہرتے ہیں۔ اگر آپ کے لیے سب سے زیادہ خطرہ ہے تو وہیں ہے۔ آپ وہاں ہرگز نہیں جائیں گے۔''

38

بھائی اور میر صاحب کی تنبیہ کے باوجود میں اگلی صبح پھر کھیتوں میں تھا۔ دونوں کے منع کرنے کے باوجود میں گھر پر نہ رہ سکا۔ وجوہ دو تھیں، ایک تو گلنازی کے آنے کا اندیشہ — میں کسی صورت بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اب میں اور گلنازی ایک دوسرے کو دیکھیں؛ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر میں ڈر گیا تو میرے ذہن پر خوف کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ یہ بات میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اگر کسی بھی خوف سے مراجعت اختیار کی جائے تو وہ بھاگنے نہیں دیا کرتا۔ خوفزدہ ہو کر اگر چھپنے کی کوشش کی جائے تو خوف بار بار پرتوں کی صورت میں ذہن پر اترتا ہے۔ وہ اگر اژدہے کی طرح بدن پر ایک بھی بل ڈال دے تو پورے بدن کو لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے — کسی بحرِ بیم میں آکٹوپس کی طرح اپنے آٹھ بازوؤں میں سے ایک بازو سے بھی اگر کسی شناور کو پکڑ لے تو اگلے ہی لمحوں میں اس کے آٹھوں بازو شکار کو جکڑ لیتے ہیں۔ اگر انسان ایک بار خوفزدہ ہو جائے تو خوف ذہن پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ خوفزدہ شخص بے بسی کی انتہا تک جا پہنچتا ہے... وہ اژدہے کی لپیٹ میں، اس کے کھلے جبڑے کو دیکھ کر، کسی آخری سہارے کی شدید خواہش تو کرتا ہی ہے... وہ آکٹوپس کے آٹھوں بازوؤں میں جکڑا ہونے کے باوجود، پانی میں آگے پیچھے دائیں بائیں ہاتھ پاؤں تو مارتا ہی ہے... کسی آخری سہارے کی آخری تلاش میں... کسی خونخوار شیر کے سامنے، بے بس تنہا انسان، جسے اپنی موت کا یقین ہو چکا ہو، آخری بار یہ خواہش تو کرتا ہی ہے کہ آسمان سے بجلی گر کر خونخوار شیر کو مار دے، یا اس کے خونخوار پنجے پر کوئی ناگ ہی ڈس لے...

''شاید مذاہب کی ابتدا میں یہی کچھ ہوا ہوگا...'' میں نے کھیتوں سے نہر کی جانب جاتے

ہوے سوچا۔ ''طاقتور کے سامنے کمزور کو سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور اگر، اتفاق ہی سے سہی، کمزور کو ختم کرنے سے پہلے طاقتور پر آسمانی بجلی گر پڑی ہوگی تو کمزور نے آسمانی بجلی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہوں گے... اسے خدا مان لیا ہوگا اور اس کی پرستش شروع کر دی ہوگی... اسی طرح کسی طاقتور کے ہاتھوں ختم ہو جانے والے کسی کمزور کو ناگ نے، طاقتور کو ڈس کر، بچا لیا ہوگا تو کمزور نے ناگ کے سامنے ماتھا ٹیک کر اسے ناگ دیوتا مان لیا ہوگا اور پوجا شروع کر دی ہوگی۔ اسی انداز میں اجتماعی احساس نے کمزوروں کے لیے کئی خدا، کئی دیوتا بنا دیے ہوں گے... اسی سے ساحر شاہی کا آغاز ہوا ہوگا، اور مذاہب کا بھی... ''

میں نہر کے کنارے کے قریب پہنچ گیا جو ڈھلوان سی بنا کر کھیتوں کی سمت اترتا ہے۔

''اس خوف کی ماہیت پر ذرا سا غور کروں تو مجھے اس سے وابستہ خود غرضی کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی... '' میں نے پھر سوچا۔ ''ذہن میں یہ اعتراض اٹھ سکتا ہے کہ اگر یہ خود غرضی کا اجتماعی روپ تھا تو اسے منفی نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس کی ماہیت پر بھی ذرا سا غور کروں تو بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ کُل جب جزئیات میں تقسیم ہوتا ہے تو کُل کا ہر عنصر جزئیات کے عناصر میں بدل جاتا ہے، اور آج تک ایسا تو کبھی ہوا ہی نہ ہوگا کہ بغیر جزئیات کے کُل کی تشکیل ہوئی ہو... اسی کُل سے مذاہب نے جنم لیا ہوگا، جو آج بھی ہوس کے دوستونوں، خوف اور خود غرضی، پر اپنی اپنی شاندار عمارتیں بنائے کھڑے ہیں — وہ ہوس جو آج بھی ایک کُل کی طرح ہے ہر جز کی ہوس بن چکی ہے... ''

میں نہر کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس بار میرا رخ جانب شمال تھا، جدھر پرانی حویلی کے کھنڈر ہیں۔

''یہ بھی نہیں کہ میں حفظِ ماتقدم کو نہیں مانتا... '' میرے خیال پھر بھائی اور میر صاحب کی تنبیہ کی سمت چلے گئے۔ ''لیکن انسانی ذہن میں اتنی سمجھ بوجھ تو ہوتی ہی ہے کہ وہ خطرے کی نوعیت کو سمجھ لے۔ اس سمجھ کے بغیر کسی انجان شے سے خوفزدہ ہو کر بچاؤ کی تدبیروں میں لگ جانا اور سہارے تلاش کرنا کہاں تک درست ہے؟''

میں نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔

''جانتا ہوں کہ جو حادثہ ہوا ہے اور جس انداز میں ہوا ہے، وہ ہوس کے نمائندے اب ادھر کا

رخ نہیں کریں گے ... بھائی کہتے ہیں کہ میری جان کو خطرہ ہے ... میر صاحب کہتے ہیں کہ ملنگ مجھے وارننگ دے کر گئے ہیں کہ وہ مجھ سے پیر کی شکست کا انتقام لیں گے ... لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکیں گے، کم از کم بُوبے کی عمر کے پانچ برس پورے ہو جانے تک تو قطعی نہیں، اور میں اس سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

نہر کے دوسرے کنارے پر ایک دیہاتی بیل کی رسی تھامے نظر آیا۔ بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی مسلسل ٹن ٹن کیے جا رہی تھی۔ دیہاتی نے میری سمت دیکھا، کچھ دور تک دیکھتا رہا، پھر بیل کی رسی تھامے دور ہوتا چلا گیا۔ ''اس دنیا میں سب سے بڑا خوف تو نامعلوم کا ہے ... انسان جس بات کو نہیں جانتا وہ اسے زندگی کے کسی حصے میں بھی خوفزدہ کر سکتی ہے ... اماوس کی رات دلیر سے دلیر انسان کو بھی دہلا دیتی ہے۔''

مجھے چکوال کے قریب ایک گاؤں چکوڑہ[57] کا ایک واقعہ یاد آیا۔ گاؤں کے پاس ایک بہت پرانا قبرستان تھا۔ اس قبرستان میں کئی قبریں ٹوٹی ہوئی تھیں جن میں سے ساون کی راتوں میں، بارش سے ہڈیوں میں موجود فاسفورس جل اٹھنے سے شعلے سے لپکتے نظر آتے تھے اور لوگ سہم جایا کرتے تھے۔ اسی قبرستان میں ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں ہڈیاں، کھوپڑی، لمبے لمبے بال اور لمبے لمبے ناخن نظر آیا کرتے تھے، جو انسانی جسم کے مرجانے کے بعد بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ بال مٹی سے اٹے ہوئے خاصے خوفناک لگتے تھے۔ گاؤں کے نوجوانوں نے ایک دن شرط لگائی کہ جو نوجوان اماوس کی رات کو اس قبر کے پاس لوہے کا سُماں (کھونٹا) گاڑ کر واپس آ جائے گا اسے پچیس روپے انعام دیا جائے گا اور اسے گاؤں کا سب سے بہادر نوجوان قرار دیا جائے گا۔ شرط میں یہ بھی شامل تھا کہ کوئی نوجوان اپنے ساتھ روشنی لے کر نہیں جائے گا، یہاں تک کہ دیا سلائی بھی نہیں۔ اندازے سے قبر تک پہنچے گا، کھونٹا گاڑے گا اور واپس آ جائے گا۔ ایک مضبوط جسم والا لمبا تڑنگا جوان تیار ہو گیا۔ وہ رات کے وقت کھونٹا اور ہتھوڑا لے کر قبرستان میں چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد قبرستان سے بھیانک چیخ کی آواز آئی۔ اماوس کی رات میں قبرستان سے دو کھیت دور کھڑے دیہاتی لرز گئے۔ پھر لالٹینیں جلیں،

57۔ چکوڑہ: یہ گاؤں چکوال سے تلہ گنگ جانے والی سڑک پر چکوال سے پانچ کلومیٹر دور تھا۔ اب اسے شاید جعفر آباد کہا جاتا ہے۔

نار چیس آن ہوئیں۔ سب ڈرتے ڈرتے قبرستان کی سمت بڑھے۔ وہ نوجوان ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس بے ہوش ہو کر اوندھا گرا ہوا تھا۔ جب اسے سیدھا کیا تو پتا چلا کہ جب وہ کھونٹا قبر کے پاس گاڑنے لگا تھا تو اس کے کرتے کا دامن کھونٹے کے نیچے آ گیا تھا۔ اماوس کی تاریک رات میں، جب نظروں کو چھ انچ کی دوری پر بھی کوئی شے نظر نہیں آتی، قبرستان کے گھنے پیپل کے درختوں کے نیچے وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کھونٹے کو اپنے ہی کرتے کے دامن میں گاڑ رہا ہے۔ جب وہ اٹھنے لگا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا ہے۔ وہ بھیانک چیخ کے ساتھ منھ کے بل اوندھا گر گیا۔ وہ بچ تو گیا لیکن بہت دہشت زدہ رہنے لگا تھا۔ وہ کھونٹے کے کرتے کے اوپر سے گاڑے جانے کو کسی بدروح کی کارستانی سمجھنے لگا تھا۔۔۔ وہ شاید زندگی بھر نادیدہ قوتوں سے خوفزدہ رہا ہوگا۔

''نادیدہ قوتوں کا خوف جب انسان کے ذہن پر اپنی پرتیں بنانا شروع کر دیتا ہے تو انسان کو سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ سہارا اگر مادی ہو تو ساحری کہلاتا ہے، غیر مادی ہو تو مذہب۔۔۔ قدیم زمانے میں جادوگر خوفزدہ انسانوں کو سہارا دیا کرتے تھے، پھر ساحری کا یہ کام مذہب نے سنبھال لیا، اور اب دنیا بھر میں مذہب کو ذریعہ بنا کر شاطر، عیار اور مکار لوگوں نے خوفزدہ لوگوں کو سہارا دینے کو کاروبار بنا لیا ہے۔ خوفزدہ شخص کو سہارے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ کوئی سہارا مفت نہیں ملتا۔ وہ کالا دھاگہ ہو یا گلے میں لٹکا ہوا تعویذ، بازو پر بندھا نقش ہو یا گھر کی دہلیز پر گاڑا جانے والا، کھیت کی مٹی اور کھلیان کے بھوسے میں رکھا جانے والا تعویذ ہو یا درخت کی شاخوں پر باندھا جانے والا، وہ بانجھ عورتوں کی رانوں پر باندھا جانے والا تعویذ ہو یا بدروحوں اور کالی بلا کے بچے مارنے کے لیے گھول کر پلایا جانے والا تعویذ، سب کی قیمت مقرر ہے۔۔۔ سب سہارے قیمتاً ملتے ہیں، کوئی کم، کوئی زیادہ۔ سہارا حاصل کرنے والوں کو سہاروں کا معاوضہ دینا ہی پڑتا ہے۔ لیکن کیا سہارا دینے والے معاوضے کی خاطر محنت بھی کرتے ہیں؟ بالوں کے گچھے کی قیمت وزن کے برابر چاندی ہو یا سونا، یا نقشِ سلیمانی کے لیے ہزاروں روپے، پیروں کی تجوریاں بھرتی رہتی ہیں اور وہ بغیر کسی محنت کے، بنا کسی مشقت کے، گدیوں پر بیٹھے عمر بھر کھاتے پیتے، پُرآسائش اور پُرتعیش زندگی گزارتے ہیں۔ وہ معاشروں میں نہایت قابلِ تعظیم بھی ہوتے ہیں، عوام الناس پر ان کی دہشت قائم رہتی ہے اور وہ عیار اپنی اس صدیوں سے قائم عیاری کو اپنی اگلی نسل تک منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ان کی طریقت باطن کی

صفائی نہیں، باطن کی آلودگی ہے، لیکن وہ خود کو باصفا کہتے ہیں... ان کے سلاسلِ طریقت کی ہر کڑی ہوس سے جڑی رہتی ہے، کیونکہ وہ سلاسل کا مادی استعمال خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور اسی کو اپنی طریقت کی بنیاد بھی بناتے ہیں۔ مذاہب نے جہاں کچھ مثبت راہیں دکھائی ہیں وہاں بہت سے منفی رویوں کے در بھی کھولے ہیں، اور ان ہی میں ایک در اس گھناؤنے کاروبار کی منڈی میں بھی کھلتا ہے۔ یہ وہ کاروبار ہے جس میں بیوپاری کو نہ تو باردانہ خریدنا پڑتا ہے، نہ ڈھونا پڑتا ہے... یہ ایسی دکان ہے جس میں دکاندار کو نہ راس کی ضرورت ہوتی ہے نہ ترازو کی... گاہک خود بخود چلے آتے ہیں۔ اسے صرف معاشرے میں اس خوف کو پھیلانا ہوتا ہے جو گاہکوں کو سہارے کی تلاش میں اس کی دکان کا راستہ دکھا دے۔ پھر اسے گدی پر بیٹھ کر کاغذ کے پرزوں پر چوکور خانوں میں حروف ابجد اور ہندسے لکھنے پڑتے ہیں جن کا مفہوم وہ خود بھی نہیں سمجھتا۔ اسے کالے دھاگوں پر پھونکیں مارنا ہوتی ہیں، نوزائیدہ بچوں کے سروں پر بال رکھوا کر ان میں چند قطرے گرانا ہوتے ہیں، اور بس... اس کی تجوریاں کسی محنت اور مشقت کے بغیر بھرتی رہتی ہیں۔ اسے بس لوگوں کو بے وقوف بنانے کے فن کو عیاری سے قائم رکھنا پڑتا ہے، چاہے اس کے لیے کسی معصوم بچے کو قتل کیوں نہ کرنا پڑے۔''

میرے ذہن میں تلخی سی نمودار ہوئی۔ میں اٹھا اور واپس گھر کی سمت چل دیا۔ کھیتوں کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے میں پھر رک گیا۔ آسمان کی سمت چہرہ اٹھا کر میں نے سورج کی بلندی سے وقت کا تعین کیا۔ چاشت کا احساس نہ ہونے پر میں پھر نہر کی سمت مڑا... اس خیال کے ساتھ کہ یہ وقت تو گلنازی کے آنے کا ہے۔ نہر کے کنارے بیٹھ کر میں نے سلیپر اتارے، ٹانگیں پانی میں ڈبو دیں۔ خنک پانی کا احساس ہمیشہ سکون دیا کرتا ہے۔

قریب ہی ایک گھنے پیڑ پر ایک ٹہنی پر گلہری نے چرر چرر کرنا شروع کر دیا۔ شاید اس نے درخت کے اوپر اڑتے ہوئے کسی شکرے، چیل یا کوے کو دیکھ لیا ہوگا، جس نے اس کے گھونسلے میں موجود انڈوں کو دیکھ لیا ہوگا۔

''گلنازی کیا سوچتی ہوگی؟'' اس خیال نے مجھے اداس کر دیا۔ ''آج چوتھا دن ہے اور میں اس کے لیے گم ہو چکا ہوں... وہ یقیناً بہت اداس ہوگی۔''

مجھے تصور میں گلنازی کا اداس چہرہ نظر آیا جس پر بچوں جیسا بھولپن بھی تھا۔

''وہ بہت پریشان ہوگی... ''میری اداسی گہری ہوگئی۔'' پریشانی میں اسے کچھ نہ سوجھتا ہوگا کہ وہ کیا کرے... کس سے پوچھے کہ میں کہاں ہوں... میں برا ہوں، بہت ہی برا... اتنی خوبصورت اور نازک لڑکی کو دانستہ دکھ دے رہا ہوں، پریشان کر رہا ہوں... میں واقعی بہت برا ہوں... نہ جانے ماسی مجھے بیبا کیوں کہتی ہے۔''

شرمندگی کا احساس انسانی ذہن کو جس انتشار کا شکار بنا دیتا ہے، وہی انتشار میرے ذہن میں نمودار ہو چکا تھا۔ میں یہ سمجھنے ہی سے قاصر تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا یہ درست بھی ہے... اگر درست ہے تو بھی گلنازی کے لیے غم اور پریشانی کا باعث تو ہے۔''میں... کیا میں اسے بہتر عمل قرار دے سکتا ہوں؟''

درخت کی شاخ پر اب دو گلہریاں چررر چررر کر رہی تھیں۔ گلہری کے پاس اس کا ساتھی پہنچ چکا تھا اور شیشم کے گھنے پیڑ کے اوپر چکر لگاتے ہوئے ایک کوے کو للکار رہا تھا۔

''میں اگر گلنازی کے لیے برا بن رہا ہوں تو بھی... ''میرے خیالات کا رخ بدلا،'' کم از کم مجھے اپنی نظروں میں تو برا نہیں بننا چاہیے... میں یہی چاہتا ہوں کہ اسے یہ احساس دلا دوں کہ ہمارے راستے متوازی ہیں، ہم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ ہمارے راستے متوازی ہی چلتے رہیں گے۔ ہم نہر کے دو کنارے ہیں، یا دو کناروں پر ہیں، اور ہم دونوں کی حالت ان بچوں جیسی ہے جنھیں تیرنا نہیں آتا۔''

میری گہری ہوتی ہوئی اداسی نے میرے دل کے گرد گھیرا سا ڈال لیا۔ سامنے نہر کے پانی میں بھنور سا پڑتا نظر آیا۔

''زندگی رواں ہی رہے گی۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا... وہ کچھ دن مجھے یاد کرتی رہے گی، پھر بھولنا شروع کر دے گی۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل... آہستہ آہستہ، غیر محسوس انداز میں... پھر وہ مجھے بھول جائے گی... وقت تو بڑے بڑے صدمے بھلا دیا کرتا ہے۔'' مجھے پنجابی کے کلاسیکی شاعر بلھے شاہ کا ایک مصرع یاد آیا:

جنھاں بنا اک پل نئیں سی لنگھدا، شکلاں یاد نہ رہیاں
(جن کے بغیر اک پل بھی نہیں گزرتا تھا، ان کی صورتیں بھی یاد نہ رہیں)

''میں نے تو ابھی تک گلنازی کو یہ احساس بھی نہیں دلایا کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی احساس، کوئی جذبہ موجود ہے۔ ایک دوبار مسکرادینے سے کیا ہوتا ہے...''

39

سہ پہر کو میں میر صاحب کی ڈسپنسری جانے کے لیے کمرے سے نکلا تو مجھے برآمدے میں بُوبا نظر آیا۔ مجھے جانے میں دیر تو ہو ہی چکی تھی۔ بوبے کی گردن پر نظر پڑتے ہی مجھے اس تعویذ کا خیال آیا جو اس کے گلے میں لٹکا رہتا تھا۔ میں نے رقیہ کے غصے کی پروانہ کرتے ہوئے بوبے کو پیار کرتے ہوئے اس کی گردن کو ٹٹولا۔ رقیہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

''جلا دیا ہے چولھے کی آگ میں...'' رقیہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

میں چونکا۔ ایک انجانی سی سرخوشی کا احساس مجھے دل کی گہرائی سے اٹھتا محسوس ہوا، جیسے میرے اندر روشنی سی پھیل گئی ہو... اسی لمحے باجی زیبا تلاوت کرتی ہوئی کمرے سے نکلیں... سیدھی بُوبے کی سمت گئیں اور اس کے سر پر پھونکیں مارنا شروع کر دیں۔

''کچھ نہیں ہوگا!'' باجی زیبا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔''پاک پروردگار پر بھروسا رکھ، کچھ نہیں ہوگا بُوبے کو۔''

''جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا بی بی جی،'' رقیہ نے کہا۔''اب اور کیا ہونا ہے۔ میرے بوبے کو مارنے آئے تھے۔ رب کرے پوہلی کے کانٹوں پر تڑپ تڑپ کر مریں — آگ سے سواہ (راکھ) ہو جائے پیر کا ڈیرہ... اس کے بچے مریں...'' رقیہ کے لہجے میں غصہ نمایاں ہوا۔''نام کا نور شریف اور کرتوتیں بدمعاشوں کی۔''

''تو فکر نہ کر، ذرا فکر نہ کر...'' باجی زیبا کی آواز میں خوف تھا۔''کچھ نہیں ہوگا بوبے کو... اللہ تعالیٰ حفاظت کریں گے بُوبے کی... تو فکر نہ کر۔''

میں پریشان سا ہو کر بیرونی دروازے سے نکلا۔

''کیا ہو گیا ہے باجی زیبا کو؟'' میں نے بشیر کی دکان کے قریب سے گزرتے ہوئے سوچا۔

''وہ کس قدر خوفزدہ ہیں۔ رقیہ کی باتوں سے تو اس بات کی گواہی مل رہی ہے کہ اس کے دل پر چھائی

ہوئی تاریکی مٹ چکی ہے۔۔۔ وہ اس خوف سے نجات پا چکی ہے جو اس کے ذہن پر پنجے جمائے ہوئے تھا، جس نے گزشتہ چار برس ساڑھے دس مہینے تک اس کے وجود کے گرد گھیرا ڈالے رکھا ہے۔ اب وہ آزاد ہے لیکن باجی زیبا اسی خوف کا بار بار اظہار کر رہی ہیں۔ ان کی اندرونی کیفیت کسی بے حد خوفزدہ لڑکی کی ہے۔۔۔ وہ کہیں رقیہ کو پھر خوفزدہ نہ کر دیں۔ وہ کام جو چار برس ساڑھے دس مہینے پیرنور شریف نے کیا تھا، باجی زیبا وہی کام پھر سے نہ دہرا دیں۔ ابھی ہمیں آٹھ دن اور یہاں رہنا ہے۔۔۔ کہیں باجی زیبا رقیہ کو خوفزدہ کر کے پھر سہارا تلاش کرنے پر مجبور نہ کر دیں۔ میں باجی زیبا کو کیسے روکوں؟ کیا کروں؟''

پریشانی کے عالم میں میں بازار سے گزرا۔ میر صاحب کی ڈسپنسری سے کچھ پہلے ہی مجھے رکنا پڑا۔ ڈسپنسری بند تھی۔ میں تاخیر کا شکار ہو چکا تھا۔

40

ہر انسان روزمرہ کی مصروفیات سے تنگ آ جاتا ہے۔ میں بھی تنگ آ چکا تھا۔ صبح کھیتوں میں جانا، چاشت نہر کے کنارے گزارنا، دوپہر کو گھر آ کر کھانا کھانا، پھر باہر بھاگنا، سہ پہر ہر حال میں باہر گزارنا اور شام کو بشیر نعل بند سے اس کی آپ بیتی سننا۔ عجیب بیزاری سی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ لیکن کرتا بھی تو کیا کرتا — باقی سات دن بھی تو کسی صورت گزارنا ہی تھے۔

اس روز بھی میں نہر کے کنارے جا کر پانی میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے نوراں کا آدھا بدن ننگا دیکھا تھا۔ میں کسی صورت بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ حرکت نوراں نے دانستہ کی ہو۔۔۔ وہ اتفاق ہی ہو تو بہتر ہے۔۔۔ ورنہ ایسی لڑکی کی دوستی۔۔۔ میں گلنازی سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ ''لیکن میں یہ کیوں سوچ رہا ہوں؟ گلنازی سے میرا کیا ناتا ہے؟ میں اس کا کون ہوں؟ وہ میری کون ہے؟ ایک طرف تو میں اس سے بھاگ رہا ہوں اور دوسری جانب مجھے اس کی فکر ستا رہی ہے۔۔۔ میری شخصیت میں یہ دو رخی کیوں در آئی ہے؟۔۔۔ میں ایک فیصلہ کرنے کے بعد اس پر قائم کیوں نہیں رہ پا رہا ہوں؟''

اسی الجھن میں چاشت دوپہر میں بدل گئی۔ میں گھر آیا۔ مجھے دیکھ کر عصمت نے ہنسنا شروع

کر دیا۔ بھابھی اور غیر متوقع طور پر باجی زیبا بھی مسکرا رہی تھیں۔ مجھے ان کی مسکراہٹ اور عصمت کی ہنسی عجیب سی محسوس ہوئی۔ پھر جب میں کاپی پنسل اٹھا کر میر صاحب کی سمت جانے لگا تو عصمت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''وہ آئی تھی . . . '' عصمت کی آواز میں شرارت تھی۔ ''کیا بات ہے؟ . . . وہ کہہ رہی تھی . . . پوچھ رہی تھی۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ گلنازی آئی ہوگی۔ پھر بھی میں نے انجان بن کر پوچھا، ''کون؟''

''گلنازی!'' عصمت کی آواز میں شوخی تھی۔ ''بہت اداس لگ رہی تھی . . . تمھارا پوچھ رہی تھی کہ تم کہاں ہو؟ . . . خیر تو ہے؟'' عصمت نے قہقہہ لگایا۔

''وہ . . . گلنازی . . . ''میں نے فوراً جواب دینے کی کوشش کی لیکن زبان لڑکھڑا گئی۔ ''وہ گل ناز . . . گلنازی . . . وہ تو چاہتی ہے میں اس کے ساتھ لکّن میٹی (آنکھ مچولی) کھیلوں۔''

بھابھی اور بہنیں بے اختیار ہنسنے لگیں۔

''تو کھیلو نا!'' بھابھی نے ہنستے ہوئے کہا، ''تمھیں کس نے منع کیا ہے؟''

''تم بڑے کب سے ہو گئے ہو؟'' باجی زیبا نے کہا۔ وہ خلافِ توقع بہت نارمل لگ رہی تھیں۔

میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی بھرپور شعوری کوشش کی۔

''بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی . . . '' عصمت نے کہا، ''اداس اداس سی . . . باتوں میں پہلے جیسی چہک نہیں تھی۔''

مجھے پہلی بار اپنے سینے میں دل کی دھڑکن تیز محسوس ہوئی۔ چہرہ تپنے لگا۔

''گلنازی . . . ''میں نے سوچا۔ ''وہ سب کچھ کر کے رہے گی جو میں نہیں چاہتا . . . اب کیا کروں؟''

اچانک مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے انگلیاں ہلتی نظر آئیں۔ عصمت میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

''واپس آ جاؤ!'' عصمت ہنسے جا رہی تھی۔ ''تمھاری چوری تو پکڑی گئی ہے۔ اب کن سوچوں میں گم ہو؟''

''میں... میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان بڑا کب ہو جاتا ہے؟'' میرا چہرہ یقیناً سرخ ہو چکا ہوگا...
''جب اس کی مونچھیں نکل آتی ہیں...'' بھابھی نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تو بھابھی...'' میں نے ہونٹوں کے اوپر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا، ''میں تو بڑا ہو گیا۔''
میں تیزی سے برآمدے میں آیا۔ بھابھی اور بہنوں کی ہنسی کی آواز مجھے بیرونی دروازے تک سنائی دی۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ پھر میرے ذہن میں سوال سا ابھرا۔
''انسان بڑا کب ہو جاتا ہے؟'' سوال پوری شدت سے وارد ہوا۔ ''کتابیں کہتی ہیں کہ جب کوئی انسان علم و عمل سے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے، وہ دوسروں کے مقابلے میں بڑا ہو جاتا ہے۔ مذہبی کتابیں کہتی ہیں کہ جس کے اعمال سب سے اچھے ہوں، وہ بڑا ہو جاتا ہے۔ تاریخِ رزم کہتی ہے کہ جو عربدہ جُو ہو کر ہمیشہ فتح سے ہمکنار ہو، وہ بڑا ہو جاتا ہے۔ مذہب اس معاملے میں شہید ہو جانے والوں کو بڑائی کا درجہ دے دیتا ہے۔ مولوی اور ذاکر حضرات کہتے ہیں کہ شعائرِ دین و مذہب کی ادائیگی بڑا بناتی ہے۔ مذہبی علما اور فصحا کہتے ہیں کہ تقویٰ بڑا بنا دیتا ہے۔ صوفی کہتے ہیں کہ خود کو مٹا دینے سے کوئی بھی شخص دوسروں کے مقابلے میں بڑا ہو جاتا ہے۔ معاشیات کے ماہر کہتے ہیں کہ دولت کسی کو بھی بڑا بنا دیتی ہے۔ دانشور کہتے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں مقام حاصل کر لینا بڑائی ہے... لیکن اس دنیا میں شہنشاہ، بادشاہ، راجے، مہاراجے، نواب، سردار، صدور، وزرائے اعظم اور اعلیٰ مقامات پر فائز لوگ کیسے بڑے ہو گئے؟''

میری حیرت نے خود مجھے پریشان سا کر دیا، جب میں نے محسوس کیا کہ کاغذ پنسل ہاتھ میں پکڑے، میں میر صاحب کی ڈسپنسری جانے کے بجائے پگڈنڈی پر پہنچ گیا ہوں۔ مجھے پتا بھی نہ چلا اور میں کھیتوں کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ میں وہیں ایک پگڈنڈی پر کھڑا ہو گیا۔ کپڑوں کے پھڑ پھڑانے پر مجھے ہوا کے جھونکوں کا احساس ہوا جو مکئی کی فصل کو جھلا رہے تھے اور ہر سمت فصل کی مہک تیر رہی تھی... پھر مجھے اپنے چاروں جانب چھاتی ہوئی دھند کا احساس ہوا، میرے سامنے اوپر کی سمت دھند میں روشنی سی پھیل گئی اور اس روشنی میں، مجھے گلنازی کا خوبصورت چہرہ، مسکراتی چمکتی آنکھیں نظر آئیں، پھر اس کے چہرے کے گرد مسکراہٹ شعاعوں کی طرح نظر آئی... اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے، اس کی زلف بار بار اس کے رخسار پر پھیل کر سمٹ رہی تھی۔

''بات بس اتنی سی ہے . . . ''میں مسلسل گلنازی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ جواب میرے ذہن میں اتر رہا تھا۔''جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو حکم دیتا ہے اور وہ شخص حکم کو ماننے سے انکار کر دے تو دونوں کا درجہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ اگر دوسرا شخص پہلے شخص کا حکم مان لے تو پہلا شخص دوسرے سے ایک درجے بلند ہو جاتا ہے۔ پھر وہی حکم اگر دوسرا شخص کسی تیسرے شخص کو دے اور تیسرا شخص اس حکم کو مان لے تو دوسرا شخص تیسرے سے ایک درجے اور پہلا شخص تیسرے سے دو درجے بلند ہو جاتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ اوپر سے نیچے کی سمت جاری رہتا ہے۔ حکم دینے والے پہلے شخص کا حکم جب ہزارواں شخص مان لیتا ہے تو پہلا شخص ہزارویں شخص سے ایک ہزار درجے بلند ہو جاتا ہے . . . بس یہی بڑائی اور حکمرانی کی جادوگری ہے۔''

گلنازی چمکتی ہوئی روشن شعاعوں میں اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ میں اپنے وجود ہی کو بھول چکا تھا۔

''اگر اس سلسلے کو نیچے سے اوپر کی سمت رواں کر دیا جائے تو ایک ہزار درجے اوپر شخص ایک ہزار درجے نیچے بھی آ سکتا ہے، اور یہ ہو گا بغاوت کا فسوں . . . اس دنیا میں آج تک یہی ہوتا آیا ہے . . . ''

گلنازی کے چہرے کے گرد روشن شعاعیں آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگیں اور ان ہی کے ساتھ گلنازی کا انتہائی خوبصورت مسکراتا چہرہ مدھم ہوتا ہوا دھند میں اپنے نقوش کا احساس چھوڑ گیا۔ پھر ایک لمحے ہی میں دھند بھی چھٹ گئی۔ میں کھیتوں کے وسط میں پگڈنڈی پر مبہوت کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد حواس بحال ہونے پر میں واپس مڑا اور میر صاحب کی ڈسپنسری جانے کے لیے میدان میں پہنچا۔

''یہ کیسا تصور ہے . . . ''میں نے سوچا،''جو مجھے مجھ سے جدا کر دیتا ہے . . . جسے میں کھلی آنکھوں سے حقیقت کی طرح دیکھتا ہوں . . . گلنازی کا چہرہ میرے تصور میں بظاہر ساکن کیوں نہیں ہے؟ میری طرح اس کے بال بھی کیوں ہوا میں لہراتے ہیں؟ وہ دھند میں میرے سامنے میرے سر سے کچھ اونچی دکھائی دیتی ہے اور میں اسے چھو بھی نہیں سکتا . . . رات کو چھت پر لیٹے ہوئے بھی اس کا تصور مجھے حیرت زدہ کر دیتا ہے . . . یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟''

اچانک میر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''ارے برخوردار، کہاں جا رہے ہو؟''میں چونکا۔ کچھ دیر پہلے تو میں میدان میں تھا، اب میر

صاحب کی ڈسپنسری سے آگے نکل رہا تھا۔

''اوہ!'' میں نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے ہنس کر کہا، ''سوری سر، خیال ہی نہیں رہا۔''

''اس عمر میں ...'' میر صاحب نے کہا۔ ''کیا سوچتے رہتے ہیں آپ؟ اس عمر میں یہ حال ہے تو بڑھاپے تک پہنچتے پہنچتے تو آپ کو نسیان مار جائے گا۔''

میں شرمندہ سا تھا، پتا ہی نہ چلا تھا کہ ڈسپنسری سے آگے نکل رہا ہوں۔

''وہ... میں یہ سوچ رہا تھا...'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''بچے کی عمر پانچ سال ہونے تک پیر دوسری کوشش تو نہیں کرے گا۔'' میں نے اس اندیشے کو زبان دی جو میرے ذہن میں تھا ہی نہیں۔ میں میر صاحب کے پہلو میں سٹول پر بیٹھ گیا۔

میر صاحب نے پہلو بدلا، باہر کی سمت دیکھا... کسی مریض کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

''جہاں تک ہمارا تجربہ ہے صاحبزادے،'' میر صاحب نے کہا، ''اور جہاں تک ہم قیاس آرائی کر سکتے ہیں، بچے پر دوبارہ حملے کا کوئی امکان نہیں... امکان ہے تو آپ پر جان لیوا حملے کا۔'' میر صاحب کا لہجہ دھیما تھا۔ ''یہ لوگ بہت بغض والے ہوتے ہیں۔ آپ نے پیر نور شریف کی بادشاہت میں لات ماری ہے، انھیں شکست دی ہے، ناکام کیا ہے... وہ زخمی درندے کی طرح تلملا رہے ہوں گے، تڑپ رہے ہوں گے... انھیں بے بسی کا احساس بھی ہوگا اور وہ اس واقعے کی تشہیر سے خوفزدہ بھی ہوں گے، بچے پر دوبارہ حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ پیر یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلے حملے سے کچھ لوگ آگاہ ہو چکے ہیں، اور ان میں بچے کی ماں بھی شامل ہے۔ وہ اس بات کو ہمیشہ کے لیے دبا دیں گے، کیونکہ اسی میں ان کی اپنی بھلائی ہے۔ ہاں، غصہ ہوگا تو آپ پر... منتقم ہونے کی خواہش ہوگی تو آپ کے وجود سے... اب ان کے انتقام کا ہدف آپ ہی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنے جرائم پیشہ ملنگوں کو اب آپ کے پیچھے نہ لگا دیں... وہاں... کیا نام ہے اس شہر کا جہاں آپ پڑھتے ہیں؟... ہاں، چکوال... آپ کو وہاں بھی محتاط ہی رہنا ہوگا۔ ان لوگوں کی دشمنی بہت زہریلی ہوتی ہے۔ ہمیں بہت فکر ہے۔ اگر وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے تو چین سے جینے نہ دیں گے۔''

میں نے میر صاحب کے چہرے پر پریشانی کو محسوس کیا۔

''سر،'' میں نے کہا، ''مجھے احساس ہے کہ میں نے درندوں کی کچھار میں جھانکا ہے۔ میں محتاط رہوں گا۔''

41

تین دن اور گزر گئے۔ میری پوری کوشش تھی کہ گلنازی سے دور رہ کر اسے احساس دلا دوں کہ وہ غلط راستے پر چل نکلی ہے۔

شام کو میں پھر بشیر نعل بند کے پاس جا بیٹھا۔

''بشیر،'' میں نے کہا۔ ''تم بس ایک ہی فلمی گیت گاتے رہتے ہو: بھاٹی لوہاری بھئی، کلی سواری بھئی...''

بشیر نے قہقہہ لگایا۔ ''او پائی، اب کیا گانا وانا! سب کچھ گیا جوانی کے ساتھ۔''

''کیا بات کر رہے ہو!'' میں نے کہا۔ ''تم تو ابھی چالیس پینتالیس کے ہو۔''

''رَن (عورت) کا ساتھ نہ ہو تو بندہ بہت جلدی بڈھا ہو جاتا ہے... اونتری دی بڈھا نہیں ہونے دیتی۔''

''یہ تم کیا ہر وقت عورتوں والی گالی بکتے رہتے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''اونتری دی، اونتری دا، اونتری دے۔''

''یہ گالی مجھے رجو نے سکھائی تھی، وہی دیا کرتی تھی یہ گالی۔''

''بشیر...'' میں نے کہا۔ ''سچ سچ بتا، تو نے کہیں رجو کی وجہ سے تو شادی...''

''او نہ پائی!'' بشیر نے میری بات کاٹ دی۔ ''گولی مار رجو کو... کمینی کنجری... گر گئی دولت دیکھ کر۔ میرے یار ہرنامے نے ٹھیک ہی کہا تھا پر میری عقل پر ہی سواہ (راکھ) پڑ گئی تھی۔ گورداسپور میں ہوتا تو اپنا گھر ہوتا، خراد کا چلتا کاروبار ہوتا، بیوی بچے ہوتے، مرغیاں ہوتیں... ہرنامے نے کہا تھا کہ بہت سے مسلمان خاندان نہیں جا رہے ہیں، تجھے کوئی مُسلی (مسلمان عورت) مل ہی جائے گی... او پائی، سخت غلطی ہو گئی مجھ سے، پر اب کیا کروں؟ مامے نے میرا سب کچھ لوٹ کر میری زندگی برباد کر دی۔''

''چل دفع کر اس قصے کو،'' میں نے کہا۔

''یہ گالی... اونتری دا... مجھے رجو ہی نے سکھائی تھی۔ زبان پر چڑھ گئی ہے... ایسی چڑھی ہے کہ اب اترتی نہیں ہے اونتری دی۔'' بشیر نے گالی کو بھی گالی دی۔

''میں پوچھ رہا تھا کہ کیا تجھے کوئی اور گیت نہیں آتا؟'' میں نے کہا۔ ''بس اپنی دھن میں ایک ہی گاتا رہتا ہے۔''

''ادھر گورداسپور میں میں اور میرا یار ہرنام بولیاں[58] گایا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ گوبندا (گوبند سنگھ) بھی ہوتا تھا، کرتارا (کرتار سنگھ) بھی، رام چرن بھی ہوتا تھا اور شمشو دھوبی بھی۔ ہم دائرہ بنا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ باری باری بولیاں گاتے تھے۔''

''کوئی بولی یاد ہے؟'' میں نے کہا، ''کہ سب بھول گئے ہو؟''

بشیر کچھ دیر سوچتا رہا، جیسے یاد کر رہا ہو... پھر اس نے چٹکی بجانا شروع کر دی۔

''مُنجو منجیت کور وانگ ہنیری لنگھ گئی—

بیریاں دے بیر جھڑ گئے، بلے او، بیریاں دے بیر جھڑ گئے

شاوا شاوا

منڈا ہو گیا شدائی رجپوت دا —

انکھی نوں اکھ مار گئی، بلے بلے او، انکھی نوں اکھ مار گئی

شاوا شاوا

گوری یار دے ہجوگ اچ روندی —

چرخے دی تند توڑ کے، ہائے ہائے او، چرخے دی تند توڑ کے

شاوا شاوا

(من جیت کور آندھی کی طرح گزر گئی ہے۔ کیا گزری ہے کہ بیریوں کے بیر جھڑ گئے ہیں... راجپوت کا بیٹا دیوانہ ہو گیا ہے، انا پرست کو آنکھ جو مار گئی ہے... گوری یار کے ہجر میں رو رہی ہے، اس سے چرخے کی ڈور جو ٹوٹ گئی ہے...)

58۔ بولیاں: پنجابی لوک موسیقی کی ایک صنف۔

سڑک پر گداؤ روٹیوں کی چنگیر اٹھائے آ رہا تھا۔

''لے پائی... میں تو چلا تندور پہ!'' بشیر سلیپر پہن کر دکان کی سمت بھاگا۔

میں بیرونی دروازے سے گھر کے صحن میں داخل ہوا تو گداؤ ٹائیگر کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شرارت سی نمودار ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

''کیا بات ہے گداؤ؟'' میں نے کہا۔ ٹائیگر نے ہمیشہ کی طرح اگلے پیر اٹھا کر میرے پیٹ پر رکھ دیے۔

''وہ... آج وہ...'' گداؤ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ''وہ گلنازی... چنگیر میں تیرہ روٹیاں ڈال کے کہنے لگی، یہ لے روٹیاں۔ میں نے کہا، پندرہ کیوں نہیں؟ تو بولی، ڈاکٹر کا بھائی تو چلا گیا ہے نا۔ میں نے کہا کہ نہیں، وہ تو یہیں ہے۔ تو کہنے لگی، نظر ہی نہیں آتا... بہت اداس سی تھی صاب۔'' گداؤ مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

میرا چہرہ پھر سرخ سا ہو گیا۔ ''شرمائیں نہیں صاب... ایسا ہی ہوتا ہے۔''

میں بہت گھبرا گیا۔ عصمت نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس نے میری چوری پکڑ لی ہے۔ اب گداؤ بھی جان گیا ہے۔

''گلنازی ضرور کوئی گل کھلائے گی،'' میں نے سوچا۔ ''ماسی کے سامنے بہانے بہانے سے پوچھ رہی ہے...''

''صاب،'' گداؤ مسکرا رہا تھا۔ ''صرف گلنازی ہی نہیں، ماسی جیراں بھی پوچھ رہی تھی کہ ڈاکٹر کا بھائی کہاں غائب ہو گیا ہے؟''

''ماسی جیراں بھی؟'' مجھے حیرت آمیز سکون محسوس ہوا۔

''ہاں صاب،'' گداؤ نے کہا۔ ''تندور پر سب لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ماسی نے سب کے سامنے کہا، ڈاکٹر کا بھائی جتنا سوہنا ہے، اتنا ہی سیانا بھی ہے اور سب سے بڑھ کر بڑا بیبا پتر[59] بھی ہے۔''

میں حیرت سے گداؤ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماسی اس سے پہلے بھی مجھے بیبا پتر کہہ چکی تھی۔

59۔ پنجابی زبان میں بی بی کا مذکر بیبا ہے۔ لغوی معنی اچھا کے ہیں لیکن کلاسیکی شاعر و ادیب اس لڑکے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں جو لڑکی کی طرح شرمیلا ہو۔

42

رات کو چھت پر ہوا کے جھونکوں میں تیزی نمودار ہوئی۔ کھیتوں کی جانب سے آنے والی ہوا میں نباتات کی مہک کے ساتھ ساتھ خنکی اور نمی کا احساس بھی ہو رہا تھا — بارش سے پہلے کی نمی کا احساس . . . رات بھر تیز نم آلود خنک ہوا چلتی رہی۔ صبح افق پر سرمئی بادل دکھائی دیے جو ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ، بہت کم وقت میں آسمان پر چھا رہے تھے۔ سب نے جلدی جلدی بستر سمیٹے، چارپائیاں اٹھائیں۔ سیڑھیوں سے چارپائیاں اتارنا خاصا مشکل کام تھا۔ یہ کام مجھے اور بھائی کو کرنا پڑا۔ آسمان پر بادلوں کا سرمئی رنگ سیاہی مائل محسوس ہوا۔ صبح کی دھیمی دھیمی روشنی مدھم ہو کر پھر رات کا احساس دلانے لگی۔ برآمدے کی چقیں تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ بھابھی نے کمرے میں جا کر لالٹین جلائی۔ آسمان پر وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔ ہر چمک کے بعد گرج سی سنائی دے رہی تھی، کبھی آہستہ، کبھی بلند . . . پھر ایک تیز چمک کے بعد بجلی کڑکی . . . ہوا کی شائیں شائیں بڑھ رہی تھی . . .

''یہ مون سون کے بادل ہیں،'' بھائی نے کہا، ''ساون شروع ہو گیا ہے، اب موسم آہستہ آہستہ بدلے گا۔ تپش کم ہو جائے گی۔''

''اور اُمس — حبس؟'' بھابھی نے کہا۔

''وہ تو ہوگا ہی،'' بھائی نے کہا، ''تم لوگ تو چکوال چلے جاؤ گے۔''

''موسم تو ہم دیکھیں گے!'' بھابھی نے کہا۔ ''بجلی کے پنکھوں کے نیچے تو اُمس اور حبس کا احساس بھی نہ ہوتا ہوگا۔''

''تم بھی چلی جاؤ،'' بھائی نے کہا۔ ''مہینے دو مہینے تک آ جانا، موسم سرد ہو جائے گا۔''

''نہ!'' بھابھی نے کہا۔ ''پڑھی لکھی نہیں ہوں پر اتنا جانتی ہوں کہ جو بیویاں شوہروں کو چھوڑ کر اپنا آرام ڈھونڈتی ہیں، بے سکون رہتی ہیں۔''

میں نے صحن میں جا کر ٹائیگر کو ڈھونڈا۔ نہ جانے کہاں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اندھیرے میں ''ٹائیگر، ٹائیگر . . .'' کہا تو وہ چھپر کے نیچے سے اچھل کر میرے پاس آیا۔ ایک تیز جھونکے کے ساتھ پہلی بوچھاڑ نے مجھے اور ٹائیگر کو بھگو دیا۔ میرے ساتھ برآمدے میں آ کر ٹائیگر نے زور سے

جھرجھری لی، بالوں پر گرے قطروں کو اڑایا۔ بوبے نے یہ دیکھ کر تالی بجائی اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ بہت دنوں کے بعد میں نے رقیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔

اس نے برآمدے میں رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے سے مٹی ہی کے پیالے میں پانی نکالا اور بوبے کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر دائیں ہاتھ سے اس کا منھ دھویا، جہاں ٹائیگر کے بدن سے اڑنے والے قطرے گرے تھے۔ بھابھی نے ایک چارپائی درمیان اٹھی ہوئی چق کے سامنے بچھا دی۔ ہوا کے ساتھ بارش کا رخ اگرچہ برآمدے کی سمت نہ تھا، پھر بھی پھوار چارپائی تک آ رہی تھی۔ یہ پھوار بہت ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ چھت پر، صحن میں، ہر سمت بوندوں کا شور اور ہوا کی شائیں شائیں تھی۔ میں بچپن ہی سے بارش میں نہاتا چلا آیا تھا۔ ننگے بدن پر بوندوں کی مار مجھے بچپن ہی سے بہت اچھی لگتی ہے۔ بہت جی چاہا کہ قمیض اتار کر صحن میں چلا جاؤں، لیکن بھابھی، بہنوں اور رقیہ کی موجودگی میں مجھ پر فطری جھجک سی طاری ہو گئی — مجھے اپنی اس بچگانہ خواہش کو دبانا پڑا۔

ساون کی پہلی بارش کی طرح، یہ بھی طوفانی بارش تھی۔ ایسی بارش کا دورانیہ کم ہوتا ہے۔ ہوا اور بوندوں کا پھیلتا چکراتا شور نصف گھنٹے ہی میں مدھم ہوتے ہوتے مٹنے لگتا ہے۔ دھیمی دھیمی پھوار جاری رہتی ہے، پھر وہ بھی ختم ہو جاتی ہے، ہر سمت پھر سے روشنی پھیل جاتی ہے، اکثر دھوپ بھی نکل آیا کرتی ہے۔ میں برآمدے سے صحن میں آیا۔ آسمان پر اب سفید سفید بادل پھیلے ہوئے تھے۔ تیز ہوائیں سرمئی بادلوں کو اڑا کر شمال مغربی افق کی سمت لے گئی تھیں۔ کہیں کہیں آسمان کا نیلا اور بہت شفاف رنگ بھی ظاہر ہو چکا تھا۔ صحن بھیگا بھیگا تھا، دیواروں کی اینٹیں دھل کر سرخی مائل ہو چکی تھیں۔ ہوا کے جھونکے اب بھی جنوب مشرق سے شمال مغرب کی سمت سرسراتے ہوئے اڑتے جا رہے تھے۔ میری نظر ہینڈ پمپ سے آگے ٹائیگر کے چھپر کی سمت گئی جو ہوا کے زور سے ٹوٹ کر ایک طرف لٹکا ہوا تھا۔

رقیہ ناشتہ بنا رہی تھی۔

ناشتے کے بعد میں بیرونی دروازے کی سمت جانے ہی لگا تھا کہ بھائی نے بھابھی کی سمت دیکھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی تھیں، تمھیں بوبے کی عمر کے پانچ برس مکمل ہونے سے پہلے کہیں نہیں جانا چاہیے،" انھوں نے کہا۔ "تمھارے جانے پر رقیہ کو بھی ماسی کے گھر جانا ہوگا اور وہاں یہ بات چھپائے نہیں چھپے گی۔"

میں بیرونی دروازے سے باہر نکلا اور کھیتوں کی سمت چل دیا۔ میرے قدم کھیتوں کے درمیان ان پگڈنڈیوں میں سے ایک پر تھے جو سیدھی نہر کی سمت جاتی ہیں۔ بارش کے بعد کھیتوں کی ہریالی بہت نکھری نکھری سی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں خوشبو سی تھی — سوندھی مٹی کی خوشبو، نباتات کی خوشبو۔ دور دور تک کھیتوں میں گہرا سبز رنگ نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں مکئی کے خوشوں میں ہلکے سبز رنگ کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ بھٹے، بہت چھوٹے چھوٹے، مکئی کے پودوں سے یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے بچے اپنی ماں کے بدن سے لپٹے رہتے ہیں۔ پگڈنڈی کی دونوں جانب کھیتوں میں پانی پھیلا ہوا تھا۔ سبز گھاس میں بارش کا پانی صبح کی روشنی میں چمک رہا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ ساٹھ منٹ سے بھی کم مدت میں یہ پانی مٹی میں جذب ہو جائے گا۔ پگڈنڈی پر پھسلن تو تھی لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ چلا نہ جا سکے۔ مجھے بس پگڈنڈی پر نظریں جمانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ اکثر ساون کی پہلی بارش کے بعد کھیتوں کے کناروں پر بلوں میں چھپے سانپ پگڈنڈیوں پر آ جایا کرتے ہیں۔ کچھ دور جانے پر مجھے مینڈکوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دبلے مینڈک اور مینڈکیاں، پگڈنڈی کی دونوں جانب سبز گھاس میں پھیلے پانی سے منہ نکالے، مسلسل بول رہی تھیں۔ ان کی آوازوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ ان کے گلے ہر آواز پر پھول رہے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے غبارے ہر آواز پر نظر آنے کے بعد غائب ہو رہے تھے — ٹرّاں، ٹرّاں، ٹرّپ، ٹرّاں، ٹرّاں . . . نہر پر پہنچ کر میں نے گدلے پانی میں تیزی کو محسوس کیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ نہر دریائے جہلم سے نکلنے والی بڑی نہر سے، جس مقام پر نکلتی ہے، وہاں جھاوریاں سے پہلے ہی بارش ہو چکی تھی۔ پانی کا مٹیالا رنگ کہیں کہیں دھیما سرخ نظر آ رہا تھا— تازہ مٹی کا رنگ نہر کے پانی میں توانائی اور زندگی کا احساس دلا رہا تھا۔ پانی کہیں کہیں بھنور سا بناتے ہوئے دائروں کے مدوّر کناروں پر گلابی نظر آ رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نہر کے پانی میں گلابی رنگ کے پتے چکراتے ہوئے بہے جا رہے ہیں۔ نہر کے اس بہتے پانی میں زندگی، نمو اور روئیدگی فطرت کی لامتناہی قوتوں کا آئینہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس سمت چل دیا جہاں میں گھوڑا باندھ کر نہایا کرتا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی، لیکن تمازت کم کم تھی۔

''بھابھی پڑھی لکھی نہیں ہیں . . . '' میری سوچ کے دھارے میں بھنور سا نمودار ہوا۔ ''وفا، زندگی کے ساتھی سے محبت، اس کے سکھ دکھ میں شرکت — یہ سب کچھ کتابیں تو نہیں سکھایا کرتیں ...

گلنازی پڑھی لکھی نہیں تو کیا ہوا، وہ باہمی تعلقات کی سوجھ بوجھ تو رکھتی ہوگی۔ . . یہ سوجھ بوجھ تو محبت خود ہی سکھادیا کرتی ہے۔ . . ایسا نہ ہوتا تو وہ بوبے کی جان بچانے پر کیسے تیار ہوتی! میں اس سے بھاگ تو رہا ہوں . . . شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے گھر والے ناخواندہ . . . میں یہ کیا سوچ رہا ہوں؟ . . . وہ محمد اکبر خان کی منگیتر ہے . . . یہ بار بار میرے قدم بوجھل کیوں ہو جاتے ہیں؟ اس سے دور بھاگتے ہوئے رک کیوں جاتا ہوں؟ وہ پگڈنڈی کی پھسلن تو نہیں کہ میں پھسل جاؤں گا . . . لیکن میرے قدموں میں استقامت کیوں نہیں ہے؟ میں بار بار اسی کے متعلق کیوں سوچتا ہوں؟ میں اس سے بھاگ تو جاؤں گا، لیکن کیا میرا یہ مڑ مڑ کر دیکھنا مجھے زندگی بھر کسی محرومی کا احساس تو نہیں دلاتا رہے گا؟''

میں نے جس درخت کے ساتھ پہلی بار گھوڑا باندھا تھا، وہ سامنے تھا۔ مجھے نوراں کا آدھا ننگا بدن تصور میں ابھرتا محسوس ہوا۔ سانولے بدن کے خطوط ابھرے، مجھے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا وجود برا برا سا لگنے لگا۔

''یہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ . . . کیا ہو گیا ہے مجھے؟ کیا میں اس قدر گر گیا ہوں کہ اب میرے تصور میں ننگے سانولے بدن کے خطوط ابھرنا شروع ہو گئے ہیں؟ . . . یہ تو ہوس ہے۔ تاریک تہوں سے ابھرتی ہوئی۔ جبلت کا نتیجہ . . . ہوس . . .''

اچانک مجھے پھر اپنے اردگرد دھند سی چھاتی محسوس ہوئی۔ نظریں اوپر اٹھنے پر مجھے گلنازی کا انتہائی خوبصورت چہرہ نظر آیا۔ مسکراتی چمکتی آنکھوں میں گہرائی سی تھی۔ میری نگاہیں ٹھہر سی گئیں۔

''محبت ایک والہانہ جذبہ ہے . . . ہو جائے تو کوئی مصلحت بھی باقی نہیں رہتی، کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا . . . محبت کا گھر انسان کا دل ہے، ذہن نہیں . . . ذہن تو ہوسناکیوں کو فروغ دیتا ہے، سانولی ہوسناکیوں کو . . . یہ محبت نہیں ہوتی، ہوس ہوتی ہے . . . جہاں ہدف کو دیکھا، نگاہ کا تیر اسی جانب چھوڑ دیا۔ محبت کے جذبے کو عقل کی میزان پر نہیں تولا جا سکتا، دانش کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا . . . محبت جسم کی محتاج نہیں ہوا کرتی . . . مادیت اسے اپنے حصار میں نہیں لے سکتی۔ یہ وہ وجود ہے جو ہر وجود سے بالا ہے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے دو تین بار پلکیں جھپکی ہیں۔ نہ میرے اردگرد دھند تھی نہ

سامنے گلنازی کا چہرہ... میں شاید اس تصور کی ماہیت کو کبھی بھی، کسی طرح بھی بیان نہ کر پاؤں گا...

''یہ تصور ساکن ہو کر بھی رواں کیوں ہے؟ کیا میں جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں؟''

مجھے اپنے پورے بدن میں کھنچاؤ سا محسوس ہوا۔ نہر کے کنارے بیٹھتے ہوئے مجھے بدن میں تھکن کا احساس ہوا۔

''لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں...'' میں نے سوچا۔ ''محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ گلنازی کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے... لیکن مجھے تو ابھی تک کوئی ایسا جذبہ اپنے دل میں جاگزیں محسوس نہیں ہوا جس پر میرا اختیار نہ ہو... میں تو ہر جذبے کو عقل کی میزان پر تول رہا ہوں، دانش کی کسوٹی پر پرکھ رہا ہوں۔ میں تو یہی سوچتا رہتا ہوں کہ گلنازی سے دور بھاگ جانے ہی میں میری اور اس کی بھلائی ہے۔ مجھ میں خود سپردگی کی کوئی کیفیت نہیں... یہ تو ہوس ہے... میں تو ہوس کا اسیر ہو رہا ہوں...''

مجھے آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا محسوس ہوا۔

''جب میرے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ ہی موجود نہیں، جب میں اس کی روح سے محبت نہیں کرتا تو میں اس کے جسم کو لے کر کیا کروں گا؟''

اندھیرے میں جگنو کی مانند کرن سی چمکی اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر مون سون کے پہلے سیاہی مائل بادلوں کی طرح اداسی اتری جو اپنی پرتوں کو مایوسی میں بدل رہی تھی... خواہش کی بجلی کئی بار چمکی، کئی بار ہیجان خیز گڑگڑاہٹ بھی ہوئی، لیکن سیاہی مائل مایوسی میرے دل پر گھیرا ڈال چکی تھی... اداسی میرے وجود پر چھا گئی۔ نہ بوندا باندی ہوئی نہ موسلا دھار بارش... میری آنکھیں سنگ بستہ تھیں، جن میں اِدھر اُدھر جھانکنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ بس سامنے ایک کرن جگنو کی طرح چمک چمک جاتی تھی۔

''میں گلنازی سے صاف صاف کہہ دوں گا...'' سوچ نے رخ بدلا، ''میں کہہ دوں گا کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی سچا جذبہ موجود ہی نہیں ہے۔ میں تو بس اس کے حسن سے متاثر ہوا ہوں اور یہ تاثر عارضی ہوا کرتا ہے۔ جسم سے محبت محبت نہیں ہوتی، یہ چاہت عارضی ہوتی ہے جو آسودگی کے ساتھ ہی مٹ جایا کرتی ہے، تسکین کے ساتھ ہی اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے... لیکن کیا مجھ میں یہ سب کچھ گلنازی سے کہنے کی ہمت ہے؟ اگر وہ پوچھ لے کہ میں نے یہ تجربہ کہاں

سے حاصل کیا ہے تو میں کیا جواب دوں گا؟ یہ سب کچھ تو میرے ذہن کی اُس دنیا کے اکتساب ہیں جن کی ہر صورت خیالی ہے اور جنھیں میرا تصور مجھے اس انداز میں دکھاتا رہتا ہے جیسے میں ایک جزو ہوں جسے کُل سے جدا کرنا کسی متصوّر قوت کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔''

مجھے میر صاحب کی بات یاد آئی۔ ''گھناؤنے معاشرتی بندھنوں، تاریک مذہبی رویوں میں عزتِ نفس کے حصول کی ہر کوشش بغاوت ہی کہلائے گی۔''

میں کتنی دیر خاموش نہر کے بہتے دھاروں کو دیکھتا رہا۔ بارش کے بعد پانی میں بار بار بھنور پڑ رہے تھے اور ہر بھنور کا کنارہ تازہ مٹی کے رنگ سے گلابی نظر آ رہا تھا۔ مجھے ایک بار پھر آس پاس دھند کا احساس ہوا۔ نہر کے بہتے دھاروں کے اوپر دھند میں شعاعیں سی حلقہ بنا رہی تھیں... گلنازی کی خوبصورت آنکھیں دھند میں نمایاں سی تھیں... پھر اس کا مسکراتا چہرہ میرے سامنے تھا۔

''یہ بغاوت صرف خارجی نہیں ہوتی — یہ بغاوت داخلی ہوا کرتی ہے۔ ہوس وہ مکڑی ہے جو جبلّتوں کے تانے بانے سے جال بنتی ہے۔ اس جال میں پھنس کر اس شعور کو حاصل کرنا ہی بہت دشوار ہوتا ہے، کہ آزادی کا در صرف عزتِ نفس ہی سے کھل سکتا ہے، اور اس جال میں اسیر کسی بھی انسان کے لیے عزتِ نفس کے حصول کی کوشش خود اپنی ذات سے بغاوت ہوگی۔ یہ داخلی بغاوت خارجی بغاوت سے کہیں زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ اس کے لیے جبلّتوں سے بنے ہوئے جال کا ایک ایک تار توڑنا پڑتا ہے۔ ہر تار ایک خواہش سے جڑا ہوتا ہے۔ ہر تار توڑنے کے لیے خواہش کی نفی کرنا ہوتی ہے۔ یہ جال بالوں کا گچھا ہے جس کے ایک ایک بال کو کاٹنا خواہشات کی نفی کرنا ہے، اور یہ بلاشبہ ایک جذباتی خودکشی ہے۔''

میرے سامنے مسکراتے، چمکتے اور روشنی پھیلاتے ہوئے گلنازی کے چہرے پر اس کی سیاہ زلف لہرا سی گئی... پھر وہ اس کے رخسار پر مرتعش سی ہوگئی۔

''اس جذباتی خودکشی کو زندگی میں موت کا تجربہ کہا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ موت ہوس کے ہیجان کو ساتھ لے کر مرتی ہے تو شعوری زندگی اپنی صدیوں سے بند آنکھیں، قرنوں سے بند پلکیں کھول کر انسان کو اس زندگی کا راستہ دکھاتی ہے جو جسمانی تو ہوتی ہے، مادی تو ہوتی ہے، لیکن اس میں ہوس کا نم خمیر نہیں اٹھا سکتا... جس میں انسان کے تلووں پر ہوس کی آلائش نہیں لگتی اور وہ ہر دلدل کو

پار کر لیتا ہے... یہی وہ زندگی ہے جو لافنا ہوتی ہے۔''

ہوا کے جھونکے میں شاید درخت سے ٹوٹا ہوا پتا میرے رخسار سے ٹکرایا۔ میں چونکا۔ دھند پھر غائب ہو چکی تھی، لیکن میرے وجود پر چھائی ہوئی اداسی ختم ہو چکی تھی۔ سرمئی بادلوں کی طرح سیاہی مائل مایوسی کہیں دور افق کی جانب جا چکی تھی۔ میرا وجود بہت سبک سا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں اب صبح والی تیزی نہیں رہی تھی۔ اب چاروں طرف اس کا احساس پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ دھوپ کی حدت میں نہ جانے کیا تھا— سارے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ درخت کی چھاؤں میں بھی گھٹن سی محسوس ہوئی۔ میں واپس مڑا۔ کنارے کنارے چلتے ہوئے میں اس پگڈنڈی تک پہنچا جو سیدھی بھائی کے گھر کی سمت جاتی ہے۔ پگڈنڈی کی دونوں جانب اب بھی پانی چمک رہا تھا، مینڈکوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ گھر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا... میں شمال کی سمت چل دیا۔ شمالی سمت ہی وہ پرانی حویلی کے کھنڈر ہیں جہاں ملنگ ٹھہرا کرتے تھے اور جہاں جانے سے مجھے میر صاحب نے سختی سے منع کیا تھا۔ گداؤ نے بتایا تھا کہ ہندو سیٹھ کی پرانی حویلی کے پاس ایک مندر بھی تھا، جسے تقسیم ہند کے وقت مقامی لوگوں نے توڑ پھوڑ دیا تھا، اس امید پر کہ شاید دیواروں کی کسی اینٹ کے نیچے چھپی ہوئی سونے یا چاندی کی مورتی مل جائے گی یا مندر کے فرش کے نیچے دبا ہوا کوئی خزانہ مل جائے گا۔ مقامی لوگوں کو، گداؤ کے بقول، ککھ (تنکا) بھی نہیں ملا تھا۔ کل مال غنیمت ایک پیتل کا کلس تھا جو مندر کے اوپر سیمنٹ پر منڈھا ہوا تھا۔ ایک بچے کو مندر کے ایک کونے میں دو شنکھ ملے تھے جو کئی مہینوں تک وہ بچہ گاؤں کی گلیوں میں بجاتا رہا تھا۔

میں نہر کے کنارے چلتے چلتے وہاں پہنچ گیا جہاں سے پرانی حویلی کے کھنڈر نظر آ رہے تھے۔ مجھے میر صاحب کا چہرہ نظر آیا، جیسے وہ تصور میں بھی مجھ سے یہی کہہ رہے ہوں کہ اس سمت نہ جاؤ، لیکن تجسس نے میرے قدم رکنے نہ دیے۔ دور سے حویلی کے کھنڈر تو نظر آ رہے تھے، مندر کا کہیں وجود ہی نہ تھا... یہ ایک ہندو سیٹھ کی حویلی تھی جو اس نے تقسیم سے تقریباً بیس برس پہلے گاؤں کے ایک برہمن کو دان کر رہی تھی۔ بیوی بچوں کو مشرقی پنجاب میں بسایا اور خود کاشی (بنارس) چلا گیا۔ پجاری برہمن نے حویلی کو اپنی رہائش گاہ بنالیا اور پاٹھ شالا بھی... وہ اس پاٹھ شالا میں جھاوریاں کے ہندو بچوں کو دھرم سکھایا کرتا تھا۔ بھجن کیرتن بھی ہوا کرتا تھا۔ گداؤ نے یہ بھی بتایا تھا کہ مقامی لوگوں کے ہاتھ

تقسیم ہند کے وقت اس حویلی سے جو سامان لگا تھا، اس میں حویلی کا پرانا فرنیچر، پردے، قالین، رسوئی گھر کے برتن، الماریاں اور دوسرا گھریلو سامان تھا۔ پجاری سے متعلق کسی کو علم نہیں کہ سرحد پار جا سکا تھا کہ اسے مار کر اس کی لاش نہر میں پھینک دی گئی تھی۔

یہ احساس کہ میں ڈرپوک نہیں ہوں اور خوفزدہ ہونا اپنی توہین سمجھتا ہوں، مجھے حویلی کی سمت جانے پر اکسا رہا تھا۔ بھائی اور میر صاحب کی تنبیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے، دل ہی دل میں ان سے معافی چاہتے ہوئے، میں اس پگڈنڈی پر اتر گیا جو سیدھی پرانی حویلی کی سمت جاتی ہے۔ جون اور جولائی کی جھلسی ہوئی زمین، بہت جلد ہی مون سون کی پہلی بارش کو جذب کر چکی تھی۔ پگڈنڈی پر پھسلن نہیں تھی، صرف نم آلودگی کا احساس تھا۔ اردگرد کے کھیتوں میں مکئی کے پودے میری کمر تک اونچے تھے اور ان پر کہیں کہیں نوزائیدہ بھٹے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک مخصوص مہک، بہت خوشگوار، ہر سمت پھیلی ہوئی تھی، لیکن اس مہک میں خوشگواری کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اُمس کا ناگوار احساس بھی اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ ہوا تقریباً بند تھی، لیکن بہت ہی دھیمے جھونکوں کی موجودگی مکئی کے لمبے پتوں کے ارتعاش سے نمایاں ہو رہی تھی۔

میں مندر اور حویلی کے قریب پہنچ گیا۔

مندر ایک گول چبوترے پر بنایا گیا تھا۔ مشرق کی سمت پانچ چھ سیڑھیوں کے پائیدان سے نظر آئے۔ زینے بلند ہو کر مندر کے فرش تک اٹھ رہے تھے جو سرخ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ بارش کے بعد مندر کا فرش بہت صاف نظر آ رہا تھا۔ مندر توڑنے والوں نے، نہ جانے کیوں، فرش نہیں اکھاڑا تھا۔ چبوترے پر ہر سمت گول کناروں میں ٹوٹی ہوئی دیواروں کے نشانات باقی تھے۔ ایسا ہی ایک مندر چکوال کے مضافات میں کوٹ طرّے باز خان کے پاس بھی تھا، جہاں اکثر میری سہ پہریں گزرا کرتی تھیں۔ دوسرے مندروں کی طرح جھاوریاں کے مندر کی دیواریں بھی اونچی ہوں گی اور اوپر اٹھ کر مخروطی چھت کا منظر پیش کرتی ہوں گی، جس پر پیتل کا کلس ہوگا۔ پیتل کا کلس یا تو جھاوریاں کے کسی گھر میں ہوگا۔۔۔ ہوگا بھی کہ نہیں۔۔۔ بک بکا گیا ہوگا! میری چشم تصور نے مجھے ماضی کے وہ مناظر دکھانے شروع کر دیے جب مندر کی سیڑھیوں پر نوجوان لڑکیاں اور ابلا ناریاں آرتی کے تھالوں میں پھول، سیندور، جلتا ہوا دیا اور اگربتیاں سلگائے مندر میں آتی جاتی ہوں گی۔ سب اپنی بھگتی میں مگن ہوں

گی... بوڑھے، ادھیڑ عمر کے مرد، بوڑھی ادھیڑ عمر کی عورتیں، بچے بچیاں سب بہت خوش ہوں گے۔

''وہ کسی کے دشمن نہیں تھے... انھوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ ایک آندھی اٹھے گی اور ان کے آشیانوں کو تنکوں کی طرح بکھیر دے گی۔''

یہی کچھ سرحد کے پار بھی ہوا ہوگا۔ وہاں بھی آندھی کے تھپیڑے تنکوں کو بے رحمی سے اڑا کر اس جانب لے آئے ہوں گے۔ وہ سب انسان تھے جو تنکوں کی طرح بکھر گئے۔

''ان میں کوئی بلراج تھا تو کوئی بلبیر سنگھ، کوئی میر تھا تو کوئی بشیر، کوئی لکشمی تھی تو کوئی چندر مکھی، کوئی رضیہ تھی تو کوئی کلثوم — سب تنکوں کی طرح بکھر گئے ہوں گے۔ جب آندھی کا زور ٹوٹا ہوگا، جب گرد کی چلتی دیواروں میں شگاف نمایاں ہوئے ہوں گے اور مٹی سے آنکھوں میں آنسو کیچڑ بن کر خود ہی اسے دھو رہے ہوں گے تو بصارت بحال ہونے پر سب اپنے اپنے حاصل کو زیاں کی طرح دیکھ رہے ہوں گے۔ اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے! اب تو انھیں تنکوں میں آشیانوں کو دیکھنا تھا... سو دیکھتے رہے...''

میں مندر کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ بارش سے بھیگی ہوئی زمین چاروں جانب گرم ہو چکی تھی۔ دھوپ سے گرم ہونے والی اس زمین سے اٹھنے والا امس گرم سانسوں کی مانند تھا۔ مٹی سے فضا کی سمت اٹھنے والی نادیدہ ہوا میں گرمی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ گرم ہوا مندر کے چبوترے سے بھی اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر حویلی کے کھنڈر کی سمت چل دیا۔ حویلی کا رقبہ کم نہیں تھا۔ نہر سے نظر آنے والا دو چار کمروں والا احاطہ قریب جانے پر خاصا بڑا نظر آیا۔ مندر سے بیس پچیس قدم دور، شمال مشرق کی سمت، حویلی کا ٹوٹی پھوٹی دیواروں والا احاطہ تھا جس کا بیرونی دروازہ یقیناً بہت مضبوط اور بڑا ہوگا۔ اب نہ دروازہ تھا نہ چوگاٹھ، بس نشانات ہی رہ گئے تھے۔ احاطے میں جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی اینٹوں اور مٹی کے ڈھیر سے نمایاں تھے۔ اینٹیں لے جانے والے ٹوٹی ہوئی اینٹوں کو احاطے ہی میں چھوڑ گئے ہوں گے، جو اب مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں تلے دبی ہوئی تھیں۔ سامنے والا احاطہ بڑا نہیں تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جو جون جولائی کی تپش میں مٹیالے پتوں کے ساتھ نم آلود، مٹی کے ڈھیر ہی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس احاطے کے پیچھے پھر ٹوٹی ہوئی چار دیواری کے نشانات تھے جن کے پیچھے رہائشی

کمرے ہوں گے۔ اس سامنے والے احاطے میں پجاری بچوں کو سردیوں میں چمکتی دھوپ میں بیٹھ کر پاٹھ پڑھایا کرتا ہوگا۔ اسی احاطے میں ایک سمت ہوم کنڈ[60] کے نشانات بھی نظر آئے، جہاں ہَون کی آگ میں گھی ڈالا جاتا ہوگا۔

احاطے سے آگے چار دیواری کے نشانات سے گزرنے پر مجھے برآمدے سے پہلے چوکور صحن سا نظر آیا۔ اس صحن میں بھی جگہ جگہ سوکھی گھاس، مٹی کے ڈھیر اور جھاڑیاں نظر آئیں۔ برآمدے کے نشانات واضح تھے۔ میں صحن سے گزرا، برآمدے سے گزرا اور ٹوٹے ہوئے کمروں تک پہنچا تو مجھے طرزِ تعمیر کا انوکھا انداز نظر آیا۔ کمروں کے درمیان پھر ایک چھوٹا سا چوکور صحن تھا، جس کے درمیان اینٹوں ہی کا چوکور چبوترا تھا۔ یہ چبوترا اندر سے خالی تھا— شاید یہاں تلسی کا پودا لگایا گیا ہوگا۔ چاروں جانب مٹی کے ڈھیر تھے۔ ٹوٹی ہوئی اینٹیں موسموں کے تھپیڑے کھا کر سیاہ ہو چکی تھیں۔ ان کے درمیان آک کے بہت سے پودے نظر آئے۔ پتے جھلسے جھلسے سے تھے لیکن کچھ پتوں پر مون سون کی پہلی بارش نے مغموم سی طراوت کو بکھیر دیا تھا۔ اس صحن کے ایک کونے میں بس ایک کمرہ ابھی تک محفوظ تھا۔ شکستہ دیواروں اور بوسیدہ چھت والے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ کمرہ عورتوں کا پوجا گھر ہوگا۔ ایک سمت مورتی کے استھاپن[61] کے لیے اونچی جگہ بنائی گئی تھی۔ یہ اونچی جگہ مستطیل تھی... میں نے چکوال کی میونسپل لائبریری کی ایک کتاب میں اس قسم کی تصاویر دیکھی ہوئی تھیں۔ اونچی جگہ تقریباً تین فٹ چوڑی اور دو فٹ لمبی تھی۔ پیچھے دیے جلانے کے لیے طاق تھے۔ دونوں جانب صراحی دار ستون تھے۔ یہاں شاید اگربتیاں جلائی جاتی ہوں گی۔ ہر جگہ شکستگی نمایاں تھی۔ ایک کونے پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔

وہاں تین اینٹوں کا بنا ہوا چولھا نظر آیا۔

چولھے کے قریب ایک دو گندے برتن پڑے تھے۔ برتنوں کے پاس مٹی کا گھڑا تھا جس میں پانی موجود تھا۔ چولھے میں جلی ہوئی لکڑیوں کے درمیان بجھا ہوا کوئلہ اور راکھ موجود تھی۔ یوں محسوس ہوا کہ

60۔ ہوم کنڈ: ہَون کی انگیٹھی، آگ رکھنے کا چوکور حوض۔

61۔ استھاپن: مورتی کا نصب کیا جانا۔

یہاں آگ جلے زیادہ دن نہیں ہوئے ... کمرے کی دوسری سمت خشک گھاس اس طرح پڑی تھی جیسے سونے کے لیے بستر بنائے گئے ہوں۔ کمرے سے صحن میں کھلنے والے دروازے پر میں ٹھٹک گیا۔ دروازے میں، نیچے فرش پر، دو تین سیاہ دھبے موجود تھے — جمے ہوئے خون کے دھبے...

میں تھوڑی دیر ہی حویلی کے کھنڈر میں ٹھہرا۔ وہاں کچھ اور دیکھنے کو تھا ہی نہیں۔ واپس مندر کے چبوترے پر آیا۔ دھوپ میں حدت بڑھ جانے سے نم آلود زمین سے جیسے بھاپ سی اٹھنے لگی تھی، جو نظر تو نہیں آ رہی تھی لیکن اس کا احساس شدید امس سے نمایاں تھا۔

پگڈنڈی پر چلتے چلتے میں پھر نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ نہر کے کنارے پر اونچے شیشم کے گھنے درختوں میں خنکی کا احساس ہوا، لیکن بند ہوا کی وجہ سے بدن پر پسینے کے قطرے ناگوار محسوس ہو رہے تھے؛ خصوصاً جب بغلوں سے یہ قطرے پسلیوں پر پھسلتے تو بہت ناگوار سی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ میں آہستہ آہستہ، درختوں کی چھاؤں میں چلتے ہوئے، اس پگڈنڈی تک پہنچ گیا جو سیدھی بھائی کے گھر کی سمت جاتی تھی۔ نہر کے کنارے سے پگڈنڈی پر اترتے ہوئے میں نے پھر سورج کی بلندی سے وقت کا اندازہ لگایا اور بھائی کے گھر کی سمت چل دیا۔

بھائی کے گھر کا بیرونی دروازہ عموماً کھلا رہتا تھا۔ میری حیرت نے مجھے تھوڑا سا پریشان بھی کیا جب میں نے دروازے کو اندر سے بند پایا۔

''شاید رقیہ نے بند کر دیا ہوگا۔'' میں نے اس خیال کے ساتھ ہی دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد، اندر سے کسی قسم کی حرکت کا احساس نہ ہونے پر، میں نے دروازہ پھر کھٹکھٹایا — نہ تو کوئی دروازے کے پاس آیا نہ ہی کوئی جواب آیا۔

''دروازہ کھولیں... '' میں نے بلند آواز میں کہا، ''میں ہوں!''

مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی دروازے کی سمت آ رہا تھا۔ پھر دروازے کی چٹخنی گری، ایک پٹ کھل گیا۔

میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا... وہ گلنازی تھی! اس کے پہلو میں بوبا کھڑا تھا۔

اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی، چمک تھی، جو پھیل کر اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ

سارے وجود پر محسوس ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے لمبے بالوں سے پیشانی کے قریب چند بکھرے بکھرے بالوں والی زلف اس کے رخسار پر قوس بنا کر اس کے ہونٹوں کو چھو رہی تھی۔ اس کے دبلے بدن پر اس کا کُرتا کمر کے قریب پھنسا پھنسا سا تھا۔ پہلی بار میری نگاہوں میں گلنازی کے جسم کے سارے خطوط ابھرے۔ وہ بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھی... پلک جھپکنے کے سے لمحے میں میں نے اسے نئی نظروں سے دیکھا۔ نہ جانے میری نگاہوں میں کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں چمکنے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر کھل اٹھی، اس کا گلابی چہرہ سرخی مائل ہو گیا۔

''میں نے آپ کو نہیں بلایا...'' گلنازی نے پہلی بار مجھے سرگودھا کی زبان میں ''تساں نوں'' (آپ کو) کہہ کر بلایا۔ اس نے سر کو دائیں جانب خوبصورت سی جنبش دی۔ ''خود آئے ہیں نا؟''

برآمدے کی درمیانی چق اب بھی اٹھی ہوئی تھی۔ میں برآمدے کی سمت بڑھا۔ برآمدہ خالی تھا۔ کمروں میں بھی کوئی نہ تھا۔ میں نے مڑ کر گلنازی کو دیکھا۔

''کہاں گئے سب؟'' میں نے بھی سرگودھا ہی کی زبان میں آہستہ سے پوچھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھر چکی تھی۔ گلنازی نے چمکتی ہوئی نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھا، پھر وہ بُوبے کی طرف دیکھنے لگی۔

''بیبیاں تو ڈاکٹر جی کے گھر گئی ہوئی ہیں...'' گلنازی نے بھی اپنی خوبصورت آواز میں میری طرح آہستہ لہجے میں کہا۔ ''ماسی رقیہ انھیں لینے گئی ہے... مجھے بلا لیا تھا ماسی نے، بوبے کو باہر نہیں لے جا سکتی نا، اسی لیے...'' وہ لمحے بھر کو رکی۔ ''میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی تھی...''

میرے وجود میں نہ جانے کہاں سے جرأت سی آئی۔ میں نے گلنازی کی سمت مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''تم نے تو نہیں بلایا... لیکن...'' میری آواز تھوڑی سی اکھڑی۔ ''میرا تو دل یہی چاہتا ہے کہ...'' میں کہنا چاہتا تھا کہ میرا دل یہی چاہتا ہے کہ تم مجھے بلاؤ، میرا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرو، اتنی باتیں کہ ہمیں وقت کا اندازہ ہی نہ رہے، وقت ہمارے لیے ختم ہو جائے... لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔

گلنازی مسلسل مسکراتی چمکتی آنکھوں سے میری سمت دیکھ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے کہ میرا دل... دل کیا چاہتا ہے؟ لیکن اس نے کچھ نہ پوچھا، بس خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے بُوبے کا بازو پکڑا اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' گلنازی کی آواز بہت دھیمی ہوگئی۔ اس نے نظریں جھکا کر نیچے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں بوکھلا سا گیا۔

''وہ... وہ...'' میری بوکھلاہٹ آواز میں ظاہر تھی۔ ''میں تو ابھی کچھ اور دن یہاں رہنا چاہتا تھا... چھٹیاں ہی ختم ہوگئی ہیں... دو تین دن بعد جانا ہے۔''

گلنازی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مسکراتی ہوئی چمک پل بھر کے لیے اداسی میں بدلی، پھر اس نے بوبے کا بازو پکڑ کر اسے ہینڈ پمپ کی سمت کھینچا، جہاں ٹائیگر آنکھیں بند کیے سرکنڈوں کے چھوٹے سے چھپر کے نیچے، بارش سے نم آلود زمین پر، اپنی اگلی ٹانگوں پر منہ رکھے سو رہا تھا۔ لٹکا ہوا چھپر کا حصہ گداؤ نے ٹھیک کر دیا تھا۔ میں ہینڈ پمپ کے قریب ہی چھت سے نیچے آتی ہوئی سیڑھی کے آخری زینے پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس طرح بیٹھے دیکھ کر گلنازی کی آنکھوں میں مسکراہٹ پھر چمکی۔ اس نے بالٹی میں پانی نکالا، کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور بوبے کا منہ دھلاتے ہوئے گنگنانا شروع کر دیا۔

''کوئی کھلے وے بازار آ سے
اُو وا چھڈی ویندے نیں، جنھاں نال وڈے وے پیار آ سے''
(بازار میں کچھ جوتوں کے جوڑے ہیں
وہی چھوڑ کر جا رہے ہیں، جن سے مجھے بہت زیادہ محبت ہوگئی ہے...)

میرا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ مجھے گلنازی کی آواز ہمیشہ بہت خوبصورت محسوس ہوتی رہی تھی، لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قدر سریلی بھی ہوگی... یوں محسوس ہوا جیسے ساون کے بادل پھر چھا گئے ہیں اور دھیمی دھیمی سی پھوار پڑنا شروع ہوگئی ہے۔

''اُوں ہُوں اُوں ہُوں ہُوں ہُوں اُوں ہُوں...'' گلنازی نے دھن اٹھائی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی سارنگی سے بہت ہی شدھ اور میٹھے سُر دھیمی دھیمی سی پھوار کے ساتھ ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔

''کوئی انجنے ناں دُھوں ماہیا
ساہڈی بر بادی دا پہلا مجرم توں ماہیا...''
(ریل گاڑی کے انجن سے دھواں اٹھ رہا ہے
جانے والے ماہی، ہماری بر بادی کا پہلا مجرم تو تُو ہی ہے...)

میرے تصور میں تنور کے پاس دیوار پر سے گلنازی کودی، لاچا ہوا میں اڑ گیا اور اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ گلنازی نے اوک میں پانی لے کر بُوبے کے منہ پر چھینٹا مارا، پھر کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی بھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے بدن میں قوتِ سماعت نمود پا گئی ہے... میرے روئیں روئیں میں میرے پردہ ہائے سماعت تھرتھرا رہے ہیں...

''کوئی سرد ہوائیں گھلیاں
انج کوئی رُل ویکھے جیویں تینڈے پچھے میں رُلی آں''[62]
(فضا میں سرد ہواؤں کے جھونکے تحلیل ہو رہے ہیں۔ کوئی اس طرح بدنام ہو کر تو دیکھے جیسے تیرے لیے میں ہو رہی ہوں...)

گلنازی کی خوبصورت چمکتی مسکراتی آنکھوں میں شوخی سی نمودار ہوئی۔ اس نے سیڑھیوں کی سمت دیکھا۔ میں نے سر گھما کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ ان ہی دو سیڑھیوں کی سمت دیکھ رہی تھی جہاں اس نے میرے پیچھے سے آ کر مجھے دبوچ لیا تھا، اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا... نہ جانے کیوں ہوا... کیسے ہوا... میرا بایاں ہاتھ میرے بائیں رخسار پر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خوبصورت قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے تیزی سے گلنازی کی سمت دیکھا۔ وہ ہینڈ پمپ کے پاس سیدھی کھڑی میری

62۔ رُل جانا: یہ ٹھیٹھ پنجابی کا لفظ ہے۔ اس کے عمومی معنی برباد ہو جانے کے ہیں لیکن کلاسیکی پنجابی شاعروں نے اسے بدنامی کے مفہوم میں بھی باندھا ہے۔ زیادہ تر پنجابی ادیب اور شاعر یہ لفظ برباد ہونے کے مفہوم ہی میں استعمال کرتے ہیں۔ پنجابی کے کسی قدیم شاعر کا ایک مصرع مجھے یاد ہے:

کئی شومنیاں لے مان گیاں، کئی رُل گیاں عزت والیاں وے
(کئی بخیل عورتوں کو مان سمان اور عزت مل گئی اور کئی عزت والی عورتیں، بدنام ہو کر رہ گئیں)۔

سمت دیکھ رہی تھی۔ بوبا اس کے سامنے میری سمت منہ کیے کھڑا تھا اور وہ بوبے کی طرف دیکھے بغیر اس کا منہ اپنی اوڑھنی سے پونچھ رہی تھی۔

گلنازی نے گلابی کرتا اور خاکستری مائل سفید لاچا پہن رکھا تھا۔ سرخ اوڑھنی کے پلوؤں نے اس کے کندھوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔ دھیمے دھیمے ہوا کے جھونکوں سے اس کے بال اڑ اڑ جاتے تھے لیکن مرتعش ہو کر پھر آہستہ آہستہ سر پر بیٹھ سے جاتے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ نہ جانے میری نظروں میں کیا تھا، اس کے شگفتہ چہرے پر حجاب سا نمودار ہو چکا تھا۔

میں قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ میں نے اب تک اس سے متعلق کیا سوچا ہے، کیا فیصلہ کیا ہے... مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا... اچانک باہر، بیرونی دروازے کے قریب ہی، رقیہ کی آواز سنائی دی۔ میں زینے سے چھلانگ سی لگا کر اترا، تیزی سے برآمدے میں گیا۔ برآمدے میں بچھی کرسی کے سامنے میز پر، انگلش کے مینرز کی کاپی کھول کر، پنسل ہاتھ میں پکڑ کر اس انداز سے بیٹھ گیا جیسے پڑھائی میں بہت محو ہوں۔

''گلنازی!'' رقیہ نے غصے سے کہا ''میں نے کہا تھا دروازہ بند رکھنا... کھلا کیوں ہے؟''

''نکے صاب آئے ہوئے ہیں'' گلنازی نے اپنی خوبصورت آواز میں تیزی سے جواب دیا۔

بھابھی بہنوں کے ساتھ برآمدے میں آتے ہی سیدھی میری سمت آئیں۔

''لکن میٹی نہیں کھیلنی؟'' بھابھی نے ہنستے ہوئے کہا۔ بہنیں ہنسیں اور صحن سے رقیہ کے ہنسنے کی بھی آواز آئی۔ میں گھبرا گیا۔

''مونچھیں جو نکل آئی ہیں!'' عصمت نے کہا۔ قہقہے بلند ہوئے، ان میں رقیہ کا قہقہہ بھی شامل تھا۔ بھابھی نے اسے بھی میری باتیں بتا دی تھیں۔ رقیہ بھی ہنستی ہوئی برآمدے میں آ گئی۔

''پڑھنے بھی نہ دیں!'' میں نے مصنوعی رنجیدگی سے کہا۔ اس بار پہلے سے بھی زیادہ قہقہے بلند ہوئے۔ میں تیزی سے اٹھ کر صحن میں آیا۔ بوبا گلنازی سے بازو چھڑا کر برآمدے کی سمت دوڑا جہاں ہنسی بلند ہو رہی تھی۔ میں گلنازی کو دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔

اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ خوشی اس کے پورے بدن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں نازک سی جنبش بھی نمایاں تھی۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی مسکراہٹ میں فتح کا احساس نمایاں تھا...

میری نگاہیں پوری شدت سے پلٹ کر میری سمت آئیں۔

''یہ میں نے کیا کیا!'' مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ رقیہ کی آواز سن کر میں سیڑھیوں سے اٹھ کر تقریباً بھاگ کر برآمدے میں گیا تھا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔۔۔ گلنازی کا سیدھا سادہ دیہاتی ذہن اتنی بات تو پوری طرح جان گیا تھا کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی ایسا جذبہ موجود ہے جسے میں چھپانا چاہتا ہوں۔ گلنازی کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ خوشی سے تمتمارہی تھی جیسے وہ بھی قہقہہ لگائے گی۔ وہ سیدھی بیرونی دروازے کی سمت گئی۔ باہر جانے سے پہلے اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کا گلابی رنگ سرخ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فتح کا خمار سا تھا۔۔۔ وہ جیت گئی تھی۔۔۔ میں ہار گیا تھا۔۔۔

کچھ دیر بعد میں بھی دروازے سے باہر نکلا۔ میر صاحب کی سمت جانے کو جی نہ چاہا۔ میں کھیتوں سے ہو کر نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ مجھ پر ابھی تک گھبراہٹ طاری تھی۔

''یہ میں نے کیا کیا!'' پریشانی میں خیال ایک ہی سمت پانی کے دھارے کی طرح بہہ رہے تھے۔ ''مجھ سے شدید غلطی ہوگئی۔ مجھے بھاگ کر برآمدے میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب تو گلنازی کو یقین ہو چکا ہوگا کہ میرے دل میں اس کے لیے وہ جگہ موجود ہے جو چھپائے جانے والے جذبے کا گھر ہوتی ہے۔۔۔ میں نے جو کچھ سوچا، جو فیصلے کیے، وہ تو نہر کے پانی میں بہتے ہوئے تنکوں کی طرح بے بس ہو چکے ہیں، انھیں تو اب دھارا جس سمت لے جائے گا، بہہ نکلیں گے۔''

اچانک میری نظر نہر کے دھارے میں دو تنکوں پر پڑی جو ایک دوسرے سے جڑ کر بہہ رہے تھے۔ مجھے ایک بار پھر آس پاس دھند کا احساس ہوا۔ نگاہیں اٹھانے پر میرے سامنے گلنازی کا مسکراتا چہرہ موجود تھا۔

''انھیں کسی لہر نے جوڑ دیا ہوگا۔۔۔'' میں گلنازی کی مسکراتی چمکتی آنکھوں کو دیکھے جا رہا تھا۔

''لیکن وہ ہمیشہ تو جڑے نہیں رہیں گے۔۔۔ کوئی نہ کوئی دھارا، کوئی نہ کوئی تھپیڑا، انھیں پھر جدا کر دے گا۔ پھر یہ الگ الگ بہتے ہوئے دور ہوتے چلے جائیں گے۔۔۔ یہ زندگی بھی بہتے ہوئے پانی کے دھارے کی مانند ہے۔ تم سب تنکوں کی مانند ہو۔۔۔ سب بہے جا رہے ہو۔۔۔ کوئی لہر ایسی بھی آتی ہے جو الگ الگ بہتے ہوئے تنکوں کو جوڑ دیتی ہے۔ وہ کچھ دور تک آپس میں پیوست ہو کر بہتے

رہتے ہیں، پھر کوئی دوسری لہر انھیں پھر سے الگ کر دیتی ہے... تو پھر... پیوستگی کے عرصۂ حیات کو دائمی کیوں سمجھا جائے؟''

ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں مجھے اپنا وجود تنہا محسوس ہوا۔ نہ دھند تھی نہ گلنازی کا خوبصورت چہرہ... نہر کے کنارے میں اکیلا کھڑا تھا۔ میں نے نہر کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔

''گلنازی اب مجھے تنہا ملنے کی کوشش کرے گی...'' میں نے سوچا۔ ''وہ چاہے گی کہ اس نے میرے دل میں جس پوشیدہ جذبے کو دیکھا ہے وہ میرے ہونٹوں تک بھی آئے، اور وہ اس جذبے کے اظہار کو پانی کی وہ لہر سمجھے جو دو تنکوں کو جوڑ دیا کرتی ہے۔ وہ مجھ سے پیوست ہو جائے گی۔''

مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

''میری اور گلنازی کی چاہت بہتے ہوئے تنکوں ہی کا اتصال ہو گا۔ مجھے جانا ہے... میں چلا جاؤں گا تو میں اس عرصۂ حیات کو دائمی کیوں جانوں؟ یہ تو عارضی ہے، اسے تو ختم ہو جانا ہے...''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنی نظروں میں ایک مجرم کی طرح خود اپنے سامنے کھڑا ہوں... میری ان نگاہوں کی طرح جو گلنازی کے سامنے پلٹ کر خود مجھ تک پہنچ جاتی ہیں... مجھے اپنے مجرم ہونے کا احساس ہوا۔

''کیا میں گلنازی سے تنہائی میں ملوں؟''

اس سوال کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے بوکھلاہٹ میرے وجود پر سیاہ بادل کی طرح چھا رہی ہے۔

''نہیں، ہرگز نہیں!'' میرے خیالات کی فضا میں بجلی کوندی۔ ''مجھے کسی صورت بھی اس سے اکیلے میں نہیں ملنا چاہیے۔ میں تو اس کے سامنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں، سب کچھ بھول جاتا ہوں... تنہائی میں تو ہم جذبات کے اس دوراہے پر ہوں گے جہاں ایک سمت دائمی فراق ہوتا ہے تو دوسری جانب حسیاتی زندگی کا در کھلتا ہے... دائمی فراق ہمیں زندگی بھر محرومی کی آتش میں جلائے گا اور حسیاتی زندگی کا آغاز ہمارے اس شعور کی موت ہو گی جسے عزتِ نفس درخشاں کیا کرتی ہے۔ وہ موت صرف شعور ہی کی نہیں ہو گی، ہمارے اس وجود کی بھی ہو گی جو جسمانی زندگی کی قیود سے ماورا ہوا کرتا ہے... حسیاتی زندگی کا عرصۂ حیات تو بہت مختصر اور فانی ہو گا، میں اسے دائمی کیونکر سمجھ لوں؟ نہیں، مجھے فنا نہیں، زندگی چاہیے... وہ زندگی جسے دوام حاصل ہو... میں اتنا نیچے نہیں گر سکتا۔

گلنازی میرے بدن کی ساتھی تو بن جائے گی، لیکن وہ میرے بدن سے بلند میرے اس وجود کی ساتھی کبھی نہ بن پائے گی جس کا عرصۂ حیات دائمی ہے۔۔۔ نہیں، مجھے اس سے ملنا نہیں چاہیے۔۔۔ میں بار بار کیوں بھول جاتا ہوں کہ وہ کسی اور سے منسوب ہو چکی ہے؟ مجھے چاہیے کہ میں اسے یہ احساس دلاؤں کہ میرے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں جسے چھپایا جانا ضروری ہو۔۔۔ میں تو بس اس خیال سے کہ مجھے گلنازی کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر بھابھی بہنیں اور رقیہ کیا سوچے گی، بھاگ کر برآمدے میں چلا گیا تھا۔۔۔ وہ تو میں۔۔۔ جھوٹ کیوں بولوں، میں ڈر گیا تھا۔۔۔ لیکن کس سے؟ کیا گھر والوں سے یا اپنے آپ سے؟''

خوف کا یہ تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ یہ دو دھاری تلوار کی مانند تھا، ایک ہی ماہیت کے دو رخ لیے ہوئے، یہ خارجی بھی تھا داخلی بھی۔۔۔ ماسی جیراں نے مجھے بیبا لڑکا کہا ہے۔ اگر رقیہ مجھے گلنازی کے قریب بیٹھا دیکھ لیتی تو وہ کیا سوچتی؟ یہ ڈر خارجی بھی تھا داخلی بھی۔۔۔ لیکن میں اسے مکمل عزتِ نفس کا احساس بھی نہیں کہہ سکتا تھا، کیونکہ عزتِ نفس کا مکمل احساس تو خوف سے بہت بلند ہوتا ہے۔

''مجھے ابھی اپنے اندر، خود سے بغاوت کرنا ہے۔۔۔ میں مکمل عزتِ نفس چاہتا ہوں۔ ابھی مجھے خود سے لڑنا ہوگا، اپنی جبلتوں سے نبرد آزما ہونا ہوگا۔ ابھی بالوں کا گچھا میرے سامنے ہے۔۔۔ ابھی مجھے اس کا ایک ایک بال کاٹنا ہوگا تاکہ میں ہوس سے مکمل نجات پا سکوں۔''

میں نہر کے کنارے کھیتوں میں اترا۔ پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

''میں اب گلنازی سے نہیں چھپوں گا۔ واپسی میں صرف کل کا دن رہ گیا ہے۔ میں آج شام ہسپتال جاؤں گا۔ تنور کے سامنے بیٹھوں گا۔ اپنی ہر حرکت سے گلنازی پر یہ ظاہر کروں گا کہ میرے دل میں ایسا کچھ نہیں ہے جسے میں چھپانا چاہتا ہوں۔ میں یہی ظاہر کروں گا کہ میں اس کی کسی بات، کسی ادا سے متاثر نہیں ہوں۔'' نہ جانے کیوں، میں نے مڑ کر نہر کی سمت دیکھا۔۔۔

نہر کے دوسرے کنارے پر گھنے شیشم کے درخت کی شاخ سے ایک فاختہ اڑی اور فضا میں بلند ہوتی ہوئی مشرقی سمت میں غائب ہو گئی۔ میں پھر پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

''کیا یہ خود میرے ساتھ میرا اپنا ظلم نہ ہوگا؟'' خیالات نے جیسے گردش اختیار کرتے ہوئے پلٹا سا کھایا۔ ''یہ ظلم جو میں گلنازی کے ساتھ کرنے جا رہا ہوں۔ اگر میں اسے پہلی نظر ہی میں اچھا لگا تھا

تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ دنیا میں ہر جینے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ذوقِ جمال کے مطابق کسی کو بھی پسند کرے... محبت پر کس کا زور چلتا ہے!... یہ تو جبر و اختیار سے ماورا ایک سچا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ جرم تو نہیں کہ جس کے خانۂ دل میں یہ گھر بنا لے اسے سزا دی جائے اور اس کے گھر ہی کو توڑ دیا جائے۔ اگر گلنازی کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے تو یہ اس کا جرم تو نہیں کہ اسے اس کی سزا ملے۔ میں اسے کس جرم کی سزا دینے چلا ہوں اور میں ہوں کون کہ اسے سزا دوں؟ اگر میں اسے اچھا لگتا ہوں تو یہی اس کا معیارِ جمال ہوگا۔''

کھیت سے کچھ چڑیاں اڑیں۔ جھنڈ سا بنا کر فضا میں بلند ہوئیں۔ پھر دوسرے کھیت میں اترتے ہوئے وہ بکھری گئیں۔

''میں کب تک خود سے جھوٹ بولتا رہوں گا؟ پہلی نظر ہی میں وہ مجھے بھی بہت اچھی لگی تھی، جدا جدا سی، بہت خوبصورت... مجھے حیرت ہوئی تھی کہ دیہاتی ماحول میں رہ کر بھی وہ دیہاتی لڑکیوں کی طرح اکھڑ نہیں ہے۔ وہ بہت نازک سی ہے، بچی جیسی، بھولی بھالی، دوسری لڑکیوں سے قطعاً مختلف... اب اتنے دن گزر جانے کے بعد، اتنے واقعات کے بعد، جب اسے یقین سا ہو چلا ہے کہ میں بھی اسے چاہنے لگا ہوں، میرا یہ فیصلہ کیا اس کے ساتھ زیادتی نہ ہوگی؟''

مکئی کے پودے پر دو چڑیاں پنجے جمائے جھولتی نظر آئیں۔ ان کے وزن سے مکئی کا پودا نیچے کی سمت جھکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چڑیا، نہ جانے چڑا تھا کہ چڑیا— اڑ گئی... مکئی کا پودا لہرا کر پھر اوپر کی سمت اٹھا۔

''رفاقت کا وہ عرصہ جو عارضی ہو، اپنے ساتھ دائمی دکھ بھی لایا کرتا ہے... اسے دائمی عرصہ حیات سمجھنا درست نہیں ہوگا۔''

مجھے پھر اپنے آس پاس دھند کا احساس ہوا۔ میں ٹھہر گیا، نظریں خود بخود اوپر اٹھیں... سامنے گلنازی کی مسکراتی چمکتی آنکھوں میں سے روشنی سی نکل رہی تھی۔

''محبت کا سچا جذبہ جرم نہیں ہے... ہر جذبہ اپنے اظہار پر آسودگی کی راہ بھی تلاش کرتا ہے۔ یہ آسودگی اگر عارضی ہو تو جذبہ ہی باطل ہو جاتا ہے۔ اگر اسے دوام کی راہ چاہیے تو یہ دیکھنا بھی لازم ہو جاتا ہے کہ اس راہ کو کوئی دوسرا راستہ کاٹ تو نہیں رہا ہے۔ کٹ جانے والی راہ بھی دوام سے محروم ہو

جاتی ہے۔ اگر جذبہ ہی باطل ہو جائے تو خود سزا بن جاتا ہے۔ اگر راہ کٹ جائے تو سامنے گہراؤ کے سوا کچھ نہیں رہتا...''

میں چونکا۔ میں پگڈنڈی پر تنہا کھڑا تھا — نہ دھند رہی نہ گلنازی کا چہرہ...

''شاید میں آسودگی کی راہ تلاش کر رہا ہوں... جذبہ تو میرا باطل ہے، سزا تو مجھے ملنی چاہیے۔ گلنازی تو دوام کے رستے پر چلتی آ رہی تھی۔ اس کا رستہ تو میں کاٹ رہا ہوں۔ وہ دوسرا رستہ تو میں ہوں۔ وہ بچپن ہی سے ایک شخص سے منسوب ہے — اس نے کبھی کسی اور کے متعلق سوچا بھی نہ ہوگا۔ میں یہاں نہ آتا تو وہ کبھی کسی کے متعلق نہ سوچتی، شادی ہونے کے بعد محمد اکبر خان کے ساتھ چلی جاتی... اس کی راہ تو دائمی رفاقت کی راہ تھی۔ اس کی راہ کو تو میں کاٹ رہا ہوں... میں عارضی رستے پر... اپنے باطل جذبے کے ساتھ... نہیں نہیں... گلنازی سے دور ہونا اس کے لیے کوئی سزا نہ ہوگی... سزا تو مجھے ملنی چاہیے... گلنازی کی راہ تو میں مسدود کر رہا ہوں... میرا فیصلہ درست ہے۔ میں خود ہی اس سے دور ہو جاؤں گا۔ آج شام ہی میں اسے احساس دلا دوں گا کہ آج جو کچھ بھی ہوا ہے، غلط ہے — درست نہیں ہے۔ میرا اور اس کا کوئی تعلق ممکن ہی نہیں...''

میں ایک بار پھر پگڈنڈی پر چلنے لگا... خیالات کا بہاؤ اب بھی جاری تھا۔

''اگر میں گلنازی سے تنہائی میں ملوں...'' میرے دل پر اداسی اتری۔ ''تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں اسے اپنی چاہت کا یقین دلا دوں گا اور یہ بھی جتا دوں گا کہ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں... وہ تو اس بات کے لیے پہلے ہی سے خود سپردگی کا جذبہ اپنے دل میں رکھتی ہے۔ ایسا کرنا میری حماقت ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ بے رخی دکھا کر میں اسے دکھ پہنچاؤں گا، لیکن یہ دکھ عارضی ہوگا۔ یہ دکھ اس دکھ سے بہت کم ہوگا جو بات بڑھ جانے پر، چاہت کے راستے پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کے بعد جدا ہو جانے پر ہوگا۔ ہم تو نہر کے پانی میں چمٹ کر بہنے والے دو تنکوں جیسے ہو جائیں گے، اور جب کوئی تھپیڑا، کوئی لہر ہمیں جدا کر دے گی تو پانی کی ہر بوند ہمارے لیے زہر بن جائے گی۔ ہمارا ساتھ دائمی تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑے دکھ سے یہ چھوٹا دکھ کہیں بہتر ہوگا... یہ دکھ تو تنور سے اڑتی ہوئی اس چنگاری کی طرح ہوگا جو ہاتھ کو تھوڑا سا جلا دیتی ہے... وہ دکھ تو لاوے کا سمندر ہوگا جسے ہم دو اطراف سے پار کرنے کی کوشش کریں گے، کیونکہ نجات کا اور کوئی راستہ ہی نہ رہے گا۔

ہمیں پار کرنے کے لیے لاوے کے سمندر میں اترنا ہوگا... جو شاید ہم کبھی پار نہ کر پائیں گے... نہ میں بچوں گا نہ گلنازی... ''

اس کے ساتھ ہی ایک خیال سے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میں سکول کی نویں کلاس کا طالب علم... میرا وجود ہے ہی کیا؟ نہر میں بہنے والے پانی کے سب سے چھوٹے قطرے سے بھی چھوٹا... میں نے ابھی زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے؟ چکوال کی میونسپل لائبریری میں تیس چالیس کتابیں پڑھ کر میں اتنا بالغ نظر تو ہو نہیں سکتا کہ حیاتی زندگی کے تجربات سے متعلق سوچتا رہوں۔ یہ تجربات تو میرے پاس ہیں ہی نہیں... یہ تجربات تصوراتی تو ہو ہی نہیں سکتے۔ ان کا تعلق تو انسانی جسم سے ہے، مادیت سے ہے... انسانی جسم میں موجود کیفیات سے ہے جو حواس اور جبلتوں سے تشکیل پاتی ہوں گی۔ مجھے تو بس اتنی ہی بات سمجھ لینا بہت ہوگی کہ چھوٹا دکھ بڑے دکھ سے بہتر ہوتا ہے... میں اب گلنازی کو یہ احساس بھی نہ ہونے دوں گا کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی ایسا جذبہ موجود ہے جسے حجاب کی ضرورت ہو... دن بھی تو ایک ہی رہ گیا ہے... پرسوں صبح تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا... ''

43

شام سے کچھ پہلے میں ہسپتال کی سمت جا رہا تھا۔ تنور سے پچاس قدم پہلے مجھے نوراں نظر آئی۔ وہ میری سمت ہی چلی آ رہی تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے مڑ کر تنور کی سمت دیکھا۔ سڑک پر آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''گھوڑے آں سیر کران لئی نہر تے نہ جاسو؟'' (گھوڑے کو سیر کرانے نہر پر نہیں جائیں گے کیا؟) نوراں پلکیں جھپکے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں؟... کی ہویا؟'' (کیا ہوا) سانولی نوراں میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''پرسوں سویرے میں نے یہاں سے چلے جانا ہے، اور...'' میں نے کہا، ''کیا مجھے گلنازی نے بلایا ہے؟''

نوراں خاموش ہوگئی۔ وہ مسلسل پلکیں جھپکائے بغیر میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''گلنازی نیں بلاون تے ای جاسو؟... گلنازی ناں گڈا ای بنے راہسو؟'' (گلنازی کے بلانے پر ہی جائیں گے کیا؟ گلنازی کا گڈا ہی بنے رہیں گے؟)

نوراں کی آنکھوں میں بدمستی نظر آئی۔ میں پریشان سا ہوگیا... اگلے ہی لمحے نوراں بڑی دلیری سے آگے بڑھی۔ اس نے ایک مڑ کر تنور کی سمت دیکھا... اس کی آنکھوں میں بدمستی گہری سی ہوگئی۔ وہ اور آگے بڑھی، اتنی کہ میرے اور اس کے بدن میں ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا... میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔

''مڑ آسونا؟'' (واپس آئیں گے نا؟) نوراں کا لہجہ دھیما سا ہوگیا۔

''پتا نہیں،'' میں نے کہا۔

نوراں نے فوراً قدم اٹھایا۔

''آنا تاں پوسی...'' (آنا تو پڑے گا...) وہ میری بائیں جانب سے اس طرح گزری کہ اس کا دایاں کندھا میرے بائیں کندھے سے ٹکرایا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ حرکت اس نے دانستہ کی تھی۔

''کیا یہ گلنازی کی سہیلی ہے؟'' میں نے کڑواہٹ سے سوچا۔ مجھ پر گھبراہٹ بھی طاری تھی۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے میں ہسپتال پہنچا۔ بھائی اور میر صاحب وہاں موجود تھے۔ میں تنور کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تنور پر گلنازی نہیں تھی۔ کچھ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سرمہ زدہ آنکھوں والی زبیدہ اور شریفاں کٹی بھی موجود تھی۔ زبیدہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے تنور کی سمت دیکھنا چھوڑ دیا۔

''آپ کی یہ چھٹیاں تو ایڈونچر ہی میں گزر گئیں،'' میر صاحب نے کہا۔

''اس کا ہر دن ہی ایڈونچر ہوتا ہے،'' بھائی بولے۔ ''کوئی نہ کوئی مسئلہ بنا ہی رہتا ہے۔''

میر صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''آپ کی فطرت میں سکون نہیں ہے،'' انھوں نے کہا، ''مسائل ہمیشہ بے چین لوگوں ہی کو درپیش رہتے ہیں۔ ہمیں دیکھیے، کیسی آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔''

''وہ آپ نے...'' میں نے کہا۔ ''غالب کا شعر تو سنا ہی ہوگا کہ:

''وہ زندہ ہم کہ ہوے روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے''

میر صاحب مسکرائے۔ ''تو کیا آپ عمر جاوداں نہیں چاہتے؟'' انھوں نے کہا۔

''کم از کم آلائشِ خضر کے ساتھ تو نہیں،'' میں نے کہا اور بھائی نے میری طرف دیکھا۔

''چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ پڑھتے لکھتے تو ہو نہیں... آوارہ گردی کرتے رہتے ہو یا لائبریری میں بیٹھ کر وہ کتابیں پڑھتے رہتے ہو جو تمھاری کورس کی کتابوں میں کوئی مدد نہیں کر سکتیں...'' انھوں نے میر صاحب کی سمت دیکھا۔ ''ایک دن روسی ناول نگار شیخوف کی اور ڈان بہتا رہا اٹھا لایا تھا۔ ہم نے اچھی طرح سے اس کی طبیعت صاف کی تھی۔''

سڑک پر پھر نوراں نظر آئی۔ وہ تنور پر جانے کے بجائے ماسی جیراں کے گھر کے بیرونی دروازے کی سمت گئی، مڑ کر میری سمت دیکھا اور اندر چلی گئی۔

''آپ کے بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''ایسی کتابیں پڑھنے کی ابھی آپ کی عمر نہیں ہے۔''

گلنازی گھر کے بیرونی دروازے پر نظر آئی۔ اس کے پیچھے نوراں بھی تھی۔ نوراں نے نہ جانے گلنازی سے کیا کہا تھا، اس کے خوبصورت چہرے پر پریشانی سی تھی۔ پریشانی سے اس کے چہرے پر بھولپن بھی نکھر گیا تھا۔ نوراں کی آنکھوں میں مجھے عیارانہ سی چمک نظر آئی۔ وہ مکار آنکھوں سے پلکیں جھپکائے بغیر میری سمت دیکھ رہی تھی۔ گلنازی تنور پر جا بیٹھی۔ مجھے حیرت محسوس ہوئی— اس نے میری سمت پشت کر لی تھی۔ اس کا چہرہ میری نظروں سے اوجھل تھا... اب میں پریشان سا ہو گیا۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' میر صاحب نے کہا۔ ''آپ کے سکول میں بھی تو لائبریری ہو گی۔ وہاں مطالعہ کیا کیجیے۔''

''اسے آوارہ گردی سے فرصت ملے تب یہ پڑھائی کی سمت توجہ بھی دے،'' بھائی نے کہا۔

''آپ کا انگریزی زبان کا علم بہت محدود سا ہے۔ آپ کو اردو تراجم پر ہی انحصار کرنا ہوگا،'' میر صاحب نے کہا۔ ''انگریزی زبان میں استعداد بڑھائیں اور انگلش لٹریچر کا مطالعہ کریں۔''

میں بار بار تنور کی سمت دیکھ رہا تھا... پریشانی بڑھ رہی تھی۔

''نہ جانے کیوں...''میں نے بے دلی سے میر صاحب کی بات کا جواب دینا شروع کیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے... میرا دل ہی نہیں چاہتا انگریزی زبان سیکھنے کو... والد صاحب بھی مجھے ڈانٹتے رہتے ہیں کہ میں انگریزی کے مضمون میں بہت کمزور ہوں... پتا نہیں کیوں، میں جرمن زبان سیکھنا چاہتا ہوں، لیکن وہ یہاں سکھائی ہی نہیں جاتی... اردو ہی سیکھ رہا ہوں۔''

''اردو...''میر صاحب نے کہا۔''سیکھ رہے ہیں؟ برخوردار آپ کو تو اردو کے کلاسیکی شاعروں اور ادیبوں نے اپنی محفل میں جگہ دے رکھی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ابھی سیکھ رہے ہیں!''

بھائی نے پہلے میر صاحب اور پھر میری طرف دیکھا۔

''پانچویں جماعت میں اس نے آزاد کی آبِ حیات پڑھ لی تھی،'' انھوں نے کہا،''لیکن ایک زبان سیکھنا اور اس پر عبور حاصل کرنا تو عقلمندی نہیں ہے۔''

''زبان تو اظہار کا ذریعہ ہے،''میں نے کہا۔''کیا میں اردو زبان میں اپنے خیالات، احساس وجذبات کا اظہار نہیں کر پاؤں گا؟''

''ہم نے یہ تو نہیں کہا،''میر صاحب نے کہا۔''ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ عالمی ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے آپ کو انگریزی زبان سیکھنا ہی ہوگی۔''

گفتگو بہت پھیکی اور بیزار قسم کی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بار بار تنور ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ماسی جیراں کے دائیں ہاتھ نوراں بیٹھی تھی۔ وہ اب بھی پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ماسی کے بائیں ہاتھ سرمہ زدہ زبیدہ بیٹھی تھی۔ وہ بھی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی جنگلی بلی کسی شکار کو دیکھ رہی ہو۔ میرا دل چاہا، میں اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ گلنازی نے مجھ سے چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

''کیا ہو گیا؟''میں نے پریشانی میں سوچا۔''گلنازی سے نوراں نے کیا کہا ہے؟ اس نے مجھ سے منہ کیوں موڑ لیا ہے؟... وہ میری طرف پشت کر کے کیوں بیٹھ گئی ہے؟ اس نے مجھ سے چہرہ کیوں چھپا لیا ہے؟ وہ میری طرف دیکھتی کیوں نہیں؟''

میرے سینے میں ٹیس سی اٹھی۔ نہ جانے بھائی اور میر صاحب کیا باتیں کر رہے تھے۔ بخشو چائے لایا، پھر نہ جانے کب پیالیاں اٹھا کر بھی لے گیا۔ مجھے چائے پینے کا بھی احساس نہ ہوا... میں

بہت بے چین ہو چکا تھا۔ دل میں بار بار ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار میں نے ہر جھجک کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے تنور پر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایسی جرأت میں نے پہلے کبھی نہ کی تھی۔

گداؤ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''گداؤ...'' میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔ ''پتا نہیں کہاں ہے... روٹیاں میں لے جاتا ہوں۔''

میر صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا، لیکن مجھ پر بے چینی کی ایسی کیفیت طاری تھی کہ مجھے اپنا سارا وجود ایک تاریک سے اندیشے میں گھرا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے اپنی کوئی بہت ہی پیاری شے کہیں کھو دی ہے۔ میں نہ رہ سکنے کے سے انداز میں اٹھا، سیدھا تنور کی سمت گیا۔ ایک لڑکی چنگیر لے کر جانے والی تھی، کھڑی ہو گئی۔ تمام لڑکیاں میری طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ میں گلنازی کے قریب پہنچ گیا۔ گلنازی کے ساتھ ہی شریفاں کٹی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

''ماسی...'' میں نے کہا۔ ''گداؤ پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ روٹیاں مجھے دے دے۔''

ماسی نے میری طرف دیکھا، مسکرائی۔

''ٹھہر پتر، میں دو تین روٹیاں نکال لوں۔'' ماسی تنور پر جھک گئی۔

''میں لے جاتی ہوں،'' گلنازی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔

پل بھر میں گلنازی کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی مسکراہٹ نمایاں ہوئی، پھر اس کے سارے چہرے پر چمکنے لگی۔

''تو کہاں جائے گی اس وقت؟'' نوراں نے سرگودھا کی زبان اور لہجے میں کہا، ''وہ لے جائے گا... بیٹھ جا گلنازی۔''

گلنازی نے نوراں کی بات ان سنی کر دی۔ وہ اپنے انتہائی خوبصورت انداز میں سر کو ذرا سا ترچھا کرتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلف بائیں رخسار پر لہرا گئی۔ مجھے اپنے پورے بدن میں سرخوشی کا احساس ہوا، ایک لہر کی طرح، سر سے پاؤں تک... یقیناً میری آنکھوں میں بھی مسکراہٹ چمکی ہو گی۔ گلنازی کی آنکھیں خمار آلود ہو گئیں۔

''یہ لے!'' ماسی کی آواز پر میں اور گلنازی دونوں چونکے۔ ''دے دے اسے۔'' ماسی نے چنگیر گلنازی کی سمت اٹھائی۔ ''چھوٹی بی بی سے کل مل لینا۔''

گلنازی نے ماسی کی طرف جھک کر چنگیر پکڑی۔ مجھے پکڑاتے ہوئے گلنازی کا ہاتھ میرے ہاتھ پر آ گیا۔

''گھٹ کے پھد لے...'' (زور سے پکڑ لے!) شریفاں کٹی کی اڑینگتی ہوئی آواز آئی۔ وہ دانت پیسنے کے سے انداز میں گلنازی کو دیکھ رہی تھی۔ واقعی یوں لگ رہا تھا جیسے تنور کے پاس کٹڑی بیٹھی ہو۔

ماسی نے چونک کر شریفاں کٹی کو دیکھا۔

''کیا کہا تو نے؟'' ماسی نے سخت لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر نیں بھرا آں پئی کہنی آں، گھٹ کے پھد لے، روٹیاں ڈھے جاسن۔'' (ڈاکٹر کے بھائی کو کہہ رہی ہوں، زور سے پکڑ لے۔ روٹیاں گر جائیں گی۔)

''وہ بچہ تو نہیں ہے،'' ماسی نے تنور میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''لے جائے گا۔''

گلنازی کا ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ کھینچوں لیکن میں نے چنگیر پکڑی۔ میرے مڑنے سے پہلے گلنازی مڑی اور سیدھی اپنے گھر کے بیرونی دروازے تک گئی اور پٹ کھول کر اندر چلی گئی۔

''گلنازی یقیناً تنور پر بیٹھی لڑکیوں اور ماسی سے اپنی خمار آلود آنکھیں چھپانا چاہتی ہے...'' میں نے سوچا۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ سی تھی۔ مڑ کر میں کچی سڑک پر چنگیر اٹھائے چلا جا رہا تھا کہ اچانک ہی گھر کے سامنے چوڑی گلی سے گداؤ سڑک پر آ گیا۔ مجھے چنگیر پکڑے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ قریب آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''صاب...'' اس کی آواز میں شوخی سی تھی۔ ''آپ؟... میں لینے جا ہی رہا تھا، آپ لے آئے۔''

''وہ... وہ، تم...'' مجھ پر گھبراہٹ سی تھی۔ ''تم ہسپتال نہیں آئے تو...''

''آپ کو دید کا بہانہ مل گیا!'' گداؤ کی آنکھوں میں بھی شرارت سی تھی۔ ''یہی ہوتا ہے

صاب... اُدھر بھی یہی حال ہے... کبھی میں بھی شانی سے ملنے کے، اسے دیکھنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔''

میری حالت کسی ایسے ملزم کی سی ہو چکی تھی جو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ گداؤ سب کچھ جانتا تھا۔

''یہ سب گلنازی کی بے چینی نے کیا ہے...'' میں نے سوچا۔ ''نہ بہانے بہانے سے میرے متعلق پوچھتی نہ کسی کو پتا چلتا... اب تو گداؤ جانتا ہے کہ گلنازی اور میں ایک دوسرے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔''

گداؤ نے مسکراتے ہوئے مجھ سے روٹیوں کی چنگیر لے لی اور بھائی کے گھر کی طرف مڑا۔ میں بھی آہستہ قدموں سے کچی سڑک پر گھبرایا ہوا چل رہا تھا۔

44

اگلی صبح میں گھر سے نکلا اور بشیر نعل بند کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کل صبح ہماری روانگی ہے۔ بشیر نے نہائی کو ایک کپڑے سے صاف کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''چکوال کتنا بڑا شہر ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''زیادہ بڑا نہیں۔'' میں نے اس کے سوال پر حیرت محسوس کی۔ ''تحصیل ہے... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا یہاں سے اُکتا گئے ہو؟''

''او پائی،'' بشیر نے کہا، ''پوری بات سن لیا کر، پھر بولا کر۔ پہلے ہی ٹپوشیاں مارنا شروع کر دیتا ہے۔''

''تم نے سوال ہی ایسا پوچھا ہے،'' میں نے کہا۔

''او پائی، مجھے یہ بتا،'' بشیر نے کہا، ''وہاں بڑی مارکیٹاں ہیں؟''

''نہیں، زیادہ بڑی تو نہیں ہیں،'' میں نے کہا۔

''پھر تو مشکل ہے،'' بشیر نے کہا۔ ''سیلوں والا ریڈیو لینے، لگتا ہے لاہور ہی جانا پڑے گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''پوچھوں گا،'' میں نے کہا۔ ''وہاں ایک دکان ہے ریڈیو کی۔''

''او یائی!'' بشیر نے خوش ہو کر کہا، ''او تیرا بھلا ہو! میرا یہ کام کر دے۔ اگر مل جائے تو اگلی بار لیتے آنا، پورے پیسے دوں گا۔''

بشیر کی دکان سے اٹھ کر میں کھیتوں کی سمت چلا گیا۔ اس بار میں خالی الذہن تھا۔ کوئی ایسی سوچ میرے ساتھ نہ تھی جو نہر کے دھاروں کی طرح مجھے بہالے جاتی... بس ایک مدھم سا احساس تھا جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، کہ میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد گلنازی کا کیا ہوگا؟

''وہ کیا کرے گی؟'' میں نے خیالات کو ہوا کے اس جھونکے کی طرح محسوس کیا جو جبس میں اچانک ہی اپنا احساس دلادے۔ ''گلنازی کن کیفیات سے گزرے گی؟ اس کے شب و روز کیسے ہوں گے؟ وہ بہت اداس ہو جائے گی۔ ہر شام وہ ہسپتال کے صحن میں مجھے تلاش کرے گی...''

میرے خیالات کی ساکن سطح پر ان سوالات سے تموج نمودار ہو چکا تھا۔ ''میں کیا کروں گا؟ میری کیفیات کیا ہوں گی؟ میں آج کچھ دیر کے لیے گلنازی کا چہرہ نہ دیکھ سکا تھا تو مجھ پر بے چینی آندھی سی بن کر گری تھی... میں گلنازی کو دیکھے بغیر... میں کیا کروں گا؟'' خیالات کے بہاؤ نے جیسے اپنے سامنے کوئی چٹان حائل دیکھی اور رخ بدلا۔ ''شاید ہم پہلے ہی کی طرح مصروف ہو جائیں گے۔ میں یہاں سے جا کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جاؤں گا۔ وہی سکول، چکوال کے بازار، کوٹ طرّے باز خان کے باہر کھلے کھیت، رہٹ، شکستہ مندر، کھیل کا میدان، میونسپل لائبریری... یہاں گلنازی بھی مصروف ہو جائے گی... شاید میں جلد ہی اسے بھول جاؤں گا... وقت کے ساتھ ساتھ گزرتے لمحوں کی طرح وہ بھی مجھ سے دور ہوتی چلی جائے گی... اسی طرح میری یاد بھی تنور سے اٹھتے دھوئیں کی طرح کچھ دیر ہوا میں رہنے کے بعد تحلیل ہو جائے گی... گلنازی مجھے بھول جائے گی۔ یہ سب کچھ جذباتی طوفان سا ہے۔ نہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھ سکتی ہے نہ میں... ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے تو سب کچھ خود ہی معدوم ہو جائے گا۔''

اس قسم کے خیالات ہمیشہ پہلے بیزاری اور پھر بے حسی کو لاتے ہیں۔ سہ پہر تک میں گھر سے باہر رہا... خالی الذہن... کوئی احساس تک باقی نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں بے حس ہوں... اس حالت میں گھر واپس آیا تو بھابھی ناراض ہوئیں کہ میں دوپہر کھانے پر کیوں نہیں آیا۔

''تمھاری لُکن میٹی آئی تھی،'' بھابھی نے کہا۔ ''یہی کہتی رہی کہ آپ لوگ نہ جاؤ۔''

''سچ مچ بھابھی،'' عصمت نے کہا،''اگر میں نے یہاں ہی رہنا ہوتا تو گلنازی میری بہترین سہیلی ہوتی۔''

''وہ سر پر دوپٹہ نہیں لیتی،'' باجی زیبا نے کہا۔''نماز نہیں پڑھتی... پتا نہیں اسے آتی بھی ہے کہ نہیں... اس نے قرآن پاک بھی نہیں پڑھا ہوگا... ڈھولے اور ماہیے گاتی ہے... ایسی لڑکیاں ٹھیک نہیں ہوتیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم ایسی لڑکیوں کو سہیلیاں بناؤ۔''

باجی زیبا عصمت کی طرف غصے سے دیکھ رہی تھیں۔ باجی زیبا کی باتوں سے عصمت چڑ گئی۔

''ضروری نہیں،'' عصمت نے کہا،''کہ سر پر دوپٹہ لینے والی، پانچوں وقت نماز پڑھنے والی، ہر وقت تلاوت کرنے والی لڑکی کردار کی بھی اچھی ہو۔''

باجی زیبا کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ انھوں نے عصمت کی بات کو ذاتی توہین سمجھا۔ ان کی آواز بلند ہوگئی۔ عصمت بھی غصے میں اونچا اونچا بولنا شروع ہوگئی۔ یہ منظر ہمارے گھر کے معمولات میں شامل ہے۔ اس سے پہلے کہ جھگڑا بڑھ جاتا، بھابھی نے ڈانٹ کر دونوں کو چپ کرا دیا۔

شام کو گداؤ نے آ کر بتایا کہ تانگے کا انتظام ہو گیا ہے۔ تانگہ صبح چھ بجے ہمیں شاہ پور لے جانے کے لیے آ جائے گا۔''

45

''بھابھی اور بہنوں کو یہ تو پتا چل ہی چکا ہے...'' میں نے چھت پر لیٹے ہوئے، رات کے اندھیرے میں، رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی بے چینی میں سوچا۔ چاند کے طلوع ہونے میں بہت دیر تھی۔ ستاروں کے جھرمٹ ہر سمت نظر آ رہے تھے۔''اسی لیے تو بھابھی بار بار گلنازی کو لکن میٹی کہہ کر مجھے چھیڑتی ہیں... آنکھ مچولی تو وقت نے ہمارے ساتھ کھیلی ہے... کیا ماسی جیراں بھی یہ جان چکی ہوگی کہ میں اور گلنازی ایک دوسرے کے لیے بے چین رہنے لگے ہیں... گاؤں کی وہ لڑکیاں جو تنور پر آتی ہیں، وہ بھی سب کچھ جانتی ہوں گی۔ ایسی باتیں بھلا کب چھپتی ہیں! شریفاں کٹی تو بول پڑی تھی: زور سے پکڑ لے! جب گلنازی کا ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا۔ اچھی بات ہے... بہتر ہے کہ کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا... گلنازی رسوائی سے تو بچ جائے گی۔''

میں ستاروں کے جھرمٹ میں سب سے چھوٹے ستارے کو تلاش کرنے لگا۔ تارا جتنا چھوٹا ہو، زمین سے اس کا فاصلہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے...

''یہ معاشرتی رویے کس قدر سفاک ہیں۔ محبت انسان کو فطرت کا ودیعت کردہ جذبہ ہے لیکن محبت کی ضد، نفرت، ہمیشہ تخریبی قوت بن جاتی ہے۔ شریفاں کی گلنازی کے لیے نفرت اس کے بدصورت چہرے اور بدہیئت جسم کی طرح سیاہ دل میں موجود ہوگی۔ اس کی نفرت کا باعث گلنازی کا بے انتہا حسن ہے... شریفاں نفرت کے سوا اپنے احساس کمتری اور، اس سے بھی شدید، احساس محرومی سے پیدا ہونے والی جلن کو مٹا بھی نہیں سکتی... شاید یہی کچھ ہمیشہ سے انسانی معاشروں میں ہوتا آیا ہے۔ یہ تخریب ہمیشہ تضاد سے پیدا ہوتی ہے اور اس دنیا میں رہنے والوں نے آج تک اس تضاد کو ختم کرنے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں کیا۔''

مجھے ایک بار پھر اپنے اردگرد اور سر کے اوپر دھند کا احساس ہوا اور میرے سر سے کچھ اوپر گلنازی کا خوبصورت چہرہ نظر آیا۔

وہی مسکراتی، چمکتی آنکھیں، چہرے پر مسکراہٹ کی چمک، ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے اڑتی ہوئی زلف...

''ایسا بھی نہیں کہ اس دنیا میں اس تضاد کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ صدیوں پہلے آریاؤں نے اس تضاد کو ختم کرنے کے لیے کچھ اصول بنائے تھے جو وقت کی آندھی میں تنکوں کی مانند اڑ چکے ہیں۔ تضاد کے بہت سے پہلو ہیں۔ زندگی کے ہر گوشے میں تضاد کے لیے غیر مرئی تکون بن جایا کرتی ہے۔ زندگی کے اس بڑے تضاد، باہمی رقابت کو ختم کرنے کے لیے آریاؤں نے کچھ اصول بنائے تھے۔ انھوں نے اس معاملے میں مکمل اختیار فرد کو سونپا تھا۔ ہر لڑکی کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے لیے اپنی زندگی کا ساتھی چنے... ہر لڑکے کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے لیے اپنی زندگی کی ساتھی چنے... اگر ایک لڑکی کو دو نوجوان حاصل کرنا چاہتے ہوں اور دونوں اس کے لیے کٹ مرنے پر تیار ہوں تو اس تخریب کو روکنے میں لڑکی کا اختیار ڈھال بن جاتا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں ورمالا (شوہر کے لیے پھولوں کا ہار) دے دیا جاتا تھا کہ وہ جسے چاہتی ہے اس کے گلے میں ڈال دے۔ جب وہ اپنے محبوب کے گلے میں ہار ڈال دیتی تھی تو کٹ مرنے کا جذبہ خودبخود سرد پڑ جاتا تھا اور دوسرا

نوجوان سرلپیٹ کر چلا جاتا تھا، کیونکہ اسے یہ شعور دیا جاتا تھا کہ جبر میں نہ تو سکون ہے نہ خوشی۔ پھر یہ اصول معاشرے میں عملی شکل اختیار کر گئے۔ باپ بیٹی کے جوان ہونے پر اس سے شادی کے خواہش مند نوجوانوں کو اپنے گھر میں بلاتا تھا اور ور مالا لڑکی کے ہاتھ میں دے کر یہ اختیار سونپ دیتا تھا کہ وہ جسے چاہے، اپنے لیے پسند کرے۔ جب وہ کسی نوجوان کے گلے میں ور مالا ڈال دیتی تھی تو دوسرے نوجوان منتخب ہونے والے کو مبارک باد دیتے تھے، دعوت میں حصہ لیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ راجاؤں نے اس کی ایک اور صورت نکالی جسے سوئمبر کہا جاتا تھا۔ وہ کسی راجکماری سے بیاہ کے خواہشمند راجکماروں کو بلاتے تھے اور کوئی امتحان بھی رکھ دیتے تھے۔ جو راجکمار آزمائش میں کامیاب ہو جاتا تھا، راجکماری اس کے گلے میں ور مالا ڈال دیتی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بزرگ آریاؤں کے بنائے ہوئے اصولوں میں دراڑ پڑ گئی تھی، کیونکہ اکثر ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ کوئی بدصورت راجکمار آزمائش میں کامیاب ہو جاتا تھا اور راجکماری نہ چاہتے ہوئے بھی سوئمبر کے جبر کا شکار ہو جاتی تھی، کیونکہ اسے بادلِ نخواستہ جیتنے والے بدصورت، بدہیئت نوجوان کے گلے میں ور مالا ڈالنا ہوتی تھی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ جبر، جسے ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی، دوبارہ کئی صورتوں میں معاشروں میں جڑ پکڑ گیا اور آریاؤں کے اصول مٹتے مٹتے مٹ گئے... کیونکہ خودغرضی میں بے پناہ قوت ہوتی ہے، اسے ختم کرنا نہایت ہی دشوار ہوتا ہے، کیونکہ اس کے پیچھے ہوس کا ہاتھ ہوتا ہے جو اختیار کے ہاتھ کو پسند کے ہاتھ میں نہیں دیکھ سکتا...''

گلنازی کے چہرے پر روشنی پھیل چکی تھی اور پھر وہ انھی شعاعوں میں تحلیل ہو گیا... دھند ختم ہو گئی اور میں ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔

''گلنازی...'' میں تصور ہی میں ہم کلام ہوا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟... مجھے بھی تو بتاؤ، میں کیا کروں؟''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیم بیداری تھی یا غنودگی... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی خوبصورت وادی میں کھڑا ہوں۔ میرے سامنے نیم دائرہ بنائے بہت سی لڑکیاں کھڑی ہیں۔ سب کے ہاتھوں میں پھولوں کی مالائیں ہیں۔ سب مسکرا رہی ہیں۔ ان کے وسط میں گلنازی کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھ میں مالا نہیں ہے۔ وہ بہت اداس سی لگ رہی ہے... میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔

غنودگی سے آنکھیں بوجھل تھیں۔ ستارے دھندلاتے ہوئے نظر آئے۔ آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔ تمام لڑکیاں نیم دائرہ بنائے، ایک ایک قدم آگے بڑھیں۔ گلنازی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے لڑکیوں کو روکا۔

''ٹھہرو... میں اتنی مالاؤں کا بوجھ نہیں سہار سکوں گا... اور اگر تمھیں اختیار ہے کہ اپنی پسند کا انتخاب کرو تو یہ اختیار میرا بھی ہے۔'' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک مالا میرے ہاتھ میں بھی ہے۔ ''مجھے بھی یہ اختیار دو کہ تم میں سے میں جسے چاہتا ہوں اس کے گلے میں مالا پہنادوں۔''

لڑکیوں نے ہاتھ نیچے کر لیے۔ مجھے اختیار دیا کہ میں اپنی پسند کا اظہار کرسکوں۔ میں سیدھا گلنازی کی سمت گیا۔ میں نے گلنازی کے گلے میں مالا پہنانے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو گلنازی نے میرے ہاتھوں کو روک دیا۔

''نہیں...'' گلنازی نے کہا، ''میں یہ مالا قبول نہیں کرسکتی... میں کسی کی منگیتر ہوں۔''

''لیکن تم اسے نہیں چاہتیں...'' میں نے کہا، ''تمھیں تو مجھ سے محبت ہے۔''

''ہاں ہے!'' گلنازی نے کہا، ''لیکن اگر تم نے یہ مالا میرے گلے میں پہنادی تو یہاں سے کوسوں دور، ایک چھوٹے سے گاؤں میں، میں جن لوگوں میں رہ رہی ہوں... وہ مجھے اور تمھیں... ہم دونوں کا وجود اس زمین پر نہیں رہنے دیں گے... ختم کردیں گے۔''

''میں مرنے سے نہیں ڈرتا،'' میں نے کہا۔

''لیکن میں ڈرتی ہوں... اپنے لیے نہیں، تمھارے لیے۔ اور کیا تم میرے لیے اپنی خواہش کو موت کے حوالے نہیں کرسکتے؟ یہ تمھارے ہاتھوں میں مالا نہیں، بالوں کا گچھا ہے۔''

''گلنازی...'' میری پلکیں بھیگ سی گئیں اور مالا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گلنازی کے قدموں میں گر گئی۔ سب کچھ معدوم ہوگیا۔

46

صبح جب میں بیدار ہوا، میری آنکھوں میں نمی تھی۔

میرے دل پر تاریک مایوسی نے گھیرا تنگ کر رکھا تھا۔ صبح کی بہت مدھم روشنی، دور سے آتی

ہوئی موسیقار چڑیا کی آواز، آسمان پر سیاہی مائل نیلی روشنی، سفید بادلوں کے ملگجی ٹکڑے، ہوا میں خنک سی مہک، چھت، منڈیر، سیڑھیاں — سب کچھ بے حقیقت معلوم ہوا۔

میں بے دلی سے اٹھا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے میں اس سیڑھی پر ٹھہر گیا جہاں گلنازی نے مجھے زندگی کے اس غیر معمولی احساس سے آگاہی دی تھی جس سے میں نا آشنا تھا۔ طبیعت کچھ اور بوجھل سی ہوگئی۔ میں نیچے صحن میں اترا۔ ہینڈ پمپ کی طرف گیا۔ ٹائیگر بیرونی دیوار کی سمت سے بھاگتا آیا اور ہمیشہ کی طرح اگلے پیر میرے پیٹ پر رکھ کر مجھ سے لپٹ سا گیا۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کا ہر عضو بوجھ سا بن گیا ہے۔

کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

گداؤ بیرونی دروازہ کھول کر اندر آیا۔

''تانگہ آ گیا ہے صاب!'' گداؤ برآمدے میں گیا۔ سامان برآمدے ہی میں تھا... سامان کیا تھا، تین بیگ تھے۔ میں باہر نکلا۔ بشیر نعل بند تانگے کے پاس کھڑا تھا۔

''بس چار دن دی یاری سی گی؟'' (بس چار دن کی یاری تھی؟) اس نے مشرقی پنجاب کی زبان اور مخصوص لہجے میں کہا۔

''چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں بشیر،'' میں نے کہا۔'' جانا ہی پڑے گا، سکول کا معاملہ ہے۔''

''ہاں پائی، مسئلے مسائل تو زندگی کے ساتھ رہتے ہی ہیں،'' بشیر نے کہا۔'' دوبارہ کب آؤ گے؟''

''اگر بھائی کی ٹرانسفر نہ ہوئی تو دسمبر میں آؤں گا،'' میں نے کہا۔

''او پائی، اوئے نہیں ہوتی ٹرانس پھر...'' بشیر نے تانگے کی طرف دیکھا۔'' میری چیز یاد ہے نا؟''

''ریڈیو...'' میں نے کہا۔'' پتا کروں گا۔''

بشیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''بس ایک بار اونتری دا سیلوں والا ریڈیو مل جائے...'' بشیر نے کہا،'' زندگی سَوکھی (آسان) ہو جائے گی۔''

میری طبیعت اس قدر بوجھل ہو چکی تھی کہ مجھے کسی سے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''اچھا بشیر، میں چلوں۔'' میں نے گھر کے بیرونی دروازے کی سمت دیکھا۔ میں اندر جا کر ایک بار اپنا بیگ چیک کرنا چاہتا تھا کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ رقیہ ناشتہ بھی بنا چکی تھی۔

''ایداں کِداں جان دوؤں...'' (ایسے کیسے جانے دوں) بشیر نے کہا۔ ''ایک منٹ ٹھہر۔''
وہ تیزی سے دکان کے اندر گیا۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا چھوٹا سا گلاس تھا، جس میں سے بھاپ اٹھنے کا معمولی سا تاثر بھی تھا— بشیر چائے لایا تھا۔

چائے پی کر میں گھر میں گیا۔ بھابی، بہنیں اور رقیہ صحن میں موجود تھیں۔ صحن میں روشنی کم تھی۔ ہوا میں خنکی اور نمی کا احساس موجود تھا۔ میں سیدھا ٹائیگر کی طرف گیا۔ گداؤ اسے باندھ چکا تھا۔ ٹائیگر کو بھی شاید اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ ہم جا رہے ہیں۔ وہ آہستہ سے بھونکا... میں نے اسے سہلایا، تھپتھپایا۔ وہ دو تین بار آہستہ سے بھونکا جیسے پوچھ رہا ہو: کہاں چلے ہو؟ برآمدے میں بیٹھ کر ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔

رقیہ نے بڑے روایتی انداز میں بہنوں کو رخصت کیا— گلے لگا کے، آنسو بہا کے... مجھے دیکھ کر اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے خود ہی ہمت کی، اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''جب تک بوبا پانچ سال کا نہیں ہو جاتا، اسے باہر نہ جانے دینا۔'' میں نے برآمدے میں سوئے ہوئے بُوبے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بات چھپی رہنی چاہیے... خاموشی میں ہی بھلائی ہے۔ اور یہی خاموشی پیر نور شریف کو بے بس کر دے گی، وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔''

میں ایک ہی سانس میں سارے جملے کہہ گیا۔ رقیہ نے پھر بھی میری طرف نہ دیکھا۔ میں پلٹا۔

''جی...'' میرے پیچھے رقیہ کی دھیمی سی آواز ابھری۔

''سامان رکھ دیا ہے،'' گداؤ نے کہا، ''تانگہ تیار ہے۔ جلدی چلیں، شاہ پور سے بس وقت پر ہی نکلتی ہے۔''

بھابھی نے ہمیں رخصت کیا۔ بھائی اور گداؤ ہمارے ساتھ تانگے پر بیٹھ گئے۔ لاری اڈے سے آگے ہمیں خود ہی جانا تھا۔

گداؤ نے تانگے والے کو تاکید کی کہ ہم جب تک چکوال والی بس پر نہ بیٹھ جائیں، وہ شاہ پور کے اڈے پر ہمارے ساتھ ہی رہے۔

تانگہ تنور کے پاس پہنچا۔ ماسی کے گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔

میں تو صبح ہی سے مایوس تھا، اداس تھا۔ ۔ ۔ تالا دیکھ کر یوں لگا جیسے میری آنکھوں میں پلکوں کو کسی نے آہنی لچکدار دھاگے سے سی دیا ہے۔ تانگہ لاری اڈے پر پہنچا تو یکا یک میری آنکھوں کے سلاسل ٹوٹ گئے۔ لاری اڈے پر ماسی جیراں اور گلنازی موجود تھیں۔ قریب ہی میر صاحب بھی کھڑے تھے۔

بھائی، گداؤ، بہنیں اور میں تانگے سے اترے۔ میں نے کنکھیوں سے گلنازی کی سمت دیکھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیتے، کیونکہ وہ بھی مجھے کنکھیوں ہی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ تھی۔ یہی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ عصمت ماسی جیراں اور گلنازی کی طرف اور میں میر صاحب کی سمت بڑھا۔

''سر، آپ؟'' میں نے کہا۔

''ہم نے سوچا، چلیں صبح کی سیر کرنے کا موقع مل گیا ہے، سیر ہی سہی۔ ۔ ۔ '' میر صاحب نے کہا، ''آپ کو رخصت بھی تو کرنا تھا۔ اب ہم شاہ پور تک تو جا نہ پائیں گے۔''

''سر، آپ کا یہاں آنا ہی ہمارے لیے بہت خوشی کا باعث ہے۔'' میں نے پھر کنکھیوں سے گلنازی کو دیکھا۔ وہ عصمت سے باتیں کر رہی تھی۔ میر صاحب عصمت بہن کی طرف بڑھے، سر پر ہاتھ پھیرا، پھر باجی زیبا کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر بھائی کی سمت مڑے۔

ماسی جیراں نے بھی بہنوں کے سروں پر باری باری ہاتھ پھیرا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے سر ہلایا جیسے شاباشی دے رہی ہو۔

گلنازی آگے بڑھی اور عصمت سے لپٹ گئی۔

''ایک ہی دکھ ہے مجھے۔ ۔ ۔ '' گلنازی نے اپنی خوبصورت آواز میں کہا۔ ''آپ جیسی سہیلی ملی اور اتنے تھوڑے دنوں کے لیے۔''

''سہیلی کہہ رہی ہو تو۔ ۔ ۔ '' عصمت نے کہا۔ ''تو پھر کم یا زیادہ دنوں کی کیا بات ہے؟ ہم تو اب زندگی بھر سہیلیاں ہی رہیں گی۔ پاس رہیں یا دور رہیں، ایک دوسرے کو یاد تو کرتی رہیں گی۔''

گلنازی کے چہرے پر اداسی گہری سی ہوگئی۔

''آپ پھر آئیں گی نا چھوٹی بی بی؟'' گلنازی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

''اگر بھائی جان اسی ہسپتال میں ہوے تو سردیوں کی چھٹیوں میں ضرور آؤں گی،'' عصمت نے کہا۔ باجی زیبا تانگے میں بیٹھ چکی تھیں۔ نہ انھوں نے گلنازی کی طرف دیکھا، نہ گلنازی نے انھیں کوئی اہمیت دی۔

اچانک ہی گلنازی بڑی دلیری سے میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر مغموم سی مسکراہٹ تھی۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے مایوسی نے میری ساری کیفیات کو نگل لیا ہے... میرے سب احساسات مٹ گئے ہیں... مجھ پر بے حسی سی طاری ہے جس کا تاثر میری خالی خالی آنکھوں میں یقیناً ہوگا... مجھے پھر، پتا بھی نہ چلا، میرا بایاں ہاتھ میرے بائیں رخسار پر جا ٹھہرا۔

اس کے ساتھ ہی گلنازی کا گلابی چہرہ سرخ سا ہوگیا۔ اس کے ہونٹ ذرا سے کانپے، پھر ان پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ناگ سے لڑنا سیکھ لے...'' گلنازی نے سر کو ایک سمت دلکش سی جنبش دیتے ہوے کہا، ''پھر نہیں روکوں گی۔''

ماسی جیراں اور گداؤ نے ہنسنا شروع کردیا۔ میر صاحب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ نہ جانے کیا ہوا، میرے سارے بدن میں ایک لہر سی دوڑی... یوں لگا جیسے مسکراہٹ میرے پورے بدن پر پھیل گئی ہے۔ میری اس کیفیت کو میری آنکھوں میں دیکھ کر گلنازی کی آنکھیں پھر خمار آلود ہوگئیں۔ مجھے بھی اپنی آنکھوں میں گلنازی کی خمار آلودگی کے لیے آئینے سے محسوس ہوے۔ پھر گلنازی کی آنکھوں کی خمار آلودگی پر کہرا سا نمودار ہوا اور اس کی پلکوں پر شبنم سی نظر آئی۔ میرا دل چاہا کہ دونوں ہاتھوں سے گلنازی کا چہرہ پکڑ کر اس کی پلکوں سے شبنم کو، اس کے گلِ نو دمیدہ کی طرح رخساروں پر نہ اترنے دوں... کیا کرتا... مجھے خود اپنی پلکیں تھرتھراتی محسوس ہورہی تھیں۔

''چلیں صاب!'' گداؤ کی آواز پر میں اور گلنازی دونوں چونکے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے میر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ انھوں نے مجھے کندھوں سے کھینچ کر گلے سے لگایا۔ گداؤ بھی مجھ سے گلے ملا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں کسی خواب آلود کیفیت میں ہوں۔ میری نظریں گلنازی سے ہٹ

نہیں رہی تھیں۔ وہ بھی مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔ بچھڑنے کا غم مجھے اور گلنازی کو بری طرح اپنا احساس دلا رہا تھا۔ گداؤ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تانگے پر بٹھایا۔ بہنیں پچھلی نشست پر تھیں، میں اور کوچوان اگلی نشست پر تھے۔ میں نے نشست پر تقریباً مڑ کر پیچھے دیکھا۔

گلنازی مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم کا گہرا سایہ سا تھا۔ ماسی جیراں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور اسے پیچھے کی سمت کھینچ رہی تھی۔ گلنازی کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اب اس کے چہرے پر نہ مسکراہٹ تھی نہ چمک...

ماسی اسے بار بار پیچھے کھینچ رہی تھی۔ گلنازی کا بازو پیچھے کی طرف کھنچا ہوا تھا اور کندھا نیچے کو جھکا ہوا تھا، لیکن وہ پاؤں جمائے کھڑی تھی۔ وہ مجھے اور میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ لمحہ لمحہ ہم دور ہو رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں گھوڑے سے، تانگے سے، چرچراتے پہیوں سے، گھوڑے کی ٹاپوں سے، کوچوان سے، بہنوں سے قریب ہو کر بھی ان کے قریب نہیں ہوں... میں کہیں اور ہوں، جہاں مجھے دور جاتی ہوئی گلنازی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر ایک موڑ پر سب مناظر نگاہوں سے چھپ گئے۔

گلنازی اب صرف میرے تصور میں تھی...

گھوڑے کے آہنی نعل تارکول کی چھوٹی سی سڑک پر ٹکبر ٹکبر کر رہے تھے۔ سورج کی کرنیں درختوں کی اونچی شاخوں پر روشنی سی بکھیر رہی تھیں۔ ہوا میں خنکی تھی۔ تانگے کی رفتار سے جو جھونکے چہروں سے ٹکرا رہے تھے، ان میں درختوں اور کھیتوں میں کھڑی فصلوں کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے درختوں پر شور مچانے والے پرندے اب دانے دنکے کی تلاش میں شاخوں سے اڑ چکے تھے۔ کسی کسی درخت پر کوے بیٹھے نظر آ جاتے تھے۔ پھر ایک درخت کی بلند نازک سی شاخ پر ایک گلہری اپنے اگلے پنجے اٹھائے چرّر چرّر کرتی نظر آئی۔ میرا دل پھر چاہا کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں... گلنازی پیچھے رہ گئی تھی... میرے سینے میں ٹیس سی پیدا ہوئی — سب واقعات یاد آ رہے تھے۔ مجھے اپنی بے حسی یاد آئی... ایک بار پھر مجھے اپنے احساسات اور جذبات مرتے محسوس ہوئے۔ بے حسی چٹان کی طرح میرے دل پر پھیل گئی...

''میں نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟ کیا گلنازی جیسی نازک اور انتہائی خوبصورت لڑکی کے ساتھ

مجھے وہ سب کچھ کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا تھا؟'' بے حسی کی چٹان میں دراڑ سی محسوس ہوئی۔''وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، مجھے چاہتی ہے... میں لاکھ انکار کروں... سچائی چھپا نہیں سکوں گا، کم از کم خود سے تو نہیں... گلنازی مجھے اپنے وجود کے خالی حصے میں گھر کرتی محسوس ہوتی ہے...'' بے حسی کی چٹان سرکنے لگی، پھر جیسے تڑخ گئی۔ بھاری پتھروں کے ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے سنگریزے مجھے اپنے وجود پر گرتے محسوس ہوئے — ندامت کے بھاری پتھر... تمناؤں کے سنگریزے...''یہ میں نے کیا کیا؟'' مجھے سینے میں پھر ٹیس کا احساس ہوا۔''یہ میں نے کیوں کیا؟ میں نے گلنازی کی محبت کا کتنی سنگدلی سے انکار کیا۔ ایک بار بھی زبان سے یہ نہ کہہ پایا کہ گلنازی، مجھے اگر زندگی میں تمھارا ساتھ مل جائے تو میری زندگی کا ایک ایک دن صدیوں پر محیط ہو جائے گا... میں کچھ بھی نہ کہہ سکا... میں نے بار بار اس کا دل دکھایا ہے... میں بہت برا ہوں، بہت ہی برا!''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں رو پڑوں گا۔ میں نے کھیتوں کی سمت دیکھنا شروع کر دیا جہاں خریف کی فصلیں اپنے شباب کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہو رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے ایک دیہاتی عورت بھیڑ بکریاں لیے سڑک کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی۔ اس نے چھینٹ کا کرتا اور کالا لاچا پہن رکھا تھا۔ اس نے لاچے میں دائیں جانب کمر کے قریب گیروے رنگ کا کپڑا اُڑس رکھا تھا۔ وہ ترچھی سی ہو کر، ہاتھ میں پتلی سی چھڑی پکڑے، بڑے باوقار انداز میں چلی جا رہی تھی۔ تانگہ اس کے قریب سے گزرا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اس کی بھیڑ بکریوں کی سمت ہی دیکھتا۔ پھر اچانک ہی مجھے سڑک کی دونوں جانب مالٹوں، سنگتروں اور مٹھوں کے وہ باغ نظر آئے جو آتے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے نظروں سے روپوش رہے تھے۔

''میں ڈرپوک ہوں...''میں نے سوچا۔''اپنے اظہار کے معاملے میں بہت ہی ڈرپوک... گلنازی کے سامنے کھڑے ہو کر اظہارِ محبت کرنے کی مجھ میں ہمت ہی نہ تھی، اور بہانے تراشتا رہا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں... کہاں وہ، کہاں میں، چار دن کی دوستی سے عمر بھر کا روگ لگا لینا کہاں کی عقلمندی ہے... وہ کسی کی منگیتر ہے، کسی کی امانت ہے — اس کا منگیتر، اس کے خواب دیکھتا ہوگا۔ میں... کیا میں اتنا گرا ہوا ہوں کہ کسی انسان سے اس کے خواب بھی چھین لوں؟... یہ سب بہانے ہی تو تھے — اظہارِ محبت کے لیے ہمت نہ ہونے کے بہانے!''

مجھے افسوس سا ہوا کہ میں گلنازی سے تنہائی میں کیوں نہیں ملا۔ مجھے اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہیے تھیں۔ کاش میں اس سے کہیں بھی، کھیتوں میں، نہر کے کنارے... کہیں بھی اکیلے میں مل لیتا۔ میں اس سے کہتا، گلنازی، میں..."

ایک خیال کے آتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ یوں لگا جیسے میرے خیالات کو بہنیں، کوچوان، گھوڑا، درخت، پرندے، کھیت، فصلیں، سب سن رہے ہیں... مجھے حقارت سے دیکھ رہے ہیں...

"میں کس قدر خود غرض ہو گیا ہوں..." میں نے سوچا۔ "یہ خیالات تو خود غرضی ہی کسی انسان کے دل و دماغ میں پیدا کر سکتی ہے۔" میں نے حالات و واقعات کی تلخی کو شدت سے محسوس کیا۔ "گلنازی ماسی جیراں کے بھائی کی مانگی ہوئی ہے۔ وہ ماسی جیراں کے بھتیجے محمد اکبر خان کی منگیتر ہے۔ میرے جھاوریاں جانے سے پہلے اس نے صبح شام اپنے منگیتر ہی کے متعلق سوچا ہوگا۔ اگر وہ مجھے چاہنے لگی ہے تو اس سے حقائق تو نہیں تبدیل ہوں گے... یہ کوئی قدیم آریائی دور تو ہے نہیں کہ وہ ور مالا میرے گلے میں ڈال دے گی تو سب اس کے فیصلے کو بخوشی تسلیم کر لیں گے... یہاں تو اغراض کا شدید تصادم ہوگا جس کے نتیجے میں میرے ساتھ گلنازی کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔" مجھے کندھوں پر کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ "نہیں... نہیں... گلنازی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے... میں نے جو بھی کیا ہے وہی درست ہے۔ میرا فیصلہ درست ہے، کیونکہ اسی میں گلنازی کی سلامتی ہے اور اس کے رضاعی خاندان کا سکون بھی... نہیں، میں ڈرپوک نہیں ہوں... کوئی ڈرپوک تو ایسا فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔ وہ تو اپنی جبلتوں کا اسیر ہوتا ہے... جبلتیں اس پر حکمرانی کرتی ہیں اور وہ سہمے ہوئے شخص کی طرح قوتِ شر کا ہر تقاضا پورا کرتا ہے... کمزور شخصیت اور کمزور دل والا شخص تو ایسا فیصلہ کر ہی نہیں سکتا جو میں نے کیا ہے... مجھے گلنازی سے دور رہنا ہی اس کی سلامتی اور بھلائی محسوس ہوا، سو میں دور رہا... میں ڈرپوک نہیں ہوں..."

گھوڑے کی رفتار قدرے سست تھی، اسے شاید کوچوان نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

"کھرّرر کھرّرر... کڑک کڑک... ٹک ٹک ہا آ..." کوچوان نے گھوڑے کے بدن پر چابک گھمائی اور گھوڑے کی رفتار میں تیزی سی آ گئی۔

جیسے جیسے تانگہ شاہ پور کی طرف بڑھ رہا تھا، مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ ہر سمت اداسی

سی پھیل گئی۔ ۔ ۔ ہر شے پر اداسی محیط تھی۔ افق تا افق پھیلی اس اداسی میں مجھے اپنا وجود بہت تنہا محسوس ہوا۔ تنہائی کا وسیع احساس مجھے خود سے جدا کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے بدن میں نہیں ہوں، کہیں اور ہوں، کسی ایسی جگہ پر جہاں خود میرا وجود افق تا افق ایک گہری اداسی کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مجھے ہر سمت سناٹا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ۔ ۔ پھر سناٹے میں بہت ہی دھیمی سرگوشی جیسی بہت ہی خوبصورت آواز سنائی دی۔

''نہ چھڈ دی۔ ۔ ۔ ''

سناٹے میں سنسناہٹ سی نمودار ہوئی۔ مجھے اپنا وجود، افق تا افق پھیلا ہوا وجود، سمٹتا محسوس ہوا۔ میرے ساتھ اداسی بھی سمٹی اور مجھے ایک بار پھر گھوڑے کے سموں کی ٹکبر ٹکبر سنائی دینے لگی۔ ۔ ۔ پھر مجھے اپنے پورے بدن میں گدگدا سا احساس ہوا۔ ۔ ۔ میرے ہونٹوں پر یقیناً مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی۔ ۔ ۔ تنہائی کا طویل وعریض احساس مسکراہٹ میں سمٹتا محسوس ہوا۔

''چاچڑاں آ گیا ہے،'' کوچوان نے کہا، ''بس آ گے شاہ پور ہے۔''

''کیا؟'' میں نے کہا، ''کوٹ احمد خان، کوٹ بھائی خان گزر گئے ہیں؟''

''کب کے صاب!'' کوچوان نے سرگودھا کی بولی اور لہجے میں کہا۔ ''کیا سو گئے تھے؟''

''نہیں،'' میں نے کہا، ''پتا ہی نہیں چلا۔'' میں نے درختوں کے تنوں کے درمیان سے نظر آتے ہوئے، پیچھے کی سمت بھاگتے کھیتوں کو دیکھنا شروع کر دیا جن کی مہک بھی پیچھے کی سمت اڑتی جا رہی تھی۔

''گلنازی کیا کر رہی ہوگی؟'' میں نے سوچا۔ ''شاید سو گئی ہوگی۔ ۔ ۔ نہیں۔ ۔ ۔ گاؤں کی لڑکیاں صبح اٹھ کر پھر نہیں سویا کرتی ہیں۔ ۔ ۔ وہ جاگ رہی ہوگی۔ ۔ ۔ بہت اداس ہوگی۔ ۔ ۔ شاید روتی بھی ہوگی۔ ۔ ۔ ''

مجھے اپنی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔ درختوں کے تنوں کے درمیان ابھرنے والے کھیتوں کے مناظر دھندلے سے محسوس ہوئے۔

''اب کیا کروں؟'' میرے دل پر پھر گہری اداسی اتری۔ ''کہاں جاؤں؟۔ ۔ ۔ واپس بھی نہیں جا سکتا کہ جا کے گلنازی کے آنسو پونچھ سکوں۔ ۔ ۔ اب کیا کروں؟۔ ۔ ۔ کیا کروں میں؟''

47

شاہ پور میں ہمیں کچھ دیر بس کا انتظار کرنا پڑا۔

بہنیں اور میں — ہم تانگے میں بیٹھے رہے۔ بہن عصمت نے میری اداسی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا، مسکرائی۔

''سردیوں کی چھٹیوں میں پھر آئیں گے،'' عصمت نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں زبردستی مسکرایا ہوں۔

سرگودھا سے چکوال جانے والی بس پر زیادہ سواریاں خوشاب کی تھیں۔ شاہ پور میں اتر گئیں۔ بس میں بہت کم سواریاں رہ گئیں۔ نشستیں خالی پڑی تھیں۔ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر عصمت اور بہن زیبا بیٹھ گئیں۔ میں ان کے پیچھے والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ بس کے سفر میں مجھے کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ باہر کے مناظر وقت کا احساس ہی نہیں رہنے دیتے۔

بس چلی، پھر وہی سڑک کے کنارے شیشم کے لمبے لمبے درخت، درختوں کے پیچھے کھیت، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیہاتی، ان کی عورتیں . . . پھر وہی کٹھہ کالرہ کا پہاڑی راستہ . . . چڑھائی پہ چڑھتے ہوئے بس کی رفتار کم ہوگئی۔ سڑک کی ایک جانب پہاڑ کی سلیٹی دیواریں اور دوسری جانب گہری کھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ سڑک کے موڑ، نابینا موڑ، انتہائی خطرناک ہیں لیکن ڈرائیور کو جیسے سڑک کے ہر موڑ، ہر زاویے کا اس قدر گہرا تجربہ تھا کہ وہ کھلی سڑک کی طرح بڑے سکون سے ہر موڑ پر یوں اسٹیئرنگ گھماتا تھا جیسے اس کے بازو انسانی نہیں، مشینی ہیں۔ بس ایک ہی رفتار میں موڑ پر موڑ کاٹتی، چڑھائیاں چڑھتی رہی اور پھر میدانی علاقہ آ گیا۔ یہ میدانی سلسلہ سرگودھا کے میدانی علاقے سے سینکڑوں فٹ بلند ہے اور بہت اجاڑ ہے۔ جہاں کھیت نظر آتے ہیں وہاں خریف کی سرسبز فصلوں کے بجائے چھوٹے چھوٹے پودوں والی فصلیں تھیں جو پک کر تیار ہو چکی تھیں۔ کئی کھیتوں میں مردوں اور عورتوں کے ہاتھوں میں درانتیاں نظر آئیں۔ کھیتوں کے کناروں پر جھاڑیوں کے سلسلے دور تک جاتے محسوس ہو رہے تھے۔ ان ہی جھاڑیوں میں پوہلی بھی نظر آ رہی تھی جس کے پودے پیلے

ہو چکے تھے۔ یہ پو ہلی خزاں اور موسم سرما میں زردی مائل مٹیالی ہو جاتی ہے اور اگلے برس موسم بہار کے بعد آنے والے آندھیوں کے موسم میں زناٹے دار ہواؤں کے جھونکوں میں اڑتی ہوئی نہ جانے کہاں چلی جاتی ہے۔

پھر وہی قصبے گزرے... جابہ، چینجی، کھچیاں... اور ٹھہرتی چلتی بس تلہ گنگ پہنچ گئی۔

تلہ گنگ میں بس تقریباً بیس پچیس منٹ ٹھہرتی تھی۔ دوپہر ڈھلنے والی تھی۔ چاشت کب دوپہر میں بدلی تھی، مجھے پتا بھی نہ چلا۔ میں اپنے، باجی زیبا اور بہن عصمت کے لیے ہوٹل سے چائے لایا۔ بھابھی نے صبح صبح پراٹھے اور انڈے بنوا کر باجی زیبا کو دے دیے تھے۔ باجی نے مجھے پراٹھے پر آملیٹ رکھ کر دیا۔ پہلی بار احساس ہوا کہ مجھے واقعی بھوک نہیں ہے۔ میں نے چوتھائی پراٹھا کھایا اور باجی کو واپس کر دیا۔

''کیوں... چھوڑ کیوں دیا ہے؟'' باجی زیبا نے کہا۔

''پتا نہیں باجی،'' میں نے کہا۔ ''پیٹ بھرا بھرا سا لگ رہا ہے، بھوک ہی نہیں ہے۔''

مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اداسی اب ایک ایسی بے نام کیفیت میں بدل رہی تھی جسے شاید دنیا کی کسی زبان کے الفاظ بھی بیان نہیں کر سکیں گے... میں خاموش تھا۔ مجھ پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ سہ پہر کے احساس میں چمکتی دھوپ اور تمازت کے احساس کی آمیزش تھی — کیفیت نام سے بے نیاز تھی۔

بس تلہ گنگ سے چلی۔ قصبے گزرتے رہے۔ برساتی نالوں کے چھوٹے چھوٹے پلوں سے گزر کر جب بس بکھاری کلاں پہنچی تو احساس ہوا کہ بلکسر اب صرف دو میل دور ہے۔ بھائی نے پانچ چھ دن پہلے ہی والد صاحب کو خط لکھ کر بتا دیا تھا کہ ہم کس روز آ رہے ہیں۔ وہ کمپنی کی وین کے ساتھ بلکسر کے اڈے پر موجود تھے۔ ہمیں ایک دو دن بلکسر میں رہ کر والدہ صاحبہ اور بڑی آپا کے ساتھ چکوال چلے جانا تھا۔

48

شام سے کچھ پہلے شام کی لالی کو بادلوں نے ڈھانپ لیا۔ رات سی ہو گئی۔ ہوا میں تیزی تھی۔

ہم سب ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دور افق کی جانب آسمان پر بجلی کے لپکے کو کھڑکی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

''تم جب سے آئے ہو،'' امی نے میری طرف دیکھ کر کہا، ''اداس اداس سے ہو۔'' انھوں نے باجی زیبا اور عصمت کی طرف دیکھا۔ ''وہاں سب ٹھیک تو رہا ہے؟''

باجی زیبا نے والد صاحب اور امی کو بُوبے کی رکھ کاٹنے اور پھر پیر کے بھیجے ہوئے ملنگوں سے مقابلے کی ساری بات بتا دی۔ امی نے ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔

''تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے؟'' والد صاحب نے درشتی سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے تم کوئی بہت بڑی مصیبت کھڑی کرو گے ہم سب کے لیے . . . '' انھوں نے غصے سے چائے کی پیالی پرچ میں زور سے رکھی۔ ''جانتے ہو کن لوگوں سے دشمنی کر رہے ہو؟ وہ پورے معاشرے پر چھائے ہوئے ہیں — انتہائی باعزت ہیں۔ ملک کے سربراہان ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں، ان کے ہاتھ چومتے ہیں۔ پہلے بھی تم نے یہاں پیر قدرت شاہ کی بے عزتی کر کے اپنی اور ہماری زندگیاں داؤ پر لگائی تھیں، اب وہاں . . . کیا نام ہے پیر کا . . . ''

''پیر نور شریف،'' باجی زیبا نے کہا۔

''اب اس سے دشمنی مول لے آئے ہو۔ وہاں تمھارا بھائی ہے، بھابھی ہے، ان کے لیے مصیبت بنا آئے ہو۔'' والد صاحب کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ ''میں تمھیں کہاں کہاں بچاؤں گا؟'' ان کی آواز بلند ہو گئی۔ ''کہاں کہاں تمھاری حفاظت کروں گا؟''

''آپ . . . آپ . . . '' امی نے تیزی سے کہا۔ ''آپ خود پر قابو رکھیں . . . آج ہی تو آیا ہے . . . ''

''میں کچھ نہیں جانتا!'' والد صاحب نے انتہائی غصے میں اٹھتے ہوئے کہا، ''بتا رہا ہوں میں تمھیں . . . میں تمھیں یہ بات ابھی سے بتا دیتا ہوں . . . یہ نہیں بچے گا . . . مارا جائے گا . . . بہت جلد مارا جائے گا۔''

''خیر مانگیں!'' امی تقریباً چیخیں۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

والد صاحب غصے میں باہر چلے گئے — یا شاید اپنے کمرے میں۔ پرچ میں پڑی ان کی پیالی

میں آدھی چائے باقی تھی۔ امی، باجی زیبا اور عصمت میری سمت دیکھ رہی تھیں۔ پھر عصمت نے باجی زیبا کی طرف دیکھا۔

''کیا ضرورت تھی ابا جی کو یہ سب باتیں بتانے کی؟'' عصمت نے بیزار سے لہجے میں باجی زیبا سے کہا۔ باجی زیبا کے ہونٹ دو تین بار ہلے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہیں، لیکن خاموش رہیں۔ میں اٹھا اور باورچی خانے سے ملحق دروازے سے بنگلے کے پچھواڑے نکل آیا۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہوا کے جھونکے اپنی مخصوص آوازوں کے ساتھ شمال سے جنوب کی سمت اڑے جا رہے تھے۔ میں بنگلے کا چکر کاٹ کر سامنے والی کچی سڑک پر آ گیا۔ آسمان پر رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ ہر چمک کے بعد مجھے گرج کا انتظار تھا۔ کچی سڑک پر آ کر میں ٹھہر گیا۔ سامنے وہ کھیت تھے جہاں میں اور نارو بچپن میں چنے اکھاڑ لیا کرتے تھے اور پھر بنگلے کے پچھواڑے جا کر، انھیں دھو کر کھایا کرتے تھے ... بائیں ہاتھ سو قدم پر کچی سڑک چوراہے میں بدل جاتی ہے۔ دائیں ہاتھ شمال کی جانب سڑک پیر کوثر شاہ کی ڈھوک کے قریب سے گزر کر بنگلوں کی ایک قطار کی سمت چلی جاتی ہے۔ ڈھوک سے بنگلوں تک جھاڑیوں کا سلسلہ تھا جس میں کمپنی کے ناکارہ پائپ پڑے ہوئے تھے — اس سلسلے کو پمپ جھاڑ کہا جاتا تھا۔ بنگلوں سے آگے سڑک کمپنی کے ایک نمبر کنویں کی طرف چلی جاتی تھی۔ جنوب کی سمت کمپنی کا پاور ہاؤس تھا جس کے آگے کمپنی کے دفاتر تھے۔ مغرب کی جانب چھوٹے ملازمین اور کارکنوں کے لیے کوارٹروں کی دس بارہ قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ بلکسر کالونی کا سب سے آباد یہی حصہ تھا۔ انھی کوارٹروں سے پیچھے ورکرز کلب تھا۔

میں کچی سڑک پر کھڑا تھا۔ بجلی کبھی کم کبھی زیادہ چمکتی تھی اور گرج بھی کبھی دھیمی اور کبھی کڑک جیسی سنائی دیتی تھی۔

''کس بات کا برا مانوں؟'' والد صاحب کی باتیں میرے ذہن میں چمک اور گرج کا احساس دلا رہی تھیں۔ ''اب تو عادی ہو چکا ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک ہر بار مجھے ہی ڈانٹا جاتا ہے۔ گالیاں، بددعائیں، دھمکیاں، کوسنے ... ان کے سوا مجھے ملا ہی کیا ہے؟ لیکن میں جھوٹ کو سچ کیسے کہہ لوں، کیسے مان لوں؟ ظلم کو کیسے جائز قرار دوں؟ عیاری، مکاری کو دیکھ کر، سمجھ کر، پہچان کر، کیسے اس کی سمت انگلی نہ اٹھاؤں؟''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شمال کی جانب سے آنے والے ہوا کے تیز جھونکے مجھے جنوب کی سمت دھکیل رہے ہیں۔ میرے کپڑے پھڑ پھڑا رہے تھے، بال اڑ رہے تھے۔میرے کندھے بار بار آگے کو جھٹکے سے کھا رہے تھے۔

''مارا جاؤں گا!'' والد صاحب کا جملہ میرے ذہن میں کسی مرغولے کی طرح چکر کاٹ گیا۔

''بہت جلد مارا جاؤں گا... پھر کیا ہوا؟... اس دنیا میں جو بھی پیدا ہوتا ہے، ایک نہ ایک دن اسے مرنا ہی ہے۔ اگر میری موت ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کے باعث ہوتی ہے تو ہو جائے — میں اپنی یہ بغاوت جاری رکھوں گا۔ میں سیدھے سادے دیہاتیوں کو لوٹنے والے درندوں کے خلاف رہوں گا... ہوس کے ان عفریتوں کے گھناؤنے کاروبار کی مخالفت اور مذمت کرتا رہوں گا۔ان کی اصلیت جان کر میں بغاوت کیوں نہ کروں؟ سر براہان ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں تو لگائیں، ہاتھ چومتے ہیں تو چومیں — میں اپنی بساط کے مطابق ان کے چہروں سے نقاب کھینچتا رہوں گا، اتارتا رہوں گا... یہ اندھی عقیدتوں کو اپنا ذریعہ بنا کر، ہوس کے تانے بانے سے جال بنا کر، انسانیت کو پھانسنے والے قوتِ شر کے نمائندے، یہ خوف اور خود غرضی کے عفریت، جن کی پٹاریوں میں زہر اگلنے والے، پھنکارنے والے ناگ رہتے ہیں، جن کے سیاہ لبادوں میں کالی بلائیں چھپی رہتی ہیں، جنھوں نے انسانی معاشروں کو تاریک دلدلوں میں بدل رکھا ہے، جہاں وہ جونکوں کی طرح اپنے ہم جنسوں کا خون چوستے رہتے ہیں — میں ان کے خلاف بغاوت کیوں نہ کروں؟ مرتو ایک روز جانا ہی ہے... تو ان عفریتوں سے لڑ کر کیوں نہ مرا جائے؟''

بلکسر میں شاید یہ مون سون کے پہلے بادل تھے۔ پہلے ہوا کے تیز جھونکوں میں پھوار سی اڑتی محسوس ہوئی، پھر بڑی بڑی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ پھر اچانک ہی ان میں بوچھاڑ سی آئی اور میں چند لمحوں ہی میں بھیگ گیا۔ مجھے جھاوریاں کی پہلی بارش یاد آئی۔ تیز بارش میں جی چاہا کہ لان سے گزر کر برآمدے میں چلا جاؤں لیکن بدن میں تپش سی تھی جو ہر سمت نیم تاریکی میں تیز بوندوں کی بوچھاڑ میں، تیز جھونکوں کے تھپیڑوں میں، دھیمی دھیمی خنکی کے احساس میں بدل رہی تھی۔ میں کچی سڑک پر ہی بھیگتا رہا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا بدن ایک گیلی لکڑی ہے جسے گلنازی نے تنور میں پھینک دیا

ہے... اپنے ہاتھوں سے دہکتے انگاروں پر گرا دیا ہے، اور پھر خود ہی اپنا ہاتھ جلاتے ہوئے تنور سے نکال کر اپنے پہلو میں رکھ دیا ہے۔ میرے ایک سرے پر آگ اور دوسرے سرے پر قطرے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ سینے سے ٹیس اٹھی... تیز بارش میں بھی میری پلکیں میرے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

''نہ جانے مجھے کب تک سلگنا ہوگا...'' میں نے سوچا۔ ''اگر گلنازی میرے سامنے محمد اکبر خان کے گلے میں ورمالا ڈال دے تو میں پرسکون ہو جاؤں گا، کیونکہ اس طرح گلنازی کے لیے میری محبت خودغرضی سے بلند ہو کر احترام میں بدل جائے گی... لیکن وہاں تو تضاد کی تاریکی منھ کھولے نظر آ رہی ہے — مجھے نگلنے کے لیے... یہ تضاد قطرہ قطرہ گر رہا ہے، کسی بچے کے سر پر رکھے گئے بالوں کے گچھے کی طرح... زہریلے قطروں کی طرح۔ یکسانیت کی روشنی کے سامنے تضاد کی یہ تاریکی، یہ بڑھتا ہوا سایہ جو مجھ پر، میرے وجود پر محیط ہونا چاہتا ہے، شاید ازل سے موجود ہے... گلنازی حسن و جمال کی مثال ہے۔ بدنمائی اور بدصورتی سائے کی طرح اس کی سمت بڑھ رہی ہے — معاشرتی بدصورتی، سماجی بدنمائی... اس کے دل میں چاہت ہے، اسے مجھ سے محبت ہے۔ اس کے ہاتھ میں ورمالا ہوتی تو وہ میرے گلے ہی میں ڈالتی، لیکن تاریک معاشرتی رویوں کے بندھن، جن میں اِدھر میں جکڑا ہوا ہوں، اُدھر وہ... تضاد کی کالی بلا دھنی کے موذی کوبرے کی طرح پھن اٹھائے کھڑی ہے...''

بوندوں کی تیز بوچھاڑ شمال سے جنوب کی سمت تھی۔ میں شمال کی جانب چہرہ کرتا تھا تو بوندیں میرے چہرے پر طمانچے سے مارنے لگتی تھیں، آنکھیں بند ہو ہو جاتی تھیں... جنوب کی سمت رخ کرتا تھا تو پشت پر بوندیں چھوٹی چھوٹی کنکریوں کی طرح لگنے لگتی تھیں۔ بوندوں اور ہوا کے شور میں گلنازی کی خوبصورت آواز سنائی دی۔

''ناگ سے لڑنا سیکھ لے... پھر نہیں روکوں گی۔''

میں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی آنکھوں پر پھیری۔

''مجھے لڑنا ہوگا...'' میں نے سوچا۔ ''مجھے اب اس سے لڑنا ہی ہوگا... اب تو مجھے روکنے والی گداز بانہیں بھی نہیں ہیں... میرے شعور کی روشنی مجھے اس کا زہر آلود پھن دکھا چکی ہے... مجھے

اب اس سے لڑنا ہی ہوگا... گلنازی، میں ہوس کے زہریلے ناگ سے لڑوں گا... اس پھنکارتے ناگ سے لڑوں گا جو اپنے منھ میں دوزہر لیے ہوئے ہے۔ میں اس مارِ دوزباں سے لڑوں گا جس نے خوف اور خودغرضی کے زہر سے انسانی شعور ہی کو سلا رکھا ہے... گلنازی، میں تمھارے لیے اپنی ہر خواہش کو موت کے حوالے کر دوں گا... چاہے ہزار بار مالا میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر تمھارے قدموں میں کیوں نہ جا گرے...''

کسی دکھ کے شدید ترین احساس کے بجائے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ گلنازی مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوئی۔ بوندوں کی خنکی بدن پر بڑھتی جارہی تھی۔ زور سے بجلی چمکی۔ نیم تاریکی میں پل بھر کے لیے ہر شے نمایاں ہو کر پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے کڑکتی ہوئی آواز بوندوں اور ہوا کے شور کو چیرتی ہوئی گزر گئی... ایک بار پھر بوندوں کا شور تیز ہواؤں میں مدغم ہونا شروع ہو گیا۔

49

تین دن بعد ہم چکوال چلے گئے۔

وہی معمولات لوٹ آئے۔ سکول، سکول سے واپسی، اور پھر چکوال کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزر کر چھپڑ بازار تک جانا، پھر بازار کے سامنے تارکول کی چھوٹی سی سڑک پر دائیں جانب مڑ کر میونسپل لائبریری میں شام تک بیٹھے رہنا... کبھی چکوال سے کلر کہار جانے والی بھون روڈ پر چلتے ہوئے سڑک کے کنارے اونچے شیشم کے درختوں پر پرندوں کے گھونسلے گنتے رہنا۔

تین برس پہلے مجھے ان درختوں پر موجود سب گھونسلوں سے متعلق مکمل معلومات تھیں کہ کون سا پرندہ کس گھونسلے میں رہتا ہے، کتنے گھونسلوں میں انڈے موجود ہیں، کتنوں میں بچے نکل آئے ہیں۔ میں بندر کی طرح ہر درخت پر چڑھ جایا کرتا تھا۔

''اب میری مونچھیں نکل آئی ہیں... کیوں نکل آئی ہیں؟ میں گلنازی کے ساتھ لکن میٹی کیوں نہیں کھیل سکتا؟''

کبھی کبھی سکول سے واپسی پر راستے میں واقع ایک قبرستان میں پیپل کے گھنے درخت کے

نیچے بیٹھ کر سوچتا رہتا تھا کہ جب انسان مرنے لگتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔۔۔ جو لوگ کوما میں یا بے ہوشی کی حالت میں مر جاتے ہیں، انھیں تو کچھ پتا ہی نہیں چلتا ہوگا۔۔۔ میں کیسے مروں گا؟ مرتے وقت میرے قلب و ذہن کی کیا کیفیت ہوگی؟

کبھی شام کے وقت کوٹ طرے باز خان کے قریب ہی کھیتوں میں موجود رہٹ پر چلا جاتا تھا۔ جھاوریاں اور چکوال کے رہٹ ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے تھے — دونوں کھیتوں کے درمیان تھے، دونوں پر سرخ اینٹوں کی گول منڈیریں بنی ہوئی تھیں — فرق صرف اتنا تھا کہ جھاوریاں میں ایک اور چکوال میں دو بیل رہٹ چلاتے تھے۔ مسلسل گھومتے رہنے والے ان بیلوں کی آنکھوں پر بڑے بڑے کھوپرے[63] چڑھے رہتے تھے اور وہ اندھے ہو کر چکر کاٹتے رہتے تھے۔ نہ جانے کیا محسوس کرتے ہوں گے۔ رہٹ کے چھوٹے چھوٹے بوکے[64] پانی کھینچ کر آڈ[65] پر گراتے تھے اور آڈ سے پانی ایک چھوٹے سے گہرے حوض میں آبشار بن کر گرا کرتا تھا۔ میں آڈ کی اسی آبشار کے نیچے بیٹھ کر نہایا کرتا تھا۔

کبھی میں رہٹ سے آگے، کھیتوں کے پار، ایک شکستہ مندر میں چلا جایا کرتا تھا۔ جھاوریاں کی طرح، وہاں کی پرانی حویلی کے مندر کی طرح، اس مندر کے آس پاس بھی کھنڈر ہی باقی تھے، لیکن جھاوریاں کی طرح چکوال کے ٹوٹے ہوئے مندر کے پاس کوئی حویلی نہ تھی۔ مندر کے سامنے ایک بڑا سا تالاب تھا۔ اس مستطیل تالاب میں پانی کی جگہ اب جھاڑ جھنکاڑ نظر آتا تھا۔ اس جھاڑ جھنکاڑ میں ایک بڑی سی پتھر کی مورتی کے دو حصے نظر آتے تھے۔ مورتی کا نصف دھڑ ایک سمت اور نصف دھڑ دوسری جانب نظر آتا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ مورتی کو اٹھا کر گھر لے جاؤں لیکن اس کے دونوں حصے اتنے بھاری تھے کہ ایک کو بھی جنبش دینا میری جسمانی طاقت سے ممکن نہیں تھا۔ مندر موجود تھا، گول چبوترے کی سمت جانے والی سیڑھیاں بھی موجود تھیں، لیکن کلس غائب تھا۔ مندر کی اندرونی چھت پر ابابیلوں نے اتنے گھونسلے بنائے ہوئے تھے کہ چھت سے چپکے ہوئے ان سیاہی مائل گھونسلوں کو گننا

63۔ آدھے آدھے ناریل کے گودا نکالے ہوئے حصے۔

64۔ پانی اٹھا کر لانے والے مٹی یا ٹین کے ڈبے۔

65۔ لکڑی یا ٹین کی چوڑی نالی جس میں ڈبے پانی گراتے ہیں۔

مشکل تھا۔ اندرونی فرش پر ابابیلوں کی بیٹوں سے ایک اور فرش بن چکا تھا اور مندر کے اندر اس قدر تعفن تھا کہ سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا۔

معمولات تو سب پہلے جیسے ہی تھے، لیکن نہ جانے مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میں پہلے جیسا شگفتہ طبیعت نہیں رہا تھا۔ عصمت مجھے کئی بار احساس دلا چکی تھی کہ میں بہت سنجیدہ سا ہو گیا ہوں — نہ پہلے کی طرح باتونی رہا ہوں، نہ ہی ہر وقت گنگناتا ہوں — مجھے کیا ہو گیا ہے؟ ایک بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی کہ میری بھوک مرتی جا رہی ہے۔ ہر وقت پیٹ بھرا بھرا سا لگتا تھا، کبھی کبھی پیٹ میں تپش سی محسوس ہوتی تھی۔ منہ میں لعابِ دہن کی زیادتی کا احساس رہنے لگا تھا، جس میں پھیکا پن تھا۔

''بھوک کا احساس شکم میں نہیں، دہن میں ہوتا ہے۔'' میں سوچتا رہتا تھا۔ ''مجھے تو منہ اور زبان کا احساس ہی نہیں ہوتا، بس پھیکا پن ہی محسوس ہوتا رہتا ہے... کیا گلنازی کی بھی بھوک مر گئی ہوگی؟''

میری خاموشی کو میرے سکول کے دوستوں نے بھی محسوس کیا۔

''یار، سچ سچ بتا،'' ایک دوست نے پوچھا، ''تجھے ہوا کیا ہے؟''

50

ایک ہفتے بعد بھائی کا خط آیا۔ خط میں سب خیریت کے بعد تحریر تھا کہ سب اندیشے اب ختم ہو رہے ہیں، پیرنور شریف کے بدمعاش ملنگ دوبارہ گاؤں میں نہیں آئے... میرے لیے میر صاحب کا پیغام خط میں موجود تھا کہ میں انگلش مینرز کو بار بار کاپی پہ لکھوں اور پھر زبانی یاد کروں۔ گلنازی کی کوئی خبر نہ تھی — ہوتی بھی کیسے؟

مجھ پر چھائی ہوئی اداسی، روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سکول میں دوستوں نے بہت پوچھا لیکن میں خاموش رہا... وہ سب میری خاموشی سے پریشان بھی تھے۔

''او یار!'' ایک دوست نے میرے چہرے کی سمت غور سے دیکھ کر کہا، ''کیا ہو گیا ہے تجھے؟ ہم تو تیری بک بک سننے کو ترس گئے ہیں۔ تیرے گانے کدھر گئے؟... ہم سننے کے لیے بے چین ہیں اور تو... لگتا ہے اپنا سب کچھ کسی کو دے آیا ہے۔ کون ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے؟''

میں پھر بھی خاموش رہا۔ وہ پوچھ پوچھ کر تنگ آ گئے۔ پھر انھوں نے میری سمت توجہ دینا ہی چھوڑ دی۔ میں بہت تنہا ہو گیا۔ اب میں نے میونسپل لائبریری جانا بھی چھوڑ دیا۔ میرا زیادہ تر وقت کلر کہار جانے والی بھون روڈ پر آوارہ گردی کرنے میں، کھیتوں میں رہٹ کی منڈیر پر اور شکستہ مندر کے تالاب میں اترنے والی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر گزرنے لگا تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں شکستہ مورتی کے دو ٹکڑوں کو دیکھتا رہتا تھا۔

''یہ بھی کسی فنکار سنگ تراش کا شاہکار تھی، جس نے مہینوں اسے تراش کر مورتی کا روپ دیا ہوگا۔ تیشے کی ہر ضرب پر اسے دیوتا کے قرب کا احساس ہوتا ہوگا۔ وہ سوچتا رہتا ہوگا کہ وہ جس کی مورتی بنا رہا ہے، وہ اسی طرح کا نظر آتا ہوگا جس طرح وہ پتھر کو تراش رہا ہے۔ اب مورتی کی صورت سے بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ مہادیو کی تھی کہ وشنو کی؛ نہ مورتی کے گلے میں ناگ نظر آتا تھا نہ ہی مورتی کے سر پر مور مکٹ (مور پنکھ والا تاج)۔ توڑنے والوں نے طیش سے تپتے چہروں اور غیظ و غضب سے ابلتی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ، بڑے بڑے ہتھوڑوں کی ایک دو ضربوں سے مورتی کے دو ٹکڑے کر دیے تھے — شاید مورتی تراشنے والے کے بدن کو بھی دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہوگا...
ایسا کرنے پر مورتی توڑنے والوں کو کیا اور کس قسم کا سکون ملا ہوگا؟ شاید میں اس حیوانی کیفیت سے کبھی آشنا نہ ہو پاؤں گا جو مورتیوں کو توڑنے، مندروں اور مسجدوں کو گرانے، گرجا گھروں اور گوردواروں کو منہدم کرنے والوں پر طاری ہوتی ہوگی... بائبل، گیتا، قرآن اور گرنتھ کو آگ میں جلانے والوں کے تعصب کی شدت کیسی ہوتی ہوگی؟ کون سے حیوانی جذبوں کو آسودہ کرتی ہوگی؟ لیکن میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ یہ سب کچھ انھیں ان کے مذہب ہی سکھاتے ہیں... کوئی لاکھ کہے کہ مذہب بیر نہیں سکھاتا — سب عناد کی اساس پر مذاہب ہی تو موجود ہیں۔ حیوانیت کا اظہار کرنے والے مسلمان تھے، عیسائی تھے، ہندو تھے، یہودی تھے یا پارسی تھے، سکھ تھے یا کسی ازم کے ماننے والے، اشتراکی تھے یا کوئی اور — انسان ہرگز نہ تھے...''

میری اداسی تاریک سی ہو جاتی تھی اور مجھے مندر اندھیرے میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ ''انھوں نے انسانیت کو تاریک گہراؤ کی سمت دھکیل دیا۔ سیاسی مفادات، معاشی مفادات، معاشرتی مفادات ہوس سے تشکیل پانے والے تمام مفادات، انھیں انتہا پسند بناتے رہے اور انھیں سمجھانے یا روکنے والا

کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو اس کی آواز طوفانی رات میں جھینگر کی آواز کی مانند تھی، جسے طوفان کا شور بہت حقیر سمجھتا ہے۔ ان کی یہ شدت پسندی ان کے تاریک مذہبی رویوں کی سکھائی ہوئی ہوگی۔ وہ یہ شدت پسندی بچپن ہی میں حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ زندگی کا پہلا درس اسی شدت پسندی پر مشتمل ہوتا ہے، اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد ان کی شدت پسندی کو بالغ کر دیتے ہیں — وہ ہوس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ خوف، خودغرضی اور ہوس اپنے ان تانوں بانوں سے بنے جال میں انھیں مکڑی کی طرح پھانس لیتی ہے۔۔۔ کیوں نہ پھانسے؟ یہ جال تو ان کے نابالغ اذہان پر پھینک دیا جاتا ہے۔''

تالاب کے جھاڑ جھنکاڑ میں، مکڑیوں کے بہت سے جالے نظر آ رہے تھے۔ نئے پرانے، مٹیالے سفید جالے، جن پر مکڑیاں، اِندریوں (جبلتوں) کی طرح حیوانی انداز میں نشیب وفراز دکھاتی ہوئی چلتی رہتی ہیں اور ان کے چلنے سے جالوں میں ارتعاش سا نمایاں رہتا ہے — شاید ہمیشہ رہتا ہوگا۔۔۔

''وہ بچہ جسے بچپن میں ہی یہ بتا دیا جائے کہ اگر وہ کوئی برا کام کرے گا تو اسے آگ میں جلایا جائے گا اور اگر وہ اچھا کام کرے گا تو اسے دودھ اور شہد والے باغوں میں جگہ ملے گی، تو وہ نہ صرف یہ کہ خوفزدہ ہو جاتا ہے بلکہ اس کے ذہن میں شدید قسم کا لالچ بھی نمودار ہو جاتا ہے — یہی لالچ اسے خودغرضی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا نابالغ خوف جب بالغ ہو جاتا ہے تو اس پر یہ بات پوری طرح حاوی ہو چکی ہوتی ہے کہ خوف سے بہت کام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ احساس اس کی شخصیت میں ظلم وتشدد کے رجحانات پیدا کرتا ہے۔۔۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو خوفزدہ کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتا ہے۔ خوف اسے ایک ہتھیار کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے جبلی تقاضوں کو بھی پورا کرنے لگتا ہے۔ اس کے قلب وذہن میں رحم مر جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو دہشت زدہ کر کے اپنی تسکین کا سامان پیدا کرنے لگتا ہے۔ اگر اتفاق سے حالات وواقعات اسے فطرتِ خیر سے آشنا کر دیں تو اس کی ساری زندگی اندرونی کشمکش ہی میں گزر جاتی ہے۔۔۔ خوف کو ذریعۂ آسودگی سمجھنے والا شخص جو بچپن ہی سے لالچ کا شکار ہو چکا ہوتا ہے، خودغرضی اس کی شخصیت کا اہم جزو بن جاتی ہے۔ وہ بچپن ہی سے ہر اچھا کام کسی صلے کی خاطر کرتا نظر آ رہا ہوتا ہے۔ یہی اس کی تربیت میں تھا کہ اسے ہر کام ثواب کی خاطر کرنا ہے — ثواب، جس کا مفہوم ہی بدلہ یا اجرت ہے۔ وہ ثواب ہی کو زندگی

کا مقصد سمجھنے لگتا ہے، اور پھر یہ مقصد اس کی ذات تک محدود ہو جاتا ہے اور وہ شدید قسم کی خود غرضی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے اردگرد خود غرضی کی فصیل کھڑی ہو جاتی ہے اور زندگی بھر اس فصیل سے باہر نہیں نکل پاتا۔ اور وہ قوتِ شر جس نے اسے مکڑی کی طرح پھانس رکھا ہوتا ہے، دوام حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے... یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے...''

51

میری بھوک مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔

اب میں کھانا کھاتا تھا تو صرف اس لیے کہ بدن میں توانائی رہے۔ بھوک کے ساتھ کھانا کیا ہوتا ہے، میں بھولتا جا رہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری خوراک دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ میرا جسم دبلا ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے دبلے پن کا احساس مجھے آئینے کے سامنے ہونا شروع ہو چکا تھا۔ میرے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہونا شروع ہو چکی تھیں... امی بہت پریشان تھیں۔ انھیں یہ فکر پریشان کر رہی تھی کہ مجھے کوئی بیماری چمٹ گئی ہے؛ میں جگر یا معدے کی کسی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ وہ ایک ہفتے کے روز مجھے بلکسر لے گئیں۔ وہاں کمپنی کی ایک لیڈی ڈاکٹر رضیہ نے میرا چیک اپ کیا۔ میرا خون نمونے کے لیے نکالا اور کہا کہ بظاہر تو کوئی بیماری نظر نہیں آتی، بہر حال میں خون کا نمونہ راولپنڈی بھجوا دیتی ہوں۔ رپورٹ آنے پر ہی کچھ بتا سکوں گی۔ اگلے ہفتے والد صاحب چکوال آئے اور انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر رضیہ کہتی ہیں کہ آپ کے بیٹے کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ دراصل یہ عمر بدن کے بڑھنے کی ہے اور اس عمر میں کچھ لڑکے کمزور ہو جاتے ہیں، پھر ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں... فکر کی کوئی بات نہیں۔

چکوال میں میرے دن بہت برے انداز میں گزر رہے تھے۔ میں ہر وقت گلنازی کے خیالوں میں گم سم سا رہنے لگا تھا۔ بار بار کتنے ہی اندیشے سر اٹھاتے تھے اور میرے ذہن کو ڈس جاتے تھے۔ گلنازی ٹھیک تو ہو گی؟ وہ کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو... تنور میں لکڑیاں ڈالتے ہوئے کہیں اس کا ہاتھ نہ جل گیا ہو... اسے کوئی چوٹ تو نہیں لگی... اندیشے میرے دل پر تاریک سایوں کی طرح اترتے تھے اور میں بے سکون سا ہو کر، دیوانہ وار سڑکوں پر، کھیتوں میں پھرتا رہتا۔ عصمت مجھے دیکھ دیکھ کر پریشان سی رہنے لگی تھی۔ اکتوبر کے آخری ایام تھے جب بھائی کا وہ خط آیا جس کا میں بے تابی

سے انتظار کر رہا تھا۔ عصمت نے خط پڑھنا شروع کیا۔

''ایک بڑی خبر یہ ہے،'' عصمت بولی، ''محبوب (بُوبے) کی عمر پانچ سال ہوگئی ہے۔'' عصمت کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرے۔ ''سب کچھ خیریت سے ہوا، بس ایک مسئلہ گاؤں کے حجام، فیکے نائی نے کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اپنا تھیلا اٹھا کر بچے کی لٹ کاٹنے آ گیا تھا۔ گداؤ نے کہا کہ رقیہ تو میگھا پتن جا کر بوبے کی رکھ کٹوا آئی ہے، تو وہ بھپر گیا۔ کہنے لگا کہ رکھ کھلوانے کا دن آج کا ہے، رقیہ نے تین دن پہلے رکھ کیسے کھلوادی ہے؟ گداؤ نے کہا کہ تو بوڑھا ہو چکا ہے، پانچ سال پرانی بات تجھے کیسے یاد رہ سکتی ہے۔ بھلا ماں سے زیادہ بچے کی عمر کون جانتا ہے! لیکن وہ اڑ گیا کہ میرا حساب غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ رکھ تین دن پہلے اتری ہے۔ گداؤ نے مجھے آہستہ سے بتایا کہ فیکے نائی کو صرف اپنی نیگ[66] کی فکر ہے، وہ رکھ کاٹنے کے دس روپے لیتا ہے، تو میں نے فیکے کو دس روپے دے دیے۔ وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا، ہاں گداؤ، میں بوڑھا ہو گیا ہوں، شاید میرا حساب ہی غلط تھا۔ چلو میں نے نہ سہی، میرے ہی کسی بھائی بند نے رکھ اتار دی ہوگی۔ مجھے میری نیگ مل گئی۔ پانچ سال خدمت کی ہے رقیہ کی۔ ہر دو تین مہینوں بعد بوبے کی رکھ چھوڑ کر ٹنڈ کرتا رہا ہوں، رکھ کا ایک بال بھی نہیں کاٹا۔ پھر وہ بچے کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ رقیہ کی چند رشتہ دار خواتین بھی آئی تھیں۔ مبارک کے ساتھ تحائف بھی دے گئی ہیں۔ گاؤں میں کسی کو خبر نہیں ہوئی کہ خالد اڑھائی مہینے پہلے ہی رکھ کاٹ چکا تھا۔ ویسے کچھ بھی ہو، اس بات پر میں اس کا قائل ہو گیا ہوں کہ یہ پیر لوگ سب کے سب فراڈیے ہیں۔ ہماری توقع کے مطابق پیر نور شریف کی طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ وہ ڈر کر خود ہی اس واقعے کو دبا دینا چاہتا ہے۔ تمھاری بھابھی میرے پاس بیٹھی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ میں خط میں ان کی طرف سے بھی پیغام لکھ دوں۔ کہہ رہی ہیں کہ عصمت کی سہیلی اور خالد کی لکن میٹی گلنازی ہر دوسرے تیسرے دن آ جاتی ہے۔ آپ سب کی خیریت پوچھتی ہے اور ہر بار یہی کہتی ہے کہ آپ لوگ کب جھاوریاں آئیں گے۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے — بہت دبلی اور کمزور . . . ''

عصمت نے میری طرف دیکھا۔ میں عصمت کی نظروں کا مقابلہ نہ کر پایا — نیچے دیکھنے لگا۔

''بہت دبلی اور کمزور ہو گئی ہے۔ ماسی جیراں کہتی ہے کہ وہ ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہے۔ وقت

66۔ نیگ: خوشی کے موقع پر دیے جانے والے روپے یا تحائف۔

پر کھانا نہیں کھاتی۔ آپ لوگوں کی تو دسمبر ہی میں چھٹیاں ہوں گی۔ خالد کیسا ہے؟ اب یہاں موسم تبدیل ہو چکا ہے۔ ہم سب کمروں میں سوتے ہیں، اکثر رات کو کھیس سے بدن ڈھانپنا پڑتا ہے۔ آپ لوگ جب آئیں گے تو یہاں پھر موسم سخت ہوگا۔ بہت سردی ہوگی۔ لیکن سخت گرمی کے مقابلے پر سخت سردی کا موسم زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ رقیہ بہت خوش ہے۔ آپ سب کو سلام کہہ رہی ہے۔

یہ تھا تمھاری بھابھی کا پیغام۔ میں اب خط بند کرتا ہوں۔ دسمبر میں آپ سب ضرور آنا۔

تمھارا بھائی''

عصمت نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ابھر آنے والی ہڈیوں پر تھیں۔

''کبھی آئینے میں غور سے اپنی شکل دیکھی ہے؟'' عصمت نے کہا۔ ''لیکن تمھیں آئینہ دیکھنے کا خیال ہی کب آتا ہوگا؟''

میرا جی چاہتا تھا کہ عصمت کے سامنے سچ بول کر کہوں کہ وہ مجھے آئینہ ہی تو دکھا رہی ہے... ہر وقت وہی تو دیکھتا رہتا ہوں...

52

''اب اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ عصمت اچھی طرح جان چکی ہے کہ میں اور گلنازی اس راہ پر چل نکلے ہیں جس پر دکھ زیادہ اور سکھ بہت کم ہوتے ہیں۔''

یہی سوچتے ہوئے میں گھر سے نکلا، کھیتوں کا رخ کیا۔ مجھے اپنی جسمانی حالت کا اندازہ تھا جو دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس زوال پذیری کو روک بھی نہیں سکتا تھا... اب تو چکوال کی گوری، لمبوترے چہروں والی لڑکیاں سکول سے واپس آتے ہوئے ڈھلوان نما سڑک پر مجھے دیکھ لیتی تھیں تو ان کی نگاہوں میں حیرت نمودار ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی تھیں۔ ان کے چہرے پر سوالیہ نشانات بن جاتے تھے، وہ ابروؤں کو اوپر کی سمت جنبش دے کر ایک دوسرے سے جیسے پوچھنے لگتی تھیں کہ وہ گلابی رنگ والا، چمکتی مسکراتی آنکھوں والا، ہوا کے دھیمے جھونکے کی طرح چلنے والا لڑکا کہاں گیا؟

میں کسی کو کیا بتاتا کہ میں اسے جھاوریاں کے ایک تنور پر چھوڑ آیا ہوں . . .

میں کھیتوں سے ہو کر رہٹ پر پہنچ گیا۔ رہٹ پر سرخ اینٹوں کی گول منڈیر اکثر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا کرتی تھی ۔ میں بیٹھ گیا۔ ذہن میں بس ایک ہی سوال تھا کہ جو کچھ مجھ پر اور گلنازی پر بیت رہی ہے، اس کا انجام کیا ہوگا؟ بیٹھے بیٹھے مجھے پھر اپنے اردگرد اسی دھند کا احساس ہوا جو جھاوریاں میں مجھے گلنازی کا چہرہ دکھایا کرتی تھی ۔ میرا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ میری نگاہوں کے سامنے گلنازی کا خوبصورت چہرہ دھند میں چمک رہا تھا— آنکھوں میں وہی چمکتی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر میں خود کو بھول جایا کرتا تھا۔

''کھیت میں اگر دو پودے ہوں، دونوں قریب قریب اُگے ہوئے ہوں، تو بھی وہ آپس میں مل نہیں پاتے۔ کسی جانور کے پیروں سے ٹوٹ کر وہ ایک دوسرے پر گر تو سکتے ہیں، مل نہیں سکتے . . . پکنے پر جب ان کا رنگ سبز سے سنہری ہو جاتا ہے تو وہ کٹ جاتے ہیں۔ ان کے خوشوں سے جو دانے نکلتے ہیں، وہ کھلیان میں پھینک دیے جاتے ہیں، پھر انھیں ڈھیروں کی شکل دے دی جاتی ہے لیکن وہ آپس میں پھر بھی نہیں مل پاتے۔ ہر دانہ الگ الگ رہتا ہے۔ وہ آپس میں تب ملتے ہیں جب ان کو چکی میں پیس دیا جاتا ہے۔ ان کی انفرادی حیثیت ایک دانے کی صورت میں ختم ہو جانے پر وہ آٹے کی صورت میں اپنی پہچان حاصل کر لیتے ہیں جو گندھ جائے تو پیڑا بن جاتی ہے، تنور میں پک جائے تو روٹی بن جاتی ہے، تنور میں گر جائے تو جل کر خاکستر ہو جاتی ہے . . . یہ بات سمجھ کیوں نہیں لیتے کہ ہم کھیت میں اُگے ہوئے دو پودے ہیں . . . یا پھر یہ کیوں نہیں جان لیتے کہ ہم دو خوشوں سے نکلے ہوئے دانے ہیں— جب تک چکی میں پس نہ جائیں گے، مل نہ پائیں گے۔''

میں چونکا۔ نہ وہاں دھند تھی، نہ گلنازی کا خوبصورت چہرہ اور چمکتی مسکراتی آنکھیں . . . میں تنہا سرخ اینٹوں کی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ رہٹ پر میرے سوا کوئی اور نہ تھا۔

''اگر مجھے دکھوں کی چکی میں پسنا ہی ہے،'' میں نے سوچا،'' تو مجھے اپنے کچلے جانے کا خوف نہیں ہے، لیکن کیا میں ایک بھولی بھالی نازک سی لڑکی کو چکی کے حوالے کر دوں؟ کیا میں اس قدر خود غرض ہوں کہ اپنی خاطر گلنازی کو بھی مسلے جانے کے لیے چکی کے حوالے کر دوں؟ نہیں، میں اتنا خود غرض ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر میں نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو . . . میں تو ظلم و تشدد کی چکی میں

کچلا ہی جاؤں گا، گلنازی بھی نہ بچے گی۔۔۔ نہیں، جو فیصلہ میں نے جھاوریاں میں کیا تھا، وہی درست ہے۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو چکی ہے۔۔۔ میں نے گلنازی کو یہ بتادیا ہے کہ میرے دل میں اس کے لیے وہ جذبہ موجود ہے جو بہت انفرادی ہوا کرتا ہے۔ کاش رخصت کے لمحوں میں میں گلنازی کو اپنی چاہت کا یقین نہ دلاتا، کاش میرے چہرے پر گلنازی کا چہرہ منعکس نہ ہوتا، کاش میری آنکھیں گلنازی کی آنکھوں کی مانند خمار آلود نہ ہوتیں۔۔۔ ایسا نہ ہوتا تو آج بھائی کے خط میں میرے دل میں پیوست ہو جانے والا یہ ناوک اپنی خلش سے مجھے یہ خبر تو نہ دیتا کہ میری گڑیا اپنے گڈے کی طرح بہت دبلی اور کمزور ہو چکی ہے۔''

میری پلکیں نم آلود ہو کر بوجھل سی ہو گئیں۔۔۔ کیا کروں، میں کیا کروں؟ بے بسی کا احساس میرے دل میں پیوست ناوک کے زخم پر تیزاب چھڑک رہا تھا۔۔۔

وقت کا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ پھر رہٹ کے مالک ملیار اور بیلوں کی جوڑی کے آنے پر میں اٹھا اور واپس گھر کی سمت چل دیا۔۔۔ بار بار ایک ہی خیال آ رہا تھا: عصمت سب کچھ جانتی ہے۔

53

نومبر کا آخری ہفتہ آتے آتے میرے تمام کپڑے ڈھیلے ہو چکے تھے۔

آئینے کے سامنے جاتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ چہرے پر رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ رخسار قدرے پچکے ہوئے لگتے تھے۔ آنکھیں بھی کچھ اندر کی سمت دھنس گئی تھیں۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ میرے جسم کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ بس میں اتنا ہی جانتا تھا کہ میرے سینے میں تپش سی رہنے لگی تھی۔ مجھے بھوک بالکل نہیں لگتی تھی — یوں لگتا تھا جیسے معدہ بھرا بھرا سا ہے اور پیٹ میں بھی تپش کا احساس ہوتا رہتا تھا۔ گلنازی کا خیال رات میرے ساتھ سوتا اور صبح میرے ساتھ بیدار ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی سینے میں ہوک سی اٹھتی تھی تو میں گھر سے بھاگ کر کھیتوں میں چلا جاتا تھا۔ کبھی کلر کہار والی سڑک پر بے مقصد پھرتا رہتا تھا، کبھی مندر کی سیڑھیوں پر، شکستہ سیڑھیوں پر، گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔

نومبر کے آخری ایام میں گلنازی کے لیے میری بے چینی بہت بڑھ گئی۔ میں ساری ساری

رات بستر پر کروٹیں لینے لگا تھا— میری نیند بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ خود کو لاکھ سمجھانے کے باوجود مجھے اپنی بے چینی کی ڈور گلنازی سے بندھی محسوس ہوتی تھی۔

ایک سہ پہر میں مندر کی شکستہ سیڑھیوں پر بے حد اداس اور مایوس سا ہو کر بیٹھا تھا۔ میرے اندر جبلتوں کی جنگ جاری تھی — شدید ترین جنگ۔ میں اسے جبلتوں اور شعور کی جنگ بھی کہہ سکتا تھا... یہ جبلتِ فرار اور جبلتِ حصول کی جنگ تھی، یہ شعورِ ہوس کی تقاضائے ہوس سے جنگ تھی۔ جو کچھ بھی تھی، میرے سکون کو تاراج کر رہی تھی، میرے قرار کو گریز پا کر رہی تھی... ہزار بار سوچا کہ گلنازی اور میری محبت کا رشتہ سراب اور صحرا کا رشتہ ہے۔ دشت میں سراب تو رہے گا، لیکن اسے کبھی سیراب نہیں کر پائے گا۔ گلنازی اور میں اس چھوٹی سی عمر میں جو چاہتے ہیں وہ لاحاصلی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جب میرا اور گلنازی کا ہمیشہ کا ساتھ ممکن ہی نہیں تو اس طرح اپنا قرار کھو دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟

''محبت عقل کے تابع نہیں ہوا کرتی۔'' یہ ایک جملہ میرے سب خیالات کو ان قطروں کی طرح گھاس کی پتیوں پر پالے میں تبدیل کر دیتا تھا جو نومبر کے ان آخری ایام میں صبح سویرے سکول جاتے ہوئے ہر سمت سبزی مائل سفیدی میں بکھرنے لگے تھے۔ میں پھر خود کو سمجھاتا۔

''میں اور گلنازی ہم عمر ہی سہی، ہمیں معاشرہ اور قانون ابھی بالغ قرار نہیں دے گا۔ مجھے ابھی تعلیم مکمل کرنا ہے، کالج جانا ہے، یونیورسٹی میں جانا ہے، پانچ چھ برس لگ جائیں گے۔ گلنازی جو میری طرح پندرہ اور سولہ برس کے درمیان میں ہے، کیا اکیس بائیس برس کی ہونے تک انتظار کر سکے گی؟ کرنا بھی چاہے گی تو کیا ماسی جیراں کے خاندان والے اسے کرنے دیں گے؟''

میں خود کو سمجھاتا رہتا تھا کہ گلنازی کے متعلق سوچنا چھوڑ دوں، لیکن ہر بار میری کوشش رائیگاں جاتی تھی۔

''کیا خبر وہ مجھے بھول چکی ہو۔'' میں نے پھر خود فریبی سے کام لیا۔ ''دیہاتی لڑکی ہے، لاابالی طبیعت ہے... وقتی جذباتی کشش سے میری جانب کھنچ گئی ہوگی، ہیجان انگیز کیفیت میں مجھے چاہنے لگی ہوگی۔ اب میں اس کے سامنے نہیں ہوں تو سب کچھ مدھم پڑ گیا ہوگا۔ اب نہ اس کی کوئی جذباتی کیفیت ہوگی نہ ہیجان ہوگا... میں کیوں احمقوں کی طرح اسی کے متعلق سوچتا رہتا ہوں؟''

اپنے آپ کو سمجھانے کی یہ کوشش بھی خود بخود مٹنے لگتی تھی۔

''جھوٹ مت بولو!'' میں خود سے کہتا تھا۔ ''وہ تم سے محبت کرتی ہے، وہ تمھیں کیسے بھول سکتی ہے؟ وہ ہر دوسرے تیسرے دن بھابھی سے ہمارا حال پوچھتی ہے . . . وہ میرا حال پوچھتی ہے . . . میرا حال . . . اسے کون بتائے کہ میں اسی کا آئینہ ہوں . . . '' میں نے ایک تاریک سی مایوسی کو تہہ بہ تہہ دل پر اترتے محسوس کیا۔

''اسے بھی بھوک نہیں لگتی ہوگی۔ میری طرح اس کا معدہ بھی بھرا بھرا رہتا ہوگا، اس کے شکم میں بھی آتش سی ہوگی۔ اس کی چھاتی میں بھی آگ سی بھڑکتی ہوگی، جیسے میرے سینے میں بھڑکتی ہے۔ میں تو بھاگ کر ان کھیتوں میں آ جاتا ہوں، مندر میں آ بیٹھتا ہوں . . . وہ کہاں جاتی ہوگی؟ تنور کے پاس بیٹھے بیٹھے یہی سوچتی ہوگی کہ تنور کے اندر شعلوں میں تپش زیادہ ہے یا اس کی چھاتی میں . . . ''

میں مایوسی کی شدت میں خود کو اس قدر بے بس محسوس کر رہا تھا کہ میری پلکیں بھیگ گئیں۔ پھر مجھ پر غنودگی سی چھا گئی۔ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو نہ خواب ہوتی ہے نہ بیداری۔

اچانک مجھے کہیں دور سے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ پھر یہ آواز میرے بہت قریب آ گئی۔ ایک بازو میری گردن کے گرد حمائل ہو گیا۔ مجھے اپنی گود میں جسم کا احساس ہوا، میرے سینے سے کسی کا رخسار لگا . . . مجھے لمس کا بھرپور احساس ہوا۔ دھیمی سی سسکی مجھے اپنے سینے کے قریب سنائی دی . . . میں نے غنودگی میں آنکھیں کھولیں۔ گلنازی . . . میں نے چونک کر پوری آنکھیں کھولیں . . . وہ کہیں بھی تو نہ تھی . . . میں تنہا تھا۔ جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رولوں۔ میرے سینے میں پھر چنگاریاں سی اڑیں . . . یوں لگا جیسے دور بہت دور گلنازی رو رہی ہے، سسکیاں لے رہی ہے . . . میں تڑپ اٹھا۔ ٹوٹے ہوئے مندر کی ہر اینٹ کی مانند مجھے اپنے وجود کے سارے عناصر ٹوٹے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس شکستگی سے میری پلکوں پر آئے ہوئے آنسو میرے رخساروں پر ابھر آنے والی ہڈیوں پر لڑھک گئے اور پھر پچکے ہوئے رخساروں میں اتر گئے۔ میرے ذہن پر بادل سے چھا چکے تھے اور یوں لگتا تھا کہ میرے آنسو باہر کم اور اندر دل کی جانب زیادہ بہہ رہے ہیں . . . پھر یہ بوندا باندی ختم ہوگئی۔

''میں دیوانہ ہو جاؤں گا . . . '' میں نے سوچا۔ ''میں اپنے ہوش و حواس کھو رہا ہوں . . . مجھے سنبھل جانا چاہیے . . . اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیے۔ لیکن کروں بھی تو کیا؟ گلنازی نے پہلی بار مجھے میرے وجود کا سچا احساس دلایا ہے۔ بچپن گزر گیا، لڑکپن بھی تقریباً گزر چکا ہے . . . اب تو میں

نوجوانی کی کیفیتوں سے آشنا ہو رہا ہوں۔ نوجوانی کے اس تیز دھارے میں خود کو تنکے کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ بچپن میں بملا کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ پھر میری دوستی ایک چرواہی اکرو (کرماں بی بی) سے ہوگئی۔ وہ بھی بملا جتنی ہی تھی۔ اتوار کے روز میں صبح سے شام تک اکرو چرواہی کے ساتھ پہاڑیوں میں اس کے ریوڑ چرایا کرتا تھا، جنگلی بیر توڑا کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے گاؤں احمد ال کی بہت سی باتیں بتایا کرتی تھی۔ شام کو میں جب واپس بنگلے میں آتا تھا تو امی کی ڈانٹ میرے استقبال کے لیے دروازے پر موجود ہوتی تھی۔ بملا کو جب میری اس دوستی کی خبر ہوئی تو وہ مجھ سے روٹھ گئی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دوستی کھلونے کی طرح ہوتی ہے جو کوئی لڑکی کسی دوسری لڑکی کو نہیں دینا چاہتی۔ جب ایک دو اتوار میں اکرو کے ساتھ نہ گیا تو وہ بنگلے کے سامنے سڑک کے پار چٹانوں پر آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک اتوار کو میں رہ نہ سکا۔ اکرو کے پاس جانے کے لیے گیٹ کھول ہی رہا تھا کہ پیچھے سے دوڑتی ہوئی بملا آئی اور میرا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی واپس بنگلے میں لے گئی۔ پھر میں نے کبھی اکرو کو چٹانوں پر نہیں دیکھا تھا۔۔۔ بلکسر میں نارو اور میں آوارہ گردی کے ساتھی تھے۔ بلکسر ہی میں مجھے ایک دن ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی — گول چہرے والی، گوری، بہت سیاہ آنکھوں والی۔ ایک دو بار میں نے اسے اور اس نے مجھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے پاس جاتا، وہ خود میرے پاس آ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کمپنی کے بڑھئی کی بیٹی ہے اور اس کا نام زینب ہے۔ بہت جلد زینب سے میری گہری دوستی ہوگئی۔ ہم گھنٹوں اکیلے بیٹھے نہ جانے کیا کیا کھیلتے رہتے تھے۔ ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر نما گھر میں بہت گہری سبز گھاس پر ہم لیٹ جایا کرتے تھے۔ بہت باتیں کیا کرتے تھے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ جب نارو نے زینب سے جھگڑ کر ہاتھا پائی کی، اس کے بال کھینچے تو مجھے پہلی بار رقابت سے آشنائی ہوئی — باہمی رقابت سے۔ زینب جہاں بھی مجھے اکیلا دیکھتی تھی، دوڑ کر آ جایا کرتی تھی۔ نارو اسے گالیاں دیا کرتی تھی۔ لیکن کبھی بھی میرے دل و دماغ میں ایسے جذبات پیدا نہ ہوئے تھے جن سے مجھے گلنازی نے آگہی دی ہے۔ ٹھیک ہے، وہ بچپن تھا، لیکن جھاوریاں جانے سے پہلے کسی لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں یہ کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ میں اسے دوبارہ دیکھوں اور دیکھتا ہی رہوں — شاید اس لیے کہ گلنازی جیسی خوبصورت لڑکی میں نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ جن کیفیات سے میں اب گزر رہا تھا، یہ نوجوانی کے احساسات و جذبات گلنازی سے وابستہ تھے۔ مجھے

اپنے بدن پر گلنازی کا لمس بے حد خوبصورت اور خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ وہ گدگدا سا احساس جس سے میں گلنازی کے بازوؤں میں جکڑے جانے پر آشنا ہوا تھا، مجھے زندگی کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ گلنازی کے رخسار کا لمس میں اپنے رخسار پر ہر رات سونے سے پہلے محسوس کرتا تھا اور اس کے ہونٹوں کے کنارے سے اپنے ہونٹوں کے لگ جانے کا احساس مجھے بے خود کر دیتا تھا...

مندر کے تالاب کی سیڑھیوں پر اکیلا بیٹھا میں اپنی یادوں میں محو ہو کر مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میرے ذہن پر جو بادل چھا گئے تھے، جو بارش میری آنکھوں سے میرے دل پر ہوئی تھی، وہ بادل چھٹ جانے پر، وہ بارش رک جانے پر، ایک دلکش سا منظر ابھر رہا تھا کہ مجھے پھر یوں محسوس ہوا کہ گلنازی رو رہی ہے... سرمئی بادل سیاہی مائل ہو کر پھر چھا گئے اور میں ایک بار پھر مایوسی کی تہہ در تہہ چادروں میں، سیاہ چادروں کے نیچے دبتا چلا گیا... مایوسی کے یہ پردے سیاہ سایوں کی طرح تھے...

54

وہ کپکپاتی صبح بھی آ گئی۔

ہم کوٹ طرے باز خان سے چکوال کے بس اڈے پر پہنچے۔ تلہ گنگ جانے والی بس میں بلکسر کے ٹکٹ خرید کر بیٹھے۔ اس بار بھی امی اور آپا کا ارادہ بلکسر ہی میں رہنے کا تھا۔ میرا اور بہنوں کا ارادہ ایک رات بلکسر میں گزار کر اگلی صبح جھاوریاں جانے کا تھا۔ بھائی کو سارا پروگرام ہم نے ایک ہفتہ پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ ان کا جواب بھی موصول ہو چکا تھا۔ انھوں نے خط میں لکھا تھا کہ چونکہ ہم بدھ کے روز شاہ پور پہنچیں گے، وہ ہمیں لینے نہیں آ پائیں گے۔ گداؤ تانگے کے ساتھ شاہ پور میں موجود ہوگا۔

امی، بڑی آپا، باجی زیبا اور عصمت بلکسر جانے والی بس میں بیٹھی تھیں۔ میں باہر تھا۔ روانگی میں دس منٹ باقی تھے۔

بسوں کے اڈے کے سامنے ایک ہوٹل کے ساتھ والا پلاٹ خالی تھا۔ میری نظریں اس پلاٹ پر رک گئیں۔ ہوٹل کی عقبی دیوار کے پاس ایک ملنگ کھڑا تھا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی سمت متوجہ پا کر وہ تیزی سے ہوٹل کے پیچھے چلا گیا۔

''میر صاحب ٹھیک کہتے تھے۔۔۔'' میرے ذہن سے خیال تیزی سے گزرا۔''ملنگ میرا پیچھا کررہے ہیں۔۔۔ لیکن میں اکیلا سکول جاتا رہا ہوں، تنہا چکوال شہر اور مضافاتی سڑکوں پر گھومتا رہا ہوں، کھیتوں میں، رہٹ پر، مندر میں اکیلا بیٹھا رہا ہوں—وہاں کوئی ملنگ مجھ پر حملہ آور کیوں نہیں ہوا؟''

میں بھی تیزی سے خالی احاطے میں پہنچا۔ ہوٹل کے عقب میں کھیت تھا اور کھیت کے آگے مکانوں کے درمیان ایک تنگ سی گلی تھی۔ ملنگ نے مڑ کر میری سمت دیکھا اور تنگ سی گلی میں گھس گیا۔ میرے کمزور بدن میں سنسنی سی نمودار ہوئی۔

''یہ مارا جائے گا۔۔۔ بہت جلد مارا جائے گا!'' والد صاحب کا جملہ ذہن میں گونج اٹھا۔

''ایسی کی تیسی!'' بہت جلد میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا۔''مجھے ماریں گے؟ ٹھیک ہے، ماریں۔۔۔ اگر میں ڈرپوک ہوتا تو معاشرے کے ان عفریتوں کے خلاف بغاوت ہی نہ کرتا۔''

میں واپس بس کے پاس آیا۔ روانگی میں تین چار منٹ ہی باقی تھے۔ میں بس میں سوار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے ملنگ کا چہرہ تصور میں ابھرتا محسوس ہوا۔ گلی میں جانے سے پہلے اس نے مڑ کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ۔۔۔ ذہن میں ایک کرن سی لہرائی۔۔۔ ایک یاد۔۔۔ میں نے جس ملنگ کو دیکھا تھا اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی نہ تھا—اسے میں پہلے بھی بلکسر میں پیر کوثر شاہ کی ڈھوک کی سمت آتا جاتا کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے کندھے پر بوری سی اٹھا رکھی ہوتی تھی۔ پھر مجھے اچھی طرح سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ ملنگ ایک بار سائیکل پر بوری لادے گزر رہا تھا کہ ایک پتھر سے ٹائر ٹکرانے پر بوری گر گئی اور بھنگ کے سبز پتے باہر بکھر گئے۔ وہ ڈھوک میں بھنگ سپلائی کیا کرتا تھا، شاید اب بھی کرتا ہو۔ کلر کہار میں کثرت سے بھنگ اُگتی ہے اور کلر کہار سے بلکسر کا راستہ چکوال ہی سے ہو کر گزرتا ہے۔

''تو یہ پیر قدرت شاہ کا ملنگ تھا؛'' میں نے سوچا۔''ابھی تک پیر کی بے عزتی کو نہیں بھولا، تبھی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔''

مجھے اطمینان سا ہوا کہ پیر نور شریف کے ملنگ میرے پیچھے چکوال تک نہیں آئے۔ مجھے اپنی فکر نہیں، امی، آپا اور بہنوں کی تھی۔ وہ کرائے کے گھر میں میرے ساتھ رہتی تھیں۔

55

بلکسر میں ایک رات ٹھہر کر اگلی صبح ہم بلکسر کے لاری اڈے پر پہنچ گئے۔

والد صاحب اور کمپنی کی وین کے ڈرائیور ہمارے ساتھ تھے۔ کپکپاتی ہوئی سرد ہوا، صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی... بہنیں وین ہی میں بیٹھی رہیں۔ میں باہر نکلا۔ ہوا اس قدر یخ بستہ تھی کہ جسم میں کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔

''شاید میں بہت کمزور ہو چکا ہوں،'' میں نے سوچا۔ ''والد صاحب بھی میرے لیے کچھ کچھ پریشان لگتے ہیں۔''

اس احساس کے باوجود کہ میں جسمانی طور پر بہت لاغر ہو چکا ہوں، ایک انجانی سی مسرت بھی مجھے اردگرد ہر شے پر نظر آ رہی تھی، جیسے ہر شے میں زندگی ہے اور وہ خوشی کا اظہار کر رہی ہے... گلنازی سے ملنے، اسے ایک نظر دیکھنے کا احساس گلنازی ہی کی طرح خوبصورت تھا۔

لاری اڈے کے چھوٹے سے ہوٹل میں آگ جل رہی تھی جس پر چائے کے لیے بڑی سی کیتلی دھری تھی۔ کیتلی سے مسلسل بھاپ اٹھ رہی تھی۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا ہوٹل والا ایک اور دیگچے میں دودھ ابال رہا تھا۔ اندر لکڑی کی بنچوں پر کچھ مسافر شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں چائے پی رہے تھے۔ کچھ چلم کے کش لگا رہے تھے۔ بڑے بڑے پٹکے باندھے، جسموں کو کمبلوں، دُھسوں اور کھیسوں سے ڈھانپے، وہ مسلسل باتیں کر رہے تھے۔ ہوٹل میں بھاپ اور دھویں کی آمیزش سے ماحول کوزی محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد چکوال سے سرگودھا جانے والی بس آ گئی۔ ہوٹل میں شاید چکوال جانے والے مسافر بیٹھے تھے۔ ہمارے ساتھ صرف ایک مسافر بس پر سوار ہوا۔ سواریاں بس میں بھی کم تھیں۔ اس بار بھی ہمیں آگے کی طرف نشستیں مل گئیں۔ والد صاحب ڈرائیور کے ساتھ واپس چلے گئے۔ میں نے بس کے ڈرائیور کی طرف دیکھا، اس کے بال سفید تھے۔ بس چلی۔ بلکسر کے قریب ہی بکھاریاں کے قصبے سے دو مسافر بس میں بیٹھے۔ دونوں بہت پریشان لگ رہے تھے۔ ایک بہت غصے میں بھی تھا۔

''حرامیاں... میں نہ چھوڑ ساں...'' (حرامیوں کو میں نہیں چھوڑوں گا...) اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہی اتنی زور سے کہا کہ ساری بس میں اس کی آواز سنائی دی ہوگی۔ وہ ہم سے دو نشست پیچھے بیٹھا ہوا

تھا۔ ''اونہاں میندی عزت تے ہتھ پایا اے، میں اونہاں دے ہتھ نک چھوڑ ساں . . . '' (انھوں نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے، میں ان کے ہاتھ کاٹ دوں گا . . .) وہ پھر اونچی آواز میں بولا۔

'' اولائی بکھشا، جھلا نہ تھی، وینے پئے آں تلہ گنگ . . . '' (اوالٰہی بخش، پاگل نہ بن، جا رہے ہیں تلہ گنگ . . .) دوسرے نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اس کی آواز قدرے دھیمی تھی۔

'' کم ہو ویسی، '' (کام بن جائے گا) پہلے نے پھر اونچی آواز میں کہا۔ اسے بس کے مسافروں کی کوئی پروا نہ تھی۔

''ٹمن شریف [67] اچ ملک نور خان [68] نال ملاقات تھی ویسی۔ توں فکر نہ کر۔ ماں احمد خانے دسیا ہا کہ او چھٹی تے آئے ہوے ان . . . '' (ٹمن شریف میں ملک نور خان سے ملاقات ہو جائے گی، تو فکر نہ کر، مجھے احمد خان نے بتایا تھا، وہ چھٹی پر آئے ہوے ہیں۔) پہلا دیہاتی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

'' اصل حرامی سلطان اے . . . '' (اصل حرامی سلطان ہے) وہ پھر غصے سے چیخا۔ '' اصل حرام نی اولاد اے . . . بہوں گندا خون اے۔ بھرا اسکندر بکھشا، اُساں تے میں نہ چھوڑ ساں، کپ چھوڑ ساں . . . '' (اصل حرام کی اولاد ہے۔ اسے تو میں نہیں چھوڑوں گا، کاٹ ڈالوں گا . . .)

'' ٹھیک پیا آہدا ایں . . . '' (ٹھیک کہہ رہے ہو) دوسرے نے کہا۔ '' بہوں حرامی جاگت اے۔ مامے نی دھی بھیین ہونی اے . . . '' (بہت حرامی لڑکا ہے۔ ماموں کی بیٹی بہن ہوتی ہے۔) وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ '' پر کے کریے!'' (پر کیا کریں) اس کی آواز میں بھی غصہ ابھرا اور اونچی ہو گئی۔

'' آدمی جمن تاں ای بھینوں ناں کھسم اے . . . '' (آدمی پیدائش ہی سے بہن کا خصم ہے۔)

ڈرائیور نے سر گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری تھی۔ ان دیہاتیوں کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک دیہاتی نے ان سے کوئی بات کی۔ وہ خاموش ہو گئے۔ ایک دو بار سرگوشیوں میں انھوں نے کوئی بات کی جو سمجھ میں نہ آئی۔ وہ تلہ گنگ تک خاموش ہی رہے۔

'' یہ بھی کوئی لڑکی ہی کا قصہ ہو گا،'' میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوے سوچا۔ '' کیا خبر وہ لڑکی

67۔ ٹمن شریف، تلہ گنگ سے میانوالی جانے والی سڑک پر ایک قصبے کا نام ہے۔

68۔ ایئر مارشل نور خان۔ یہ ایئر فورس کے سربراہ تھے، قصبہ ٹمن شریف کے رہنے والے تھے۔

اپنے پھوپھی زاد سے پیار کرتی ہو۔"

میری سوچ کا رخ بدلا۔"کیا خبر وہ چھپ چھپ کر ملتے ہوں گے ... پتا چل جانے پر برادری میں شور مچ گیا ہوگا۔لڑکی کے باپ کا غصہ بتا رہا ہے کہ اس پر غیرت کا تاریک ترین سایہ اتر چکا ہے۔دونوں گھرانوں میں یقیناً تصادم ہوا ہوگا جس کے نتیجے میں اب لڑکی کا باپ علاقے کی بااثر شخصیت کے پاس مدد لینے، اپنے بھائی کے ساتھ جا رہا ہے ... کیا خبر لڑکی اغوا ہو چکی ہو جسے بازیاب کرانے کے لیے وہ ٹمن شریف جا رہا ہے۔"

بس تلہ گنگ پانچ منٹ کے لیے رکی۔وہ دونوں دیہاتی لاری اڈے پر کھڑی میانوالی جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔بس دوبارہ چلی، میانوالی روڈ پر کچھ دور جا کر سرگودھا کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

"آدمی ابتدا ہی سے بہن کا خصم ہے ..." دیہاتی کا جملہ بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔مشرقِ وسطیٰ سے جو مذاہب نکلے ہیں، ان میں آدم اور حوا کا قصہ موجود ہے۔ہابل اور قائن (قرآن کے ہابیل اور قابیل) دونوں بھائیوں کے درمیان رقابت کا یہ قصہ حسد اور بغض سے متعلق ہے جو ہوس کے نم سے آدم کے خمیر میں موجود ہے۔مذاہب کے اس قصے سے صاف ظاہر ہے کہ تشکیل آدم میں ہوس کا نم شامل کیا گیا ہے۔قائن نے ہابل کو قتل کر دیا تھا، لیکن کسی مذہبی کتاب میں یہ تحریر نہیں ہے کہ قائن کی شادی کس سے ہوئی تھی جس سے آدم کی نسل چلی تھی۔اب یا تو وہ اپنی ماں کے پاس گیا ہوگا یا آدم اور حوا کی کسی بیٹی، اپنی بہن کے پاس ... ماں سے بیاہ تو آدم کی وجہ سے ممکن نہ رہا ہوگا، قائن نے اپنی بہن ہی کو بیاہا ہوگا، کیونکہ اس زمین پر اور کوئی جوڑا تو موجود نہ تھا جس کی اولاد سے قائن کی شادی ہوتی۔دیہاتی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ آدمی پیدائش ہی سے بہن کا خصم ہے ... میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ قدیم زمانے میں شاہی خاندانوں میں بھائیوں کی شادیاں بہنوں سے ہوا کرتی تھیں۔اس کا ثبوت رومن ایمپائر میں ملتا ہے۔میونسپل کمیٹی کی لائبریری میں ایک کتاب قدیم تواریخ سے متعلق بھی تھی جس میں تحریر تھا کہ رومن شہزادے روم کی شہزادیوں، اپنی سگی بہنوں سے ہی شادیاں رچاتے تھے۔بہرحال، مجھے ان روایات سے کیا! میں تو مذاہب کے قصوں کو مانتا ہی نہیں ہوں۔میرے نزدیک تو دنیا کے ہر حصے میں انسانی زندگی ارتقا ہی کا مظہر ہے ورنہ انسانوں میں اتنے

رنگ، گورے کالے، پیلے، سرخ اور چہروں کی اتنی بناوٹیں، آنکھیں، ناک، جبڑے — یہ کسی ایک آدم کی اولاد سے تو ممکن نہیں ہو سکتے۔ قطبین میں پائے جانے والے اسکیمو اور صحرائے کالاہاری افریقہ کے بونے ایک آدم کی اولاد کیسے ہو سکتے ہیں؟ کولمبس نے انتہائی دشواریوں کے بعد بحرِ اوقیانوس عبور کرتے ہوئے جب امریکہ کے ساحل پر ریڈ انڈین دیکھے ہوں گے تو اس نے ایک بار تو ضرور سوچا ہوگا کہ یہ کس آدم کی اولاد ہیں؟ کچھ مذہبی اسکالر یہ استدلال دیتے ہیں کہ طوفانِ نوح نے زمین کو بانٹ دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ طوفان اس قدر شدید تھا کہ پوری زمین اس کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ مشرق تھا کہ مغرب، شمال تھا کہ جنوب، اس کرۂ ارض پر پانی ہی پانی تھا جس پر ایک کشتی تیر رہی تھی۔ پھر پانی اترا تو پانی اور خشکی کے اس بٹوارے میں جو لوگ جدا ہو گئے ہوں گے، وہ بڑے اور چھوٹے جزیروں میں بس گئے ہوں گے... لیکن اس استدلال کی تو مذاہب خود نفی کر دیتے ہیں کہ صرف وہی لوگ بچ پائے تھے جو کشتی پر موجود تھے اور کشتی ایک ہی جگہ چٹانوں پر ٹھہری تھی۔''

بس چینجی کے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ بس قدرے سست رفتار تھی۔ چاشت دوپہر میں بدل رہی تھی اور بس ابھی چینجی کے گاؤں ہی میں پہنچی تھی۔ انجن بھی ریں ریں کرتا چلا جا رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر ہاتھ رکھنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر ہوا کس قدر ٹھنڈی ہے۔ علاقہ بہت اجاڑ نظر آ رہا تھا۔

''اگر بکھاری کے قصبے میں...'' میرے خیالات کی کڑیاں پھر دیہاتیوں سے جا جڑیں۔ ''اگر وہاں لڑکے اور لڑکی کا معاملہ ختم نہ ہوا، باہمی صلح نہ ہوئی، تو خوفناک تصادم ہوگا۔ تضاد اپنا بھیانک روپ دکھائے گا — خونی روپ۔ ایک دو دیہاتی قتل ہو جائیں گے۔ کئی لاشیں گریں گی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا... وہ قوتِ شر جس نے یہ تضاد تشکیل دیا ہے، کشت و خون سے تقویت حاصل کرتی رہے گی۔ جب تک عالمِ انسانیت میں ہابل اور قابیل کی روایت موجود ہے، یہ خونیں سلسلہ چلتا رہے گا...''

مجھے نہ نیند نہ بیداری والی کیفیت میں کہی ہوئی گلنازی کی بات یاد آئی۔ ''گلنازی نے اسی لیے مجھے روکا تھا کہ میں مالا اس کے گلے میں نہ ڈالوں، کیونکہ وہ اس تضاد سے آشنا تھی۔'' لیکن وہ تو ایک تصور تھا، میں اسے بھی حقیقت مان بیٹھا ہوں۔ سڑک کے کنارے اونی چادروں اور کمبلوں میں لپٹے کچھ دیہاتی نظر آئے جو پیدل ہی چلے جا رہے تھے۔ ایک دو بار سڑک کے کنارے بھیڑ بکریاں بھی نظر آئیں۔

''اگر ماسی جیراں کے خاندان والوں کو پتا چل گیا کہ گلنازی محمد اکبر خان سے نہیں، مجھ سے محبت کرتی ہے تو انجام کیا ہوگا؟''

مجھ پر مایوسی سی اتری لیکن تحفظ کا احساس بھی ہوا کہ میں نے ابھی تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس سے میرے اور گلنازی کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو۔ ''ماسی جیراں تو مجھے بیبا پتر کہتی ہے . . . '' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی۔ ''پھر میں نے بھی تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں گلنازی کی لاحاصل خواہش میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا، میں خواہش کی کالی بلا سے گلنازی کو بچاؤں گا . . . پھر میں کسی تضاد سے خوفزدہ کیوں ہوں؟''

بس سڑک پر ہی رک گئی۔ کوئی قصبہ، کوئی گاؤں قریب نہ تھا۔ ایک دیہاتی مرد اور ایک عورت بس میں سوار ہوئے۔ عورت نے چھوٹا سا بچہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ نہ جانے کب سے پیدل چل رہی ہوگی۔ بس پھر رواں ہوئی۔

''اس طرح تو ہم شام کو اندھیرا ہو جانے پر جھاوریاں پہنچیں گے،'' میں نے سوچا۔ ''یہ بس تو نہایت سست رفتار ہے۔''

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے دل میں اس عجلت کا احساس ہوا جو بے چینی سے پیدا ہوتی ہے۔ میں فوراً جھاوریاں پہنچنا چاہتا تھا۔ چند منٹ پہلے والے خیال سرد ہوا میں اڑ چکے تھے۔ میں گلنازی کے لیے بے چین تھا . . . ''وہ کیسی ہوگی؟'' میں نے دور افق کو دیکھا۔ ''کیا میری طرح وہ بھی بہت دبلی ہوگئی ہوگی — دبلی ہو کر تو وہ اور بھی خوبصورت لگتی ہوگی۔ کیا اس کے رخساروں کی ہڈیاں بھی نمایاں ہوگئی ہوں گی؟ کیا اس کی آنکھیں بھی اندر کی سمت تھوڑی سی دھنس چکی ہوں گی؟ کیا اس کی گلابی رنگت بھی کہیں کھو گئی ہوگی؟ کیا میری طرح اس کی آنکھوں کی چمکتی مسکراہٹ بجھ سی گئی ہوگی؟ یہ محبت اور یہ فراق بھی کیا شے ہے — سب کچھ چھین لیتا ہے . . . ''

بس کی رفتار میں کوئی فرق نمایاں نہ ہوا۔ دوپہر کا بھرپور احساس ہو رہا تھا اور ابھی کھچیاں کا قصبہ ہی آیا تھا۔

''میں گلنازی سے ملوں گا تو . . . کیا کہوں گا؟'' میں نے کھڑکی کے باہر تا حدِ نظر اجاڑ بیابان کو دیکھتے ہوئے، مسکراتے ہوئے سوچا۔

''نہیں... جب ہم ملیں گے تو سب سے پہلے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر خوب ہنسیں گے ــ دونوں ہی ہڈیوں کے ڈھانچے بنے ہوں گے... دیر تک ہنسیں گے... منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکلے گا اور ہم ایک دوسرے کو بتادیں گے کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں... اسی کو عشق کہا جاتا ہے... جو حال گلنازی کا ہوگا وہی میرا ہوگا۔''

مجھے پشتو زبان کے کسی کلاسیکی شاعر کا ایک شعر یاد آیا جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے: ''آؤ، سینے سے سینہ ملا کر سو جاتے ہیں، صبح اٹھ کر دیکھیں گے کہ کس کے سینے پر داغ ہے۔'' یعنی کون آتشِ ہجر میں زیادہ جلا ہے یا جلی ہے... اس بار تو میں تھوڑا سا بے شرم ہو جاؤں گا۔ میں گلنازی کو سینے سے لگالوں گا۔ جب وہ کہے گی، چھوڑو، مجھے چھوڑو! تو میں کہوں گا، نئیں چھڈدا (نہیں چھوڑتا)... اس بار میں یہ نہیں چاہوں گا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہیں لے جائے ــ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر نہر کے کنارے پر لے جاؤں گا۔ ہم نہر کے کنارے پر بیٹھ جائیں گے۔ دھوپ ہمارے جسموں کو تمازت کا احساس دلائے گی۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے۔ میں اسے خود پر گزرے ہجر کے ایک ایک لمحے کی روداد سناؤں گا... وہ مجھے اپنی برہا کی باتیں بتائے گی۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر فطرت کے بچوں کی طرح دوڑیں گے... لکن میٹی کھیلیں گے اور میں گھر جا کر باجی زیبا سے کہوں گا: مونچھیں نکل آئی ہیں تو کیا ہوا؟ مجھے بڑا ہونا پسند ہی نہیں ہے۔ پھر جب کھیتوں سے رہٹ کا مالک اور بیل، دونوں چلے جائیں گے تو ہم رہٹ کی سرخ اینٹوں والی منڈیر پر بیٹھ جائیں گے۔ گلنازی مجھے چھیڑے گی... کیا کہے گی؟... وہ، وہ یہ کہے گی کہ میں تو محمد اکبر خان کی منگیتر ہوں۔ وہ آئے گا، مجھے لے جائے گا ــ تم کیا کرو گے؟ میں کہوں گا کہ میں تمھارے منگیتر کو بے حد قیمتی تحفہ دوں گا۔ گلنازی پوچھے گی، کون سا تحفہ؟ میں کہوں گا، میرا تحفہ میری آنکھیں ہوں گی... گلنازی لمبی انگلیوں والے اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے مارے گی اور پھر میری آغوش میں گر جائے گی... اس کا رخسار میری چھاتی سے لگ جائے گا، اس کا بازو میری گردن میں حمائل ہوگا... ہوا کے جھونکے بار بار اس کی زلف کو، اس کے چہرے پر بکھیریں گے اور میں بار بار انھیں اٹھاؤں گا... پھر میں چونک اٹھوں گا۔ گلنازی... میں چونک کر کہوں گا۔ ہم کھیتوں کے درمیان رہٹ پر ہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو... گلنازی اپنی آنکھیں بند کرے گی... آہستہ سے کہے گی، آنے دو، جو بھی آتا ہے، دیکھنے دو

جو بھی دیکھتا ہے۔ ۔ ۔ پورا گاؤں آ کر دیکھ لے کہ میں نے تم سے پیار کیا ہے — سچا پیار۔ ۔ ۔ یہ چھاتی۔ ۔ ۔ یہ چھاتی میری ہے۔ ۔ ۔ اس پر سر رکھ کر سونے کا حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے؟ ماردیں گے ہمیں؟ ماردیں — ایک دوسرے کے بغیر ہم ویسے بھی کون سے زندہ رہ کر جییں گے۔ ۔ ۔''

میں چونکا۔ دور کسی قصبے کے خطوط ابھر رہے تھے — شاید جابہ کے۔

بس کی سست رفتاری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ سہ پہر ہو چکی تھی اور ابھی ہم کٹھہ کالرہ کے پہاڑوں تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ میں نے ڈرائیور کی سمت دیکھا۔ پھر میں نے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

اس قدر اجاڑ بیابان تھا کہ جہاں تک نظر جاتی تھی، سرمائی چمکتی دھوپ اور چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ افق سے افق تک سناٹا سا چھایا ہوا ہے۔ میری نظر پھر ڈرائیور کی سمت گئی — سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔

کٹھہ کالرہ کے پہاڑوں سے پہلے دور دور تک سبز کھیت نظر آئے جن میں چھوٹی چھوٹی ڈھوکیں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کھیتوں میں بارانی گندم کے چھوٹے چھوٹے پودوں میں کثرت سے سرسوں کے پیلے پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ سڑک ان کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں، ورنہ بس ان پھولوں کی خوشبو سے مہک جاتی۔ میں نے تھوڑی سی کھڑکی کھولی۔ ہوا کے پہلے سرد جھونکے میں سرسوں کے پھولوں کی خوشگوار سی مہک محسوس ہوئی۔ میں نے گنگنانا شروع کر دیا — ایک چھوٹی سی نظم میری زبان پر موسیقی میں ڈھل رہی تھی:

گلنازی کو جا کر دوں گا یہ سرسوں کے پھول
وہ دیوانی کیا جانے گی ان پھولوں کا مول
اس کے لیے سب پھول برابر، نرگس ہو یا گلاب
اس کے لیے تو ڈنٹھل اچھے جن سے پکاتی ساگ
دیوانہ تھا میں بھی کتنا، ہو گئی مجھ سے بھول
گلنازی کو جا کر دوں گا یہ سرسوں کے پھول

میں دنیا سے، دنیا کی ہر شے سے بے نیاز سا ہو چلا تھا... بے خودی کی اس کیفیت کو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یقیناً میری آنکھوں میں خمار ہوگا، وہی خمار جو میں گلنازی کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔ بس آگے بڑھتی رہی اور کٹھہ کالرہ کے پہاڑ آ گئے۔

کٹھہ کالرہ کی ایک خطرناک ڈھلوان پر بس نے موڑ کاٹا تو سامنے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ آ گیا۔ ڈرائیور نے زور سے بریک لگائی۔ سب مسافروں نے آگے کی سمت جھٹکا کھایا۔ میرے دونوں ہاتھ اگلی سیٹ پر جا لگے، میرا سر سیٹ سے ٹکرانے سے بچ گیا۔ بہنوں کی سیٹ کے آگے خالی جگہ تھی اور اس سے آگے ڈرائیور کی سیٹ تھی۔ وہ بھی گرتی گرتی سنبھلیں۔ بس کی رفتار تیز نہیں تھی، کسی مسافر کو کوئی چوٹ نہ آئی، لیکن بس کے ٹائر تارکول کی سڑک پر گھسٹتے ہوئے چیخے اور بس ترچھی ہو کر سڑک کے کنارے کنکریٹ کی بنی ہوئی چوڑی اور ڈھائی فٹ اونچی حفاظتی دیوار سے جا لگی... کئی مسافروں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ باجی زیبا نے آہستہ آواز میں تلاوت شروع کر دی۔ بس کی باہر کی سمت کھلنے والا ایک ہی دروازہ کنکریٹ کی دیوار سے لگا ہوا تھا۔ کوئی مسافر نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ اترنے کا راستہ بس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں، جن سے کوئی بچہ ہی بآسانی گزر سکتا تھا۔ صرف ڈرائیور کے پاس والا دروازہ ہی تھا جو دوسری جانب تھا۔ بس بہت پرانی تھی۔ ڈرائیور چرواہے پر برس پڑا، اسے گالیاں دیں۔ سڑک کی ایک سمت سلیٹی رنگے پہاڑ کی دیوار نما ڈھلوان تھی اور دوسری جانب کنکریٹ کی حفاظتی دیوار کے نیچے گہری کھائی سی تھی۔ ریوڑ کو اس تنگ راستے سے ہٹانا بھی آسان نہ تھا۔ کھلی جگہ ایک دو موڑ کاٹنے کے بعد ہی آتی تھی۔ ڈرائیور نے گالیاں دیتے ہوئے، غصے بھری آواز میں چرواہے سے کہا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے، دو موڑ آگے کھلی جگہ پر ریوڑ لے جائے۔ اگرچہ اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر رہتی تھی، کئی کئی گھنٹوں بعد کوئی بس، ٹرک یا کار گزرتی تھی، لیکن خطرہ موجود تھا کہ اگر بلندی سے کوئی کار، ٹرک یا بس آتی تو سیدھی ہماری بس کے پہلو سے ٹکراتی۔ کنڈکٹر نہایت دشواری سے ڈرائیور سیٹ کے ساتھ والے دروازے سے نیچے اترا تاکہ بلندی سے آنے والی کسی بس، ٹرک یا کار کو روک سکے۔ دس منٹ گزر گئے، دوسرے موڑ سے پہلے چرواہا ریوڑ سمیت نظروں سے اوجھل ہو گیا، پندرہ منٹ پر وہ پھر دوسرے موڑ پر نظر آیا جس کے آگے کھلی جگہ تھی۔ ڈرائیور نے بس کی بریکیں کھولیں۔ یوں لگا کہ بس کے زور سے کنکریٹ کی حفاظتی دیوار ٹوٹ جائے

گی، لیکن ڈرائیور نے فوراً ہی بس کو ریورس کیا، بس کو زیادہ پیچھے لے جانا بھی خطرناک تھا، لیکن ڈرائیور کا کوئی پرانا تجربہ کام آیا — ایک دوبار آگے پیچھے ہونے کے بعد بس سڑک پر سیدھی ہوگئی۔ کشادہ سڑک کے کنارے چرواہا ریوڑ کے ساتھ موجود تھا۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر چرواہے کو پھر گالیاں دیں۔ وہ خاموشی سے، کوئی ردِعمل دکھائے بغیر، اپنے ریوڑ کی سمت دیکھتا رہا۔ بس حادثے سے بچ گئی۔

موڑ پر موڑ کاٹنے کے بعد بس اس سیدھی ڈھلوان پر پہنچی جس سے آگے کوئی موڑ نہیں، ہر سمت ہریالی کا سمندر نظر آیا۔ سرگودھا کے کھیتوں میں گندم کے پودے بہت اونچے ہو چکے تھے اور ان کی قطاروں کے درمیان سرسوں کے اکادکا پودوں پر پھول بھی سورج کی ترچھی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ سہ پہر شام میں مدغم ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑی اور کھڑکی کھولی۔ ہوا میں خنکی کم اور نباتات کی خوشبو زیادہ تھی۔ ایک کھیت کے پاس جھاڑیوں پر تتلیاں اڑتی نظر آئیں۔ کچھ رنگ تو نظر آئے، لیکن گزرتی بس میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ جنگلی بیروں کی ہیں یا نہیں۔ گندم کے پودے کمر کمر اونچے تھے۔

شاہ پور کے اڈے پر گداؤ موجود تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مسکرائے بغیر خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت سی نمودار ہوئی اور پھر اس کے چہرے پر المناک سی کیفیت ظاہر ہوئی۔ خلافِ توقع وہ مجھ سے بے دلی سے ملا۔

''کیا بات ہے گداؤ؟'' میں نے کہا ''اداس سے لگ رہے ہو۔''

''اوہ... نہیں... بس نے...'' گداؤ کا لہجہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ ''بس نے بہت دیر کر دی ہے۔ جھاوریاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا جائے گا اور ہوا میں بہت ٹھنڈ ہے۔''

گداؤ نے اپنی طرف سے بات سنبھالنے کی کوشش کی لیکن مجھے بار بار یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جس سے گداؤ دکھی ہے — شاید اس کا کوئی نجی معاملہ ہو ... کہیں پیر نور شریف نے اسے پریشان تو نہیں کیا؟ وہ واقعے کا گواہ ہے۔ گداؤ نے سامان تانگے پر رکھا۔ پچھلی نشست پر بہنوں کے ساتھ تیس پینتیس برس کی دیہاتی عورت بھی بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بدن کو گرم شال سے ڈھانپ رکھا تھا۔ شمالی پنجاب کی نوے فی صد عورتوں کی طرح وہ بہت دلیر اور بے باک لگتی تھی۔ میں، گداؤ اور کوچوان آگے بیٹھ گئے۔ تانگہ جھاوریاں کی طرف رواں ہوا۔ گداؤ نے ٹھیک ہی

کہا تھا، ہوا بہت سرد تھی اور تانگے کی رفتار سے جو جھونکے چہرے اور ہاتھوں سے ٹکراتے ہوئے پھیل رہے تھے، جسم کو کپکپا دینے کے لیے کافی تھے۔ میں نے جیب سے اونی ٹوپی نکالی اور پہن لی۔

باتونی گداؤ بہت خاموش تھا۔ مجھے اس کی خاموشی سے پریشانی محسوس ہو رہی تھی، لیکن یہ سوچ کر کہ یہ شاید اس کی کوئی گھریلو پریشانی ہوگی، میں خاموش رہا... لیکن پیر کا خیال آنے پر میں رہ نہ سکا۔

''گاؤں میں پھر ملنگ تو نہیں آئے گداؤ؟'' میں نے سرگوشی کی تا کہ کوچوان نہ سنے۔ ''تمھیں کسی نے پریشان تو نہیں کیا؟''

''نہیں صاب،'' گداؤ نے اونچی آواز میں کہا، ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

چاچڑاں گزر گیا۔ مجھے شام ہو جانے کا احساس ہمیشہ شام کی آوازوں سے ہوا کرتا تھا جو دن کے ختم ہونے کا اعلان کرتی ہیں، اور ان میں پرندوں کی آوازیں نمایاں رہتی تھیں، لیکن گھوڑے کے سموں کی آواز اور پہیوں کی چرچراہٹ ہی سنائی دے رہی تھی۔ شام ڈھل چکی تھی اور رات میں بدل رہی تھی۔ گداؤ کی خاموشی سے میں گھبرا رہا تھا۔

''رقیہ اور بُوبا تو ٹھیک ہیں؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''انھیں کیا ہونا ہے صاب،'' گداؤ نے کہا۔ ''بھلے چنگے ہیں۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ گداؤ اپنے کسی نجی معاملے سے پریشان ہے اور اس وقت اس سے کچھ پوچھنا عقلمندی نہیں ہوگی۔ کوچوان کبھی کبھی گھوڑے کو ایک ہی چال میں رکھنے کے لیے مخصوص آوازیں بلند کرتا تھا۔ گھوڑا ایک ہی چال میں دوڑ رہا تھا۔ پیچھے بیٹھی ہوئی عورت خاموش تھی، بہنیں خاموش تھیں۔ خاموشی بوجھل سی ہوتی جا رہی تھی، اس تاریکی کی طرح جو گھنے درختوں کے نیچے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پھر مجھے ایک خیال نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ جھاوریاں میں کوئی واقعہ ہوا ضرور ہے، ورنہ گداؤ جیسا باتونی شخص اس طرح خاموش نہ رہتا۔

''جھاوریاں میں سب خیریت تو ہے؟'' میں نے سرگوشی سی کی۔

''خیریت ہی ہے صاب،'' گداؤ نے آہستہ سے جواب دیا اور پھر خاموش ہو گیا۔ رات ہونے کا احساس ہر سمت پھیل چکا تھا جسے ہوا کے سرد جھونکے فروغ دے رہے تھے۔ ہاتھ سن سے ہو رہے تھے جنھیں میں نے کوٹ کی جیبوں میں ڈالا ہوا تھا۔

دیہاتی عورت نے بہنوں سے کوئی بات کی۔ عصمت نے جواب دیا۔ پھر عصمت نے پوچھا کہ وہ کہاں کی ہے؟ تو اس نے بتایا کہ جھاوریاں ہی کی ہے اور اپنی بہن کے گھر خوشاب گئی تھی۔ بہنوں نے گرم شالوں سے سروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مجھے سردی کا احساس ناک اور کانوں پر زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ تانگے کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ کوٹ احمد خان آچکا تھا۔

''بس نے کچھ زیادہ ہی دیر کر دی۔'' کوچوان نے گداؤ کی سمت دیکھا۔

''ہاں ...'' گداؤ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ گداؤ کو بتادوں کہ کٹھہ کالرہ کی پہاڑی ڈھلوان پر ہم ممکنہ حادثے سے بچ کر آئے ہیں، لیکن اس کے چہرے پر غم کا تاثر گہرا سا ہو گیا تھا — مجھ میں اس سے بات کرنے کی ہمت ہی نہ رہی۔

''گلنازی تو اب تنور پر نہیں ہوگی،'' میں نے سوچا۔ ''اس وقت تو ماسی تنور بند کر دیتی ہے۔ شام کو جھاوریاں میں بھی پہاڑ کی سمت سے آنے والی ہواؤں میں بہت خنکی ہوتی ہوگی۔ تنور کے چھپر کے اندر تو ہوا گرم ہوتی ہوگی ... وہ بہت کمزور ہو چکی ہوگی ... بھابھی نے خط میں یہی لکھوایا تھا ... کہیں اسے سردی نہ لگ جائے ...'' سڑک کے کناروں پر لمبے لمبے درختوں کا احساس اب ان کے نیچے اماوس جیسے اندھیرے سے ہو رہا تھا۔ ''گلنازی کو یہ تو پتا چل ہی چکا ہوگا کہ میں جھاوریاں آ رہا ہوں۔'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ ''وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی ... کیا واقعی ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت ہنسیں گے؟ وہ بھی ڈھانچہ، میں بھی ڈھانچہ ... ہم اپنی غیر معمولی محبت کا اور کیا ثبوت دے سکتے ہیں ..''

اماوس کی رات تو نہ تھی لیکن سڑک پر تانگہ کوچوان کے تجربے ہی سے دوڑ رہا تھا — یا شاید گھوڑے کے تجربے کے ساتھ۔ تانگے پر چکوال کے تانگوں کی طرح روشنی دینے والی لالٹینیں نہیں لگی ہوئی تھیں۔ گھوڑا سڑک پر اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے اسے ہر موڑ کا مکمل علم ہو۔ اسے سڑک کا ہر رخ، ہر موڑ اس طرح یاد تھا جیسے پرائمری سکول میں بچوں کو پہاڑے یاد ہوتے ہیں۔

''اتنی رات گئے تو گلنازی ملنے نہیں آسکے گی،'' میں نے سوچا۔ ''چار مہینے ہو گئے ہیں گلنازی کو دیکھے ہوئے، اور اب چار لمحے بھی گزارنے دشوار محسوس ہو رہے ہیں ... آج نہیں تو کل صبح تو وہ ضرور آئے گی، عصمت سے ملنے کے بہانے ... سب کے سامنے ہمیں اپنے جذبات پر بہت قابو رکھنا

ہو گا . . . اس بار تو میں اس سے تنہائی میں ضرور ملوں گا۔ پچھلی بار میں نے اسے بہت دکھ دیا تھا . . . نہیں، اس بار نہیں . . . وہ کتنی خوش ہو گی . . . لیکن یہ خوشی . . . ''

جھاوریاں قریب آ رہا تھا اور مجھے پھر ان خیالات نے گھیر لیا جن سے میں گریز چاہتا تھا۔ یہ خیالات میری خوشی کو روک دیا کرتے تھے — اسے عارضی بھی نہیں رہنے دیتے تھے، معدوم سا کر دیتے تھے، ان سیاہ بادلوں کی طرح جو سورج کی شعاعوں کو روک دیتے ہیں، ڈھانپ لیا کرتے ہیں۔

''کیا میں اپنی اس عارضی خوشی کو روشنی کا نام دے سکتا ہوں؟'' یہ سفاک سوال میرے ذہن میں تاریکی کی طرح داخل ہوا جو دوڑتے تانگے کے آس پاس دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ''میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کے لیے اتنی بے چینی محسوس کی ہے، پہلی بار کسی کے لیے اتنا تڑپا ہوں . . . میرا گلنازی سے کوئی تعلق ممکن ہو یا نہ ہو . . . اس نے مجھے نوجوانی کے ان جذبات سے آشنائی تو دے ہی دی ہے جو میرے ادراک میں نہ تھے اور نہ ہی مجھے ان کے اکتساب کا پہلے کبھی موقع ملا تھا . . . اُس نے مجھے وہ خوشی دی جس سے میں نا آشنا تھا — چاہے جانے کی خوشی، جو شاید اس دنیا کی تمام مسرتوں سے بڑھ کر ہے . . . ''

میرے خیالات میں لفظ ناممکن کی تلخی جس بند کو باندھ رہی تھی، مجھے وہ بھی عارضی محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا اسے خوش ہونے کا بھی حق نہیں؟ کیا میں اسے چاہے جانے کے احساس سے ملنے والی خوشی سے بھی محروم کر دوں؟ کیا میں اس سے یہ حق بھی چھین لوں؟ میں نے پہلے بھی اسے بہت ستایا تھا۔ کیا میں اتنا برا ہوں کہ اسے پھر دکھوں کے بھنور میں اکیلے تنکے کی طرح چھوڑ دوں؟ وہ دل کی گہرائیوں سے میری منتظر ہو گی۔ مجھے اب یہاں جتنے دن بھی رہنا ہے، میں اسے خوشی سے سرشار کر دوں گا۔ میں اپنی محبت کا ہر ممکن اور خوبصورت اظہار کروں گا . . . میں اس سے اس کی محبت سے کئی گنا محبت کروں گا . . . مجھے یہی خوف ہے نا کہ ہم بہک کر حسیاتی زندگی میں قدم نہ رکھ دیں؟ میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں کہ خود کو اور اسے روک نہ سکوں۔ ہاں، اس بار میں کسی کی پروا کیے بغیر اسے نہر پر، کھیتوں میں، ہر جگہ لے جاؤں گا۔ میں اسے کہوں گا کہ میں نے اسے بہت یاد کیا ہے، اس کے بغیر بہت اداس رہا ہوں، بہت تڑپا ہوں . . . میری بھوک مر گئی ہے، مجھے نیند نہیں آتی . . . میرے دوست مجھ سے پوچھتے رہے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں تو انھیں کچھ بتا بھی نہیں پایا . . . وہ بھی مجھے اپنے پر گزری ہر ساعت سے متعلق بتائے گی کہ اس نے چار مہینے کیسے گزارے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت

ناراض ہوگی کہ میں اس سے اتنی گہری محبت کے باوجود اس سے بھاگتا کیوں رہا ہوں... اس کے اس سوال کا میں کیا جواب دوں گا؟ میں تو وہ جواب دینا ہی نہیں چاہتا جو کڑوے سچ کی طرح، میرے دل میں خلش سی بن جاتا ہے۔''

مجھے پتا بھی نہ چلا اور جھاوریاں آ گیا۔ دیہاتی عورت لاری اڈے پر اتر گئی۔ بہت اندھیرا تھا— رات کے وقت اکیلی وہ کہاں جائے گی؟ نہ بہنوں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ شمالی پنجاب کی عورتیں مردوں سے زیادہ بے باک اور دلیر ہیں، یہ بات میں بچپن سے جانتا ہوں۔ تانگہ گھر کی سمت مڑا۔ میرا اندازہ درست تھا، گھروں میں ہر سمت لالٹینیں بجھ چکی تھیں، پھر بھی گلنازی کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اینٹوں کی بیرونی دیوار سے گزر کر، صحن سے گزر کر، برآمدے سے گزر کر، اندرونی کمرے کی دیوار سے گزر کر، میری نظر لحاف میں دبکی ہوئی گلنازی تک پہنچ گئی ہے... میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گلنازی بھی مجھے تانگے میں بیٹھا دیکھ رہی ہے اور اس کے سامنے میری آنکھیں یوں چمک چمک جاتی ہیں جو کسی سے ملنے کی امید پر اپنا احساس جگنو کی طرح دلایا کرتی ہیں۔

''اس نے اس وقت سڑک سے تانگے کے گزرنے کی آواز تو سن لی ہوگی۔'' میں مسکرایا۔

تانگہ گھر کے سامنے رکا۔ تانگہ رکتے ہی بشیر نعل بند کی دکان کا دروازہ کھلا۔ وہ بھاگ کر تانگے کے پاس آیا۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ ''او پائی، او تیری خیر ہو!'' بشیر نعل بند مجھ سے گلے ملا۔ ''بڑا انتظار کرایا ہے تو نے — لیایا (لایا) ہے میری چیز؟''

''بشیر...'' میں نے آہستہ سے کہا، ''تجھے لاہور جانا ہی پڑے گا۔ سیلوں والا ریڈیو چکوال میں بھی نہیں ملا۔'' چکوال میں بھی ٹرانزسٹر ریڈیو نہیں ملا تھا۔

''اوئے فیر کی ہویا! نئیں سی گاتے نہ سہی (پھر کیا ہوا، نہیں تھا تو نہ سہی)، چلا جاؤں گا لاہور، لے آؤں گا و نتری دے کو۔''

کچھ دیر بعد ہم گھر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کمرے میں کوئلوں والی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ رقیہ اور بوبا کہیں نظر نہ آئے۔ ''بھابھی،'' میں نے پوچھا۔ ''بوبا اور رقیہ کہاں ہیں؟''

''وہ آج شام ہی اپنے بھائی کے گھر گئی ہے۔'' بھابھی نے میری طرف غور سے دیکھا۔ ''کل صبح

آ جائیں گے دونوں۔ بوبا بہت شرارتی ہو گیا ہے — اسی نے ضد کی تھی کہ ماموں کے گھر جانا ہے۔''

بھابھی خاموش سی ہو کر، دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہیں . . . ساتھ ساتھ وہ بہنوں سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

پھر کھانا دستر خوان پر لگا دیا گیا۔ کھانا کھلانے کا فرض گداؤ ادا کر رہا تھا۔ بھابھی بار بار میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ بھائی بھی بار بار میری طرف دیکھ رہے تھے، لیکن خاموش تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے چہرے پر نظر آنے والی ہڈیوں کی سمت دیکھ رہے ہیں۔

''تمھیں کیا ہو گیا ہے؟'' بھابھی رہ نہ سکیں۔ ''یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ تمھارے چہرے پر تو ہڈیاں دکھائی دے رہی ہیں — رنگ بھی پھیکا پڑ گیا ہے۔''

''اسے بھوک نہیں لگتی،'' عصمت نے کہا۔ ''بہت کم کھانا کھاتا ہے۔''

''کیوں؟'' بھابھی پریشان سی تھیں۔

''امی اسے بلکسر لے گئی تھیں۔ وہاں لیڈی ڈاکٹر رضیہ نے اسے چیک کیا تھا۔ خون کا چیک اپ راولپنڈی سے ہوا تھا۔ ڈاکٹر رضیہ کہہ رہی تھیں کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ اس عمر میں لڑکے اکثر دبلے ہو جاتے ہیں۔''

بھابھی یہ سن کر بھی میری طرف مسلسل دیکھتی جا رہی تھیں — میں گھبرا گیا۔

دوسرے کمرے میں بستر بچھے تھے۔ میں ہاتھ منھ دھو کر، دانت صاف کر کے، لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ تمام خیالات کچھ دیر بعد ہی خواب آلود سے ہو گئے۔ میری نیم وا آنکھیں کمرے کے اندھیرے میں چھت کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

''گلنازی کیا کر رہی ہو گی؟'' میں نے دھیمی دھیمی غنودگی میں خود سے سوال کیا۔ ''کیا اسے بھی چار مہینے نیند نہیں آئی ہو گی؟ کیا وہ بھی میری طرح ٹھیک سے نہیں سو سکی ہو گی؟ . . . اسے معلوم تو ہو گیا ہو گا کہ میں آ گیا ہوں۔ معلوم کیوں نہ ہو گا؟ اس نے اتنی رات گئے تانگے کے گزرنے کی آواز تو ضرور سنی ہو گی . . . کیا وہ بھی میری طرح بے چین ہو گی؟''

غنودگی بڑھتی گئی اور پھر مجھے جسم میں تھکن کا احساس ہوا اور پھر مجھ پر نیند نے اپنا لحاف بھی ڈال دیا۔

56

عصمت کی آواز نے مجھے جگایا۔

''اٹھو، ناشتہ کرلو۔'' وہ ایک دوبار آوازیں دے کر چلی گئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں گلنازی کے ساتھ کھیتوں کے درمیان رہٹ پر بیٹھا ہوں۔ سرمائی دھوپ میں رہٹ کی سرخ اینٹوں والی منڈیر، پگڈنڈیاں، کھیتوں میں گندم کے پودے اور ان کے خوشے سبھی چمک رہے ہیں۔ ہر سمت وہ ڈریگن فلائیز اُڑ رہی ہیں جنھیں میں بچپن میں ہیلی کاپٹر کہا کرتا تھا۔ گلنازی کا چہرہ گلابی سے سرخ سا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھی مجھے اپنی بے حد خوبصورت آنکھوں کی لمبی لمبی پلکوں سے، بار بار دیکھتی ہے، اور پھر نظریں جھکا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں وہی مسکراتی ہوئی چمک ہے جسے دیکھ کر میں بے خود سا ہو جایا کرتا تھا۔

''گلنازی،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''جی،'' بے حد خوبصورت اور سریلی آواز کے ساتھ گلنازی نے میری طرف دیکھا۔

''تم اتنا اچھا گاتی ہو، مجھے ماہیا سناؤ،'' میں نے کہا اور گلنازی نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔

''میں کیوں سناؤں؟'' اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکی۔ ''اب تمھاری باری ہے۔''

''میں نے کل آتے ہوئے بس میں ایک نظم کہی تھی،'' میں نے کہا۔ ''گیت سمجھ لو۔ وہی سنا دیتا ہوں۔''

میں نے گلنازی کو سرسوں کے پھولوں والی نظم گا کر سنانی شروع کی، جب میں ان مصرعوں پر پہنچا کہ:

اس کے لیے سب پھول برابر نرگس ہو یا گلاب
اس کے لیے تو ڈنٹھل اچھے جن سے پکاتی ساگ

تو گلنازی نے مجھے اپنی لمبی لمبی انگلیوں والے خوبصورت ہاتھوں سے مارنا شروع کر دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟'' گلنازی نے کہا۔ ''مجھے پھولوں کی پہچان نہیں ہے؟ پہچان نہ ہوتی تو تم سے پیار ہی کیوں کرتی۔''

گلنازی میرے قریب ہوگئی۔ اس کا کندھا، میرے کندھے سے جڑ گیا۔

''پھول تو مرجھا جایا کرتے ہیں گلنازی،'' میں نے کہا۔

''میرا پھول کبھی نہیں مرجھائے گا،'' گلنازی نے کہا۔ ''یہ میرے دل میں مہک رہا ہے۔''

''فرض کرو کہ پھول کسی وجہ سے مرجھانے لگا تو کیا کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔

گلنازی نے میری طرف چہرہ گھما کر دیکھا۔ کچھ دیر کے لیے اس کے چہرے پر اداسی سی چھا گئی۔ سرمائی دھوپ میں ہوا کے جھونکے خنک تھے۔

''میں اپنے آنسوؤں سے دل پر اتنی بارش کروں گی کہ پھول پھر کھل اٹھے گا۔'' گلنازی نے سر ترچھا کرتے ہوئے میرے کندھے پر رکھ دیا، اس کی زلف ماتھے سے نیچے گری اور رخسار پر خم کھا گئی۔

''آنسو خشک بھی تو ہو جاتے ہیں،'' میں نے کہا۔ ''آنکھیں پتھرا بھی تو جاتی ہیں۔''

گلنازی نے میرے کندھے سے سر اٹھایا، ترچھی سی ہو کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔

''اگر ایسا وقت آیا،'' گلنازی نے اداس آواز میں کہا، ''اگر میرا پھول مرجھانے لگا... تو پھول کے مرجھانے سے پہلے... میں مرجاؤں گی۔''

میں نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گلنازی کے بائیں رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔ گلنازی کھلکھلا کر ہنسی اور میرے ہاتھ کو پکڑ کر ہونٹوں سے لگالیا، اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔

''ناشتہ کرنا ہے کہ نہیں؟'' عصمت کی آواز پر میں چونکا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر ہونٹوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔

57

ناشتے کے بعد میں گھر سے نکلا، یہ سوچ کر کہ چاشت کے وقت ہی گلنازی آئے گی، اس وقت مجھے گھر پر ہی رہنا چاہیے، اس سے پہلے میں میر صاحب سے کیوں نہ مل آؤں۔ وہ صبح ساڑھے سات بجے ہی ڈسپنسری کھول دیتے ہیں۔ میں کچی سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ بشیر نعل بند میرے سامنے آ گیا۔

''اوئے تیں کی حال بنالیا وا؟'' (او تو نے کیا حال بنا لیا ہے؟) اس نے میرے چہرے کی

طرف غور سے دیکھا۔

''وہ بشیر . . . ''میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''میں بیمار ہو گیا تھا۔''

''کیا ہوا تھا؟''بشیر نے پھر میری آنکھوں کی سمت دیکھا۔

''ہر شام کو بخار ہو جاتا تھا،''میں نے پھر جھوٹ بولا۔ ''اترتا ہی نہیں تھا۔''

''یہ تو آنتوں کی بیماری ہے،''بشیر نے فوراً فیصلہ دیا۔ ''ایک بار رجو کو بھی ٹائی فائی ہو گیا تھا۔'' مجھے ہنسی سی آئی لیکن میں نے اس پر قابو پالیا۔ ''بڑی خطرناک بیماری ہے۔ شکر ہے تیرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔''

''آج کل بہت اچھی دوائیاں مل جاتی ہیں،''میں نے کہا۔ ''ٹائیفائڈ کا بھی علاج ہو جاتا ہے۔''

''ہاں پائی، دنیا او نتری دی بہت اگے نکل گئی ہے، پر تیں سویرے سویرے کدھر جا رہا ہے؟''

''وہ میر صاحب،''میں نے کہا۔ ''ان سے ملنے جا رہا ہوں۔''

''جا شابا!'' (شاباش) بشیر نے کہا،''بڑوں کو سلام کرنا اچھا ہوتا ہے۔ بڑے بھلے مانس ہیں ڈاکٹر جی۔ تو کوئی دوائی بھی پوچھ لینا—ہڈو (ہڈیوں والا) بن گیا ہے۔''

ہوا کے جھونکوں میں خنکی تھی۔ سورج طلوع تو ہو چکا تھا، لیکن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ صبح کا مکمل تاثر بادلوں نے زائل کر دیا تھا۔ میں میدان سے گزرا، پرائمری سکول کے گیٹ کے سامنے سے گزرا، بازار والی گلی میں داخل ہوا۔ کم روشنی کے باوجود بازار مکمل طور پر کھل چکا تھا۔ میر صاحب ڈسپنسری میں اکیلے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی، سر پر پھندنے والی گرم ٹوپی تھی . . . وہ ڈاکٹر کم اور سکول ماسٹر زیادہ لگ رہے تھے۔

''ارے آپ!'' مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھے۔ ''بہت انتظار . . . ''انھوں نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ''آپ کے بھیا نے بتایا تھا کہ آپ سردیوں کی چھٹیوں میں آ رہے ہیں۔''

میں ڈسپنسری میں داخل ہوا اور میر صاحب کی سامنے والی بنچ پر بیٹھ گیا۔ میر صاحب کے چہرے پر تشویش سی ابھر آئی۔

مجھے اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی—جو بھی مجھے دیکھتا تھا اسے میرے چہرے کی ہڈیاں پریشان سا کر دیتی تھیں۔

''صاحبزادے،'' میر صاحب نے کہا۔ ''کیا ہوا؟ آپ تو خاصے لاغر ہو چکے ہیں۔ رنگ بھی پھیکا پڑ گیا ہے۔ کیا ہوا؟ کیا بیمار ہو گئے تھے؟''

''نہیں سر،'' میں نے کہا۔ ''بیمار تو نہیں ہوا... مجھے بھوک نہیں لگتی، کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔''

''اے لو!'' میر صاحب نے فوراً کہا، ''صاحبزادے، آپ کے خون میں آئرن کی کمی ہے۔ آپ فکر نہ کریں، دو ایک روز میں ہم سرگودھا دوائیاں لینے جائیں گے، آپ کے لیے آئرن سیرپ لے آئیں گے۔ بھوک بھی چمک اٹھے گی اور دنوں میں یہ...'' انھوں نے پھر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''یہ ہڈیاں بھی غائب ہو جائیں گی۔''

میر صاحب کچھ دیر خاموش رہے، انھوں نے ایک ڈائری پر کچھ لکھا، شاید آئرن سیرپ ہی لکھا ہوگا... پھر وہ یک لخت چونک سے گئے۔ انھوں نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

''کیا کہا آپ نے؟'' ان کی نگاہیں گہری سی ہو گئیں۔ ''بھوک نہیں لگتی؟''

''جی سر،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

میر صاحب کے چہرے پر اچانک اداسی سی چھا گئی۔ وہ مسلسل میری سمت دیکھ رہے تھے۔

''بھوک نہیں لگتی...'' میر صاحب نے اس طرح کہا، جیسے خود سے بات کر رہے ہوں۔ پھر انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ''لیکن وہ تو...''

میر صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ پھر انھوں نے سامنے میز پر پڑے سٹیتھوسکوپ کو انگلیوں سے چھیڑنا شروع کر دیا۔

''آپ کچھ کہنے لگے تھے،'' میں نے پوچھا۔

''نہیں... وہ...'' میر صاحب نے جواب دیا۔ ''ہمیں ایک اعصاب مضبوط کرنے کی دوائی یاد آ ئی تھی، لیکن آپ کو شاید اس عمر میں اعصاب مضبوط کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ایک دیہاتی ڈسپنسری کی سیڑھیوں پر قدم رکھ چکا تھا۔

''ارے خادم میاں،'' میر صاحب نے اسے دیکھتے ہی کہا، ''کھانسی کو آرام آیا کہ نہیں؟''

''سر، میں جاؤں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں ہاں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''شام کو ہسپتال میں ملیں گے۔''

میں میر صاحب کی ڈسپنسری سے نکلا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میر صاحب کچھ کہنے لگے تھے، کہہ نہیں پائے۔ ''میری بھوک... میر صاحب میری طرف اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے تھے؟ کیا گلنازی بہت لاغر ہو چکی ہے؟'' مجھے ایک بار پھر اداسی اپنے وجود پر محیط محسوس ہوئی۔ ''میں گلنازی سے کہوں گا کہ اگر دس دنوں میں وہ دوبارہ پہلے جیسی نہ ہوئی تو میں اس سے روٹھ جاؤں گا،'' میں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ ''اور اگر یہی بات اس نے مجھ سے کہی تو؟''

میں میدان میں پرائمری سکول کے سامنے تھا کہ مجھے میدان کی دوسری طرف دو لڑکیاں نظر آئیں۔ میں ٹھٹکا۔ وہ کچی سڑک سے میدان میں داخل ہوئیں — وہ زبیدہ اور شریفاں کٹی تھیں۔

''یہ صبح صبح تنور کی طرف سے کیوں آ رہی ہیں؟'' میں نے سوچا۔ ''ماسی جیراں نے ابھی تنور میں لکڑیاں بھی نہیں ڈالی ہوں گی، اور ان کے ہاتھوں میں چنگیریں بھی نہیں ہیں۔''

وہ سیدھی میری طرف ہی آ رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے انھیں پہلے سے علم تھا کہ میں جھاوریاں آ گیا ہوں اور صبح صبح میر صاحب کی طرف گیا ہوں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے سوچا۔ ''یہ محض ایک اتفاق ہے... بہر حال، مجھے کیا!''

میں نے پرائمری سکول کی دیوار کی سمت کھسکنا شروع کر دیا، وہ بھی میری سمت ہی آئیں۔ بشیر نعل بند کی دکان کے سامنے آ کر وہ پرائمری سکول کی دیوار کے پاس اس انداز سے آئیں کہ اب میرے لیے ان سے بچنا مشکل تھا۔ اچانک ہی انھوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ ہنسی سے بے قابو ہو کر وہ آگے کی سمت جھک جھک جاتی تھیں۔

وہ بہت خوش تھیں... میں پریشان سا ہو گیا۔ میرے بائیں ہاتھ سکول کی دیوار تھی، وہ دائیں جانب سے ہنستی ہوئی آ رہی تھیں۔ جب وہ میرے اتنا قریب آ گئیں کہ ان کی آواز مجھ تک پہنچ جائے، زبیدہ نے اپنی سرمہ زدہ آنکھوں سے ہنستے ہوئے میری سمت دیکھا۔

''ہائی شریفاں، گلنازی تے اِتھایوں اے، تنورے تے کون اے؟'' (اے ری شریفاں، گلنازی تو یہاں ہے، تنور پہ کون ہے؟'' دونوں نے قہقہہ لگایا، وہ میرے اور قریب آ گئیں۔ دونوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''ہائے نی بیداں! بیبا پتر...'' شریفاں نے اڑینگتی ہوئی آواز میں کہا، ''شودے نی ہرنی

چیتے پھدلئی... ''(ہائے ری زبیدہ — اچھا بیٹا! بے چارے کی ہرنی تو چیتے نے پکڑ لی ہے۔)

مجھے یوں لگا جیسے کسی قوت نے مجھے یوں روکا ہے جیسے میں کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔

''ہرنی نئیں شریفاں! بلبل... شکرے چالئی... ''(ہرنی نہیں شریفاں، بلبل، شکرے نے اٹھالی ہے!)

وہ ہنستی ہوئی میرے قریب سے گزر گئیں۔ گزرتے ہوئے دونوں نے میری سمت عیارانہ انداز سے دیکھا... زہریلے تیر میرے دل میں پیوست ہو چکے تھے۔

''گلنازی... '' مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ میدان میں صبح کی دھوپ سیاہ سی ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے میرا گلا دبا دیا ہے اور میں بول نہیں سکتا... ''کیا ہوا گلنازی کو؟'' اندیشہ کسی آندھی میں اڑتی خاردار جھاڑی کی طرح تھا جس نے اپنے غیر مرئی کانٹوں سے میری روح کو چھلنی کر دیا تھا۔ میں دو چار قدم آگے کی سمت بھاگا۔ میرا ارادہ تنور کی سمت جانے کا تھا، لیکن میں رک گیا — تنور پر اس وقت کوئی نہ ہوگا۔ رقیہ بوبے کے ساتھ بھائی کے گھر کیوں گئی ہوئی ہے؟ سب بار بار میری سمت کیوں دیکھتے ہیں؟ گداؤ کل سے اداس سا، غمزدہ سا کیوں ہے؟ میر صاحب پریشان کیوں تھے؟ ''کیا ہوا میری گلنازی کو؟'' تنور پر کسی کے نہ ہونے کے احساس نے میرے قدم تو روک دیے، لیکن دل کو نہ روک سکا۔ میں پھر بھاگا۔ میرے دل میں شدید خواہش تھی کہ دوڑ کر ماسی جیراں کے گھر جاؤں... اس وقت... میں پھر رک گیا، میرا دل ڈوب رہا تھا۔ چیتا ہرنی پکڑ کر لے گیا... بلبل شکرے نے اٹھالی... میری چیخ میرے حلق میں پھنس گئی۔ پل بھر ہی میں تاریک اندیشوں نے میرے دماغ کو ماؤف کر دیا۔ بس ایک خیال ہی دل میں رہ گیا — بھابھی... مجھے یوں لگا جیسے ہر سمت اندھیرا ہے یا میری بینائی ختم ہو گئی ہے۔ میری چیخ پھر حلق میں اٹک گئی۔ میں گھر کی طرف یوں بھاگ رہا تھا جیسے کوئی اندھیرے میں بھاگ رہا ہو۔ میں نے سڑک پار کی، بیرونی دروازے تک اندازے سے گیا، زور سے پٹ کھولا — بینائی کچھ کچھ بحال ہوئی۔ بھابھی اور بہنیں کمرے ہی میں تھیں — مجھے اس طرح وحشت زدہ دیکھ کر وہ گھبرا گئیں۔

''کیا ہوا؟'' عصمت نے گھبرا کر پوچھا، ''اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کیا ہوا؟''

''وہ... '' میرے الفاظ میرے گلے میں گھٹ سے رہے تھے۔ ''وہ میں... '' میں نے

خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''وہ... میں میر صاحب سے مل کر آ رہا تھا...'' میں نے اپنی سانس سینے میں رکی ہوئی محسوس کی۔ ''دو لڑکیاں... کٹی...''

''کون کٹی؟ دو لڑکیاں...'' بھابھی نے پریشان سی ہو کر کہا۔

''وہ بھابھی...'' میں نے بمشکل کہا۔ ''دو لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں... گلنازی...؟''

بھابھی اور بہنوں کے چہروں کے رنگ بدل سے گئے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

''میں ٹھیک کہتی تھی نا،'' عصمت نے کہا اور بھابھی نے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر المناک سی کیفیت نمایاں ہوئی۔ ''تمھاری لکن میٹی کی شادی ہو گئی ہے،'' بھابھی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' مجھے یوں لگا جیسے سارا کمرہ اماوس کی رات کی مانند تاریک ہو گیا ہے... ہر سمت سناٹا چھا گیا ہے۔ بھابھی کیا کہہ رہی تھیں، بہنیں کیا کہہ رہی تھیں، مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا، سماعت ہی ختم ہو چکی تھی۔ پھر میرے سینے سے ٹیس سی اٹھی، یوں لگا جیسے کسی نے میری چھاتی میں خنجر گھونپ دیا ہو۔

''اتنی چھوٹی عمر میں...'' عصمت کی آواز کہیں دور سے آئی۔

''نکاح ہوا ہے...'' بھابھی کی آواز بھی کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

کس سے ہوا ہے نکاح؟'' باجی زیبا کی آواز بھی نزدیک نہ تھی۔

''ماسی جیراں کے بھتیجے محمد اکبر خان سے،'' بھابھی کی آواز کچھ صاف سنائی دی۔ ''نکاح ہوا ہے، رخصتی دو سال بعد ہو گی۔''

''وہی جو گلنازی کا...'' باجی زیبا کی آواز بھی قریب آتی محسوس ہوئی۔

''ہاں،'' بھابھی نے باجی کی بات کاٹ دی۔ ''منگیتر تھی اس کی۔ چھٹی پر آیا تھا، ماسی جیراں اور اس کے بھائی نے مل کر نکاح کر دیا۔ میں شریک ہوئی تھی رسم میں۔''

''پھر بھی بھابھی...'' عصمت نے کہا، ''اتنی جلدی... کیا پرابلم تھی ماسی جیراں کو؟''

''یہ دیہاتی لوگ،'' بھابھی نے کہا، ''ایسی حرکتیں کرتے ہی رہتے ہیں، لڑکی لڑکے کو باندھنے کے لیے...''

''کیا ان لوگوں کو اپنی بیٹیوں پر اعتبار نہیں ہوتا؟'' باجی زیبا نے کہا۔ ''دراصل یہ لوگ دین

سے دور ہو گئے ہیں — نہ دوپٹہ... نماز... کلمہ... تعلیم... قرآن... تربیت..."

پتا نہیں باجی زیبا کیا کہہ رہی تھیں — مجھے کوئی لفظ سنائی دیتا تھا، کوئی نہیں... بھائی بھی کمرے میں آ گئے۔ میں اٹھ کر برآمدے میں آ گیا، پھر نادانستہ طور پر میں نے خود کو سیڑھیوں پر... اس سیڑھی پر بیٹھا پایا جہاں گلنازی نے مجھے پیچھے سے آ کر بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے میرے چہرے کو مس کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مجھے پشت پر سرد لہر سی محسوس ہوئی... جھرجھری سی آئی۔

"یہ کیا ہو گیا؟" سناٹے میں مجھے اپنی ہی آواز سنائی دی، دھیمی سی آواز... افق پر کچھ سفید بادل برفانی چوٹیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ "میں نے یہ تو نہ چاہا تھا۔" تاریک سائے میرے آس پاس تہہ در تہہ اتر رہے تھے... "میری اور گلنازی کی چاہت ماسی جیراں نے گلنازی کو دیکھ دیکھ کر جان لی ہوگی... لیکن وہ تو پہلے ہی سے جانتی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ گلنازی کی کیا حالت ہوئی ہوگی... میری خاطر... اس پر کیا گزری ہوگی..." مجھے اپنی آنکھیں پتھرائی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"صاب جی..." مجھے پتا بھی نہ چلا، گداؤ میرے سامنے سیڑھی پر موجود تھا۔ چہرے کی مانند اس کی آواز میں بھی غم تھا۔

میں نے گداؤ کی سمت دیکھا۔ میری سنگ آلود آنکھیں خالی خالی سی تھیں۔ مجھ میں کوئی احساس، کوئی کیفیت باقی نہ تھی... میں خود کو ایک تاریک خلا میں محسوس کر رہا تھا۔ گداؤ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ وہ مجھے کھینچ کر برآمدے تک لایا۔

"خود کو سنبھالیں صاب،" گداؤ نے کہا، "اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

گداؤ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔

"ناشتے میں انڈا بھی ہے، اچار بھی،" بھابھی نے کہا، "پراٹھے کے ساتھ کیا لو گے؟"

"چائے،" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے کہا ہے نا،" عصمت نے کہا۔ "اس کی بھوک مر چکی ہے۔"

"دولھے کی عمر کتنی ہوگی؟" باجی زیبا نے پوچھا اور عصمت نے ان کی طرف ناگواری سے دیکھا۔

"بیس اکیس برس کا ہوگا،" بھابھی نے کہا۔ "گلنازی سے چار پانچ سال بڑا۔"

''یہ تو کوئی زیادہ فرق نہیں ہے،'' باجی زیبا نے کہا۔
''آج کل کسی ملٹری اکیڈمی میں ہے،'' بھابھی نے کہا۔ ''میٹرک پاس ہے فرسٹ ڈویژن میں۔''
''یہ زیادتی ہے،'' عصمت نے کہا۔ ''سولہ برس کی عمر سے بھی پہلے نکاح کے بندھن میں باندھ دینا... سراسر زیادتی ہے۔''
''کیسا ہے گلنازی کا دولھا؟'' باجی زیبا نے کہا اور عصمت نے پھر ان کی طرف ناگواری سے دیکھ کر میری سمت دیکھا۔
''اچھا ہے،'' بھابھی نے کہا۔ ''سانولے رنگ کا، خوبصورت بھی نہیں اور بدصورت بھی نہیں... اچھے قد کاٹھ والا ہے۔ چوڑے کندھے، لمبا قد — شکل ہی سے فوجی لگتا ہے۔''
کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔ کوئلوں کے جلنے کی مخصوص بو میں چائے کی مہک شامل ہو رہی تھی۔ بھائی ابھی تک خاموش بیٹھے تھے۔ انھوں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے باجی زیبا کی طرف دیکھا۔
''ٹھیک ٹھاک سیانا لگتا ہے،'' انھوں نے کہا۔ ''میٹرک پاس ہے، فرسٹ ڈویژن میں۔ اچھی گفتگو کر لیتا ہے۔ ملٹری اکیڈمی میں ہے۔ محنتی اور ذہین ہے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ ہو کر نکلے گا، پھر آگے ساری عمر پڑی ہے۔ میجر جنرل تک نہ بھی پہنچا تو بھی بریگیڈیئر کے رینک تک تو ضرور جائے گا۔ خاصا شریف لگتا ہے۔''
''گلنازی کی تو قسمت کھل گئی،'' باجی زیبا نے پھر کہا اور عصمت نے اس بار ان کی طرف غصے سے دیکھا۔
''قسمت تو کھل گئی ہے لیکن...'' بھابھی نے کہا، ''ایک بات مجھے چبھ رہی ہے... گلنازی اس شادی پر خوش نہیں تھی۔'' بھابھی کی اس بات پر میرا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ عصمت نے میری طرف دیکھا۔
''تجھے تو قیاس آرائیاں کرنے کی عادت ہوگئی ہے،'' بھائی نے بھابھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نکاح پر اور رخصتی پر لڑکیاں رویا ہی کرتی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خوش نہیں ہیں۔''
بھابھی کچھ دیر بھائی کی جانب دیکھتی رہیں۔
''رونا رونا بھی ایک سا نہیں ہوتا،'' انھوں نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ ''دکھ کے رونے کو

میں خوب سمجھتی ہوں۔'' بھابھی نے پھر بھائی کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے وہ سب کچھ نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا ہے۔''

''کیا ہوا تھا بھابھی؟'' عصمت نے کہا۔

''تو سنا انھیں اپنی قیاس آرائیوں کے قصے،'' بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا، ''میں تو چلا۔''

''دوسرے کمرے سے چھتری لیتے جائیں،'' بھابھی نے کہا۔ ''بادل چھا رہے ہیں۔''

بھابھی کچھ دیر خاموش رہیں، جیسے سوچ رہی ہوں کہ وہ جو کچھ کہنے والی ہیں، کہیں یا نہ کہیں۔

''بہت روئی تھی گلنازی،'' انھوں نے کہہ ہی دیا۔ ''پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔''

''کب ہوا تھا نکاح؟'' باجی زیبا نے کہا۔

''پچھلے مہینے کے آخر میں،'' بھابھی نے کہا، ''نومبر کے آخری دنوں میں۔''

میرے تصور میں، چکوال میں، مندر کی سیڑھیوں پر خواب آلود کیفیت اُبھر آئی جب میں نے اپنی گود میں گلنازی کو محسوس کیا تھا، اس کی رخسار میری چھاتی پر تھا اور میں نے سسکی کی آواز سنی تھی... مجھ پر پھر سکتے کی سی کیفیت چھا گئی۔

''بہت روئی تھی گلنازی،'' بھابھی نے پھر کہا۔ ''آنکھیں سوج گئی تھیں۔''

انگیٹھی میں کسی کوئلے کے تڑخنے کی آواز آئی۔ میری سماعت تو موجود تھی لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا، قوتِ گویائی نہیں رہی۔

''نوراں، اس کی سہیلی، اس کے ساتھ تھی،'' بھابھی نے کہا۔ ''وہی اسے سنبھال رہی تھی۔ میں نکاح سے ایک دن پہلے ماسی جیراں کے گھر گئی تھی تو گلنازی مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔'' بھابھی نے پھر میری طرف دیکھا۔ ''نکاح والے دن تو اس کا برا حال تھا۔ سب پوچھتے تھے کہ کیا بات ہے؟ لیکن وہ... بس روئے جا رہی تھی۔ پھر اس نے سب کے سامنے کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیا؟'' عصمت نے چونک کر کہا اور میری طرف دیکھا۔

''ہاں... صاف کہہ دیا... اس پر ساری برادری والے پریشان ہو گئے۔ محمد اکبر خان کی ماں نے تشویش سے پوچھا: مجھے سچ سچ بتا جیراں، بات کیا ہے؟ ماسی جیراں کیا بتاتی... سب عورتیں

گلنازی کے گرد جمع ہوگئی تھیں۔ سب کے چہروں پر پریشانی تھی۔ محمد اکبر خان کی ماں گلنازی کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے ٹھوڑی پکڑ کر گلنازی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ گلنازی، سچ سچ اور صاف صاف بتا، کیوں شادی نہیں کرنا چاہتی؟ جو دل میں ہے بول دے ... گلنازی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی سہیلی نوراں بول پڑی۔ کوئی بات نہیں ہے ماں جی۔ گلنازی کا نہ تو باپ ہے، نہ بہن، نہ بھائی — ایک ماں ہے، اس سے بھی الگ کرو گی تو کیا روئے بھی نہ؟ نہیں جانا چاہتی ماں کو چھوڑ کے... اس بات پر پھر ہر طرف خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ چہرے مسکرانے لگے۔ گلنازی کی ہونے والی ساس نے گلنازی کا منھ چوما، سر چوما اور کہا: ہے نا جھلّی دِھی (بے وقوف بیٹی)! نہ سوہنی دِھیے، روتے نہیں ہیں — ایک نہ ایک دن تو ماں کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ میں کون سا ابھی تجھے لے جارہی ہوں؟ رہ لے دو سال ماں کے پاس۔ اس کے بعد بھی کیا میں تجھے ماں سے نہیں ملنے دوں گی؟ توبہ استغفار۔ نہ دھیے، ایسا نہ سوچ۔ نہ میری سوہنی دھی... اچھا چل میں اکبر سے کہہ دوں گی کہ لفٹین بننے کے بعد جب کسی چھاؤنی میں جائے تو تیرے ساتھ بہن جیراں کو بھی لے جائے۔ جہیز میں... ایک عورت نے کہا اور ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔ گلنازی کی سسکیاں پھر بھی سنائی دیتی رہیں۔ جب نکاح نامے پر انگوٹھا لگانے کا وقت آیا تو نوراں نے گلنازی کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھے پر سیاہی لگائی اور انگوٹھے کو پکڑ کر نکاح نامے پر لگا دیا۔''

''نوراں نے؟'' باجی زیبا نے کہا۔

''ہاں، نوراں نے۔ اور مجھے تو یوں لگتا ہے،'' بھابھی نے کہا، ''نوراں ہی نے قبول قبول کہہ دیا تھا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' باجی زیبا نے کہا۔

''شور میں کیا پتا چلتا ہے!'' بھابھی نے کہا۔ ''انگوٹھا لگ جانے پر عورتوں نے مبارک مبارک کا شور مچا دیا۔ مولوی بھی بوڑھا تھا، وکیل بھی بوڑھے تھے... کیا پتا چلتا ہے! میں قریب ہی تھی، مجھے تو یہی لگتا ہے کہ میں نے گلنازی کی نہیں، نوراں کی آواز سنی تھی۔''

''پھر تو نکاح فسخ ہے،'' باجی زیبا نے کہا، ''قرآن اور سنت اور شرعی احکام کے مطابق...''

میں اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔

''مجھے لگتا ہے،'' میرے دروازے سے نکلتے ہی عصمت نے باجی زیبا کی بات کاٹ دی۔

''مجھے لگتا ہے، گلنازی خالد کے لیے روئی تھی۔''

میں برآمدے میں دروازے کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو عصمت،'' بھابھی نے کہا۔'' دونوں کے درمیان کوئی بات ضرور تھی جو خالد ہم سے چھپا تا رہا ہے۔حال دیکھا ہے اس کا؟ گلنازی بھی سوکھ گئی ہے۔''

''مجھے تو پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں ہی میں پتا چل گیا تھا،'' عصمت نے کہا۔'' گلنازی بار بار خالد سے متعلق پوچھتی تھی، بے چین سی رہتی تھی۔''

''پتا ہے... '' بھابھی کی آواز دھیمی ہو گئی،'' جب وہ میرے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی تو اس نے میرے کان میں سرگوشی میں کیا کہا تھا؟ بی بی جی، مرویساں...'' (بی بی جی، مر جاؤں گی...)

''بس!'' باجی زیبا نے فوراً کہا،'' مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔''

''اس میں اچھائی برائی کہاں سے آ گئی؟'' عصمت نے احتجاج سا کیا۔'' کسی کو پسند کرنے میں کیا برائی ہے؟ ہم انسان ہیں — کوئی بھی کسی کو پسند آ سکتا ہے۔محبت اسی طرح ہو جاتی ہے۔ گلنازی تو بہت بھولی بھالی اور بچوں جیسی ہے۔اور میرا بھائی تو ہے ہی ایسا— جو لڑکی دیکھ لیتی ہے، اس کی نظر ہٹتی ہی نہیں ہے۔اگر گلنازی کو پسند آ گیا ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟ وہاں چکوال سکول میں اکثر لڑکیاں مجھ سے پوچھتی رہتی ہیں کہ وہ سامنے بیری والے گھر میں جو لڑکا رہتا ہے، کیا تمھارا بھائی ہے؟ ایک لڑکی نے تو بڑی دلیری سے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے دوستی کر لو... میری سہیلی بن جاؤ... اتنے خوبصورت اور پیارے لڑکے کی بہن سے دوستی تو کرنی ہی پڑے گی۔''

''حسینہ نے کہا ہوگا،'' باجی زیبا نے فوراً کہا۔

''ہاں،'' عصمت کی آواز آئی۔

''وہ مکار لومڑی...'' باجی زیبا بولیں۔'' مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔میں نے خوب سنائی تھیں اور وہ بے شرم آگے سے ہنستی جاتی تھی۔''

مجھے بہنوں کی کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔صحن کا دروازہ کھلا۔گداؤ اندر آیا۔میں گداؤ کو دیکھ کر برآمدے سے صحن میں گیا۔میں باہر کھیتوں میں جانا چاہتا تھا۔بیرونی دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ گداؤ نے میری کلائی پکڑ لی۔وہ مجھے صحن میں کھینچ کر بیرونی دیوار کی سمت لے گیا۔اس نے

دوسرے ہاتھ میں موڑھا بھی پکڑ لیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں گداؤ مُنڈھی پر لکڑیاں چیرا کرتا تھا۔ اس نے موڑھا بچھایا، مجھے بیٹھنے کو کہا، خود مُنڈھی پر بیٹھ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو صاب؟'' اس نے کہا۔ ''باہر ہوا بہت ٹھنڈی ہے، بادل بھی چھا رہے ہیں... سر پر ٹوپی نہیں، گلے میں مفلر نہیں، پاؤں میں موزے نہیں... صرف ایک سویٹر پہنا ہوا ہے... نہ صاب جی، ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا، جہاں سفید بادلوں کی تہیں بن رہی تھیں۔

''کچھ نہیں ہوگا گداؤ،'' میں نے کہا۔ ''وہاں بلکسر اور چکوال میں زیادہ سردی پڑتی ہے — عادی ہوں میں۔''

''ہوتا تو بہت کچھ ہے صاب،'' گداؤ نے کہا۔ ''سہنا پڑتا ہے...'' اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ ''وہ تو کملی (دیوانی) ہے، نہ سوچا نہ سمجھا، خود کو روگ لگا بیٹھی ہے۔ آپ تو سیانے ہیں، یہ کیا حال بنالیا ہے؟ اب تو ہو بھی کیا سکتا ہے؟ اس نے تو خود کو نکاح کے بعد گھر میں قید کر لیا ہے... تندور پر بھی نہیں آتی۔''

میں گھبرا سا گیا۔ گداؤ نے کسی جھجک کے بغیر کھل کر بات کی۔ میں کوئی جواب نہ دے پایا۔ گداؤ میری سمت دیکھتا رہا۔

''دل آ جائے تو...'' گداؤ نے کہا۔ ''تو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ میں آپ جتنا سیانا نہ تھا... شانی کے بمبئی چلے جانے کے بعد جو حال میرا ہوا تھا، میں ہی جانتا ہوں... سینے کا لامبو (شعلہ) اٹھ اٹھ کر دماغ تک جاتا تھا۔ دماغ جلتا تھا، دل جلتا تھا اور میں بے بس تھا... یہی دل چاہتا تھا کہ مر جاؤں... پتا نہیں شانی کا کیا حال ہوا ہوگا۔'' گداؤ کی آواز میں رقت سی نمودار ہوئی۔ ''اس جھلّی کملی گلنازی کا حال تو میں نے دیکھا ہے صاب... یاد کر کر کے روتا ہوں صاب... ہر شام خالی خالی آنکھوں سے ہسپتال کے صحن کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ ماں کے بلانے پر بھی اسے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ہر شام ماں سے ڈانٹ کھاتی تھی۔ پیڑے بناتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پیڑا گر جاتا تھا۔ ساون میں ایک بار بڑی گھنگھور گھٹا چھائی۔ سہ پہر کو تنور بند کر کے ماسی جیراں کے ساتھ اندر گھر میں گئی تو پھر باہر آ گئی۔ میں بیمار جانوروں کے چھپر میں تھا صاب... اپنے گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ

گئی ... موسلا دھار بارش ہوئی اور وہ وہیں بیٹھی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے تندور میں جلنے والی آگ سے کہیں زیادہ آگ اس کے اندر ہے ... ایک بار پھر اکیلی چھپر میں تندور کے پاس بیٹھی تھی۔ بہت تیز ہوا تھی، اس کا دوپٹہ اڑ گیا، اسے پتا ہی نہ چلا۔ میں دور سے دوپٹہ پکڑ کر لایا۔ میں نے کہا، گلنازی پتر، تیرا دوپٹہ اڑ گیا ہے ... تو خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی ... آپ کی طرح اس کی بھی ہڈیاں نکل آئی ہیں صاب ... یہ عشق بڑی ظالم چیز ہے۔ ایک بار تو چنگیر میں روٹیاں ڈال کر بی بی کو دینے چل پڑی تھی جس پر ماسی نے ڈانٹ کر کہا تھا کہ گلنازی، ڈاکٹر کی بہنیں چلی گئی ہیں! پر میں تو سب کچھ جانتا تھا کہ وہ کس کی خاطر خود سے بے خبر ہو کر چل پڑی تھی ... ماسی جیراں بھی سب جانتی ہے صاب۔ گلنازی کو دیکھ دیکھ کر بہت پریشان تھی۔ بس پچھلے مہینے ... یہ ساری شرارت شریفاں کٹی کی ہے ... ایک شام جب سب لڑکیاں تندور سے چلی گئیں۔ بس میں، ماسی جیراں اور شریفاں کٹی ہی تندور پر رہ گئے۔ گلنازی گھر کے اندر سے باہر آئی۔ بہت کمزور لگ رہی تھی۔ اس نے چنگیر پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے چنگیر میں پندرہ روٹیاں ڈالیں اور ہمارے گھر کی طرف چل پڑی۔ ماسی نے تیزی سے اٹھ کر اسے پکڑا، چنگیر چھینی ... گلنازی روتی ہوئی واپس گھر کے اندر چلی گئی۔

''ماسی، شریفاں کٹی نے کہا، گلنازی آں سانبھ لے، ڈاکٹر نیں بھرا نیں عشق اچ جھلی ہوئی کھلوتی آ ... (ماسی، گلنازی کو سنبھال لے، ڈاکٹر کے بھائی کے عشق میں دیوانی ہو چلی ہے۔) اس سے پہلے کہ ماسی کچھ کہتی، میں نے غصے سے کہا، بکواس نہ کر شریفاں! اور خبردار اگر یہ بات تو نے کسی لڑکی یا گاؤں کے کسی بھی مرد یا عورت کے سامنے کی تو ... میں نے شریفاں کٹی سے کہا، گاؤں میں تیرے جو کرتوت ہیں، میں تیرے ماں باپ کو بتا دوں گا، سارے گاؤں کو بتا دوں گا ... میں بھی سب جانتا ہوں۔ شریفاں کٹی کا تو منہ کھلا رہ گیا صاب — میں نے تو اندھیرے میں غلیل چلائی تھی، پتھر سیدھا کٹی کے ماتھے پر لگا۔ سہم سی گئی۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے صاب، ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے دل میں چور ہوتا ہے۔

''میں جھلی تے ناں گداؤ چاچا ... (میں دیوانی تو نہیں ہوں گداؤ چچا ...) شریفاں کٹی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ میں کسے آں کیوں آکھساں، میں تاں ماسی آں آہدی پئی آں کہ گلنازی آں سانبھ لے ... (میں کسی سے کیوں کہوں گی۔ میں تو ماسی ہی سے کہہ رہی ہوں کہ گلنازی کو سنبھال

لے۔) اچھا اچھا، میں نے کہا، زیادہ سیانی نہ بن، ماسی تجھ سے بہتر جانتی ہے۔''

گداؤ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا، پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''پر صاب جی،'' گداؤ نے کہا۔ ''شریفاں کٹی اپنا کام دکھا گئی تھی۔ ماسی کے دل میں وہ خوف پیدا ہو گیا جو پہلے نہ تھا۔ بدنامی کا خوف... اسی خوف میں اس نے بھائی سے بات کی ہوگی۔ بھائی نے اکبرے کو دو تین دن کی چھٹی پر بلایا اور گلنازی کا نکاح کر دیا۔''

''کیا کہا ہوگا ماسی نے اپنے بھائی سے؟'' بہت دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے زبان کھولی۔

''یہی کہ گلنازی جوان ہو رہی ہے،'' گداؤ نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ کوئی اس پر بری نظر ڈالے، نکاح کر دینا چاہیے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گداؤ مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔

''میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی،'' میں نے آہستہ سے کہا، ''جسے بری نظر کہا جائے۔''

''جانتا ہوں صاب!'' گداؤ نے کہا۔ ''ماسی جیراں بھی یہ بات جانتی ہے کہ گلنازی ہی کملی ہو گئی تھی... رونا بھی تو اسی بات کا ہے صاب... گلنازی کے نکاح کے بعد رات کو میں بہت رویا تھا صاب۔'' گداؤ کی آواز میں پھر رقت نمودار ہوئی۔ ''یہ دنیا... جینے کیوں نہیں دیتی؟''

مجھے زیادہ دیر گداؤ کے پاس بیٹھنا اپنی برداشت سے باہر محسوس ہو رہا تھا۔

''میں ابھی آتا ہوں،'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور صحن کے بیرونی دروازے سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل دیا۔ کھیتوں میں گندم کے پودے کمر کمر تک آ چکے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکے گندم کے پودوں میں سرسرا رہے تھے۔ سورج بھی اپنی شعاعوں سے کھیتوں میں تمازت پھیلا رہا تھا۔ یہ شعاعیں مجھے تاریک تاریک سی محسوس ہو رہی تھیں۔ جدھر بھی دیکھتا تھا، سیاہ شعاعوں میں چمک تو تھی، روشنی کا احساس نہیں تھا — شاید صدمے نے میری بینائی بہت کمزور کر دی تھی۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے میں کچھ دور ہی گیا تھا کہ مجھے یوں لگا، میرے آنسو میرے حلق میں جمع ہو گئے ہیں... شوریدگی کی اس کیفیت سے نجات پانے کے لیے، تلخی کے اس آتشیں سیال سے نجات پانے کے لیے، نہ تو میں گھونٹ بھر سکتا تھا، نہ ہچکی لے سکتا تھا۔ پھر جیسے اس سیالِ آتشیں کے کچھ قطرے میرے سینے میں اندر کی سمت اترے... تنور سا نمایاں ہوا، خراشیں ڈالتی ہوئی سوکھی لکڑیاں میرے دل کے آس پاس

گریں اوران میں آگ بھڑک اٹھی۔ شعلے بلند ہوئے، دھواں اٹھا... میرا جی چاہا میں گلا پھاڑ کر چیخوں۔ میرے قدم بوجھل ہو گئے۔ یوں محسوس ہوا کہ میں نہر کے کنارے تک نہیں پہنچ پاؤں گا... گر جاؤں گا۔ ''نہیں نہیں نہیں... '' میرے دل سے چیخیں اٹھ رہی تھیں۔ ''نہیں... میری گلنازی کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا... وہ میری ہے... میری... '' نہر کا کنارہ مجھے دور محسوس ہوا۔

'' چھین تو تم رہے تھے!'' میرے سینے میں لگی آگ، اٹھتے شعلوں اور دھویں سے آواز ابھری۔ ''وہ کسی سے منسوب تھی... اسے چھین تو تم رہے تھے... وہ جس سے منسوب ہے، اس کا قصور بتا سکتے ہو؟''

''وہ اسے نہیں چاہتی!'' میں دل ہی دل میں چیخا۔ ''وہ مجھ سے پیار کرتی ہے — میرے ساتھ جینا چاہتی ہے... '' میرے بدن کا رواں رواں سوالیہ نشان بن چکا تھا کہ میرا کیا قصور ہے، میری گلنازی کا کیا قصور ہے؟ اسی طرح گرتا پڑتا میں نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ شیشم کے لمبے گھنے درختوں کے درمیان، کنارے پر موٹی تہہ والی سوکھی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ میں گھاس پر لیٹ گیا، آنکھیں بند کرلیں... بے چینی اس قدر تھی کہ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا... پھر لیٹ جاتا تھا، کبھی کروٹیں لینے لگتا تھا۔ پھر میں پشت کے بل، سیدھا لیٹ گیا... آنکھیں کھولیں، ہر سمت چھائی ہوئی تاریکی میں کہیں دور، آسمان کا نیلا رنگ دکھائی دیا، جس کے آس پاس سفید بادلوں کی دھند میں بھی نیلاہٹ سی تھی۔

''کیا اس زندگی سے... '' میرے سوچنے کی قوت کچھ کچھ بحال ہوئی۔ ''اس زندگی سے موت اچھی نہ ہوگی؟ گلنازی نے بھی تو کہا تھا کہ جدا ہو کر ہم کون سا زندہ لوگوں کی طرح جی پائیں گے... میں مر کیوں نہ جاؤں؟''

مجھے اپنی چھاتی پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ سینے میں الاؤ کے شعلے اب کم ہوتے ہوئے دائیں بائیں جھول رہے تھے۔ دل کے آس پاس اب دہکتے انگاروں کا احساس ہو رہا تھا، جن کے درمیان راکھ سی بکھری ہوئی تھی... بکھر رہی تھی...

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے منہ اور حلق میں کڑواہٹ تھی۔ ایسی کڑواہٹ میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے اپنے ہونٹ خشک محسوس ہوئے۔ زبان بھی درخت کے تنے سے اتری ہوئی چھال کی مانند تھی۔ ایک انجانی تشنگی کا احساس ہونے لگا تھا جو لمحہ لمحہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ یہ تشنگی میرے

سینے میں بے تابی کی کیفیت سے جا ملی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک درخت کی سمت گیا، واپس پلٹا، پھر بیٹھ گیا...

"وے میں بے گناہی ماری آں، میرا کر گناہ صحیح..."

(میں بے گناہ ماری گئی ہوں، میرا گناہ تو درست کر دے...)

لوک گیت کی اداس دھن میرے ذہن میں گردش کرنے لگی۔ میری آنکھوں پر نمی کی تہہ سی ابھر آئی۔ مجھے نہر کے گدلے پانی کے دھارے نظر آئے۔ ان دھاروں میں گھاس کے تنکے بھی بہے جا رہے تھے۔ میں نے ان بہتی ہوئی لہروں میں۔ ان دو تنکوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے۔ پانی کے دھاروں میں سے سوکھی گھاس، درختوں کے خزاں رسیدہ ٹوٹے ہوئے پتے، سوکھی ٹہنیاں، جن کی رنگت سیاہ ہو چکی تھی، کثرت سے بہی جا رہی تھیں... وہ دو تنکے کہیں نظر نہ آئے جو چند مہینے پہلے ایک دوسرے سے چمٹ کر بہہ رہے تھے...

"وے میں بے گناہی ماری آں، میرا کر گناہ صحیح [69]
کوٹھے تے پڑ کوٹھرا، کوٹھے پخدا تنور
وے میں گن گن لاواں روٹیاں [70]
میرا کھاون والا دور وے
وے میں بے گناہی ماری آں، میرا کر گناہ صحیح

(میں بے گناہ ماری گئی ہوں۔ میرا گناہ تو درست کر دے۔ چھت کے اوپر پھر گھر بنا ہوا ہے، جس کے صحن میں تنور دہک رہا ہے... میں گن گن کر روٹیاں لگا رہی ہوں — میرا کھانے والا جو مجھ

69۔ اس مصرعے کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، بے گناہ ہوں، مجھ پر ہر الزام غلط ہے۔ میرے وجود سے یہ الزام ہٹا دے۔ میں سزاوار نہیں ہو سکتی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے: میں اس گناہ کی پاداش میں ماری جا رہی ہوں جو میں نے نہیں کیا۔ اگر سزاوار ہی کرنا ہے تو مجھے وہ گناہ تو کر لینے دے۔

70۔ گن گن کر روٹیاں لگانے کا مفہوم بہت گہرا ہے۔ اس میں محبوبہ کی بھول جانے کی کیفیت موجود ہے۔ وہ تنور کے سامنے اکثر بھول جاتی ہے کہ اس کا محبوب اس کے پاس نہیں ہے — وہ اس کے لیے بھی روٹیاں لگا دیتی ہے۔ پھر جب اسے اپنی اس اذیت ناک بھول کا احساس ہوتا ہے تو اداسی اس کے سینے میں بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ پھر وہ جب بھی تنور کے سامنے آتی ہے، گن گن کر روٹیاں لگانا شروع کر دیتی ہے۔

سے دور چلا گیا ہے . . .)

''دیکھو، میں خود فراموشی کا شکار ہو چکی ہوں ۔ تم کہاں ہو — میں اپنے ہوش و حواس کھو چکی ہوں ۔ دیکھو، مجھے سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے ۔ دیکھو، تمھارے سامنے اب دو ہی راستے ہیں ۔ یا تو اپنی عزتِ نفس کو بچا لو اور اس کائنات کی سچی قوتِ خیر سے کہو کہ وہ تمھیں سزاوار ہونے سے بچائے ... تمھیں نجات دے . . . تمھیں سکون دے ۔ تمھارے سامنے دوسرا راستہ بھی کھلا ہے ۔ وہ جس کو تم سے چھینا جا رہا ہے، اسے حاصل کر لو، حیاتی زندگی کا آغاز کر دو . . . وہ انکار ہر گز نہیں کرے گی — اگر یہ گناہ ہے تو یہ گناہ کر لو ۔ تم دونوں کو آسودگی مل جائے گی . . . تمھارے سامنے دونوں راستے کھلے ہیں . . . ایک کا انتخاب کر لو . . . ''

مجھے بار بار گلنازی کی روتی ہوئی، گریہ وزاری کرتی ہوئی صورت نظر آ رہی تھی . . . مجھ سے برداشت کی وہ دیوار تھامے نہ تھمی، جسے میں اب تک اپنے شعور کے ہاتھوں سے روکے ہوئے تھا ۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو یا ۔ میرے رونے کو سوکھی گھاس نے سنا، شیشم کے لمبے درختوں نے، ان کی شاخوں اور پتوں نے، پتوں کے درمیان پرندوں اور گلہریوں کے گھونسلوں نے، ٹہنیوں سے چمٹے حشرات الارض نے، نہر کے بہتے دھاروں نے، دھاروں میں بہتے تنکوں نے، خزاں رسیدہ پتوں نے، سیلی ہوئی سیاہ ٹہنیوں نے، گھاس کے گچھوں نے، کھیتوں نے اور گندم کے ایک ایک پودے نے سنا، لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو میرے اندوہ کو، میرے المناک احساس کو گلنازی تک پہنچا دیتا ۔

ہوا کے سرد جھونکے شیشم کے پتوں میں بھی سرسرا رہے تھے ۔

''اے ہوا! اپنے کسی دردِ دل رکھنے والے جھونکے سے کہہ کہ وہ میرے اس اندوہ کو، میرے اس غم کو، میری اس گریہ وزاری کو میری محبوبہ تک پہنچا دے ۔'' آسمان پر بادلوں نے سورج کا چہرہ ڈھانپ دیا تھا ۔ ''اے ہوا . . . '' میں نے زیرِ لب سرد ہوا کو پھر پکارا ۔ ''اپنے کسی رحم دل جھونکے سے کہہ کہ وہ میری محبوبہ کی رضاعی ماں کے کندھے تک جا کر اس کے کان میں بس اتنا کہہ دے کہ ماسی، مرویساں . . . '' (ماسی، مر جاؤں گا . . .)

مجھے ایک بار پھر ہر شے تاریک نظر آئی ۔

''اب کیا ہو سکتا ہے!'' میری آنکھوں پر آنسوؤں نے موٹی سی تہہ بنا دی تھی، ہر شے دھندلا

سی گئی۔''اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔اب تو کوئی بھی مجھے میری محبوبہ سے نہیں ملوا سکتا... کوئی بھی نہیں۔ہم تو برباد ہو گئے... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا...''

میں اٹھا، نہر کے کنارے کنارے شمالی جانب چلنے لگا۔ میرے دل کے آس پاس اب انگاروں کی جگہ راکھ بکھری ہوئی تھی، جسے میرے آنسوؤں نے بھگو سا دیا تھا۔

''میرے دلِ کا سری نگر اجڑ گیا ہے۔ مجھے دولخت کر دیا گیا ہے۔میرے مندر سنسان ہو گئے ہیں، میری مسجدوں میں سناٹا ہے، میرے شوالے اجاڑ ہیں، میرے گرجا گھروں کی گھنٹیاں خاموش ہیں، میرے گوردوارے جھاڑ جھنکاڑ اور مٹی سے اٹ گئے ہیں... ہوا کے جھونکوں میں سسکیاں ہیں... یخ بستہ ہوا میں آتشیں لہریں سی دکھائی دے رہی ہیں... میں اپنے دل کے سری نگر میں اکیلا ہوں... مجھ سے میری زندگی کو چھین لیا گیا ہے... مجھے دولخت کر دیا گیا ہے... میں کیا کروں... اب میں کیا کروں؟''

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا وجود ہی کٹ چکا ہے، لیکن اس میں غیر محسوس اتصال بھی ہے... کسی غیر مرئی پُل کی طرح، میرا نصف وجود ایک خلا کی طرح تھا— میرے دل میں ہر سمت خاکستر بچھی ہوئی تھی... سوختہ جذبات کا بقیہ... ''میں نہیں جانتا تھا کہ میں دل ہی دل میں گلنازی سے کس قدر محبت کرنے لگا ہوں۔ کاش مجھے اس کی آگہی ہوتی۔ میں تو صرف اس چاہت ہی سے آشنا تھا جو مجھے اس کے وجود کے لیے محسوس ہوتی تھی، جو مجھے چاہے جانے کے احساس سے مخمور کیا کرتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں گلنازی سے عشق کرنے لگا ہوں... کاش مجھے اپنے احساسات و جذبات سے آشنائی ہو جاتی تو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا... نجات کا کوئی در کھول ہی لیتا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ خواہش کی کالی بلاؤں نے اُدھر گلنازی کو اور ادھر مجھے دبوچ رکھا ہے، ورنہ میں خواہش کے ایک ایک بال کو تیاگ کی قینچی سے کاٹ کاٹ کر بالوں کے گچھے کو جذبات کی لہروں کے سپرد کر دیتا۔ میں اور گلنازی ناممکن کو ممکن بنانا چاہتے تھے۔اس کے لیے بھی دو ہی راستے تھے: یا تو میں دلبر چوہان کی بیٹی کو سنجوگتا[71] کی طرح بھگا لے جاتا، یا ہم دونوں زہر کھا کر اکٹھے جان دے دیتے۔اس دنیا میں انسانی

71۔ پرتھوی راج چوہان، راجہ جے چند کی بیٹی سنجوگتا کو سوئمبر سے اٹھا کر لے گیا تھا، کیونکہ اس نے پرتھوی راج چوہان کے بت کے گلے میں وَر مالا ڈال دی تھی۔

معاشروں نے اس صورت حال کے لیے کوئی تیسرا راستہ چھوڑا ہی نہیں۔ جو راستہ تھا وہ پراچین آریاؤں کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ کیا کریں... اب ہم کیا کریں؟''

کھیتوں میں بادلوں کا نقاب اوڑھے سورج کی روشنی بھی ماند پڑتی جارہی تھی۔ میری آنکھیں نیم وا تھیں۔ آسمان پر اٹھنے والے سرمئی مائل سفید بادل پھیل چکے تھے۔ ہوا میں خنکی کا احساس بڑھتا جارہا تھا۔''گلنازی کیا کرتی؟ میں چکوال میں بیٹھا کیا کر سکتا تھا؟ اب... اگر میں اپنے اور گلنازی کے دکھ کو کم کرنے کے لیے، اس آتشیں احساس کو کم کرنے کے لیے، اس کے ساتھ حیاتی زندگی کا آغاز کرتا ہوں، سب اخلاقی اور قانونی دائروں کو توڑ کر آسودگی کی راہ نکالتا ہوں تو وہ فوراً مان جائے گی، لیکن یہ تجربہ ہمارے لیے اس مادی آلائش کو بھی تو لے آئے گا جو روح سے چمٹ جایا کرتی ہے۔ میں اس کا تصور تو کر ہی سکتا ہوں۔ عارضی تسکین سے ہم اپنی محرومی کے دکھ کو کم تو کرلیں گے، لیکن کیا یہ آلائش ہمیں زندگی بھر جینے دے گی؟ یہ آلائش ہماری روحوں کو نہ ختم ہونے والی زہریلی کیفیت دے جائے گی... زہریلی یاد جو ہمیں زندگی بھر جلاتی رہے گی۔ ہمیں ہر لمحہ موت سے آشنائی کی راہ دکھاتی رہے گی۔ نہیں، ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ نہ میں اپنے مقام سے گر سکتا ہوں نہ ہی گلنازی کو گرنے دوں گا۔ ہمارا سکھ تو زندگی بھر ساتھ رہنے میں تھا... یہ سکھ تو ہم سے چھن چکا ہے...''

سورج کی روشنی بہت کم رہ گئی تھی۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ سرمائی خنک ہوا میں تیزی سی نمودار ہو رہی تھی۔ کھیتوں پر کہر زدہ تاریکی کا احساس ہونے لگا تھا... پھر میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔

''گلنازی اب کیا کرے گی؟'' میرے سینے میں بکھری راکھ سے چنگاری سی اڑی۔''اس کی بھی زندگی برباد ہو چکی ہے۔ وہ کیسے جیے گی؟ اب تو اس کی زندگی کا ہر آنے والا لمحہ تنور کے دہکتے انگاروں پر گزرے گا۔ وہ محرومی کی تپش میں کیسے جی پائے گی؟''

میرے سینے میں چنگاریاں سی اڑیں۔ سرمائی صبح میں بھی میرے چہرے پر جیٹھ اساڑھ کی لُو جیسے تھپیڑے لگے۔ میرے پورے بدن میں تپش سی نمودار ہوئی۔ یہ تپش اس تپش سے بہت مختلف تھی جو مجھے گلنازی کے سامنے محسوس ہوا کرتی تھی۔ اس تپش میں اذیت سی تھی۔ شدت سے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ قوتِ شر جو انسانوں کو اذیت دے کر، عقوبت میں مبتلا کر کے لطف اور

تقویت حاصل کرتی ہے، کاش وہ ایک بار . . . صرف ایک بار . . . اپنے بھیانک روپ ہی میں سہی . . . مجسم ہوکر میرے سامنے آ جائے۔ میں اس سے نبرد آزما ہونے کے بجائے بس اتنا کہوں:

''میں جانتا ہوں تو بے رحم ہے، سفاک ہے، تجھے انسانوں کو عقوبت دے کر تڑپانے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ تجھ میں رحم نہیں ہے، لیکن تو سب کو فریب دیتی ہے۔تو جو بھی ہے . . . میں تجھ سے یہی التجا کرتا ہوں کہ جو سزا دینی ہے، مجھے دے، جو دکھ دینا ہے مجھے دے دے، لیکن میری محبوبہ کو چھوڑ دے . . . وہ پھول کی طرح نازک ہے۔تو میرے بدن کو زہریلے کانٹوں سے چھلنی کر دے، لیکن میری محبوبہ کی سمت درد کی ایک ٹیس بھی نہ بھیج۔ میرے بدن کو آگ کی تپی ہوئی سلاخوں سے داغ دے، لیکن میری محبوبہ کی سمت ایک چنگاری بھی نہ بھیج۔ مجھے بچھوؤں سے بھرے گڑھے میں گرا دے، لیکن میری محبوبہ کو اپنے زہریلے ڈنکوں سے دور رہنے دے۔ میرے بدن کے ریشے ریشے کو خونخوار مچھلیوں کے حوالے کر دے، لیکن میری محبوبہ کے تلووں کو پایاب رہنے دے۔تو میرے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے، لیکن میری محبوبہ کی زندگی کے لمحے لمحے کو اندوہ سے دور رہنے دے۔ میرے خون سے وہ آگ بجھ جانے دے جو میری محبوبہ کو جلا رہی ہے۔تو میری ہڈیوں کو بھی ظلم و تشدد کے مگرمچھوں کو چبانے کے لیے دے دے، لیکن میری محبوبہ کی آنکھوں کے موتی جھیل کے کنارے نہ گرا . . . تو میرے بدن سے میری کھال اتار لے، لیکن اس کے جوتے بنوا کر میری محبوبہ کو دے دے تا کہ وہ زندگی کی پگڈنڈی پر، جلتی جھلستی پگڈنڈی پر سوختہ قدم نہ ہو . . . مجھے اندوہ کے گرداب میں ڈبو دے، لیکن میری محبوبہ کو بے رحم طوفانی لہروں کے سپرد نہ کر — تجھے تیرے ظلم کی قسم، تیرے تشدد کی قسم، تیری خونخواری کی قسم، تیری سفاکی کی قسم، تیری عیاری کی قسم، تیرے فریب کی قسم . . . تجھے تیرے تکبر کی قسم . . . تیرے پاس دکھوں کے جتنے خنجر ہیں میرے جسم میں پیوست کر دے . . . تیرے پاس مصائب کے جتنے ناوک ہیں، میری چھاتی پر چلا دے، لیکن میری محبوبہ کو خلش نہ دے . . . اس کی زندگی کو دکھوں سے تاریک نہ کر . . . چھوڑ دے . . . اسے چھوڑ دے . . .''

میں چلتا جا رہا تھا۔ یہ احساس بھی نہ رہا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

''وہ بچوں کی طرح بھولی بھالی ہے۔ اس میں معصومیت کی روشنی ہے . . . یہ تاریک قوت . . . یہ قوتِ شر تو اس کے قریب بھی نہیں جا سکتی۔ تو اس سے اسے چھوڑنے کی التجا کر رہا ہے؟ یہ تو اس کے

وجود کے قریب بھی نہ پھٹکے گی۔ یہ تو دور ہی سے پھن اٹھا کر اس پر زہر پھینکتی رہے گی... اس کے وجود کو جلاتی رہے گی — اس میں اتنی جرأت نہیں کہ رینگ کر اس کے قریب جا سکے۔''

یہ خیال تھا کہ آواز — میں سمجھ نہ پایا۔ میں چلتا جا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ پرانی حویلی کے کھنڈر نظر آ رہے تھے۔ میں رک گیا۔ ان کی سمت جانے کے بجائے میں واپس مڑا اور نہر کے کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ہوا میں تیزی برقرار تھی۔ ہوا سرد تھی، لیکن مجھے خنکی کا احساس لمبے لمبے وقفوں کے بعد ہو رہا تھا۔ میں اب واپس جنوب کی سمت رواں تھا۔ قدم آہستہ ضرور تھے، لیکن ایک ہی رفتار سے اٹھ رہے تھے... ہوا کے ایک سرد جھونکے نے میری پیشانی سے ٹکرا کر مجھے احساس دلایا کہ میرے سر پر اونی ٹوپی نہیں ہے۔ میں اسی رخ پر چل رہا تھا جدھر نہر میں بہتے پانی کے دھارے بہے جا رہے تھے۔ ان دھاروں میں میرے ساتھ ساتھ تنکے بھی بہہ رہے تھے — مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اٹھتے ہوئے قدموں کی رفتار سے وہ بھی آشنا ہیں۔ خزاں رسیدہ سیلے مٹیالے پتے اور سیاہ ٹہنیاں بہی جا رہی تھیں۔ میں اس پگڈنڈی کے سامنے آ گیا جو سیدھی رہٹ کی سمت جاتی ہے۔

میں نہر کے ڈھلوان نما کنارے سے نیچے پگڈنڈی پر اترنے ہی والا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ بائیں ہاتھ کھیت میں گندم کے کمر کمر اونچے پودوں سے نکل کر ایک لڑکی پگڈنڈی پر آ گئی۔ وہ نوراں تھی۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر عیارانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ واپس کھیت میں، پگڈنڈی سے چھ سات قدم دور، گندم کے پودوں میں جا کر مڑی اور کھڑے ہو کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سرخی سی تھی جس نے اس کے سانولے رنگ کو سیاہی مائل کر دیا تھا۔ ہمارے درمیان تیس قدم کا فاصلہ تھا۔ اس نے سر ترچھا کرتے ہوئے نیچے کی سمت دھیما سا جھٹکا دیا اور آنکھ کے اشارے سے مجھے بلایا، پھر اس نے نیچے دیکھا... میرا بدن کانپا... یوں لگا جیسے نوراں کے قدموں میں گلنازی بیٹھی ہے جو گہرے سبز گندم کے پودوں میں چھپی ہوئی ہے۔

''نہیں، وہ کبھی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتی!'' میں نے گھبراہٹ میں سوچا۔ ''گداؤ نے بھی تو یہ کہا تھا کہ اس نے نکاح کے بعد گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ہے... وہ تنور پر بھی نہیں بیٹھتی... نہیں، کھیت میں گلنازی نہیں ہے۔ لیکن نوراں مجھے اس طرح کیوں بلا رہی ہے؟''

نوراں نے پھر مجھے آنکھ کے اشارے سے بلایا۔ اس کا چہرہ سیاہ سا ہو چکا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر کھیتوں کی سمت دیکھا، پھر دائیں ہاتھ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی، پھر اس نے بائیں جانب اِدھر اُدھر دیکھا، پھر میری طرف دیکھا... اس کی آنکھوں میں بدمستی سی تھی۔ اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کمر کمر گندم کے پودوں میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ چند لمحوں بعد پھر اٹھی۔ بدمستی اس کے پورے چہرے پر تھی۔ بدن آگے پیچھے دھیمی دھیمی سی جنبش دکھا رہا تھا۔ اس نے دونوں بازوؤں کو چھاتی پر اس طرح دبایا جیسے کسی کو لپٹا کر بھینچ رہی ہو۔ بدمست آنکھوں سے دیکھتے ہوئے، مجھے ایک دوبار اشارے کرتے ہوئے پھر بیٹھ گئی... مجھ پر ناگواری کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں مڑ کر دو قدم شمال کی جانب گیا۔ سر گھما کر میں نے پھر کھیت کی طرف دیکھا۔ نوراں کھیت میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ غصہ آنکھوں میں نمایاں تھا۔ وہ تیز قدموں سے پگڈنڈی پر آئی۔ گندم کے پودے سرسرائے۔ میں رک گیا۔ پھر میں نے اس کی طرف ناگواری سے دیکھا اور مڑ کر چلنے ہی والا تھا کہ نوراں نے زور سے میری جانب تھوکا۔ کچھ لمحے کھڑی رہی۔ پھر میرے مڑنے کے ساتھ ہی شاید وہ بھی مڑی ہوگی۔

میں نے دو چار قدم چلنے کے بعد نوراں کی سمت سر گھما کر دیکھا۔ وہ پگڈنڈی پر گاؤں کی سمت جا رہی تھی۔ چلتے ہوئے وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے اس کے گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے ہوں... میرے ذہن میں تلخی ابھری۔ ''ہوس پرست... خود غرض... مکار... میری گلنازی سے زبردستی نکاح نامے پر انگوٹھا لگوانے والی... ہوس کے زہر سے بھری تھیلیوں والی... اور میں... دانش کی کسی سیڑھی پر بھی گلنازی کو روک نہ سکا...''

میری آنکھیں پھر دھندلا سی گئیں۔ آنسوؤں نے میری آنکھوں پر پھر موٹی سی تہہ بنادی۔ میری پلکیں اس قدر بوجھل تھیں کہ میں پوری طرح آنکھیں بھی نہ کھول سکتا تھا۔ آنکھوں میں صرف سوزش ہی نہیں تھی، سوجن کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ میرا پورا بدن شل سا ہو چکا تھا۔ پورے بدن میں درد سا تھا، یہ درد میرے سر، گردن اور کندھوں پر زیادہ تھا۔ دور گاؤں کی طرف جاتی نوراں نظر آئی۔

میں رہٹ کی سمت جانے والی پگڈنڈی پر اترا۔ رہٹ پر پہنچا۔ وہاں نہ بیل تھا نہ رہٹ کا مالک۔ میں سرخ اینٹوں والی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ آسمان پر بادل اب بھی گھرے تھے، ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔

''جو حالت میری ہوئی ہے... '' اچانک ہی میرے خیالات نے پلٹا سا کھایا۔'' اگر گلنازی شادی سے انکار کر دیتی، صاف صاف کہہ دیتی کہ وہ محمد اکبر خان سے شادی نہیں کرنا چاہتی... نکاح نامے پر انگوٹھا نہ لگاتی... تو شاید محمد اکبر خان کی بھی یہی حالت ہو جاتی جو میری ہوئی ہے... وہ بھی شاید میری طرح کھیتوں میں، نہر کے کنارے دیوانہ وار پھر رہا ہوتا۔ فوجی ہے... شاید اسے اپنی توہین سمجھ کر برداشت نہ کرتا۔ کیا خبر وہ گلنازی سے محبت کرتا ہو... یقیناً کرتا ہوگا۔ دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ ساتھ ساتھ کھیلے ہوں گے۔ دونوں بچپن ہی سے یہ جانتے ہوں گے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہیں اور انھوں نے ایک ساتھ ہی زندگی گزارنا ہے۔ پھر گلنازی جیسی لڑکی اس علاقے میں تو کیا، شاید پوری دنیا میں نہ ہوگی۔ اتنے خوبصورت دل والی... کاش میں جھاوریاں نہ آتا... گلنازی کے لیے محمد اکبر خان ہی سب کچھ ہوتا۔ وہ اسی کے سپنے دیکھتی۔ اس کی زندگی میں یہ دکھ تو نہ آتا... کاش بھائی کی ٹرانسفر اس قصبے میں نہ ہوئی ہوتی... کاش میں یہاں کبھی نہ آیا ہوتا۔'' مجھے ایک پھر سینے میں بوجھ سا محسوس ہوا، جیسے بھیگی ہوئی راکھ بوجھل سی ہو رہی تھی۔

''کس لیے؟ آخر کس لیے؟ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟''

میرا جی چاہا کہ وہ قوت، جو کائنات کی ایک سچی قوت ہے، فطرتِ لاریب ہے، حسنِ فطرت ہے... وہ میرے سامنے مجسم ہو کر آ جائے۔ میں اس سے پوچھوں:

''مجھے بتا... یہ ستم میرے اور گلنازی کے ساتھ کیوں ہوا؟ تو نے کسی انسان کو محبت پہ اختیار ہی نہیں دیا... یہ تو ہو جاتی ہے اور بے اختیار ہوا کرتی ہے۔ تو پھر یہ جرم کیسے ہو گئی؟ میں نے گلنازی سے منسوب انسان کی خوشی نہ چھیننے کے لیے بہت جتن کیے... گلنازی سے دور بھاگا، اسے اپنے قریب آنے سے بار بار روکا، لیکن تو نے انسانوں کو یہ اختیار دیا ہی نہیں کہ وہ عشق کے سیلاب پر بند باندھ سکیں۔ گلنازی کا کیا قصور ہے؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟ ہم نے تو کوئی ایسا گناہ بھی نہیں کیا کہ سزاوار ٹھہریں۔ پھر میرے ساتھ میری گڑیا جیسی گلنازی کو کیوں مارا جا رہا ہے؟ ہم بے گناہ کیوں مارے جا رہے ہیں؟''

بادل اور گہرے ہو گئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جلد ہی بارش بھی ہوگی۔ میری سوزش اور سوجن سے بوجھل پلکیں آنکھوں پر بار بار جھپک جھپک جاتی تھیں... بار بار میری آنکھیں بند ہو رہی

تھیں۔ جسم میں شدید تھکن نمودار ہو چکی تھی۔ بے تابی مجھے اب بھی اذیت دے رہی تھی۔ سر وبالِ دوش بن چکا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتے ہوئے یخ بستگی کی سمت جا رہی تھی۔ ہوا کا رخ شمالاً جنوباً تھا، وہ کالے چٹے پہاڑی سلسلے کی سمت سے آ رہی تھی۔ مجھے ابھی تک خنکی کا کوئی احساس نہ ہوا تھا لیکن اب، رہٹ پر بیٹھے ہوئے، میں ایک دو بار سردی سے کپکپایا۔۔۔ واپس گھر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اذیت اب بھی میرے بدن اور روح کو اپنا ہدف بنائے ہوئے تھی اور چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ شاید گلنازی بھی اسی اذیت میں ہوگی اور اذیت اس کے بدن اور روح کو بھی اپنا ہدف بنا رہی ہوگی اور چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ میرا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر کہوں — ہمارا قصور کیا ہے؟

انہی عقوبت کے لمحوں میں مجھے اپنے اردگرد دھند کا احساس ہوا۔ میں چونکا۔ میرے سر نے اوپر کی سمت جھٹکا سا کھایا۔ یہ دھند۔۔۔ یہ ہمیشہ مجھے گلنازی کا چہرہ دکھایا کرتی ہے۔۔۔

نیم وا آنکھوں سے میں نے سامنے اوپر کی سمت دیکھا۔ پھیلی ہوئی دھند میں مجھے گلنازی کا خوبصورت مسکراتا چہرہ نظر آیا، اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں بے انتہا خوبصورت تھیں۔۔۔ اس کے بال ہوا کے جھونکوں سے بار بار اس کے گلابی رخسار پر بکھر رہے تھے۔

''گلنازی!'' میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ''گلنازی۔۔۔ تم کہاں تھیں؟''

''بیٹھ جاؤ۔'' پہلی بار بہت سریلی آواز سنائی دی — وہی آواز جس میں ماہیا گاتے ہوئے گلنازی نے مجھے بے خود کر دیا تھا۔ آواز میں مسکراہٹ بھی تھی۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' خوبصورت آواز پھر سنائی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دھند میں بے انتہا خوبصورت چہرے پر ہونٹ ہلے ہوں۔

''گلنازی!'' مجھے خود پر اختیار نہ تھا۔

''میری بات نہیں مانو گے؟'' مسکراتی ہوئی آواز مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے نکلی۔ پھر دھند سے خوبصورت لمبی انگلیوں والا ہاتھ باہر نکلتا محسوس ہوا۔ ''بیٹھ جاؤ۔۔۔ ورنہ ماروں گی۔''

''گلنازی۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے پھر اسی کا نام لیا۔

''میرا کوئی نام نہیں ہے۔'' خوبصورت مسکراتے چہرے پر روشن شعاعیں پھیل گئیں۔ ''میرا نام جو تم نے اپنے دل پر نقش کر رکھا ہے، تمھارے لیے باعثِ تسکین ہو سکتا ہے، لیکن سچ تو یہی ہے کہ میرا کوئی نام نہیں ہے۔''

میں نے اپنی پوری شعوری کوشش سے، پہلی بار آنکھیں کھول کر لاانتہا حسن کو دیکھا۔

''تو پھر تم کون ہو؟'' میں نے کہا۔ ''تمھارا چہرہ تو گلنازی جیسا ہے۔''

''میں حسنِ فطرت ہوں۔ تم مجھے روحِ حسنِ فطرت بھی کہہ سکتے ہو... میں لاابتدا بھی ہوں، لاانتہا بھی — اس کائنات میں جتنے نظامِ شمسی ہیں، ان میں جتنے بھی حسن و جمال کے مظہر ہیں، سب میرے ہیں۔ میرے پاس نہ بدصورتی ہے نہ بدنمائی... تم نے شکایت کی کہ تمھیں بدصورتی، بدہیئتی اور بدنمائی نے دکھ دیے ہیں — میرے پاس بدہیئتی بھی نہیں ہے، لیکن اگر بدہیئتی میں روح کی خوبصورتی ہو تو وہ خوبصورتی بھی میری ہے۔ ظاہر کی بدصورتی باطن کی خوبصورتی ہو سکتی ہے، ظاہر کی بدنمائی باطن کی خوش نمائی ہو سکتی ہے، لیکن اس کائنات میں میری حریف قوت ایسا ہونے کی راہ اپنے سائے سے روکتی ہے۔ تمھارے اور سیدھی سادی دیہاتی لڑکی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، میں نے نہیں کیا — میں کسی کو دکھ دے ہی نہیں سکتی۔ اس کائنات میں، میری ضد پر بھی ایک قوت موجود ہے — بدصورت، بدہیئت، بدنما، گھناؤنی، دکھ، درد اور سوزش میں مبتلا کرنے والی، زہریلی ہوس کی قوت... تمھیں جتنے دکھ بھی دیے ہیں، اسی نے دیے ہیں۔ وہ حسن و جمال کو برداشت نہیں کر سکتی۔ سایہ بن کر میری راہ روکنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن روک نہیں پاتی اور نہ ہی خود اپنی بدصورتی، بدہیئتی اور بدنمائی سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔''

میری آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں۔ میں دھند میں بے انتہا خوبصورت چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔

''تم گلنازی ہو،'' میں نے کہا۔ ''تمھاری صورت گلنازی جیسی ہے۔ اور تم کہتی ہو تمھارا کوئی نام نہیں۔''

خوبصورت سریلی آواز میں قہقہہ سا سنائی دیا۔

''نہیں، میرا کوئی نام نہیں ہے۔ بچپن سے تمھارے ساتھ ہوں، تم نے بار بار مجھے محسوس تو کیا، لیکن دیکھ نہ پائے، اس لیے کہ ہمیشہ سے میں لاشکل رہی ہوں۔ جب سے اس کائنات کی تشکیل ہوئی ہے اور جب سے اس زمین پر انسان نے آنکھ کھولی ہے، میں آج تک کسی پر ظاہر نہیں ہوئی۔ مجھے ظاہر تو ہونا تھا — میں نے تمھیں اپنے لیے چن رکھا تھا۔ تم اس زمین پر ظاہر ہوئے — میں نے تم پر ہی

ظاہر ہونا تھا۔ تمھیں یہ بات تو یاد نہیں ہوگی، جب تم بہت ہی چھوٹے تھے، ایک برس سے بھی کم، تو موسم گرما میں گھر کی چھت پر، بستر پر لیٹے چاند اور ستاروں کو دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ تمھیں چھٹکی ہوئی چاندنی میں ستاروں کو دیکھتے ہوئے میرا احساس ہوا کرتا تھا۔ یاد کرو۔ تمھیں یاد ہوگا، جب تم صرف تین برس کے تھے تو تم نے ایک چھوٹی سی بچی کو چانٹا مارا تھا۔ وہ رودی تھی تو تمھیں اپنے دل میں ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی تھی اور تم نے بھی رونا شروع کر دیا تھا اور ننھے ننھے ہاتھوں سے اس بچی کے آنسو پونچھے تھے۔ وہ ٹیس میری دی ہوئی تھی اور وہ ہاتھ بھی میرے ہی تھے۔ یاد کرو، جب چار برس کی عمر میں تم بڑی آپا کے گھر، ایک گاؤں جانے کے لیے پیدل ہی گھر سے نکل پڑے تھے تو تمھاری انگلی میں نے تھامی تھی۔ یاد کرو، نیم پہاڑی علاقے میں، خوبصورت پھولوں پر رنگین تتلیاں اڑتی پھرتی تھیں تو تم دوسرے بچوں کی طرح ان کے پیچھے نہیں بھاگتے تھے اور کچھ دیر بعد وہی تتلیاں تمھارے آس پاس تھر کنے لگتی تھیں۔ میں ہی انھیں تمھارے پاس بھیج دیا کرتی تھی۔ جب خوبصورت پھولوں، رنگین تتلیوں، زردرو بھونروں میں گھرے، تم مہکی ہوئی ہوا میں کھل اٹھتے تھے تو میں مہک میں اڑتی ہوئی تمھارے رخساروں کو چھولیا کرتی تھی۔ تمھیں یاد تو ہوگا۔ کچھ بڑے ہو جانے پر جب تمھیں اپنے ذوقِ جمال سے آشنائی ہوئی تھی، جب تم اپنے گرد روشنی کے پردے تنے ہوئے دیکھا کرتے تھے، صحنِ گلشن میں خوبصورت پھولوں سے اٹھتی ہوئی نکہت تمھیں رنگوں کی طرح روشنی میں تیرتی محسوس ہوا کرتی تھی تو کوئی پری تمھیں چھو کر گزر جاتی تھی۔ وہ کوئی پری نہ تھی، میں تھی۔

''میں روحِ حسن فطرت ہوں۔ تمھیں اپنا تصور دینے کے لیے مجھے کسی انسانی چہرے اور بدن کی ضرورت تھی۔ میں نے اس گاؤں میں رہنے والی، دنیا کی خوبصورت ترین، بھولی بھالی، بچوں جیسی لڑکی کو چنا جو یہاں کی رہنے والی نہیں ہے . . . دنیا کی خوبصورت ترین وادی کی بیٹی ہے۔ میں تمھیں اپنا آپ دکھانے کے لیے یہاں لے آئی۔ تمھیں مجھے دیکھنے کے لیے، میرا تصور قائم کرنے کے لیے کسی انسانی چہرے کی ضرورت تھی جو زندگی بھر قائم رہے۔ میں نے وہ چہرہ تمھیں دکھا دیا — ہاں، یہی چہرہ جو تم اس وقت دیکھ رہے ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میں وہ لڑکی نہیں ہوں اور نہ ہی میرا کوئی نام ہے۔ اس دنیا میں، اس زمین پر میرا کوئی جسم نہیں ہے۔ تم نے اس بھولی بھالی لڑکی کے جتنے بھی روپ دیکھے ہیں، وہ میرے تھے۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی چمکتی مسکراتی آنکھیں، اس کی

بار بار رخسار پر گرنے والی زلف، اس کا اندازِ نگاہ، اس کا رخسار پر گری ہوئی زلف کو انگلی سے ہٹا کر، اپنے گھٹنے پر رخسار رکھ کر، مسکراتی ہوئی، چمکتی آنکھوں سے دیکھتے رہنا— اس کی ہر ادائے ناز میری تھی جسے دیکھ دیکھ کر تم خود سے بیگانہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس کی پہلی نظر سے آخری خمار آلودہ نگاہ تک، جس سے اس نے تمھیں گاؤں سے جاتے وقت دیکھا تھا— وہ نگاہِ ناز میری تھی۔ اس کی خوبصورت آواز اور سُر میرے دیے ہوے تھے۔ میں تمھیں اپنا آپ دکھانا چاہتی تھی۔ اس کے اندازِ خرام میں میں تھی۔ اس کا سکوتِ ناز میرا تھا۔ میں تم پر ظاہر ہونا چاہتی تھی، کیونکہ میں نے اس کائنات میں پہلی بار کسی انسان کو اپنے لیے چنا ہے اور وہ تم ہو۔ تمھارا دل ہی وہ دل ہے جس میں میں سما سکتی ہوں۔"

میں نے پلکیں جھپکتے ہوے خوبصورت مسکراتے چہرے کی سمت دیکھا جو بہت روشن تھا۔

"کیا تم کوئی دیوی ہو؟" میں نے کہا اور خوبصورت دھیما سا قہقہہ سنائی دیا۔

"کہا نا کہ میں روحِ حسنِ فطرت ہوں۔" دھند میں روشنی سی پھیل گئی۔ "تم جاننا چاہو گے کہ میں کیا ہوں، کہاں رہتی ہوں؟ میں کائنات میں موجود ہر نظامِ شمسی کے دلکش مناظر میں رہتی ہوں۔ میں وہ حسنِ فطرت ہوں جو لاابتدا ہے، میں وہ جمالِ فطرت ہوں جو لاانتہا ہے۔ لاانتہا خلاؤں میں جتنے رنگ ہیں، میرے ہیں۔ اس زمین پر، انسانوں کی دنیا میں، جہاں میں نے تمھیں اپنے لیے چنا ہے۔ حسنِ فطرت کے ہر مظہر میں، لافنا روح کی طرح میں ہی تو رہتی ہوں۔ زمین کے کناروں پر پھیلے ہوے برفاب میں میں ہی چمکتی ہوں۔ برفشار کے سمندروں میں گرنے سے فضا کی سمت بلند ہونے والی نیلاہٹوں میں میرے رنگ ہیں۔ کوہساروں کی چوٹیوں پر پڑی برف سے کہرے کی مانند میں ہی اٹھتی ہوں۔ برف پوش وادیوں میں، شبِ مہتاب کی روشن شعاعوں کے سیلاب میں میں ہی بہتی ہوں۔ سرسبز میدانوں میں میں ہی روشنی کی شعاعیں بن کر لہراتی ہوں۔ کھیتوں کی فصلوں میں جب ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہے تو پودوں کی لہلہاہٹ میں میں ہی لہراتی ہوں۔ گرتی ہوئی آبشاروں سے، بہتی ہوئی ندیوں سے، جھیلوں سے، دریاؤں سے پوچھو، وہ تمھیں میری خبر دیں گے۔ درختوں کی شاخوں سے گزرنے والی ہوا سے پوچھو، وہ تمھیں میری خبر دے گی۔ صحراؤں میں دور دور تک پھیلی ریت پر چمکتی ہوئی چاندنی کی شعاعیں تمھیں میرا پتا بتائیں گی۔ ساحلوں پر ٹوٹتی ہوئی ہر چھال میں، اڑتے ہوے ہر قطرے میں میں ہی تو اڑتی ہوں۔ جزیروں کی ہواؤں میں میری ہی سرسراہٹ سمندروں کے

پیغامات لاتی ہے۔

''تم نے مجھے بہت تلاش کیا ہے — میں ہر دم تمھارے ساتھ تھی۔

''میں سمندر سے اڑنے والے بخارات کو اڑاتی ہوں، بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں اڑتی ہوں۔ بلند چٹانوں پر کبھی برف کے ساتھ تو کبھی بوندوں کے ساتھ اترتی ہوں۔ وہ برف پگھل کر، وہ بوندیں رس کر میرے چشموں میں ابلتی ہیں، میری آبشاروں سے گرتی ہیں، ندیوں میں بہتی ہیں، جھیلوں سے پھر ندیوں کی طرح نکلتی ہیں، دریاؤں کا روپ بناتی ہیں۔ پہاڑوں، میدانوں، جنگلوں اور بیابانوں سے گزرتی ہیں اور سمندروں سے جا ملتی ہیں۔ میرے رستے میں میری حریف قوت بہت سی آلائشیں بھی بکھیر دیتی ہے۔ وہ حسنِ فطرت کے لطیف مظاہر میں بدنمائی کے شدید مظاہر دکھانے لگتی ہے۔ وہ چشمہ حیات کو فنا کی آلائش سے مٹانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ وہ مجھے گردشِ مدام کا اسیر بنانا چاہتی ہے، لیکن میں کبھی قطرۂ شبنم کی طرح، کبھی پھول کی خوشبو ہو کر گردش کو توڑ دیتی ہوں — میں اپنی حریف قوت کی دسترس سے باہر ہوں اور لافنا ہوں۔

''میں نے اس زمین پر، اس دنیا میں تمھیں اپنے لیے چنا ہے۔ تمھارا یہ مادی جسم، جسے دوام نہیں ہے — میری عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مجھے تمھیں اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔ جب تم اپنی آخری سانس لو گے، میں تمھیں کائنات کی وسعتوں میں لے جاؤں گی۔

''یہ تم ہی تو ہو جس نے آج سے پہلے مجھے لاشکل بھی دیکھا ہے۔ ان چند صاحبِ بصارت اور صاحبِ بصیرت لوگوں کی مانند جنھوں نے اپنے ذوقِ جمال سے مجھے لاشکل دیکھا، لیکن میری حقیقت سے آشنا نہ ہو پائے، تم نے بھی مجھے دیکھا اور مجھے تلاش کرنے لگے، کیونکہ تم میری حقیقت کو اپنے دل میں، تجسس کی مانند محسوس کیا کرتے تھے۔ تم نے اس کائنات میں، جہاں تک تمھاری نظر جاتی رہی، مجھے دیکھا تو میری جستجو بھی کی۔ دلکش رنگوں میں، آسمان کی نیلاہٹوں میں، ابرِ شفق آلودہ میں، سرمئی بادلوں میں، برستی بوندوں میں، رم جھم میں، بوچھاڑوں میں... تمھیں یاد تو ہوگا جب بچپن میں بارش میں نہاتے ہوئے اپنے بدن پر میری بوندوں کی مار کھا کر تم کھلکھلا کر ہنسا کرتے تھے تو میں ہوا کے جھونکوں میں آ کر تمھارے رخسار چوم لیا کرتی تھی اور تم اس انجانے سے لمس سے شرما جایا کرتے تھے۔ پھر جب بارش تھم جاتی تھی، تم آسمان کی سمت نظریں اٹھا کر قوسِ قزح کو دیکھا کرتے تھے تو

سات رنگوں میں تمھیں میرا احساس ہوا کرتا تھا— تم مسکرانے لگتے تھے۔ چمکتی ہوئی مسکراتی آنکھوں سے میرے رنگوں کے اتصال کو دیکھا کرتے تھے تو میں تمھاری آنکھوں پر آنکھیں لاکر، پھر ان پر اپنے ہونٹ رکھ دیا کرتی تھی۔ تم پلکیں جھپکا جھپکا کر قوسِ قزح کو دیکھنے لگتے تھے اور تمھیں ساتوں رنگ ایک ہی روشنی میں مدغم دکھائی دیا کرتے تھے۔ موسمِ بہار میں جب تم گلِ نو دمیدہ کی طرح اپنے اردگرد روشنی کے تنے ہوئے پردوں میں مہکا کرتے تھے، میں موجِ گل بن کر رنگِ صبا میں آیا کرتی تھی، اپنے لبوں سے تمھارے لبوں کو چھو جایا کرتی تھی۔ تمھارے سارے بدن میں پُرخمار کپکپی سی دوڑ جایا کرتی تھی اور تمھاری خمار آلودہ آنکھوں میں نیند شرمانے لگتی تھی۔''

مجھے اپنے بدن میں خوبصورت سی کپکپی محسوس ہوئی۔ میرے ہونٹوں پر مغموم سی مسکراہٹ آئی ہوگی، روشنی کی شعاعوں میں روحِ حسنِ فطرت کا چہرہ، کائنات کا سب سے خوبصورت چہرہ دمک گیا۔

''تمھیں یاد ہے، جب تم چھوٹے سے لڑکے تھے تو اکثر بےوجہ اداس ہو جایا کرتے تھے۔ گھر کی چاردیواری میں تمھارا دم گھٹا کرتا تھا۔ تم باہر پہاڑیوں میں آ جایا کرتے تھے۔ ایک روز سہ پہر کو تم اکیلے چٹانوں میں پھر رہے تھے۔ تمھاری اداسی اس قدر گہری تھی کہ تمھارے چہرے پر اداسی نے نقاب سے ڈالنا شروع کر دیے تھے۔ اسی لمحے تمھیں سامنے ایک چٹان پر ہدہد نظر آیا۔ جیسے ہی تم نے اسے دیکھا، اس نے پر پھیلائے، تاج پھیلایا، اِدھر اُدھر بولتے ہوئے چلنے لگا۔ پھر اس نے پر پھیلا کر تاج کو آگے پیچھے جھلایا، اِٹھلا کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا، پھر اس نے پر پھیلا کر رقص کیا، پر پھلا کر، تاج جھلا کر، منقار اٹھا کر وہ دیر تک ناچا، اس نے اپنے دلکش انداز میں تمھیں اتنا لبھایا کہ تم مسکرانے لگے، تمھاری آنکھوں میں مسکراہٹ چمکنے لگی اور تمھاری ساری اداسی، نقاب کے ساتھ، ہوا کے جھونکے اڑا کر لے گئے — وہ میں ہی تو تھی جس نے ہدہد سے کہا تھا کہ دیکھو، میرے محبوب کی اداسی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ تم نے مجھے پرندوں کی اڑان میں دیکھا، ان کی خوبصورت آوازوں کو پہچانا اور مجھے تلاش کرتے رہے۔ تم نے مجھے جیٹھ کی تپتی زمین پر حسنِ تمازت میں دیکھا، جب تم جھلتی دوپہریں چھوٹے سے ببول کے نیچے گزار دیتے تھے۔ تم نے مجھے گھنے پیڑوں کی چھاؤں میں دیکھا، جہاں پتوں سے چھن چھن کر آنے والی کرنیں دائرے سے بنا دیا کرتی تھیں۔ اپنے دل کی کسک میں، ہوا سے سنسناتے چھوٹے چھوٹے پیڑوں کی شاخوں میں، جنگلی بیریوں کے اوپر اڑتی تتلیوں میں، جھاڑیوں

کے عنابی رنگ میں — تم نے مجھے دیکھا ہے۔ وہ میں ہی تو تھی جو جیٹھ کی سونی دوپہروں میں تمھیں ببول کی ننھی منی چھاؤں میں کسی بچے کی طرح سلا دیا کرتی تھی۔ وہ میں ہی ہوں۔ آج پہلی بار تم نے مجھے ایک انسانی چہرے میں دیکھا — یہ تصور میں نے زندگی بھر کے لیے تمھیں دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میرا کوئی نام نہیں، کوئی جسم نہیں۔''

میں نے چمکتی مسکراتی آنکھوں کے ساتھ، بدلی سے نکلتے ہوئے سورج کے احساس کے ساتھ اپنے چہرے کی مسکراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے، اپنے سامنے کائنات کے سب سے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔

''مجھے سب کچھ یاد ہے،'' میں نے کہا۔ ''میں تمھارے احساس میں، تمھارے لیے کتنا تڑپا ہوں، مجھے وہ بھی سب یاد ہے۔ تمھاری تلاش میں، میں کس قدر سرگرداں رہا ہوں، مجھے سب یاد ہے، لیکن تم نے یہ کیا کیا؟ مجھے انسانی چہرے کا تصور دینے کے لیے انسانی جسم تلاش کیا، اس جسم میں مجھ سے محبت کے احساسات، جذبات جگائے اور پھر ان سب کو سلاتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس پر کیا گزرے گی؟ تم نے کیوں اسے دکھوں کی تاریکیوں میں دھکیل دیا؟ تم تو کائنات میں حسن و جمالِ خیر ہو... تم تو رحم اور ہمدردی کی لافنا مثال ہو... تم تو دیا کا ساگر ہو... تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس سیدھی سادی، بھولی بھالی بچی جیسی لڑکی کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر کروٹیں لینے کے لیے چھوڑ دیا — کیوں؟''

خوبصورت چمکتی آنکھوں نے میری سمت پلکیں جھپکاتے ہوئے دیکھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے الزام نہ دو۔ یہ سب کچھ میری اس حریف قوت نے کیا ہے جو اس کائنات میں مجھے برداشت نہیں کرتی۔ جب اس زمین پر میں نے تمھیں اپنے لیے چن لیا تو وہ بھسم سی ہوگئی۔ وہ بھی تمھیں اپنے لیے منتخب کرنا چاہتی تھی، لیکن میں نے اس سے پہلے تمھیں چن لیا تھا۔ وہ خاکستر ہوگئی۔ پھر چنگاریاں بن کر اڑی، شعلے بن کر لپکی۔ اس نے مجھے مبارزت کے لیے للکارا — وہ گردباد کی طرح چیخی، آندھی کی طرح غضبناک ہوکر اٹھی۔ اس نے مجھ سے کہا: تو نے جس انسانی وجود کو منتخب کیا ہے، جس انسانی جسم میں موجود اپنے جیسے حسن و جمال کے مظہر کو اپنے لیے چنا ہے، میں اسے تجھ سے چھین لوں گی۔ وہ اسی لمحے تک تیری بانہوں میں رہے گا جس لمحے تک وہ میرے ہوس

کے جال سے آزاد رہے گا۔ میرے ہوس کے جال سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ میں اس پر بھی یہ جال پھینکوں گی۔ نہ پھنسا تو بار بار پھینکوں گی۔ اگر تجھے خود پر اعتماد ہے تو میری راہ نہ روکنا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کسی کی راہ نہیں روکا کرتی۔ یہ تیری خصلت ہے۔ بول، تو کیا کہنا چاہتی ہے؟

''یہی کہ جسے تو نے چنا ہے، اسے بچانے کے لیے میرے سامنے نہ آنا۔ دیکھ، اگر تجھے خود پر اعتماد ہے کہ تو نے جسے اپنے لیے چنا ہے وہ ہمیشہ تیرا ہی رہے گا، تو آ . . . میں عربدہ جو ہوں، میدان مانگتی ہوں۔ یا تو یہ جسم، جسے تو نے اپنے لیے چنا ہے، مجھے دے دے، خاموشی سے میرے حوالے کر دے، یا پھر میدان میں آ . . . میں اسے تجھ سے چھین کر دکھاؤں گی۔ تو بس ایک بار اسے اپنا انسانی روپ دکھا۔ ایسا انسانی بدن چن جس کا حسن و جمال بے مثال ہو۔ اس میں اتر اور اپنے منتخب کردہ، نوجوانی کی دہلیز پر کھڑے لڑکے کو اپنا آپ دکھا۔ میری شرط صرف اتنی ہے کہ وہ جسم جس میں اتر کر تو اپنے محبوب کو اپنا آپ دکھائے گی، وہ پہلے ہی کسی کے لیے مخصوص ہو — کسی دوسرے مرد کے لیے۔ وہ پہلے ہی سے منسوب ہو اور تیرے اس چنے ہوئے محبوب کے لیے اُس جسم سے ہجرِ دوام وابستہ ہو۔ پھر دیکھ، میں کیا کرتی ہوں۔ تو میرے جبلتوں سے بنے جال کو نہیں جانتی۔ جب میں تیرے محبوب کو ہوس کے جال میں پھانسوں گی اور اسے ہجرِ دوام کی آتش میں جلا دوں گی۔ تیرا محبوب، جسے تو گلِ نودمیدہ کہتی ہے، جسے بار بار اپنے لبوں کا لمس دیتی ہے، چومتی ہے، وہی خار بن کر تیرے ہونٹوں میں پیوست ہو جائے گا۔ تیرا محبوب، جسے تو ہرن کا بچہ کہتی ہے، جس کے رخساروں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دیر دیر تک تکتی رہتی ہے، وہی درندہ بن کر تیرے سامنے آئے گا — خونخوار درندہ۔ پھر میں تجھ سے پوچھوں گی کہ اس کائنات میں تو لافنا ہے یا میں؟ کس کی قوت لافنا ہے۔ تیری یا میری؟ آ، میں عربدہ جو ہوں، میدان مانگتی ہوں۔ یاد رکھ کہ اگر میں فتح مند ہوئی تو یہ جسم، جسے تو محبوب کہتی ہے، جسے تو نے اپنے لیے چنا ہے، میرا غلام ہوگا۔ میں اس کے سر پر وہ بالوں کا گچھا لٹکا دوں گی، جس کے ایک ایک بال سے لاکھوں خواہشیں چمٹی ہوں گی۔ میں ہر بال پر ہوس کے قطرے گرا گرا کے شدت سے آشنا کر دوں گی۔ خوف اور خود غرضی — میرے ان دو پنجوں میں اسیر ہو کر تیرا محبوب کٹھ پتلی کی طرح میرے ہاتھوں کی ہر جنبش پر ہولناک رقص کرے گا — خون آشامی کا رقص۔ میرا ہر تقاضا پورا کرے گا۔ میں اُسے دنیا کا سب سے خطرناک، خوفناک، حریص اور برا آدمی بناؤں گی۔ میں اس کی

آنکھ سے وہ پتلی ہی نکال دوں گی جسے تو انسان کہتی ہے اور جو اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکتی ہے۔ تیرا آج کا محبوب تیرا اکل کا سب سے بھیانک دشمن ہوگا۔ وہ تضاد سے متعلق میری بنائی ہوئی تمام مثالوں سے بڑھ کر بدترین مثال ہوگا۔ آ . . . ہمت ہے تو میدان میں آ . . . میں عربدہ جو ہوں!

''اس پر میں نے اسے کہا: جنگ اور مقابلہ میں نہیں چاہتی، لیکن اگر تو عربدہ جو ہے، میدان مانگتی ہے، تو مجھے تیری مبارزت کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ میں جانتی ہوں کہ جنگ اور مقابلہ خونریزی سے نہ بھی ہو تو بھی کسی نہ کسی کے لیے باعثِ درد ضرور ہوتا ہے، اور تیری تو تسکین ہی انسانوں کے درد سے جڑی ہوئی ہے . . . تو خون دیکھ کر بدمست ہو جاتی ہے، دردناک چیخیں تجھے قہقہے لگانے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ تو اس زمین پر ہولناک جنگیں کراتی رہی ہے اور ان میں خونریزی سے لذت پسندی کی تیری خُو زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ جب بھی اس دنیا میں تو انسانوں کے درمیان، انھیں حیوان اور درندے بنا کر، جنگ کراتی ہے تو خونریزی اور آتش انگیز خون داری اور درندہ صفت خون آشامی سے بدمست ہو ہو جاتی ہے، اور جب تک جنگ کی چکّی چلتی رہتی ہے، تو اپنے بھیانک روپ میں بدمستی سے سرشار رہتی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ تُو اس مقابلے میں بھی کسی نہ کسی کو درد دینا چاہے گی، میں تیرا ساتھ تو نہیں دوں گی، لیکن معصومیت کا دفاع کرنے، اس کے درد کو کم کرنے کے عزم کے ساتھ تیری مبارزت کا مقابلہ منظور کرتی ہوں۔ میں اس دنیا کی انتہائی خوبصورت دوشیزہ کے بدن میں اتروں گی۔ اس پہلی نظر کے ساتھ جب وہ میرے محبوب کو دیکھے گی، میں اس کے بدن میں عارضی طور پر سما جاؤں گی۔ تیری خواہش کے مطابق وہ پہلے ہی سے کسی کی منسوب ہوگی . . . یہ میرے لیے بھی بہتر ہے۔ میں لافنا ہوں، فانی بدن میں نہیں رہ سکتی۔ میرے محبوب کا بدن بھی میری عارضی قیام گاہ رہے گا کیونکہ میں فانی جسم کے فنا ہونے پر اسے ہمیشہ کے لیے کائنات کی وسعتوں میں لے جاؤں گی۔ مجھے اس دنیا میں، اس زمین پر بھی اپنے محبوب ہی کے پاس رہنا ہے۔ میں نے اسے اپنے لیے چنا ہے۔ میری اس سے وابستگی لافنا ہوگی۔ میں اس کے بدن کے سوا کسی جسم سے عارضی پیوستگی نہیں چاہتی۔ تو نے جو کرنا ہے، کر لینا۔ تو میرے محبوب کو مجھ سے نہیں چھین سکے گی۔ تو اُس کے سر پر تاریک خواہشات والے بالوں کا گچھا اُگانا چاہتی ہے؟ وہ تیرے اُگائے ہوئے بالوں کے گچھے کا ایک ایک بال کاٹ دے گا۔ آ، اس گاؤں کو میدان بنا لے۔ یہاں پہلے سے تیرا شکار بچہ بھی موجود

ہے، دُنیا کی خوبصورت ترین دوشیزہ بھی موجود ہے۔ میں اپنے محبوب کو یہاں لے آتی ہوں۔ تو اپنی ساری قوت صرف کر دینا، وہ خواہشِ حاصل کا ایک ایک تار کاٹ دے گا۔ تو اسے کیا درندہ بنائے گی! وہ میرا ہرن کا بچہ ہی رہے گا۔ تو اسے کیا خار بنائے گی! وہ میرا گلِ نودمیدہ ہی رہے گا۔ اس کے دل میں نہ رقابت جگہ پائے گی، نہ انتقام، نہ ہی کوئی منفی رویہ۔ یہ میرا یقین ہے، میرا اعتماد ہے۔ میں نے اسے اپنے لیے بے وجہ نہیں چنا۔ تو کچھ بھی کر لینا، ہر حربہ آزما لینا، تو میرے محبوب کو نہیں چھین پائے گی۔ میرے محبوب میں وہ عزتِ نفس فروغ پا چکی ہے جو لافنا روشنی ہے۔ یہ روشنی میں نے اپنے وجود کی شعاعوں میں سے ایک ایک شعاع لے کر اپنے محبوب کے دل میں بسائی ہے۔ اسے تیری تاریکی ڈھانپ نہ سکے گی۔ میں نے اپنے محبوب کو اپنے جیسا بنایا ہے، تو اسے اپنے جیسا نہ بنا پائے گی۔ ہار جائے گی۔ پھر میں تجھ سے اتنا ضرور پوچھوں گی کہ کائنات میں تیرا مقام کیا ہے؟

''پھر جو کچھ ہوا ہے، تم دیکھ چکے ہو . . . جانتے ہو۔ تمھیں اس بھولی بھالی، بچی جیسی دوشیزہ سے جدا ہونا ہی تھا، جس کے بدن میں میں تم پر ظاہر ہوئی اور جس کا چہرہ لیے میں آج تمھارے سامنے ہوں۔ میری حریف قوت کا یہی تاریک وار تھا۔ وہ تمھیں انسان سے حیوان بنا دینا چاہتی تھی، لیکن آج وہ کہیں پاتال میں منھ چھپائے، تاریکی میں خود کو اپنے آپ سے بھی چھپا رہی ہوگی۔''

دھند میں کائنات کے سب سے خوبصورت چہرے کے گرد روشنی کی شعاعیں لہریں سی بنا رہی تھیں۔

''اس کا آخری وار بہت زہریلا تھا۔ میں بھی پریشان تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے تمھیں شدید قسم کے ذہنی انتشار کا شکار بنا دیا ہے اور اس کیفیت میں، اس فشار میں، کوئی بھی انسان شدت کے ساتھ آسودگی کی خواہش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس نے تمھیں شدید قسم کی پیاس دینے کے لیے تمھارے سینے کو انگاروں سے بھر دیا تھا۔ پھر اس نے اپنے زہریلے پنجے — خودغرضی — کو آگے بڑھایا۔ ہوس کا یہ زہریلا پنجہ تمھیں دبوچنے کے لیے تیار تھا۔ میں خاموش کھڑی دیکھ رہی تھی۔ شرط کے مطابق میں تمھیں روک نہیں سکتی تھی۔ کھیت میں مکئی کے کمر کمر تک اونچے گندم کے پودوں میں آج میرے اعتماد کا بڑا امتحان تھا۔ میری حریف قوت آخر میں خود تمھیں گندم کے کھیت میں ڈسنا چاہتی تھی۔ زہریلی ناگن کا پھن کھلا تھا۔ وہ تمھیں ہوس کی دلدل میں گرانا چاہتی تھی تاکہ ڈسنے کے بعد تمھیں

ہمیشہ کے لیے دلدل میں ڈبو دے۔ لیکن مجھے اس تربیت پر اعتماد تھا جو میں تمھیں بچپن سے دیتی آئی ہوں۔ مجھے اعتماد تھا کہ میں نے تمھیں انسانیت کے جس مقام پر کھڑا کر دیا ہے، تم وہاں سے نہیں گرو گے۔ اور وہی ہوا۔ ۔ ۔ اے محبوب، میری تربیت کے انمول شاہکار، آج تو نے اس نبرد آزمائی میں مجھے میری حریف قوت پر فتح دلائی ہے، جس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کو انسان صرف اُس کی عزتِ نفس بنایا کرتی ہے — نہ خوف انسان کو انسان بناتا ہے، نہ خود غرضی۔ عجز و رضا، بیم و رجا — یہ سب تاریکی ہی کے سائے ہیں۔ آج میں تمھارے سامنے اپنی درخشانی کے ساتھ کھڑی ہوں اور میری حریف قوت پاتال میں زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی ہے۔ میں جیت چکی ہوں، تم میرے ہو چکے ہو۔ میں آج ہی تمھارے بدن میں سما جاؤں گی۔ تمھاری اس مادی زندگی کے اختتام تک میں تمھارے ساتھ رہوں گی، یہاں تک کہ تمھاری آخری سانس تمھیں اس مادی زنداں سے رہائی دلوائے گی، اور میں تمھیں کائنات کی وسعتوں میں لے جاؤں گی۔ تم میرے ہو۔ میں آج ہی، ابھی کچھ دیر بعد، تمھارے وجود کے خالی حصے کو بھر دوں گی۔ میں تمھارے بدن میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ اس دنیا میں، اس زمین پر، اب میرا اور کوئی بدن نہیں ہے۔ میں تمھارے ساتھ اسی کیفیت میں رہوں گی جو آج تمھاری عمر نے تمھیں دے رکھی ہے۔ یہی لڑکپن ہمارے ساتھ رہے گا، تمھارا بدن جوان ہوگا، ادھیڑ پنے سے گزرے گا، بوڑھا ہو جائے گا، لیکن تمھارے بوڑھے بدن میں بھی، تم میرے ساتھ اسی لڑکپن کی کیفیت میں رہو گے۔ تم پر نہ شباب آئے گا نہ ادھیڑ پن، نہ بڑھاپا۔ تم یہی رہو گے جو ہو، لیکن تمھارا تجربہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے گا۔ میں تمھارے ادراک کا منبع ہوں، تمھارا وجدان ہوں، تمھاری ذہانت ہوں، تمھارا ارتقا ہوں، لیکن میں تمھاری قلبی حالت کو اسی لڑکپن میں رکھوں گی جہاں تمھیں محبت کی پیاس ہوگی، لیکن تم جنسی خواہشات سے آلودہ نہیں ہو گے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ اس زمین پر، اس دنیاوی زندگی میں میری ہی دی ہوئی ذہنی ارتقا پذیری سے جو جسمانی تقاضے تم میں رونما ہوں گے، میں تمھیں ان سے محروم کر دوں گی۔ نہیں — میں تمھیں محروم نہیں کروں گی۔ تم ایک انسانی جسم ہو، جسے زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہوگی۔ میں تمھارے ساتھ رہوں گی اور تمھیں تمھارے اس حق سے محروم نہ ہونے دوں گی، لیکن تمھیں کبھی بھی، تمھاری ضرورت سے زیادہ نہ کھانے دوں گی، نہ پینے دوں گی — اس لیے کہ جہاں تمھاری ضرورت ختم ہوتی ہے، وہاں

سے دوسروں کی ضرورت کا آغاز ہوتا ہے، اور ان کی ضرورتیں پورا ہونا ان کا حق ہے۔ میں تمھیں موسموں کے تغیر وتبدل سے بھی بچاؤں گی۔ تمھاری ضرورتیں پوری ہوں گی، لیکن تمھیں ضرورت سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا۔ میں تمھیں زمستاں میں ٹھٹھرنے نہ دوں گی، تابستان میں جھلسنے نہیں دوں گی۔ میں تمھیں حیاتی زندگی سے محروم نہیں کروں گی۔ میرا کوئی بدن نہیں ہے اور تمھیں حیاتی زندگی میں آسودگی کے لیے انسانی بدن کی ضرورت ہوگی، ایک نسوانی بدن کی، جو تمھاری فطری ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ میں خود کبھی بھی تمھیں حیاتی زندگی کی آسودگی نہ دے پاؤں گی، کیونکہ میرا کوئی بدن نہیں ہے۔ میں کسی مادی بدن میں اسیر نہیں ہو سکتی۔ تمھارا یہ مادی جسم تمھارا زنداں ہے۔ میں اُسی لمحے تک اس بدن میں تمھارے ساتھ ہوں، جس لمحے میں اس زنداں کا در کھلے گا، تمھارا بدن میرے لیے زنداں نہیں ہے۔ زنداں کا در کھلنے پر میں تمھیں ساتھ لے کر کائنات کی وسعتوں میں چلی جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ کائنات کی وسعتوں میں رواں ہو جاؤ گے۔ تمھارے بدن میں رہ کر بھی میں تمھارے بدن سے بلند رہوں گی۔ تمھاری حیاتی زندگی کے لمحے تمھارے ہوں گے — میرا وجود حیاتی زندگی سے بلند رہے گا۔''

نہ جانے کیوں، کائنات کے سب سے خوبصورت اور دلکش چہرے کے سامنے مجھے اپنے وجود میں ایک دلکش سی، خوبصورت سی تشنگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہ تشنگی میرے وجود کے خالی حصے میں تھی، جسے میں گلنازی کے احساس سے بھرنا چاہتا تھا، بھر نہیں پاتا تھا...

''میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری حریف قوت شکست خوردہ ہو کر بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی نہ رہے گی۔ وہ کم ظرف ہے، شکست کو نہیں مانے گی۔ وہ پاتال سے نکلے گی، کسی آتش فشاں سے ابلتے ہوئے لاوے کی طرح اچھلے گی، پھٹ کر نکلے گی اور تمھیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گی۔ اب وہ جبر وتشدد کو اپنا ذریعہ بنائے گی۔ وہ اس دنیا میں بے ضمیر اور انتہائی لالچی لوگوں کا انتخاب کرے گی۔ انھیں مادی وسائل دے کر بہت طاقتور بنائے گی اور وہ تمھیں شدید قسم کے ذہنی اور جسمانی تشدد کے تجربات سے گزاریں گے۔ ان میں بے ضمیر، خوف کو ذریعہ بنانے والے، خودغرضی کے اسیر، درندہ صفت مرد بھی ہوں گے اور عورتیں بھی۔ وہ سب میری حریف قوت کے غلام ہوں گے، اسی کے اشاروں پر عمل کریں گے۔ وہ تمھیں اس قدر محرومیوں کا شکار بنائیں گے کہ تمھاری ذہنی حالت ابتر ہو

جائے گی۔ اس عقوبت کو دے کر ان کی کوشش ہوگی کہ وہ تمھیں میری حریف قوت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں۔ یہی میری حریف قوت کا تقاضا ہوگا — سب سے بڑا تقاضا۔ وہ تمھیں مجھ سے چھیننے کے لیے اپنے غلاموں، اپنے کارندوں کو، مادی وسائل سے غیر معمولی قوت دے گی، جس کے آگے دنیا کے باضمیر اور اچھے لوگ بے بس ہوں گے۔ میری حریف قوت کے نمائندے تمھیں زخم خوردہ کرتے ہوے اپنی آقا کا تقاضا پورا کرنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔ وہ انھیں اس دنیا کی ہر آسائش دے گی، وہ عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے، بہت آسودہ ہوں گے، لیکن بہت گھناؤنے اور درندہ صفت ہوں گے۔ وہ تمھیں بہت اذیت دیں گے، لیکن مجھے یقین ہے، اعتماد ہے کہ تم اپنے بدن میں مجھے کسی آلائش سے آلودہ نہ ہونے دو گے — آلائش جو میری حریف قوت کی ہوگی۔ تم ہر دکھ، ہر درد، سہہ جاؤ گے، لیکن میرا ساتھ نہ چھوڑو گے۔ یہی میری حریف قوت کی حتمی شکست ہوگی۔ وہ ہوس ہے۔ وہ تمھیں مجھ سے چھین کر اپنی ہوس کو آسودہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ تمھیں غلیظ دلدل میں کھینچ کر، تمھیں انسان سے حیوان بنا کر، ہوس کار بنا کر، مجھے شکست دینا چاہتی ہے۔ وہ تمھیں آسودگی کا لالچ دے کر گندگی میں گرانا چاہتی ہے۔ وہ تمھیں خوفزدہ کر کے تمھارے ذہن کو منتشر کرنا چاہتی ہے۔ وہ تمھیں اس دنیا کا سب سے خطرناک، خوفناک، درندہ صفت عفریت بنانا چاہتی تھی۔ ناکام ہو کر اب وہ منتقم ہو چکی ہے۔ وہ اب انتقام کا راستہ اپنا چکی ہے۔ وہ اب تمھیں اپنے قدموں پر جھکانا چاہتی ہے۔ وہ جلد ہی پاتال سے نکلے گی اور اس دنیا کے انتہائی سفاک اور بے ضمیر مردوں اور عورتوں کو تیار کرے گی کہ وہ اس کے انتقام میں اس کا ذریعہ بنیں اور تمھیں اذیت دیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب تمھارے بدن میں سما کر تمھارے وجود کا حصہ بن جاؤں گی تاکہ تمھاری اذیت کو کم کر سکوں۔ تم مجھے اپنے بدن میں زندگی بھر محسوس کرو گے۔ میرا احساس تمھارا ہوگا۔ میں اب تمھارے دل میں مکمل عزتِ نفس اور تمھارے ذہن میں تمھارا ذوقِ جمال بن جاؤں گی۔ تمھارا ہر لمس میرا ہوگا، ہر سماعت میری ہوگی، ہر بصارت میری ہوگی، لیکن تمھارا لمس، بصارت اور سماعت تم سے ہوگی، مجھ سے نہیں۔ ان لمحات میں، جن میں، میرا ہونا بہتر نہ ہوگا، میں تم سے جدا بھی رہوں گی — ایک ارفع وجود کی مانند۔

''تم چکھو گے تو قوتِ ذائقہ میری ہوگی، سونگھو گے تو قوتِ شامہ میری ہوگی۔ لیکن ہمیشہ یاد رکھنا

کہ تمھارے لمس، بصارت، سماعت کی مانند تمھاری قوت ذائقہ اور قوتِ شامہ بھی تم سے ہوگی، مجھ سے نہیں۔ تمھارے پانچوں حواس تم سے ہوں گے، مجھ سے نہیں، لیکن میں انھیں خود سے جدا بھی نہ جانوں گی۔ میں مادی اجسام میں قید نہیں ہو سکتی، لیکن تمھارا جسم ہی اس زمین پر ایسا جسم ہے جس کے خون میں میرا عنصر بھی گردش کر سکتا ہے۔ میں تمھارے بدن میں احساس کی مکمل لطافت کے ساتھ چونکہ رہ سکتی ہوں، رہوں گی۔ پھر جب تم مادی بدن سے آزاد ہو جاؤ گے، میرا عنصر تمھارے خون سے جدا ہو جائے گا۔ میں تمھیں کائنات کے اس حسن و جمال میں، تمھاری خوبصورت سی تشنگی کی آسودگی کے لیے جاؤں گی جو ابھی تمھارے لیے بھی نادیدہ ہے۔ اس دنیا کے رہنے والوں کے لیے اس کا تصور بھی ناممکن ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوے، کائنات کے سب سے حسین چہرے کی سمت دیکھا۔

"تم تو دیویوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم روحِ حسنِ فطرت ہو۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں اور اپنے ذہن کی وسعتوں سے یہ بات مانتا ہوں، کیونکہ میں نے تمھیں تمھارے احساس کے ساتھ بہت تلاش کیا ہے۔ اب تم جس حسن و جمال کی بات کر رہی ہو کہ اسے ابھی تک میں نے بھی نہیں دیکھا، تمھارا وہ حسن و جمال کیا ہوگا؟ مجھے تو تم اب بھی اس کائنات میں سب سے خوبصورت لگ رہی ہو۔ کیا جو تم نظر آ رہی ہو، اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہو؟ تم نے میری فگار روح میں پھر سے زندگی بھر دی ہے۔ تم نے میرے زخموں سے چور چور دل کی سب خراشوں کو، سب سوختہ حصوں کو چند لمحوں ہی میں نجات دلا دی ہے۔ میری تشنگی کو کڑواہٹ سے مٹھاس میں بدل دیا ہے۔ سب تلخی شیریں سی ہو گئی ہے۔ کیا تمھارے پاس اس سے بڑھ کر بھی آسودگی ہے؟ اگر ہے تو تم دیوی ہی ہوئیں۔"

خوبصورت مسکراتی آواز میں دھیما سا قہقہہ سنائی دیا۔

"نہیں، میں کوئی دیوی نہیں ہوں۔" روشن، چمکتی ہوئی آنکھیں مجھے بہت قریب محسوس ہوئیں۔ "ہاں — یہ سچ ہے کہ میں جس حسن و جمال کی بات کر رہی ہوں وہ میرا ہی ہے، لیکن ابھی تک اسے تم نے بھی نہیں دیکھا ہے۔ تشکیل کائنات سے لے کر اب تک میرا تو یہ روپ بھی کسی نے نہیں دیکھا جو تم دیکھ رہے ہو۔ میں صرف تم پر ظاہر ہوئی ہوں، اس لیے کہ تم میرے ہو۔ میں دیوی نہیں، روحِ حسنِ فطرت ہوں — جمالِ لافنا کی فطرتِ کل۔ مجھے اس دنیا کے رہنے والوں کے محدود رویوں اور نظریات

سے کوئی سروکار نہیں ہے، کیونکہ وہ سب رویے، سب نظریات میری حریف قوت کے دیے ہوئے ہیں۔ مجھے عبادت کی ضرورت نہیں۔ میں کسی کو اپنے سامنے نہیں جھکاتی، نہ ہی کسی سے سجدہ کراتی ہوں۔ میں کسی دوزخ کا خوف نہیں دلاتی نہ ہی کسی جنت کا لالچ دیتی ہوں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ یہ بات میں نے تمھارے ذہن میں، بچپن ہی میں جاگزیں کردی تھی کہ خوف اور لالچ دونوں بری چیزیں ہیں، اور اس پر میری حریف قوت تلملا اٹھی تھی۔ میں انسانوں کو عزتِ نفس کا راستہ دکھاتی ہوں، جہاں ضمیر خود ہی راہبر بن جاتا ہے۔ میں انسانوں کو مجبور نہیں کرتی کہ وہ ہمارے راستے پر چلیں۔ جانتی ہوں کہ عزتِ نفس کا حصول آسان نہیں ہوا کرتا کیونکہ جب سچی عزتِ نفس حاصل ہو جاتی ہے تو وہ لافنا ہوتی ہے۔ تم یہ ضرور سوچو گے کہ عزتِ نفس کے حصول کا راستہ تو انسانوں کو بتانا ہوگا اور اس کے لیے کسی ہادی کا ہونا ضروری ہے۔ نہیں — تم یہ بھی نہ سوچو۔ میں نہ تمھیں نبی بناؤں گی، نہ رسول اور نہ ہی اوتار۔ میں تمھیں اس دنیا کے انسانوں کے لیے ایک مثال بنادوں گی — لافنا مثال۔ جو بھی سچے دل سے اس مثال کو اپنانا چاہے گا یا چاہے گی — اسے عزتِ نفس کا راستہ خود بخود دکھائی دینے لگے گا، اسے اسی کے ضمیر کی رہنمائی حاصل ہو جائے گی اور عزتِ نفس کا حصول دشوار نہ رہے گا۔ تم اس دنیا کے لوگوں سے ہرگز یہ نہ کہو گے کہ وہ تمھارے راستے پر ہی چلیں — یہ انداز جبر کا ہے اور جبر میری مخالف قوت کا ہتھیار ہے۔ تم کسی سے بھی یہ نہ کہو گے کہ وہ تمھارے پیچھے چلے اور تمھارے راستے کو اپنائے — تم صرف میری بنائی ہوئی مثال بن کر زندہ رہو گے۔ جو تمھیں دیکھ کر، اپنے لیے سچی مثال بنائے گا یا بنائے گی، اس کے لیے عزتِ نفس کی راہ خود بخود کھل جائے گی — میں، کہ میرا کوئی بدن نہیں ہے تمھارے بدن کے سوا، تمھارے ساتھ تمھاری آخری سانس تک رہوں گی — پھر تم میرے ساتھ لافنا اور لاانتہا زندگی جیو گے۔ اس دنیاوی زندگی میں میری حریف قوت بھی یہی چاہے گی کہ تم زیادہ عرصے تک جیتے رہو۔ وہ کوشش کرتی رہے گی کہ تمھیں اپنے آگے جھکا سکے۔ جو بھی تمھیں مارنے کی کوشش کرے گا، وہ اسی کو مار دے گی — اس لیے کہ اس دنیا میں تمھارے وجود سے رسوائی بھی وابستہ ہو جائے کہ تمھارے ساتھ ایسی قوت ہے جو منتقم اور بے رحم ہے، فوراً سزا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی اس عیاری میں بھی کامیاب نہیں ہوگی اور اسی دنیا کے لوگ بالآخر یہ پہچان جائیں گے کہ میں نہ تو منتقم قوت ہوں، نہ ہی کسی کو سزا دیتی ہوں۔ میرے پاس بیم ورجا ہے، ہی نہیں، نہ ہی میرے پاس عجز و رضا ہے۔ یہ سب ہتھیار میری حریف قوت کے ہیں۔ پھر جب میری

حریف قوت کو تمھارے بڑھاپے میں یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ ہمیشہ کے لیے شکست خوردہ ہو چکی ہے تو پھر وہ تمھارے مادی زنداں چھوڑنے کی راہ میں سدِ راہ نہیں بنے گی اور یہی اس کی حتمی شکست ہوگی ... میں اپنے اسی یقین اور اسی اعتماد کے ساتھ تمھارے ساتھ رہوں گی کہ تم کبھی میری حریف قوت کے کسی جال میں نہیں پھنسو گے اور میرا ساتھ کبھی نہ چھوڑو گے۔''

مجھ پر چھائی ہوئی تاریک مایوسی ہٹ چکی تھی۔ میری سوزش اور سوجن میں مبتلا آنکھوں میں اب سکون سا تھا۔ کائنات کا سب سے خوبصورت چہرہ میرے سامنے تھا۔ چمکتی مسکراتی آنکھوں کو دیکھ کر میں بے خود سا ہو چلا تھا... بے انتہا خوبصورت سریلی آواز، بے حد شیریں دھیما سا لہجہ... محبت کا گہرا تاثر... میں خود کو کسی ایسی جگہ پر محسوس کر رہا تھا جو میرے لیے انجانی اور ان دیکھی تھی۔

''میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری حریف قوت بھرپور کوشش کرے گی کہ تمھاری حیاتی زندگی کی ساتھی ایسی ہو جو محبت کے لیے تمھیں تشنہ رکھے۔ وہ صرف جنسی آسودگی ہی دے پائے اور تم محبت کے لیے نا آسودگی کے الاؤ میں جلتے رہو اور مجبور ہو کر گھٹنے ٹیک دو... میں اپنی حریف قوت کے اس وار کو روک نہ سکوں گی، کیونکہ میرا کوئی بدن نہیں ہے... وہ محبت جس کے مستحق تم ہو، تمھیں میرے سوا نہیں مل سکتی... پریشان نہ ہونا، میں نا آسودگی کے ہر الاؤ میں تمھاری تشنگی کی کڑواہٹ کو شیریں سی تشنگی میں بدلتی رہوں گی۔ تمھیں اذیت نہیں ہوگی اور جب تم اس دنیا میں اپنے مادی بدن کو چھوڑ کر میرے ساتھ لافنا اور لاانتہا زندگی کا آغاز کرو گے تو تمھاری ہر تشنگی کو میں مٹاؤں گی... آسودگی کا تعلق صرف جسمانی ربط سے نہیں ہوا کرتا۔ آسودگی کے ارفع احساس کو اس زمین پر رہنے والے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وہ ان کے حواس سے باہر ہے۔ آسودگی کا ارفع احساس حیاتی زندگی کے باہر بھی ہے اور جدا بھی ہے... باہمی ربط ممکن ہی نہیں... اس دنیا کے لوگ، اس زمین پر اسے نہیں جان سکتے، بالکل اسی طرح جس طرح وہ نہ مجھے چھو سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ چکھ سکتے ہیں، نہ سونگھ سکتے ہیں، اور میں تمھارے ساتھ ہوں... میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری حریف قوت تمھیں مجھ سے چھیننے کے لیے ہر حربہ آزمائے گی۔ وہ تمھیں بہت دکھ دے گی... اس کے اشارے پر اس کے کارندے تمھاری مجھ سے وابستگی کو جنون کا نام دیں گے، تمھیں احمق قرار دیں گے کہ تم دنیا کی آسائشوں اور عیاشیوں کو سامنے پا کر بھی ان سے منھ موڑ لیتے ہو... میری حریف قوت اپنے

نمائندوں اور کارندوں کے ذریعے تمھیں بہت ذہنی اور جسمانی اذیت دے گی۔ وہ اپنے کارندوں کے ذریعے تمھیں ناقابل برداشت ذہنی اور جسمانی اذیت میں مبتلا کرے گی تاکہ تم ٹوٹ جاؤ، اس کے سامنے جھک جاؤ اور وہ کامیاب ہو جائے۔۔۔ وہ میری ضد پر فطرتِ شدید ہے۔ تم اسے قوتِ شر بھی کہہ سکتے ہو۔۔۔ میں فطرتِ لطیف ہوں، تم مجھے قوت خیر بھی کہہ سکتے ہو۔۔۔ میں تمھیں قوتِ شر سے بچاتی رہوں گی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری حریف قوت تمھیں محبت کے لطیف احساسات سے محروم رکھنے کے لیے حیاتی زندگی کا شدید پہلو ہی دکھائے گی جس کا تعلق صرف جنسی تسکین سے ہوا کرتا ہے۔۔۔ تمھیں اس زندگی میں، جو اس زمین پر تم میرے ساتھ جیو گے، محبت کے لطیف احساسات سے محروم ہونا پڑے گا۔ تم محبت کے لیے بہت ترسائے جاؤ گے، ہمیشہ تمھیں جنسی آسودگی کی سمت ہی کھینچا جائے گا۔۔۔ تمھاری محبت کی پیاس بڑھتی جائے گی۔۔۔ تم ترستے رہو گے۔ تمھیں یہ درد سہنا ہوگا۔۔۔ یہ پیاس جھیلنی ہوگی۔۔۔ یہ تشنگی آسودہ نہ ہوگی، کیونکہ یہ آسودگی تمھیں مجھ ہی سے ملے گی — اس لافنا اور لاانتہا عرصۂ زماں میں، جب تم اپنا یہ مادی بدن، اپنی آخری سانس کے ساتھ چھوڑ دو گے۔ یہ وہ تیاگ ہے جو تمھیں کرنا ہی ہوگا، ایسا تیاگ جس سے محرومی بھی وابستہ ہے۔

"لیکن یہ بھی نہ سمجھنا کہ میں تمھیں دشتِ ستم میں، اس صحرائے تشنگی میں، مرنے کے لیے چھوڑ دوں گی۔۔۔ میں تو تمھارے ساتھ ہوں — پیاسا تڑپنے کیوں دوں گی؟ میں نے تمھارے بچپن میں تمھیں بہت پیار کیا ہے، اس لیے کہ اس وقت تمھارے احساسات و جذبات کسی زنداں میں نہ تھے۔۔۔ آزاد تھے۔۔۔ میری حریف قوت کا کوئی وار تم تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ میں نے تمھیں اپنے احساسِ لطافت کی جھلک تو بچپن ہی میں دکھا دی تھی اور اب سیدھی سادی دیہاتی لڑکی کی سمت سے تمھیں میرے ان لطیف احساسات سے آشنائی ہو ہی چکی ہے جو محبتِ کل کا ایک جزو ہیں، اس محبتِ کل کا جو دائمی ہے، جو تمھیں مجھ سے ملے گی۔۔۔ اس لیے کہ تم میرے ہو۔۔۔ یہ میری خود غرضی نہیں ہے — خود غرضی تو میری مخالف قوت کا بڑا ہتھیار ہے۔۔۔ یہ کائنات میں موجود تمام حسن و جمال کے لیے ایک آئینے کی ضرورت ہے، جو تم ہو۔

"تم بہت دکھ سہو گے۔۔۔ میری حریف قوت کا انتقام گھناؤنا ہوگا، لیکن میں پُراعتماد ہوں کہ تم سب جبر و تشدد سہہ جاؤ گے، سب دکھ جھیل جاؤ گے، لیکن تم میں کوئی منفی رویہ تشکیل نہ پا سکے گا۔ پھول

پر برف گر جائے تو پھول برف کی مانند نہیں ہو جایا کرتا۔ وہ برف میں دب کر بھی پھول ہی رہتا ہے، کیونکہ یہی اس کی اصلیت ہے جس پر غیریت اپنا اثر نہیں چھوڑتی۔ میری حریف قوت بار بار انگارے برسا کر تمھیں برانگیختہ کرے گی لیکن تم پھر بھی اس کا تقاضا پورا نہیں کرو گے۔ وہ تم پر بار بار برفشار گرائے گی، تم پھر بھی اس کے آگے نہیں جھکو گے۔ یہی بالآخر میری حریف قوت کی شکست ہو گی۔''

گلنازی کا خوبصورت چمکتا مسکراتا چہرہ میرے سامنے تھا۔ وہی بھولپن اب بھی اس کے چہرے پر نظر آ رہا تھا، جسے دیکھ کر مجھے اپنا ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہی آنکھیں، مسکراتی چمکتی خمار آلودہ آنکھیں میرے سامنے تھیں، لیکن اس کے خوبصورت ہونٹوں سے الفاظ، چشمۂ حیات سے نکلتے قطروں کی مانند تھے، میں بے خود ہو کر سن رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ آ چکی ہے جو تنور پر بیٹھی گلنازی کو دیکھ کر آیا کرتی تھی۔

''تم میری حریف قوت کے طریقِ کار سے تو آشنا ہو ہی چکے ہو۔ وہ پہلے اپنی ہوس کو عفریت بناتی ہے جس کے دو زہریلے پنجے، خوف اور خود غرضی ہیں۔ وہ ان ہی ہاتھوں سے جبلتوں کے لچکیلے تاروں سے تانا بانا بنتی ہے — حریص عنکبوت کی مانند۔ پھر انسانوں کو اس جال میں پھانس لیتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اگر کسی انسان کا سر پیروں پر رکھوا دیا جائے تو وہ عزتِ نفس سے محروم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے محرومی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ سب سے پہلے انسانوں کی عزتِ نفس کا راستہ عبادت سے روکتی ہے۔ وہ انسانوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے کئی نام ہیں۔ وہ اپنے تکبر سے انسانوں کو اپنے سامنے حقیر بنا دیتی ہے تاکہ وہ اس کے سامنے گڑگڑاتے رہیں، ہاتھ جوڑتے رہیں، سہارا تلاش کرتے ہوئے گھناؤنی رسوم بھی ادا کرتے رہیں، اور یہی رسوم ان کی عقیدتوں کو بندھنوں میں باندھ دیتی ہیں۔ وہ عجز و رضا، بیم و رجا اور ہزاروں زہریلے ناوک عالمِ انسانیت کی سمت چھوڑتی رہتی ہے، پُرفریب انداز میں، اپنے نمائندوں اور کارندوں کے ذریعے۔ کبھی بہت اچھی ہونے کا فریب سیدھے سادے انسانوں کو دیتی ہے، کبھی خود کو رحم سے بھی وابستہ کرتی ہے، لیکن یہ سب اس کے فریب ہیں۔ درحقیقت وہ ایک بھیانک اور سفاک قوت ہے جو خون آشامی میں ہی اپنی سالمیت دیکھتی ہے۔ وہ اس قدر مکار ہے کہ اس نے دنیا میں صدیوں سے اپنے نمائندوں کو اپنا وجود بنا کر، ان کے سامنے انسانوں کو سجدہ ریز کرنے پر مجبور کیا ہے اور وہ انسان اسی میں اپنی فلاح کو

دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے جال کو اس قدر مضبوط بنا دیتی ہے کہ ایک بار اس میں پھنس کر باہر نکلنا ناممکن لگنے لگتا ہے، لیکن ناممکن نہیں ہے۔ وہ انسانی قلب و ذہن کو اتنے سلاسل کا اسیر بنا دیتی ہے کہ ان کو توڑنا ناممکن لگنے لگتا ہے، لیکن ناممکن نہیں ہے۔

''آزادی کی خواہش ہر انسان میں موجود رہتی ہے۔ اس کرن کو تاریکیوں میں روپوش نہیں کیا جاسکتا۔ جب آزادی کی خواہش، جسے میرا دیا ہوا ضمیر ایک کرن کی طرح اپنی حفاظت میں رکھتا ہے، انسان میں خواہش آزادی کو زندہ رکھتی ہے۔ جب تاریک ذہن میں آزادی خواب و خیال لگنے لگتی ہے، یہی کرن، ذہن کو روشن کرتے ہوئے، عزتِ نفس کا راستہ تلاش کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ پھر آزادی کا حصول ناممکن نہیں رہتا۔ جو تم نے حاصل کیا، اس دنیا کا ہر انسان حاصل کرسکتا ہے۔''

مجھے اپنی آنکھوں میں چمک کا احساس ہوا۔ اب میری آنکھیں مسکراہٹ میں چمک چمک جاتی تھیں۔

''تم نے جو کچھ بھی کہا ہے، اے کائنات کی سب سے خوبصورت دوشیزہ،'' میں نے کہا۔ ''اے قوتِ جمال، میں اسے اپنے دل کی گہرائیوں اور ذہن کی وسعتوں سے مان چکا ہوں، کیونکہ تمھارا احساس بچپن ہی سے میرے ساتھ ہے۔ لیکن میں اب بھی تذبذب میں ہوں۔ ایک سوال میرے ذہن میں غیریت کا نقش بن رہا ہے۔ تم نے مجھے اپنا ایک روپ، ایک جھلک دکھانے کے لیے ایک انسانی جسم کا انتخاب کیا۔ اس گاؤں کی ایک چھوٹی سی بچی جیسی دوشیزہ کو چنا جو میری ہم عمر ہے۔ اس کے بدن میں تم نے اپنے بے انتہا حسن و جمال کی ایک چھوٹی سی جھلک بھی دکھائی۔ اپنے حسن کے ناز و انداز کی جھلک دکھا کر مجھے دیوانہ سا کر دیا۔ پھر اب تم اسے چھوڑ کر مجھ سے یہ کہہ رہی ہو کہ تمھارا کوئی جسم نہیں ہے۔ میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ اس دنیا میں تمھارا کوئی جسم نہیں ہے، نہ ہوگا، لیکن کیا تم نے سیدھی سادی، بچوں جیسی دیہاتی لڑکی کو اس کا بدن چھوڑ کر دکھ نہیں دیا؟ اس کو خوبصورت، احساسات و جذبات سے آشنا کرنے کے بعد، پھر ان سے محروم کر دینے کی اذیت نہیں پہنچائی؟ وہ کتنا روئی ہوگی، اس کے آنسو خشک ہوتے ہوتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں گی، اس نے خود کو کتنا بے بس محسوس کیا ہوگا... مجھے اس کا قصور تو بتا دو!''

روشن دھند میں چمکتی مسکراتی آنکھوں میں بہت گہری محبت کا احساس نمایاں ہوا۔

''تمھاری یہی بات مجھے بہت پیاری لگتی ہے کہ تمھارے دل میں، احساس کی مانند، میں بچپن ہی سے موجود ہوں۔ تم نے سیدھی سادی بچی کی مانند، دیہاتی دوشیزہ کے متعلق اسی کیفیت کو پھر سے محسوس کیا ہے، جسے تم نے بہت ہی چھوٹی عمر میں، ایک بچی کو تھپڑ مار کر محسوس کیا تھا۔ تم ٹھیک کہتے ہو — اس کا کوئی قصور نہیں۔

''تمھارے اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے تشکیل کائنات کے ابتدائی مراحل کی سمت جانا ہوگا تاکہ تمھیں بتا سکوں کہ قصور نہ میرا ہے نہ تمھارا، نہ اس دیہاتی لڑکی کا جسے میں نے کسی کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی دستاویز پر انگوٹھا ثبت کرنے سے ایک لمحہ پہلے چھوڑ دیا تھا اور اس نے انگوٹھا ثبت کر دیا تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ اس کی سہیلی نے انگوٹھا ثبت کرایا ہے، کیونکہ اگر میں اس کے بدن میں رہتی تو وہ مرحلہ اس کے لیے آسان نہ ہوتا۔ اب تم نے سوال کیا ہے تو سنو۔ اب جو میں کہوں گی، اسے دل کی سماعت سے سننا۔ تشکیلِ کائنات سے پہلے میں لاابتدا اور لاانتہا قوت تھی، لیکن یہ قوتِ خیر تھی — اس قوت میں تخریب نہ تھی۔ اگر تم آگ کے قریب جاؤ گے تو تمھیں تمازت کا احساس ہوگا۔ اگر اور قریب جاؤ گے تو حدت بڑھ جائے گی۔ اگر آتش میں کود جاؤ گے تو شدید درد کے ساتھ تمھارا بدن جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ اگر آگ سے دور ہوتے جاؤ گے تو تمھیں خنکی کا احساس ہونے لگے گا۔ اور دور چلے جاؤ گے تو ٹھٹھرنے لگو گے۔ اگر بہت دور چلے جاؤ گے شدید درد کے ساتھ تمھارا بدن انجمادِ احساس کے بھی فنا ہو جانے پر منجمد ہو کر ختم ہو جائے گا۔ اب دونوں جانب سے سفر، دوری کا سفر شروع کرو اور اسے جاری رکھو۔ یعنی چاہے انجمادِ احساس سے سوختگی کی جانب یا سوختگی سے انجماد کی جانب ... تم ایک ایسے مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں تمھارا احساس بہت خوشگوار ہوگا اور اس میں لاانتہا کا راستہ کھلتا نظر آئے گا — یہ مقام آتش اور انجماد سے یکساں فاصلے پر ہوگا۔ کائنات اسی مقام پر لاابتدا تھی اور اسے لاانتہا تشکیل کے بعد ہونا تھا۔ میں اسی مقام پر تھی اور کائنات میں موجود لاابتدا عناصر — آتش و آب اور پھر ان کے اتصال سے پیدا ہونے والی ہوا کے اندر موجود آتش و آب کے عناصر — میرے لاابتدا اور لاانتہا ہونے کے شاہد تھے، گواہی دیتے تھے کہ میں لاابتدا اور لاانتہا ہوں۔ اب انجمادِ احساس کے انتہائی کنارے پر بے حسی تھی اور آتشیں احساس کے انتہائی کنارے پر سوختگی تھی، بے حسی سے آگے انجمادِ احساس اور سوختگی سے آگے آتشیں احساس لاابتدا تھے۔ اس ربطِ باہمی

سے یہ دونوں کنارے بھی بظاہر لا انتہا ہونے کا احساس دلاتے تھے، لیکن یہ دونوں کنارے نہ لا ابتدا تھے نہ لا انتہا — ان ہی سے ٹکرا کر پلٹنے والی قوت نے میری حریف قوت کے روپ میں جنم لیا جس کا ازل بھی تھا ابد بھی۔

''وہ میرے رستے کے قریب آئی تو محدود ہونے کے باعث اسے فنا ہو جانے کا احساس ہوا۔ وہ میرے رستے کو، جس پر خوشگواری تھی، سکون کی ایسی کیفیت بھی تھی جو احساسِ سفر بھی رکھتی تھی، حسن و جمال تھا، آسودگی تھی، کائنات کی تشکیل سے پہلے کا، ابتدا اور انتہا سے ماورا، دونوں سے جدا لا ابتدا اور لا انتہا کا احساس تھا، میں تھی۔ اس نے میرے رستے کو مسدود کرنا چاہا۔ اس نے انجمادِ احساس کے انتہائی کنارے کو سوختگی کے انتہائی کنارے سے باندھنے کی کوشش شروع کر دی تا کہ میرے رستے کو مسدود کر سکے۔ میں قوتِ خیر تھی اور ہوں۔ وہ قوتِ شر بن کر ابھری اور ہے۔ میں جانتی تھی کہ کائنات میں خیر کے توازن ہی سے کائنات سلامت رہ پائے گی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ کائنات میں شر سے توازن کو توڑ کر وہ کائنات کو فنا کر سکتی ہے۔ میں آج بھی اس حقیقت کو جانتی ہوں کہ تشکیل شدہ کائنات کو خیر کا توازن ہی قائم رکھ سکتا ہے۔ وہ بھی جانتی ہے کہ اگر وہ یہ توازن توڑنے میں کامیاب ہو گئی تو وہ کائنات کو تباہ کر سکتی ہے — فنا کر سکتی ہے۔ ہر شے کی ایک ضد ضرور ہوتی ہے لیکن ضد اصل کے بعد آیا کرتی ہے۔ میرے حسن و جمال اور خیرِ کل کے مقابلے میں وہ بدنمائی اور شر کے ساتھ پھیلی۔

''اب مجھ سے یہ نہ پوچھنا کہ میں نے کائنات میں توازن کیسے پیدا کیا، کائنات میں کہاں کہاں اور کن کن سیاروں میں زمین جیسے عوامل ہوئے اور زندگی نے کیسے ظہور پایا؟ طویل داستان ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں تمھیں تمام رموز سے آگاہ کر دوں گی۔ . .''

دھند میں خوبصورت آنکھوں میں مسکراتی ہوئی چمک بے حد روشن ہو گئی۔

اب تم سوچو گے کہ تشکیلِ کائنات کے بیان کا تمھارے سوال سے کیا تعلق ہے اور اس میں تمھارے سوال کا جواب کہاں ہے؟ غور کرو۔ اس انسانی جسم کو جس میں تم نے میری ایک جھلک دیکھی، اس پر اس زمین کو قیاس کرو۔ جب توازن نہیں ٹوٹتا تو کوئی تخریب بھی کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ تمھاری سیدھی سادی، بچی جیسی دیہاتی لڑکی کے وجود پر جو گڑھے نمودار ہوئے تھے وہ بہت بھر چکے ہیں۔ وہ توازن جو کائنات میں قائم ہوا تھا، ایک بہت ہی چھوٹے سے وجود میں بھی قائم ہو رہا ہے۔ وہی قائم

ہوکراس کے وجود کو قائم رکھے گا۔ اگر تم میری بات کی گہرائی اور وسعت کو جان گئے ہو تو یہ بھول جاؤ کہ اس دنیا میں دکھ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ نہیں، ہر دکھ عارضی ہے... ہر گڑھے کو بالآخر بھر جانا ہے۔ ان عارضی دکھوں کا باعث وہی میری حریف قوت ہے۔ وہی قصوروار ہے — نہ تم قصوروار ہو نہ میں اور نہ وہ بدن جس سے متعلق تم بے چین ہو، احساسِ جرم کا شکار بن رہے ہو کہ اسے دکھ تم نے اور میں نے دیا ہے۔ یہ جرم تو ہم نے کیا ہی نہیں۔ وہ بدن تو اب دکھوں سے آزاد ہو رہا ہے، ایک نئی زندگی کا تصور اس کی اذیت کو ختم کر رہا ہے۔ جس طرح میری حریف قوت کائنات کو عدم توازن سے برباد کرنا چاہتی تھی لیکن نہ کر پائی، اسی طرح اس بہت ہی چھوٹے انسانی وجود میں بھی وہ عدم توازن پیدا نہیں کر سکی۔ تم ہر فکر سے آزاد ہو جاؤ — تم بھی میری طرح بے قصور ہو۔ بھولی بھالی دیہاتی لڑکی کا غم بہت عارضی ہے۔ اب وہ ان تمام احساسات و جذبات کو بھول جائے گی جو میرے ہیں۔ وہ اب تک وہی لڑکی بن چکی ہے جو تم کو پہلی بار دیکھنے سے پہلے تھی۔ میں جب تک اس کے بدن میں تھی وہ جو کچھ محسوس کرتی تھی اور جو محبت کے جذبات اس کے دل میں اٹھتے تھے — وہ خود بخود ختم ہوتے جائیں گے... وہ سب کچھ بھول جائے گی اور بہت جلد بھول جائے گی۔ کھلونا ٹوٹ جانے کا غم بچوں کو ہوا ہی کرتا ہے، لیکن اس غم کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے بدن میں اب میں نہیں ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر اب میری مسکراہٹ نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب میں نہیں ہوں۔ وہ اب تم سے ملنے سے پہلے والی لڑکی بن چکی ہے۔ تمھیں دیکھ کر وہ پھر تمھاری چاہ تو کرے گی، لیکن اب اس میں کوئی جذبہ اس کے وجود پر بھاری نہ ہوگا۔ وہ اپنی نئی زندگی کو ہی اپنی زندگی سمجھے گی۔ تم اُس کا غم نہ کرو۔

''اس دنیا میں جو اجسام آتے ہیں وہی عارضی ہوتے ہیں۔ زندہ اجسام کی مدتِ حیات بہت محدود ہے۔ میں ان میں کیونکر رہ سکتی ہوں؟ وہ مجھے سنبھال نہیں سکتے۔ ایک تم ہو جو میرے ہو۔ میں تمھارے عارضی اور فانی بدن میں بھی تمھارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ میں نے تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تمھارے فانی بدن کو اپنے لیے چنا ہے۔ تم اب ہر غم سے آزاد ہو جاؤ، ہر فکر سے خود کو جدا محسوس کرو، کیونکہ وہ لمحہ قریب آ رہا ہے جب میں تمھارے بدن کے خلا کو بھروں گی۔ تم اپنی تمام زندگی میں لڑکپن کے احساس کے ساتھ رہو گے۔ تم زندگی بھر خود کو لڑکا بھی محسوس کرو گے لڑکی بھی۔ تم ایک مکمل انسان بن جاؤ گے جس میں نر کے احساسات و جذبات بھی ہوں گے اور ناری کے بھی۔ وہ انسان جو مرد

ہیں نہ عورت — میں تمھیں ان کے احساسات و جذبات سے بھی آگاہ کردوں گی۔تم میرے ساتھ اپنے لڑکپن ہی کی کیفیت میں رہا کرو گے۔لیکن حیاتی زندگی کے لمحات میں، جب میں تمھارے وجود سے اوپر اٹھ جایا کروں گی، تم مرد بن جاؤ گے۔ نسوانی احساسات و جذبات تمھیں صرف لطیف احساسات وجذبات کی صورت میں ملیں گے جن میں آلائش نہیں ہوگی۔ میں تمھارے ساتھ، تمھارے بدن میں، اس احساس کے ساتھ رہوں گی کہ اس زمین پر میرا اور کوئی بدن نہیں ہے۔''

دھند پیچھے ہٹنا شروع ہوگئی۔ کھیتوں میں اُگے گندم کے پودے نظر آنے لگے۔ میرے سامنے بلندی پر، مسکراتے روشن چہرے، مسکراتی چمکتی آنکھوں والی، کائنات کی قوتِ جمال، اپنی تمام تر صداقت کے ساتھ موجود تھی۔

اچانک گندم کے کھیت سے، دائیں جانب والے کھیت سے سیاہ جانور سا نکلا۔ وہ بھینس کی مادہ بچی جیسا تھا— کٹڑی جیسا۔

ہاں، وہ شریفاں ہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بائیں جانب والے کھیت سے نوراں نکلی جو پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر شکست خوردگی کے تاثرات موجود تھے۔

''دیکھو انھیں — یہ ہیں میری حریف قوت کے دو ہتھیار، ہوس کے دو ہاتھ . . . ایک تاریک خوف، جو ہمیشہ ہی سے بدنما ہے۔ دوسری بھیانک زہریلی خود غرضی، جس کی ہتھیلیوں میں زہر بھرا رہتا ہے۔خوف کی کوکھ سے فشار اور انتقام جنم لیتا ہے، اور خود غرضی کے بطن سے لالچ اور رقابت پیدا ہوتی ہے۔ بدصورت، بدہیئت خوف نے حسد کے ساتھ وجود پایا تھا اور اسی نے اپنی گھناؤنی کارکردگی دکھائی، اور وہ خود غرض ناگن، پلکیں نہ جھپکنے والی، بھولی بھالی دیہاتی لڑکی کی سہیلی بن کر اسی کو ڈستی رہی۔ پہلے دن ہی سے میری حریف قوت کے اشارے پر اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ تمھیں اپنی سہیلی سے چھین لے گی۔ اس نے بار بار اپنی سہیلی کو تم سے بدگمان کیا، لیکن اس کے بدن میں میں تھی۔ وہ بدگمان نہ ہوئی۔ آج اس زہریلی ناگن نے تمھیں ہوس کی دلدل میں گرانا چاہا— کھلی کوشش کی اور ناکام ہو کر اپنی آگ میں خود ہی جلتی رہی۔ دونوں کو پہچان لو۔ یہ ہیں ہوس کے ہاتھ: خوف اور خود غرضی۔ ہوس جو میری حریف قوت کا، سب سے بڑا ہتھیار ہے۔''

شریفاں اور نوراں مجھ سے کچھ دور رک گئیں، روشنی کی شعاعیں دھند کے ساتھ میری چاروں

سمتوں میں پھیل گئیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے دھند میں روشنی کے پردے سے تن گئے ہیں۔ شریفاں اور نوراں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔

''اب میں ہمیشہ کے لیے تمھارے جسم میں تمھارے ساتھ رہنے کے لیے آ رہی ہوں۔ میں ہی تمھارے اوپر ہوں، میں ہی دائیں جانب، میں ہی بائیں جانب اور میں ہی سامنے۔ لیکن تم اس حقیقت کے باوجود، ان سمتوں سے میرا لمس نہیں پاؤ گے۔ تم اپنی پشت پر میرے لمس سے آشنا ہو گے، جو انسانی بدن میں آ کر میں نے تمھیں سونپا تھا۔ اپنے رخسار پر میرے رخسار اور اپنے کنجِ دہن پر میرے کنجِ دہن کا لمس تم زندگی بھر محسوس کرو گے۔ تم مجھے اپنے آئینۂ دل میں ہمیشہ دیکھو گے، اپنے گوشِ نہاں سے ہمیشہ سنو گے۔ میں ہی تمھاری قوتِ ذائقہ اور قوتِ شامہ میں رہوں گی۔ اس دنیا والے مجھے کبھی بھی نہ دیکھ پائیں گے، نہ ہی سن سکیں گے۔ یہ چہرہ جو تم دیکھ رہے ہو، صرف تمھیں اپنا تصور دیے رکھنے کے لیے ہے تاکہ تمھیں میری قربت محسوس ہوتی رہے۔ تمھارے اس تصور کو بھی، اپنے تمام تر مادی وسائل کے باوجود، اس دنیا والے نہ دیکھ سکیں گے۔ وہ میری اصل صورت سے بھی ناآشنا رہیں گے۔ نہ مجھے سن سکیں گے، نہ میرے لمس کو پا سکیں گے، نہ میری قوتِ ذائقہ وشامہ تک پہنچ سکیں گے۔ جو لوگ باضمیر اور شفاف باطن رکھتے ہوں گے، وہ تم میں میری جھلک ضرور دیکھیں گے، تمھاری آواز میں مجھے ضرور سنیں گے۔ انھیں میرا احساس تم سے ہوگا۔ تمھاری دید میری ہوگی۔ میری حریف قوت، اپنے کارندوں کو انتہائی طاقتور بنا کر تمھیں ان کے ذریعے بہت تکلیف پہنچائے گی۔ انھیں اہمیت نہ دینا، وہ بے ضمیر اور سفاک لوگ میری حریف قوت کے منتخب کردہ ہیں۔ ہمیشہ یہی احساس رکھنا کہ تمھیں ظلم وتشدد کا شکار میری حریف قوت بنا رہی ہے۔ وہ تمھیں عقوبتوں سے گزاریں گے، میں تمھاری اذیتوں کو کم کرتی رہوں گی۔ میں تمھارے بدن میں، تمھارے شعوری توازن کو قائم رکھوں گی۔ وہ اذیتوں سے تمھارے ذہن کو بچے جیسا بنا دیں گے تو میں تمھیں سنبھالے رکھوں گی۔ میں تمھیں راہِ صداقت سے گرنے نہ دوں گی۔ ہر بار وہ ناکام ہوتے رہیں گے۔ بالآخر تمھارے بڑھاپے میں میری حریف قوت تمھیں مجھ سے نہ چھین سکنے پر ہمیشہ کے لیے شکست خوردہ ہو جائے گی۔ وہی صداقت کی فتح ہوگی — یہ میرا یقین ہے، اعتماد ہے۔ تم کبھی مجھ سے جدا نہ ہو گے... میرے تھے، میرے ہو اور ہمیشہ میرے رہو گے۔ وہ لمحہ آن پہنچا — مجھے اب ہمیشہ کے لیے تمھارے بدن

میں آنا ہے۔''

میرے سر کے اوپر سے شعاعوں میں لپٹی دھند نیچے آتی نظر آئی۔ روشن دھند سے کائنات کی لاانتہا اور لافنا ارفع قوتِ جمال ایک ایسے خوبصورت بدن والی دوشیزہ کی طرح نکلی جس کا تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے بدن کو باریک اور نازک، قوسِ قزح کے سات رنگوں والے لباس نے ڈھانپ رکھا تھا جس کا ہر دھاگا روشنی کی ایک شعاع تھی ــ رنگین شعاع۔ ہر سمت نکہت سی تیرنے لگی۔ اس کے مسکراتے چہرے پہ دُرافشانی شعاعوں سے مسلسل ہو رہی تھی، اس کی مسکراتی چمکتی آنکھوں میں درخشانی کے ساتھ ساتھ خمار آلودگی بھی تھی۔

''کہو، اب تو تمھیں یہ شکایت نہیں کہ میں نے تمھیں حسن و جمال کیوں دیا تھا؟''

وہ میرے اور قریب آ گئی۔ قرب کے احساس سے مجھ پر بے خودی سی طاری ہوگئی۔ میں رہٹ کی منڈیر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اب تو کبھی یہ نہ کہو گے کہ اس زندگی سے مر جانا اچھا ہے؟''

''کہوں گا!'' میں نے سر کو ایک جانب دھیمی سی جنبش دی۔ ''تمھارے ساتھ جانے کے لیے اگر اس بدن کو چھوڑ دینا ہی شرط ہے تو بار بار کہوں گا۔''

اس کا دھنک رنگ لباس ہوا کے نرم جھونکوں میں مرتعش تھا۔ اس کی بے حد خوبصورت خمیدہ زلف اس کے رخسار پر بار بار بکھر کر خود ہی سنور رہی تھی۔

''کہوں گا،'' میں نے بہت دھیمے لہجے میں نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اب تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں ہجر کے پہلے لمحے ہی میں مر جاؤں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اپنا خوبصورت، لمبی انگلیوں والا نازک سا ہاتھ بڑھا کر میرے رخسار پر دھیمی سی چپت لگائی۔ میں کھلکھلا کر ہنسا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگانا چاہا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، ہر سمت رنگوں میں مہک پھیل گئی۔ میرے پورے بدن میں دلکش سی سنسناہٹ تھی۔

اس نے میرے ہاتھ کو اپنی سمت کھینچا۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے لپٹ گیا۔ میں سرخوشی کی ایسی کیفیت سے سرشار ہو گیا جو اس دنیا اور اس زمین کی نہیں ہے۔ پھر میرے جسم میں میری زندگی نے رخ بدلا۔ اب میری آنکھوں میں، اس کی آنکھیں تھیں۔ میرا چہرہ دمک اٹھا۔ آنکھیں کیا، چہرہ کیا،

مجھے اپنا سارا بدن مسکراتا محسوس ہوا۔ کائنات کے سب سے خوبصورت وجود نے میرے وجود کا خلا پر کر دیا۔ دھند چھٹ سی گئی۔ میرے سامنے شریفاں اور نوراں نے گھٹنے ٹیک دیے، سر جھکا لیے۔

''نہیں،'' میرے دل سے آواز آئی۔ ''ہمیں کسی کو اپنے آگے نہیں جھکانا... چلو... زندگی اس کنویں کے پانی کی طرح قید اور ساکت نہیں ہے کہ اسے ڈول سے کھینچا جائے تا کہ وہ رواں ہو سکے۔ زندگی تو بہتی ندی کی مانند ہر دم رواں رہتی ہے، ہر سدِ راہ کو توڑتے ہوئے چلتی رہتی ہے۔ تم بھی چلو... زندگی ہی کی مانند... چلتے رہو۔''

میں مڑا۔ لمحے سے بھی کم مدت میں تیزی سے میری آنکھیں بند ہو کر پھر کھلیں، جیسے میں نے پلکیں جھپکائی ہوں۔ وہاں نہ دھند تھی، نہ روشن شعاعیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیچھے نہ شریفاں ہے نہ نوراں۔ میں کھیتوں کے درمیان رہٹ کے قریب اکیلا کھڑا ہوں۔ لیکن اب میرے دل میں تنہائی کا اذیت دہ احساس نہیں تھا — میری زندگی میرے ساتھ تھی، جس کے وصلِ دوامی نے، جس کے لافنا اتصال نے مجھے کائنات کی قوتِ جمال کا احساس دلایا، جو لاانتہا ہے... جو بے حد ہے۔

میں بھائی کے گھر کی سمت چل دیا۔

مجھے اپنی رفتار میں تغیر سا محسوس ہوا — ہوا کے دھیمے جھونکے میں اب، خرامِ ناز بھی تھا۔

58

سرمائی بادلوں میں ہمیشہ غبار آلودگی ہوا کرتی ہے۔ آسمان پر بلند بادل، دور ہونے کے باوجود، اکثر بہت قریب محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں سرمئی رنگ کبھی کبھی ہی دکھائی دیتا ہے۔ گرج چمک بھی کم کم ہوتی ہے۔ میں اس غبار آلودگی کے احساس میں پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے دھیمے تھے، لیکن ان میں خنکی بہت زیادہ تھی۔ کھیتوں میں فصلیں عالمِ شباب پر تھیں، خصوصاً گندم، جس کے پودوں پر خوشے نظر آ رہے تھے۔ ہر سمت نباتات کی خوشبو تیر رہی تھی۔

میں بیرونی دروازے سے صحن میں داخل ہوا۔

ٹائیگر اپنے چھپر کے نیچے آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ قریب ہی وہ بوری پڑی تھی جو گدا ہر شام ٹائیگر کے بدن پر باندھ دیا کرتا تھا۔ دھوپ نہیں تھی، اس لیے بھابھی اور بہنیں کمرے میں تھیں۔ میں

چق اٹھا کر برآمدے میں داخل ہوا۔ رقیہ بارچی خانے میں تھی، بوبابھی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔
میں کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی بھابھی اور بہنوں کی نگاہیں میری سمت اٹھیں اور دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی ثانوی نگاہوں میں حیرت سی تھی۔

''کہاں تھے؟'' عصمت نے کہا۔ پھر وہ مسکرائی۔ ''بڑے نکھرے نکھرے سے لگ رہے ہو۔ کیا ہوا؟''

''وہ آئی تھی،'' بھابھی نے کہا۔ ''گلنازی۔''

''وہ تو ٹھیک ٹھاک ہے،'' عصمت نے کہا۔ ''بالکل نارمل۔ ہاں بہت دبلی اور کمزور سی لگ رہی تھی اور بہت بدلی بدلی سی بھی تھی۔''

''تمھارا پوچھ رہی تھی،'' بھابھی نے پوٹھوہاری لہجے میں کہا۔ ''کہاں گئے تھے؟''

''میں کھیتوں میں، وہ رہٹ ہے نا...'' میں نے کہا، ''وہاں بیٹھا ہوا تھا۔''

بھابھی اور بہنوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کے چہروں پر حیرت سی تھی۔ باجی زیبا کے ہونٹ ہلے۔ کچھ کہنا چاہتی تھیں، نہ کہہ پائیں۔ مجھے ان کے چہروں پر حیرت انوکھی نہ لگی۔ خود میں بھی اس احساس سے حیرت زدہ تھا۔ میری آواز بہت ہی خوبصورت تھی — دلکش اور سریلی۔

بھابھی کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

''یہ تم...'' انھوں نے کہا۔ ''نکاح سے پہلے والی اپنی لکن میٹی کی طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟''

مجھے ہنسی سی آئی۔ میں مسکراتے ہوئے برآمدے میں آیا۔

''وہ کہاں مری ہے۔'' عصمت کی آواز بھرا سی گئی تھی۔

میں صحن میں آیا، پھر چھت کی سمت سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اسی سیڑھی پر بیٹھ گیا جہاں گلنازی نے مجھے بازوؤں میں لے کر نیچے جانے سے روکا تھا۔

''تم مجھے چھپا نہ پاؤ گے۔'' دل سے خوبصورت آواز ابھری۔ ''تمھیں مجھے چھپانا ہوگا۔ اس دنیا کی ہر نظر سے چھپانا ہوگا۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔''

''کیسے چھپاؤں؟'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''تم ہو ہی ایسی، تمھارا احساس ہی اتنا

خوبصورت اور دلکش ہے کہ مجھ سے چھپائے نہ چھپے گا۔''
دھیمی سی ہنسی سنائی دی۔
''میں بتاتی ہوں۔تم ابھی، اسی لمحے یہ تصور کرو کہ تمھارے جسم سے اوپر بھی ایک جسم ہے، جسمانی وجود سے اوپر بھی ایک وجود ہے، جس میں تم ہو اور میں بھی ہوں... تصور تو کرو...''
کچھ لمحوں کے بعد ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ بدنی وجود سے اوپر بھی میرا ایک وجود ہے جس میں میں اپنی زندگی کے ساتھ جمالِ کُل کی طرح موجود ہوں۔اسی احساس میں، سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے، مجھے اپنا آپ وہی لگنے لگا جو پہلی بار جھاوریاں کے قصبے میں آنے سے پہلے تھا۔یوں محسوس ہوا جیسے اس گاؤں میں میں پہلی بار آیا ہوں۔وہی کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی جو پہلی بار تانگے سے اتر کر بھائی کے گھر داخل ہونے پر تھی۔فرق صرف اتنا تھا کہ اس شام میں پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔
''ہاں...''دل سے آواز آئی۔''اب تم مجھے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھ سکو گے۔لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمھاری زندگی میں کئی بار ایسے جذباتی لمحے بھی آئیں گے جب اس دنیا کے کچھ لوگ... مرد، عورتیں، بچے... جن میں فطری ذوقِ جمال ہوگا اور جن کی نگاہیں شفاف ہوں گی، تمھیں دیکھ کر، میری جھلک بھی دیکھ لیں گے۔بچوں کو اکثر تم میں میں نظر آؤں گی۔باقی تو وہی دیکھ پائیں گے جن کی بصارت ہوس سے آلودہ نہ ہوگی۔''

59

رات بہت سرد تھی۔باہر شام ہی سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔شمالی پہاڑی سلسلے سے آنے والی ہوا یخ بستہ محسوس ہو رہی تھی۔میں لحاف میں دبکا ہوا تھا۔باہر ہوا کے جھونکوں میں تیزی سی نمایاں تھی، کمرے میں تین چارپائیاں تھیں۔ایک پر بھائی، دوسری پر عصمت اور تیسری پر میں تھا۔دوسرے کمرے میں بھابھی، باجی زیبا، رقیہ اور بوبا تھے۔
انگیٹھیوں میں کوئلے اب راکھ بن چکے تھے۔
گداؤ نے شام کو جو انگیٹھیاں جلائی تھیں، انھوں نے کمرے میں درجۂ حرارت بہتر بنائے رکھا تھا، لیکن باہر برآمدے کی چھتوں کو جھلانے والی ہوا، چھتوں کی درزوں سے گزر کر، کمرے کے

دروازے کے نیچے سے گزر کر کمرے کو خاصا سرد کر رہی تھی۔ بہر حال، کپاس لحاف کے اندر سردی کے خلاف ڈھال بنی ہوئی تھی۔

میرے تصور میں نہر کے بہتے دھارے ابھرے۔نہر پر بوندا باندی ہوتی نظر آئی، بہتے گدلے پانی پر بوندوں کے گرنے سے بلبلے سے بن رہے تھے۔ بوندیں گر رہی تھیں۔ایسی ہی کسی بوند نے، چمٹ کر بہنے والے دو تنکوں کو جدا کر دیا۔''یہ تو ہونا ہی تھا'' میں نے سوچا۔''میں آج اگرچہ خود کو وہی پہلے جیسا محسوس کر رہا ہوں، لیکن اپنی زندگی کے اس تجربے کو کبھی بھلا نہ پاؤں گا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔اس کا احساس مجھے شروع ہی سے تھا۔ پھر بھی میں خود پر قابو نہ رکھ سکا... باوجود کوشش کے نہ رکھ پایا۔''

مجھے اپنے بدن میں خوبصورت سی مسکراہٹ کا احساس ہوا۔''تمھیں میں جو دکھائی دیتی تھی،'' خوبصورت سی آواز سنائی دی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو،'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔''میں نے گلنازی میں تمھیں دیکھا تو اپنے آپ کو بھول گیا۔خود رفتگی کے اس احساس کو بھی میں کبھی نہ بھول پاؤں گا جس نے مجھے آشفتہ سری دی تھی۔تم نے میرے سارے دکھ ختم کر دیے۔ آنے والی زندگی کے دکھوں کو میں نہیں جانتا لیکن تمھارا ساتھ میری ہمت بھی ہے، پندار بھی۔ میں اسی راہِ صداقت پر چلوں گا جو تم نے مجھے دکھائی ہے۔ وہی میری زندگی ہوگی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اس زندگی کے جنگل میں فرشِ صداقت پر بکھرے ہوئے خشک پتوں کی مانند ہوں۔تم ہی میری سچائی ہو، میری لہلہاہٹ ہو، میری روحِ بہار ہو۔ میں تمھارے سنگ سے، ہر دکھ سے آزاد ہو گیا ہوں۔لیکن ایک احساس، ایک خلش اب بھی ہے۔کیا بھولی بھالی، سیدھی سادی گلنازی اب بھی میری کمی محسوس کرے گی؟''

مجھے پھر اپنے بدن میں مسکراہٹ کا احساس ہوا۔''اس لمحے تک جب تک وہ اپنی حیاتی زندگی کا آغاز نہیں کرتی، وہ کبھی کبھی تمھیں یاد ضرور کرے گی۔ پھر وہ سب کچھ بھول جائے گی... اسے کچھ بھی یاد نہ رہے گا... اس کی ایک اپنی دنیا ہوگی اور وہ اس دنیا میں اتنی رچ بس جائے گی کہ اسے تمھاری صورت تک یاد نہ رہے گی۔''

میں نے لحاف سے سر نکالا۔ باہر ہوا کا زور طوفانی سا ہو رہا تھا۔ برآمدے کی چقوں میں

جھلاہٹ کا احساس سرسراتی آواز سے ہورہا تھا۔ دروازہ بھی ہوا کے زور سے بار بار بج اٹھتا تھا۔ مجھے برآمدے سے بھاؤں کی آواز آئی۔ ٹائیگر برآمدے میں تھا۔ گداؤ اس کے بدن پر بوری باندھ دیا کرتا تھا، وہ بوری کے ساتھ ہی دوڑتا پھرتا تھا۔

''کیا میں بھی اپنی کسی حیاتی زندگی کے آغاز پر سب کچھ بھول جاؤں گا؟'' میں نے دل ہی دل میں سوال کیا۔

''میں تم سے وعدہ کر چکی ہوں،'' خوبصورت آواز ابھری۔ ''میں تمھیں زندگی کے بیاباں میں، اس دشتِ بے پناہ میں جہاں جبلتوں کا غولِ بیابانی گردباد کی طرح دوڑتا ہے، پیاسا مرنے نہ دوں گی۔ تمھیں جنسی آسودگی مل جائے گی لیکن تمھیں میری خاطر، ایک تکلیف تو زندگی بھر سہنا ہی ہوگی — تمھیں محبت نہ مل سکے گی۔ تم زندگی بھر محبت کی تشنگی محسوس کرو گے۔ یہ تو ہوگا... تمھیں محبت کے لیے ترسنا ہوگا، میرے لیے... اس لیے کہ یہ محبت تمھیں صرف مجھ ہی سے مل سکتی ہے، اور میرا کوئی جسم نہیں ہے۔ تم اپنے جسمانی بدن میں میری اس محبت کو اس زمین پر حاصل نہیں کر سکتے... تمھیں تشنہ ہی رہنا ہوگا۔ تم اب چھوٹے سے بچے بھی نہیں ہو کہ میں تمھارے رخساروں کو اپنا لمس دے کر تمھیں شرما دوں۔ میں تمھاری آنکھوں پر اپنے لب نہیں رکھ سکتی۔ اب میں تمھارے ساتھ ارفع وجود میں ہوں، جو تمھاری حفاظت کرنے کے لیے تمھارے ساتھ ہے۔ میں تمھاری حفاظت کرتی رہوں گی۔ میں تمھاری ہر مصیبت میں تمھیں سنبھالوں گی، تمھارے ہر دکھ کو کم کروں گی، لیکن تمھیں محبت کے لیے تشنہ ہی رہنا ہوگا۔ میری محبت تمھیں طویل زندگی گزارنے کے بعد، اس فانی بدن کو چھوڑنے کے لمحے تک نہ مل پائے گی اور پھر تمھاری آخری ہچکی جب تمھیں اس مادی زنداں سے آزاد کر دے گی تو میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ تمھیں وہ محبت ملے گی جو اس دنیا کی جسمانی محبت سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کا تصور تم بھی نہیں کر سکتے۔''

میں کمرے کے اندھیرے میں شہتیروں والی چھت کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''میں تمھاری خاطر یہ تکلیف سہہ لوں گا۔ میں حیاتی زندگی سے انکار بھی نہیں کر سکتا — حیاتی زندگی کا منکر ہونا انکارِ فطرت ہے، جو میں نہیں

کروں گا۔ میں اس دنیا میں پیدا ہو چکا ہوں، میرا ایک جسم ہے، جسمانی تقاضوں میں جنسی آسودگی بھی ہے۔ مجھے حیاتی زندگی کے اس تجربے سے بھی گزرنا ہے جو نقطۂ عروج ہوگا۔ مجھے اپنے لطیف وجود کا احساس بھی ہے جس میں میری زندگی ہے۔ تم — میری زندگی جو روحِ حسنِ فطرت ہو، میری آتم سُدھا ہو، میری روحِ بہار ہو... مجھے تمھارے لیے، تمھاری محبت کے لیے تشنگی منظور ہے۔ اس کے باوجود کہ تم میرے ساتھ ہو، میں تمھیں حسنِ فطرت کے ہر مظہر میں بھی محسوس کر لیا کروں گا۔ نہ سہی... محبت نہ سہی... میں کسی ایسی لڑکی کو زندگی کی حیاتی زندگی کی ساتھی بنالوں گا جسے میں نے کبھی دیکھا نہ ہو۔ میری محبت سے محروم زندگی تو ثانوی ہی ہوگی۔ میں اس لمحے کی راہ دیکھتا رہوں گا جو مجھے اس مادی زنداں سے رہائی دے گا، جو میرے سب المیوں میں سے آخری المیہ ہوگا — میں حیاتی زندگی کی ساتھی سے محبت کی توقع ہی وابستہ نہ کروں گا۔ اُسے کمی نہ ہونے دوں گا۔ اسے آسودہ رکھوں گا، لیکن اس سے کبھی توقع نہ رکھوں گا کہ وہ مجھے، میرے جسمانی وجود سے ماورا، میرے ارفع وجود سے بھی محبت کرے۔''

مجھے آزادی کا احساس ہوا — خواہش کا یہ پہلا تار تھا جو میں نے توڑ کر ہوس کے جال کو تاراج کیا۔ خواہش کا پہلا بال جسے میں نے گچھے سے کاٹ دیا اور مجھے دکھ بھی نہ ہوا۔ مجھے پہلی بار اس حقیقت سے آگاہی ہوئی کہ جہاں خواہشات، پوری نہ ہونے پر، دکھوں کا باعث بن جاتی ہیں، وہاں شعور کا ایک مقامِ عروج ایسا بھی ہے جہاں پہنچ کر خواہش کی ڈور کاٹ کر بھی دکھ محسوس نہیں ہوتا۔ جہاں کوہ پیما چوٹی پر پہنچنے سے پہلے نہیں پھسلتا، برفشار کا شکار نہیں ہوتا۔ جہاں بالوں کے گچھے کے بال کاٹ کر بھی کوئی خوف، خودغرضی، باعثِ عقوبت نہیں بنتی۔ جہاں بالوں کے گچھے کے سب بال کٹ جاتے ہیں اور خواہشات کی کالی بلا بے بس ہو جاتی ہے، دکھ بھی نہیں دے پاتی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چارپائی پر، پھن پھیلائے، مارِ دوزباں پھنکار رہا ہے جسے میں نے گداؤ کی طرح ایک ہی وار میں چارپائی سے نیچے گرا دیا ہے۔ وہ زخم خوردہ ہو کر، درد کی شدت میں کنڈلی سی بنا رہا ہے، اس کا پھن بار بار کھلتا ہے۔

''ٹھیک ہے، گلنازی کا بدن محمد اکبر خان لے جائے گا... لے جائے... اس کی روح چند ماہ جن احساسات اور جذبات سے سرشار رہی ہے، وہ تو اب ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔''

مارِ دوزباں — ہوس کا مارِ دوزباں — خوف اور خودغرضی کا زہر اپنی تھیلیوں میں بھرے، پھن

اٹھانے ہی والا تھا کہ میرے دوسرے وار نے اس کے سر کو کچل دیا۔

''تمھیں ناگ سے لڑنا آ گیا ہے!'' خوبصورت آواز مسکراتی محسوس ہوئی۔ مجھے اپنے پورے بدن میں مسکراہٹ کا خوبصورت احساس ہوا۔

''میری زندگی نے مجھے آزادی کی راہ پر لا کر ہمیشہ میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے ہر اذیت، ہر عقوبت اور اس دنیا میں محبت کی ہر تشنگی قبول ہے۔ گلنازی کا بدن جاتا ہے تو جائے، مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔''

60

اگلی صبح میں ناشتے کے بعد باہر نکلنے کے لیے بیرونی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ گنگناہٹ سی سنائی دی۔

''کن مِن کن مِن کنیاں آ ئیاں، سڑ دے داگ دلاں دے۔''

(دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی ہے، دلوں کے داغ تو جلتے ہی رہیں گے)

گداؤ صحن میں لکڑیاں چیرتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ سرگودھا کے علاقے کا یہ لوک گیت اپنی بے حد اداس دھن سے ہر سننے والے کو اداس کر دیتا ہے۔ گداؤ کو شاید اپنی شانی یاد آ رہی تھی۔ وہ ہر شے سے بے نیاز، اپنی ہی لگن میں گنگنائے جا رہا تھا۔ آسمان پر اب بھی چھدرے چھدرے بادل اِدھر اُدھر نظر آ رہے تھے۔ مشرقی افق سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا کے دھیمے جھونکوں میں خنکی کا احساس زیادہ تھا۔ سورج کی کرنیں، بادلوں کا پردہ سرک جانے پر، کہیں کہیں، بادلوں کے کناروں کو چمکاتی ہوئی پھیل رہی تھیں۔ بیرونی دروازے سے نکلتے ہی مجھے بشیر نعل بند کے ہتھوڑے کی ٹھکا ٹھک ٹھم ٹھک سنائی دی۔ میں میدان میں جانے کے لیے کچی سڑک پار کرنے ہی لگا تھا کہ بشیر نے ہانک لگائی۔

''او پائی...'' اس کا اٹھا ہوا ہتھوڑا ہوا ہی میں رک گیا۔ ''آ جا... آ جا... او ادھر تو کوئی بات سننے والا ہے نہ کہنے والا... آ جا!''

''گپیں شام کو،'' میں نے کہا۔ ''یہ کام کا وقت ہے۔''

بشیر نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''او تیں میریاں سب گلاں یادنیں!'' (او تجھے میری سب باتیں یاد ہیں!)

''میں میر صاحب کی طرف جارہا ہوں،'' میں نے کہا۔

''جا، ہوآ!'' بشیر نے کہا۔ ''میں نے انگیٹھی کے لیے شاہ پور سے دو بوریاں کوئلوں کی منگوائی ہیں۔ آ گئی ہوں گی لاری اڈے پر او منتری دیاں۔ لینے بھی تو جانا ہے۔''

میں میدان سے ہو کر بازار والی گلی میں داخل ہوا۔ دو تین سبزی فروش دکانوں کے بجائے گلی ہی میں ایک بڑی سی انگیٹھی میں کوئلے دہکائے اردگرد بیٹھے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ ڈسپنسری تک پہنچتے پہنچتے ایک دو دکانداروں سے میری علیک سلیک ہوئی۔ ڈسپنسری میں میر صاحب کے پہلو میں ایک موٹا سا دیہاتی بیٹھا تھا۔ میر صاحب نے سیاہ شیروانی اور سفید اون کی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔

''آیئے برخوردار،'' میر صاحب نے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تسیں چکنائی کھانا چھوڑ دیں،'' میر صاحب نے پنجابی ملی اردو میں موٹے دیہاتی سے کہا۔ ''گوشت کھانا ہی ہے تو چربی والا نہ کھائیں۔ دالیں سبزیاں استعمال کریں، ورنہ۔ . . آپ نہیں جانتے، معاملہ دل کی جانب جانے والی رگوں کا ہے، ایک بھی بند ہو گئی تو ہم یہاں، اس گاؤں میں کچھ نہ کر سکیں گے۔''

موٹا دیہاتی تھوڑا پریشان سا تھا۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاب،'' اس نے کہا۔ ''آج سے دنبہ بند — دالیں سبزیاں شروع۔'' اس نے سر پر پڑکا ہاتھوں سے درست کیا۔

''میں آپ کو دوائی دے رہا ہوں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''صبح کو ایک گولی، رات کو ایک گولی، پانی کے ساتھ۔ پانی ٹھنڈا نہ ہو۔''

موٹے دیہاتی کے جانے کے بعد میر صاحب میری سمت متوجہ ہوئے۔

''ہم نے آپ کو بہت یاد کیا،'' میر صاحب نے کہا اور پھر ان کے چہرے پر پریشانی سی نمودار ہوئی۔ وہ میز پر آگے کی سمت جھکے۔ ''ملنگوں نے آپ کا پیچھا تو نہیں کیا؟''

''نہیں سر،'' میں نے جواب دیا۔

''ہمارا اندازہ درست تھا۔'' میر صاحب نے پیچھے کرسی سے ٹیک لگائی۔ ''وہ بہت مکار آدمی ہیں۔ پیرنور شریف نے خود ہی معاملے کو دبا دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر دیہاتیوں کو یہ پتا چل گیا کہ بچے کا بالوں کا گچھا ڈھائی ماہ پہلے ہی کٹ گیا تھا اور وہ پھر بھی زندہ ہے، تو لوگوں کے ذہنوں میں سوال تو اٹھے گا ہی۔ وہ فریب جو پیر نے سادہ لوح دیہاتیوں کو دے رکھا ہے، وہ کھلنا شروع ہو جائے گا۔''

''اسے کھلنا تو چاہیے سر،'' میں نے کہا۔ ''ورنہ ہماری ساری کوشش رائیگاں جائے گی۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''لیکن ہم موجودہ حالات میں اس کے حق میں نہیں ہیں۔ آپ کے بھائی اور بھابھی اسی گاؤں میں ہیں — انھیں کسی قسم کا نقصان کے پہنچنے کا احتمال ہے۔ وہ یہاں سے ٹرانسفر ہو جائیں تو یہ بات پھیلائی جا سکتی ہے۔''

میں نے میر صاحب کی سمت غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر تشویش خوف میں بدلی ہوئی تھی۔

''بھائی کے یہاں سے چلے جانے کے بعد،'' میں نے کہا، ''یہ بھید کبھی نہ کھل پائے گا سر۔ رقیہ اور اس کا بچہ کیا غیر محفوظ نہ ہو جائیں گے؟''

''صاحبزادے، یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ رقیہ اور بچہ غیر محفوظ نہ بھی ہوے تو بھی، رقیہ میں کبھی وہ حوصلہ پیدا ہی نہیں ہوگا جس کی توقع آپ کر رہے ہیں۔''

''رقیہ گاؤں کی عورتوں کو تو بتا سکتی ہے،'' میں نے کہا۔

''ہاں،'' میر صاحب نے کہا۔ ''وہ آہستہ آہستہ یہ بات گاؤں کی عورتوں میں پھیلا سکتی ہیں... پہلے اپنے رشتے داروں میں، پھر دوسری عورتوں میں... لیکن ابھی اس معاملے کو دبا ہی رہنے دیں۔''

میر صاحب کے چہرے پر خوف سا دیکھ کر میں پریشان سا ہو رہا تھا۔

''سر، اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں،'' میں نے کہا۔

''پوچھیے، برا کیوں مانیں گے؟'' میر صاحب نے کہا۔

''سر...'' میں نے میر صاحب کے ممکنہ ناراض ہو جانے کی پروا نہ کرتے ہوے سوال پوچھ ہی لیا۔

''سر کہیں آپ... یہ تو نہیں... میرا مطلب ہے آپ کی اور بھائی جان کی دوستی بہت گہری ہے... آپ کے خیال میں ان کے ساتھ آپ کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہے؟''

میر صاحب کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ خلاف توقع ان کے ہونٹوں پر تبسم ابھرا۔

''صاحبزادے،'' انھوں نے کہا، ''ہمیں کیا خطرہ ہوگا؟ ہم تو اپنے بالوں کا گچھا کب کا نذر چڑھا چکے ہیں۔ رہا باقی سر کا مونڈن... تو وہ ہم برسوں پہلے لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہلے ہی سے کرا چکے ہیں۔''

میر صاحب کے لہجے میں تلخی ابھری۔

''میں معافی چاہتا ہوں سر،'' میں نے کہا، ''مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''ارے نہیں!'' میر صاحب نے کہا، ''معافی کس بات کی۔''

ایک بوڑھا مریض ڈسپنسری میں آیا۔ میں نے میر صاحب کی طرف دیکھا۔

''سر، میں جاؤں؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا۔'' میر صاحب نے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کتنے دنوں کے لیے آئے ہیں؟''

گیارہ،'' میں نے جواب دیا۔

اوہو!'' میر صاحب نے مریض کو سٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''ملاقات تو رہے گی۔'' میر صاحب کا لہجہ خوشگوار ہو گیا۔ وہ مریض کے ساتھ مصروف ہو گئے۔

میں ڈسپنسری سے نکلا۔ میر صاحب سے غلط قسم کا سوال پوچھنے پر مجھے ندامت سی ہو رہی تھی۔ بھائی کے گھر کے قریب پہنچ کر میں نے کچی سڑک سے اس جانب دیکھا جدھر ماسی جیراں کا تنور ہے۔ پھر میں چوڑی گلی میں آیا۔ بیرونی دروازہ کھولتے ہی مجھے برآمدے کے سامنے بوبا نظر آیا۔ وہ دوڑ کر آیا اور میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ چھپر کے نیچے بندھے ٹائیگر نے بھاؤں کی اور دم ہلانے لگا۔ میں بوبے سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ چق اٹھی۔

بدن اور سر کو اونی شال میں لپیٹے ایک دبلی پتلی لڑکی باہر آئی — گلنازی...

اس کے سارے کپڑے سفید تھے۔ شال بھی سفید تھی۔ کانوں میں جھمکے نہیں تھے، گلے میں ہار نہیں تھا، کلائیوں میں چوڑیاں نہیں تھیں، یہاں تک کہ انگلی میں انگوٹھی بھی نہیں تھی۔ وہ نکاح کی سب چیزیں اتار کر آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی، دائیں ہاتھ سے شال کا کونا پکڑ کر ہونٹوں پر رکھا۔ وہ حیرت زدہ

تھی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر تھیں، جہاں رخساروں پر ہڈیاں نمایاں تھیں۔ وہ بہت کمزور سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دبلے بدن پر اونی سفید شال کمبل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں نے پل بھر ہی میں حیرت زدگی بھی گنوا دی۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نہ مسکراہٹ تھی نہ چمک۔ اس کی گلابی رنگت معدوم ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ سفید برف جیسا ہو چکا تھا۔ اس کے رخساروں پر بھی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پورے بدن میں تپش سی نمودار ہوئی ہے۔ سرد ہوا کے جھونکوں کا احساس مٹ گیا۔ پھر میرے سب احساسات، سب جذبات پورے بدن پر ظاہر ہونا شروع ہو گئے... گلنازی میرے قریب آئی۔

''ماں نے میرا نکاح کر دیا ہے... کیا کرتی میں...؟''

گلنازی نے خود پر گزرے ہوئے ہجر کے ہر پل کی اذیت، بے بسی کی عقوبت میں بیتے ہوئے ہر لمحے اور روز و شب کی گریہ وزاری کو چند لفظوں میں بیان کر دیا۔ اس کی آواز بھاری اور کھردری سی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، یوں محسوس ہوا کہ وہ اتنا رو چکی ہے کہ اب کوئی آنسو اس کی پلکوں کی سمت نہیں آ سکتا تھا۔ شاید میری طرح اس کی بھی بز جل آنکھوں کی برسات اس کے دل پر ہو چکی تھی... مجھ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو شاید چند مہینے پہلے، میرے جھاوریاں سے جانے پر، لاری اڈے میں گلنازی پر طاری ہوئی تھی۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میری آنکھیں بھی مسکراہٹ سے چمکی ہوں گی۔ میری آنکھیں بھی پُرخمار ہو گئی ہوں گی... گلنازی کے ہونٹوں پر لمحے کے لیے مسکراہٹ نمایاں ہوئی اور فوراً ہی مٹ گئی۔

میں نے ٹانگوں سے لپٹے بوبے کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے علیحدہ کیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تمھارے تو بڑے اچھے بال نکل آئے ہیں،'' میں نے سرگودھا کی زبان اور لہجے میں کہا۔

''ہاں!'' بوبے نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ اپنے سر پر پھیرا۔

''سکول جاتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں آں آں...'' بوبے نے لفظ ہاں کو کھینچا۔ ''اماں چھوڑنے جاتی ہے۔''

''شاباش!''میں نے اپنے دائیں بازو کو اس کے گرد حمائل کیا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''بہت پڑھنا،''میں نے کہا۔''پڑھ لکھ کر بڑے افسر کی طرح اس گاؤں میں آنا۔''

اچانک بوبے نے بیرونی دروازے کی سمت دیکھا۔ میں نے اس کی نظروں کا اپنی نگاہوں سے تعاقب کیا۔ گلنازی بیرونی دروازے کا پٹ کھول رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر میری سمت دیکھا۔ اس کی لہرانے والی زلف شال میں روپوش تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھنچی بھنچی تھیں۔ چہرے پر سفید بدلیاں سی چھائی ہوئی تھیں۔ وہ آہستگی سے چلی گئی۔ ہر سمت اداسی سی پھیل گئی۔ ہوا کے سرد جھونکے بھی اداس تھے۔

مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوگئی جس میں دور، بہت دور چلے جانے کی خواہش ہوتی ہے۔

پھر مجھے اپنے وجود میں دھیمی سی مسکراہٹ محسوس ہوئی۔

میں چونک کر اٹھا— برامدے کی چق پھر اٹھی۔ ماسی جیراں برامدے سے صحن میں آئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رک گئی۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں بھی بے اختیار ہونٹوں تک گئیں۔ نہ جانے اندر بھابھی اور بہنوں سے اس کی کیا باتیں ہوئی تھیں، اس کا چہرہ غمزدہ تھا۔ اس نے اداس سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ قریب آئی اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کی پلکوں پر دو بڑے بڑے آنسو نمودار ہوے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے رخسار پر لڑھک جاتے، وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی سمت گئی، اس کا دایاں ہاتھ آنکھوں کی سمت جاتا نظر آیا اور وہ باہر چلی گئی۔

چق تیسری بار اٹھی۔

رقیہ باہر آئی۔ وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ ہمیشہ مجھے دیکھ کر منھ پھیر لیا کرتی تھی، بات بھی کرتی تھی تو مجھے دیکھے بغیر۔

''مجھے خوشی ہوئی کہ بوبے نے سکول جانا شروع کر دیا ہے،''اس بار بھی میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ کو بہت یاد کرتا ہے،''رقیہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوے کہا۔ پھر اس کے چہرے پر ندامت کی گہری سی کیفیت ابھری۔''میں... میں...''اس کا لہجہ اکھڑ رہا تھا۔''میں بہت شرمندہ ہوں، میں نے آپ کو بہت بددعائیں، گالیاں اور دھمکیاں دی تھیں۔''

''کوئی بات نہیں،''میں نے مسکراتے ہوے کہا۔''وہ گالیاں، بددعائیں، دھمکیاں ایک ماں

نے دی تھیں جو بہت خوفزدہ تھی۔''

میرے اس جملے سے رقیہ کے چہرے پر سکون سا نمودار ہوا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ویر جی، میں بہت ڈر گئی تھی۔'' رقیہ کے ہونٹوں سے اپنے لیے ویر جی کے الفاظ سن کر مجھے صحن میں دھوپ دہکتی محسوس ہوئی۔ ''اس بدمعاش کے ملنگوں نے مجھے بہت خوفزدہ کیا ہوا تھا۔'' رقیہ کا لہجہ دھیما ہو گیا۔

''کیا تم اب بھی خوفزدہ ہو؟'' میں نے پوچھا اور رقیہ مسکرائی۔

''مجھے اب کسی کا ڈر نہیں ہے،'' اس نے کہا۔ ''میں بدروحوں اور کالی بلا کا بھید جان چکی ہوں۔''

''کیا تم نے اپنی جاننے والی عورتوں کو بتایا ہے کہ پیر نور شریف دھوکے باز ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسے بتاؤں ویر جی!'' رقیہ نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کی بھرجائی بی بی جی نے منع کر دیا ہے۔ ویسے بھی یہاں کی عورتیں پاگل ہیں، جیسے میں پاگل تھی... پچھلے ہفتے دتے تیلی کی بیوی گاماں کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے... ملنگ نہیں آئے تو وہ خود رکھوانے میگھا پتن چلی گئی تھی۔''

میں پریشان سا ہو گیا۔

''تم نے اسے روکا نہیں؟ بتایا نہیں کہ پیر نور شریف فریبی ہے، دھوکے باز ہے؟'' میں نے کہا۔

''کیسے روکتی؟'' رقیہ کے چہرے پر بھی پریشانی سی تھی۔ ''کیسے روکوں؟... یہ علاقہ پیر نور شریف کے مریدوں کا ہے۔ ہر مرد کے گلے میں اس کا دیا ہوا تعویذ لٹک رہا ہے۔ عورتیں اس سے پانی دم کرا کے اپنے گھروں میں اونچی جگہ پر رکھتی ہیں۔ ہر طرف پیر کی دہشت ہے... کس سے کہوں، کسے روکوں؟'' رقیہ کی آنکھوں میں پریشانی کے ساتھ ساتھ بے بسی کی کیفیت بھی نمایاں ہو گئی۔ ''کیا کروں میں... ایک اکیلی... کمزور عورت...''

❊❊

۲۷

قیمت

425/- روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰